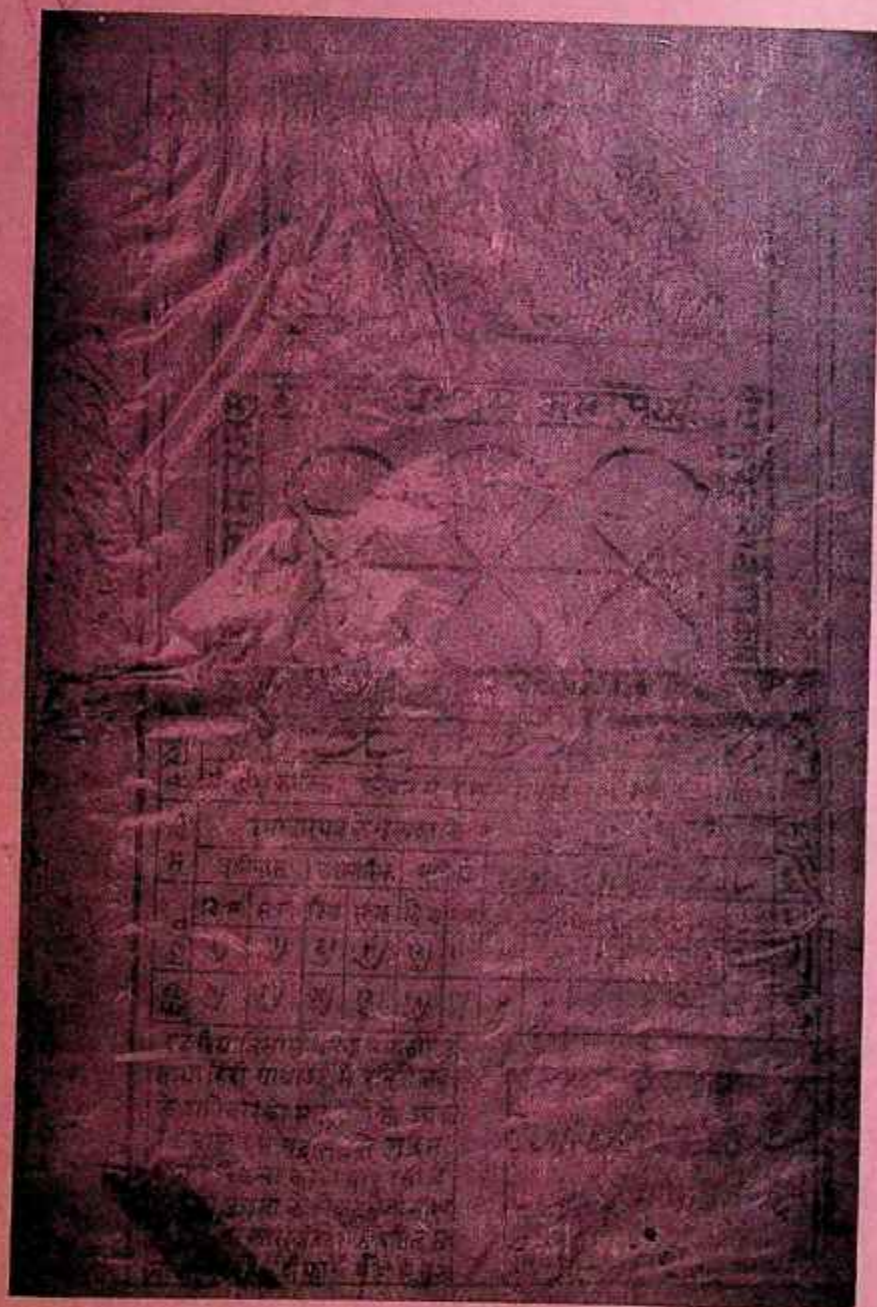


کشمیر میں اردو



جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سرنگر

کشمیر میں اردو

(دوسرا حصہ)

پروفیسر عبد القادر سروری

ترتیب

محمد یوسف ٹینگ

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹس، کلچر اینڈ لینگویج ریسرچ

ناشر — سیکرٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹس کلچر اینڈ لینگویج سائنسز

مطبع — جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرز، دہلی

چھاپ — ۱۹۸۲ء

کتابت — محمد یوسف گلزار احمد

قیمت —

سرورق — کشمیر کا پہلا خوانی اخبار بدایا پلاس —

ترتیب

- ★ ————— ذات نامہ
- ★ ————— عرض ناشر
- ★ ————— پیش گفتار
- ★ ————— ابتدائی آثار
- ★ ————— استقلال
- ★ ————— عروج
- ★ ————— نیا عہد نئی تحریکیں
- ★ ————— نیا عہد اور نثری ادب

۱۹۱۴ء میں اہلالِ شیعہ شدہ ایک اشتہار

ایرانی - قزاقستان

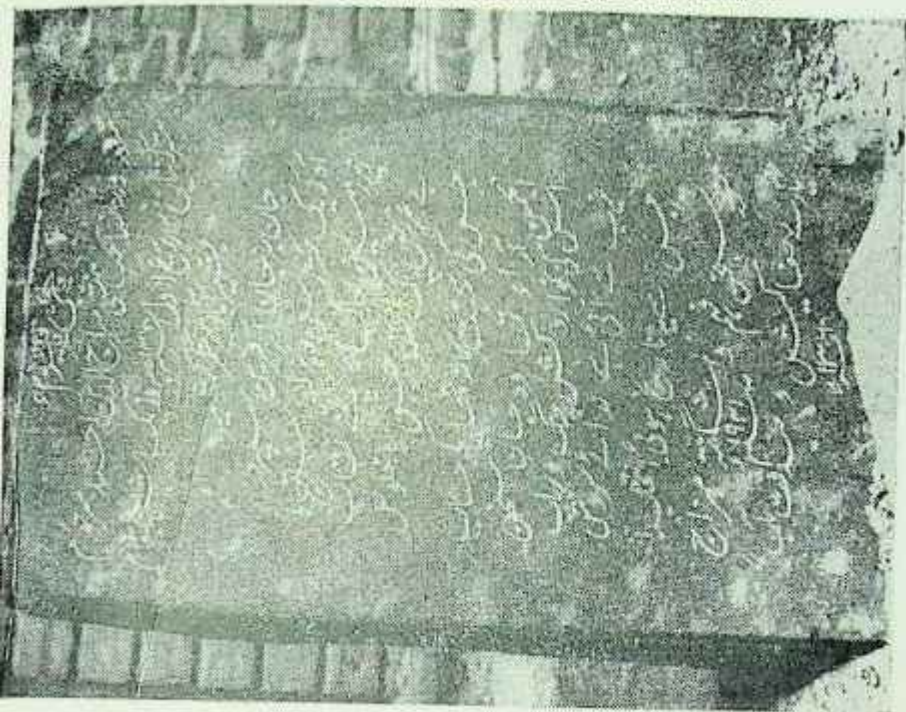
پیشانی ہاتھ سبب اسلٹ سبب (کسی کے لئے مقام پر لڑا)

شال	پایان	آفت	ارمان	ناله	ناله	ناله	ناله
دی کشمیر کو پیرا		سوسالی		دی کشمیر			
لویان	کویند	لوپیان	طوقان	بوسین	تقاسی		

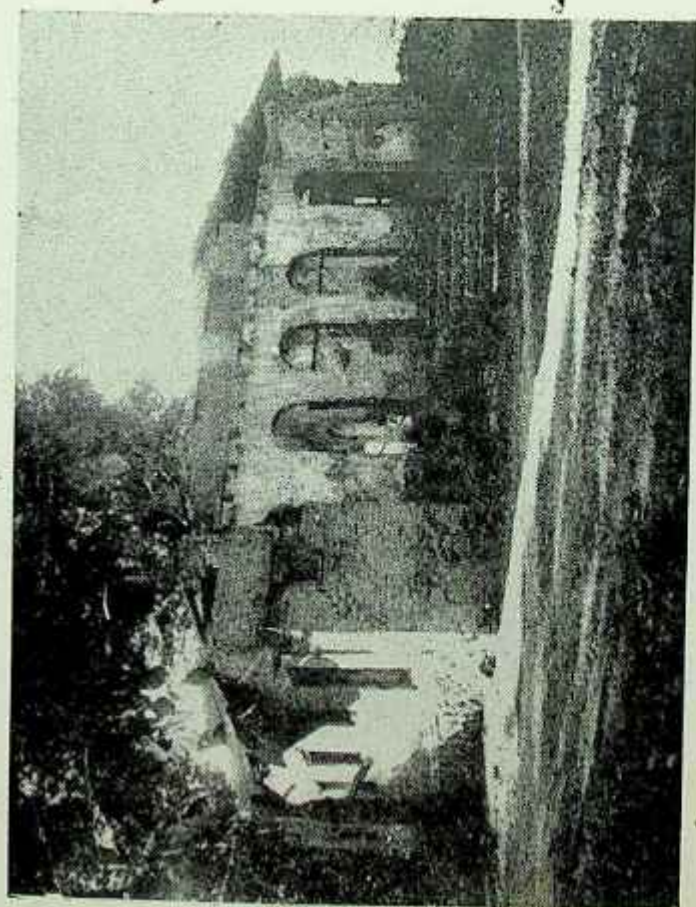
ہندوستان لگاکرم کوں سالکت کے نام ہمارا برہمنی سنگنمہ کا ارسال کیا ہوا ایک خط

[illegible]

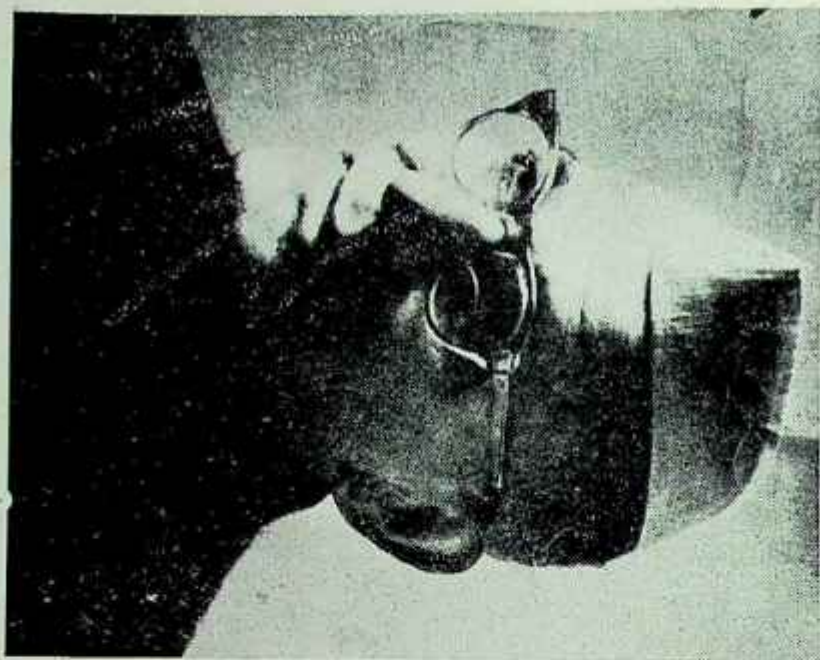
لوہ مزار فشتی ہرارج الدین



مگھین باغ ہر سینگ میں مولانا شہتہیلی کی عارضی قبراگاہ



لالہ ملک ارشد صراف



مکتبہ سید پوری





عسکر محمد پوری



دیوان نرسنگھ داس نرگس

ذات نامہ سروری

میری ولادت ۱۹۰۶ء ۱۹ اگست کو شہر حیدر آباد میں ہوئی میرے والد حضرت حاجی محمد سرور کو منصب سے کچھ حصہ ملتا تھا۔ جو بعد میں موعود الخیرت ہو گیا تھا۔ دادا حضرت محمد جعفر قبلہ قدس سرہ ایک تارک الدنیا باخدا بزرگ تھے جن کے اجداد میں ایک بزرگ حضرت سرور سلطان قدس سرہ کشمیر سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے اسلاف عرب سے کشمیر ہوتے ہوئے دہلی آ گئے تھے۔ بعد میں ان کی اولاد عالمگیر کے عہد میں دکن چلی آئی۔ عالمگیر کے عہد سے اس خاندان کے افراد دکن ہی میں رہ گئے۔

میرے خاندان کے افراد کو فقر کے علاوہ دینی علوم اور عربی و فارسی سے گہرا لگاؤ رہا۔ چنانچہ میرے بڑے بھائی مولانا محمد جعفر مولوی کابل عربی اور فارسی کے سربراہ اور وہ عالم تھے۔ جامعہ نظامیہ میں شیع الادب عربی کی خدمت عرصہ تک انجام دی۔ اس کے بعد وہ محکمہ تعلیمات میں منتقل ہو گئے تھے۔ ان کے شاگردوں میں سے اکثر اعلیٰ علمی عہدوں اور مراتب پر پہنچے۔

میری والدہ کا خاندان حیدر آباد کے دیہات سے تعلق رکھتا تھا۔ خود والدہ پڑھی لکھی نہ تھیں لیکن مذہبی امور اور اشغال میں انہیں علو کا درجہ حاصل تھا۔ وہ حیدر آباد کے مشہور پیر طریقت حضرت سید شاہ محمد عمر قبلہ قدس سرہ سے بیعت تھی جن کے مرید میرے والد بھی تھے۔

میں نے قرآن کی تعلیم مدرسہ مقبولہ زمان خان شہید میں حاصل کی اور فارسی کی تعلیم گھر پر پڑے بھائی اور والد مرحوم سے پائی۔ ابتدائی تعلیم کے لئے مدرسہ منصفداران میں داخل کیا گیا۔ انگریزی تعلیم مدرسہ مفید الانام میں شروع ہوئی۔ جہاں سے بڈل کا امتحان درجہ اول میں کامیاب کیا۔ ہائی اسکول کی تعلیم کے لئے بڈل ہائی اسکول میں داخل کیا گیا اور ۱۹۲۰ء میں میٹرک کا امتحان پاس کر کے کلیہ جامعہ عثمانیہ میں داخل ہوا۔ اور اسٹریڈیٹ بی۔ اے اور ایم۔ اے اور ایل ایل بی کے امتحانات پاس کئے۔ ۱۹۲۵ء میں میرا تقریر عثمانیہ یونیورسٹی میں بحیثیت مددگار پروفیسر اور لیکچرار اردو فارسی عمل میں آیا۔ ۱۹۳۲ء میں میرا تقریر پروفیسر اردو اور صدر شعبہ اردو فارسی و عربی کی خدمت پر جامعہ میسور میں ہوا۔ ہندی کے شعبہ کی نگرانی بھی میرے تفویض تھی۔ یہ خدمت میں نے ۱۹۴۰ء تک انجام دی۔ ۱۹۴۰ء میں جامعہ عثمانیہ کے اردو پروفیسر کی جگہ خالی ہوئی اور مجھے صدر شعبہ کی حیثیت سے واپس طلب کر لیا گیا۔ ۱۹۵۲ء میں جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر اردو اور صدر شعبہ کی جگہ پر مجھے ترقی ملی اور اس خدمت کو میں ۱۹۶۱ء تک انجام دیتا رہا۔ جامعہ عثمانیہ میں دوسری یونیورسٹیوں کے برخلاف پروفیسر کی سبکدوشی پچیس برس کی عمر میں ہوتی ہے۔ وظیفہ پربسکدوشی کے بعد تقریباً ایک سال تک اعزازی پروفیسر اور صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ ۱۹۶۲ء میں اس خدمت سے سبکدوش ہوا اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے تحقیقاتی کام کے لئے اعزازی نیشنل پروفیسر کے عہدہ پر مامور کیا۔

۱۹۶۲ء میں میرا تقریروں اور کثیر یونیورسٹی کے پورٹ گریجویٹ ڈیپارٹمنٹ میں پروفیسر اردو اور صدر شعبہ اردو اور فارسی کی خدمت پر عمل

میں آیا۔ چنانچہ اس وقت بھی خدمت انجام دے رہے ہوں۔
جن علمی اور ادبی اداروں سے میرا تعلق رہا ہے اس کی کچھ تفصیل درج ذیل ہے:-

- ۱۔ مؤسس رکن ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد۔ دکن۔
- ۲۔ مؤسس رکن واعزازی معتد مجلس تحقیقات اردو حیدر آباد۔ دکن۔
- ۳۔ رکن اکیڈمک کونسل وسینٹ عثمانیہ میسور وجوں و کشمیر یونیورسٹی۔
- ۴۔ صدر مجلس نصاب عثمانیہ میسور وجوں و کشمیر یونیورسٹی۔
- ۵۔ صدر مجلس نصاب اردو جامعہ علی گڑھ مدراس و کرم و جیلپور۔
- ۶۔ رکن لینگویج اکیڈمی کا و سزیز یونٹ۔ اسمبلی ہند۔
- ۷۔ معتد اعزازی انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند۔
- ۸۔ رکن مجلس مشاورت اردو سائنس اکیڈمی ہند۔
- ۹۔ رکن مجلس ترجمہ اردو دستور ہند۔
- ۱۰۔ رکن مجلس مشاورت "آجکل" دہلی
- ۱۱۔ رکن مجلس مشاورت "شیرازہ" سری نگر

تصانیف اور تالیفات کی فہرست ذیل میں درج ہے:-

- ۱۔ جدید اردو شاعری ۱۹۲۹ء مایند ایڈیشن ۱۹۲۹ء، ۱۹۳۳ء، ۱۹۴۵ء، ۱۹۴۶ء، ۱۹۶۰ء
- ۲۔ دنیا کے افسانے ۱۹۲۷ء (۳۔ جامعہ عثمانیہ میں اردو مخطوطات کی تفصیلی فہرست ۱۹۲۷ء)
- ۳۔ کردار اور افسانہ ۱۹۳۵ء۔ ۴۔ حیدر آباد کی تعلیمی ترقی ۱۹۳۴ء۔ ۵۔ دنیا کے شاہکار افسانے
- ۶۔ قدیم افسانے ۱۹۳۹ء۔ ۷۔ پھولیں ۱۹۳۹ء۔ ۸۔ سراجِ سخن ۱۹۴۰ء۔ ۹۔ کلیات سراج ۱۹۴۰ء۔ ۱۰۔
- ۱۱۔ نقشہ بنظیر صنعتی ۱۹۳۸ء۔ ۱۲۔ اردو مشنوی کا ارتقاء ۱۹۴۰ء۔ ۱۳۔ سراج اور انکی
- ۱۴۔ شاعری ۱۹۴۱ء۔ ۱۵۔ مراہ الاسرار۔ شاہ صدر الدین ۱۹۴۴ء۔ ۱۶۔ مہتاب سخن
- ۱۷۔ مجموعہ کلام لالہ مہتاب رائے سبقت۔ سرورنگا پٹن۔ میسور۔ ۱۹۴۵ء۔

عرضِ ناشر:

اس کتاب کا پہلا حصہ پچھلے برس شائع ہوا کہ کثیر شناسی کے ادب کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ اس حصے میں مصنف پروفیسر عید القادر سردی مرحوم نے اپنے اصل موضوع یعنی کثیر میں اردو کی گویا تثبیب باندھی ہے اور اس مختلف اللسان ریاست کی قدیم اور جدید زبانوں کا ذکر کر کے اردو کے طلوع اور عروج کی داستان بیان کرنے کا منظر نامہ تحریر کیا ہے۔ زیرِ نظر جلد میں وہ بیک وقت گریز اور توصیف، بلکہ تفصیل کے مراحل سے گزرتے ہیں اور اس لحاظ سے تین جلدوں میں شائع ہونے والی کتاب کا سب سے معلومات افزا اور قیمتی حصہ ہے۔

سردی ایک بڑے وقت طلب اور دقیق بینِ محقق تھے۔ اس کا اندازہ زیرِ نظر جلد کے تقریباً ہر صفحے کے مطالعے سے ہوگا۔ انہوں نے کثیر میں اردو کے ابتدائی آثار کی تلاش میں دفتروں کے دفتر چھان مارے ہیں۔ وہ اپنا قصہ مغل دور سے بھی پہلے شروع کرتے ہیں۔ پھر مغلیہ دور میں اردو کا اُفتخ آہستہ آہستہ کھلنے لگتا ہے اور ڈوگرہ وقت میں اس کی صبح صادق نمودار ہو جاتی ہے۔ سردی، اپنا بیانیہ دورِ حاضر تک لیتے ہیں۔ اور اس جلد میں دینا ناتھ نادام، مرزا عارف، پریم ناتھ بزاز اور غلام احمد کھنسی تک لے آتے ہیں۔ جو ابھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔

کثیر میں اردو کی ارتقاء کی کہانی کا مطالعہ کرنے والوں کو اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ کثیر کے دورِ ظلمت میں جو انیسویں صدی کی ابتداء سے اس کے وسط تک خاص طور

پہلے حد قہر سال رہا۔ یہاں منشی دیارام کا چہرہ خوشہ دل جیسے شاعر موجود تھے جو اردو کے ایسے موتی سے شعر نکال سکتے تھے۔

آئے تھے مثل صبا، ہم سیر گلشن کرچکے
لے لو مالی باغ اپنا، ہم تو اپنے گھر چلے

گلاب سنگھ نے جب ۱۹۴۶ء میں کشمیر کو خریدا تو فارسی کا اٹا ہوا ہاتھی پھر بھی سوال لکھ کا تھا۔ فارسی یہاں ایک ترقی پذیر اور استقبال آگاہ تمدن کے حشم میں آئی تھی۔ لیکن اب اُس کی نسبت سکونگیش تھیں۔ جاگیر داری سماں پر سرمایہ دارانہ نظام کے حملے کے ساتھ ہی بڑی بی فارسی کا جاگیر داری پلنگ بوسیدہ ہونے لگا۔ اور یہ چھوٹی بی اردو کو اپنی چابیاں پُرد کر کے انھیں موندنے لگی۔ اگرچہ رسمی طور پر دہلی دربار نے ۱۸۳۷ء میں فارسی کی جگہ اردو کو سرکاری زبان بنانے کا اعلان کیا لیکن اردو اس سے پہلے عوامی دلوں کی سڑیلین پر اپنے خیمے گاڑ چکی تھی اور یہ محکم ایک لمبے عمل کی محض رسم توثیق تھا۔

اردو کشمیر میں فارسی کی بیٹی اور تازہ صنعتی انقلاب کا ایک تازہ جموں لکا بن کر اُٹئی۔ مرزا غالب نے انگریزوں کی ہندوستان کو دین کے سلسلے میں اور باتوں کے علاوہ —
"حرف چوں طائر بہ پرواز آمدہ" کا خاص ذکر کیا تھا۔ ریاست جموں و کشمیر میں تاریقی کے پہلے پیغامات اردو زبان میں ہی موصول ہوئے۔ ریاست میں پتھر کا پہلا چھاپ خانہ بھی انیسویں صدی کے وسط میں ہی قائم ہوا۔ اور پھر بیسویں صدی تک آتے آتے یہاں کا سارا سرکاری کاروبار اردو میں چھپنے اور چلنے لگا۔ یہاں تک کہ ڈوگرہ سرکار کا سب سے با اختیار ادارہ یعنی اعلیٰ کونسل (کابینہ) کی کاروائی اردو میں ہی قلم بند کی جانے لگی۔ چنانچہ پہلے پاس اس رویداد کے اصل نسخے موجود ہیں جن پر اور عمائدین کے علاوہ جہانگیر کے بھی دستخط ہیں جو اردو کے نہایت خوش خط نویسوں کی تحریر میں ہیں۔ اس سطح پر کیا شکل و صورت تھی اُس کا اندازہ اس مختصر اقتباس سے ہوگا۔ تحریر ہونے کے اصول

مندرجہ (۴) دستور العمل کو کمتر منظور کرتے ہوئے راجہ بلدیو سنگھ صاحب راجہ پونچھ کو دربار کی تحریری اجازت پیش تر حاصل کرنے کے بغیر کسی شخص رعایا انگریزی کو مبلغ چالیس روپے ماہوار سے زیادہ پر ملازم رکھنے کا اختیار نہیں ہے۔ " کارروائی سرحد ۲۷ اگست ۱۹۱۷ء بمقام سری نگر۔

کشمیر میں ایک اور بڑا کارنامہ یہ رہا کہ وہ یہاں انقلاب اور نجات کا پیغام لے کر بھی آئی۔ اور ان کے اظہار کی آواز بھی بن گئی۔ پنجاب میں اردو صحافت پچھلی صدی کے آخری وسط میں برگٹ بار لائی تھی۔ ان اخبارات میں کچھ تو کشمیریوں کے ہاتھوں میں تھے۔ (جیسے اخبار عام لاہور)۔ ان اخبارات میں کشمیر پر بھی توجہ ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ نشریات کشمیریوں کا ذہنی لمس پاکر ایک نئی اُتھل پُتھل کی بشارت دے رہی تھیں۔ چنانچہ کشمیر میں باقاعدہ سیاسی بیداری کا عنوان اردو صحافت نے ہی تحریر کیا۔ زمینبر سنگھ کی کشمیری پنڈتوں کے ایک طبقے سے ٹھٹھن گئی اور اُس کے پس منظر میں سیاسی اور اقتصادی دونوں وجود کا کارفرما تھیں۔ کشمیری پنڈت وادی کے سب سے تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ مسلمانوں کی آمد اور استقلال کے ابتدائی جھٹکوں کے اور سلطان زین العابدین کے زمانے میں ان کی حالت نے پھر سنبھال لیا۔ اور یہ اپنے قلم کے پتو اوروں سے امیر خسروی کا سفینہ رواں رکھتے رہے۔ جنوں کے حکمران خاندان نے وہاں کے نسبتاً نوآموز افارب اور بیرون ریاست کے یقینی طور پر زیادہ پڑھے لکھے لوگوں کو کشمیر کی انتظامیہ میں بھرتی کرنا شروع کر دیا۔ کشمیری پنڈتوں کو اپنی روزی اور روٹی کے لالے پڑنے لگے۔ اُدھر پنجاب میں قومی تحریکوں کے اُبھارنے والوں میں جولانیاں پیدا کرنا شروع کر دیں۔ چنانچہ اس مرحلے پر کشمیریوں کے جذبات کی ترجمانی ہر گویاں خستہ نہ کی۔ اُس نے کشمیر کے قحطِ عظیم میں زمینبر سنگھ کی انتظامیہ کی کارستانیوں کی کڑی مُنکتہ چینی کی اور یہ آواز اردو کے اخبارات 'ایفارمر' غیر خواہ، رادی وغیرہ کے صفحات سے ہی بلند کی گئی۔ اس شور و شبنوں سے جنوں کشمیر کی

حکومت اس قدر زنج ہو گئی کہ آخر کار خستہ کو باہر قلعے میں پایہ جولاں کر دیا گیا۔ یہ محض اتفاق کی بات نہیں کہ خستہ کو عوام نواز آواز کا جواب بھی لکیر کے فقیر ایک کشمیری پندت راجہ کول عرض بھیجی دیری نے دیا۔ یہ مصاحب صفت مداحی اردو میں سمانہ سکی اور اس لئے فارسی میں تحریر ہوئی۔

ایک طرف تو یہ صورت تھی دوسری طرف لاہور میں علامہ اقبال کشمیریوں کے بے پناہ حُزن کو اپنے اشعار کے نگینوں میں سمو رہے تھے۔

پیچہ ظلم و جہالت نے بُرا حال کیا
بن کے مقراض ہیں بے پرواں کیا
توڑ اُس دستِ جفا کیش کو یا رب جس نے
روحِ آزادی کشمیر کو پامال کیا

لیکن احتجاج کے ساتھ آرزو مندی کی شمع بھی اُردو کے ہی شمع دان پر چل رہی تھی۔ اگرچہ شبلی نعمانی کو کشمیر کی ہمارا اس نہ آئی۔ لیکن محمد حسین عارف حبش شاہ دین ہمایوں اور خوشی محمد ناظر کی کشمیر پر لکھی ہوئی نظمیں کشمیر کے خوبصورت ترین قصیدوں میں شمار کرنے کے قابل ہیں۔ اس صدی کی ابتداء سے اس کے نصف وسط تک کشمیر میں اُردو کا زریں زمانہ تھا۔ اور اس زمانے کی ساری چھلیں سرور نے بڑی تفصیل سے بیان کی ہیں۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ اُس وقت کشمیر اُس علاقے کے کششِ ثقل کے مدار میں تھی۔ لاہور اس نظامِ شمسی کا مرکز تھا اور اُردو کا چڑھتا ہوا دریا کشمیر میں بھی کوہِ دامن سے ٹکرا رہا تھا۔ تقسیم کے بعد جہاں اس دریا کے سونے خشک ہو گئے وہاں خود ریاست میں سیاسی بیداری کے ساتھ ساتھ مقامی زبانوں کے حقوق کا چرچا ہونے لگا اور اُردو تخلیقی سطح پر علحیدہ ہونے لگی۔

واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب میں کچھ ایسے اُردو ادیبوں اور شاعروں کے نام اور ان

کے کلام کے نمونے مل جاتے ہیں کہ ان ادیبوں اور شاعروں کا نام اب اسی کتاب کی وجہ سے تاریخ ادب کے حافط میں رہ سکے گا۔ اس طرح سے یہ کتاب ایک سفینہٴ نوح سا بن گئی ہے کہ جو بھی اس میں سوار ہوا، قعر گمنانی میں ڈوب جانے سے بچ گیا۔

سروردی کی اس تصنیف کو تنقید سے زیادہ تاریخ اور تذکرے کی ذیل میں شمار کیا جانا چاہیئے۔ انہوں نے عام طور پر مداحی اور توصیف کے دریا اس افراط سے بہلے ہیں کہ جو بھی اس تصنیف کے گھاٹ پر آ نکلا۔ خوشحال اور مالامال ہو کے چل دیا۔ یہ ایک نقاد کا نہیں بلکہ ایک ہم درد کا رویہ ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کہیں کہیں جڑیات و تفصیلات کو زیب داستان کرنے میں کچھ زیادہ ہی فیاضی سے کام لیا ہے۔ لیکن محقق اور تذکرہ نگار کے حق میں یہ غامی نہیں بلکہ خوبی بن جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے شغف اور شوق سے یہ خرمن اکٹھا کر دیا۔ اس کی درجہ بندی اور مقام شناسی تو ہوتی ہی ہے گی۔ بعض مقامات پر سروردی سے چوک بھی ہوئی ہے مثلاً وہ ۱۹۳۱ء کی تحریک کشمیر کے ضمن میں کہتے ہیں کہ شیخ محمد عبداللہ مرحوم نے اُس وقت تحریک آزادی زندہ رکھنے کیلئے محنتی غلام محمد اور خواجہ غلام محمد صادق مرحوم کو لاہور بھیج دیا، تسلی ہے۔ کیونکہ ۱۹۳۱ء میں دونوں حضرات سیاست کے منہج پر موجود نہ تھے۔ دراصل سروردی ۱۹۲۶ء کی بات کرتے ہیں۔

اس کتاب کی تیسری اور آخری جلد اگلے سال شائع کی جائے گی جس میں عم عمر اردو ادیبوں اور شعراء کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ کتاب کی تکمیل کے بعد یقیناً کشمیر کے دبستانِ اردو کے متعلق ایک واضح تر اور بہت روشن صورت منظر عام پر آ جائے گی۔ اس کتاب کے لئے بعض نادر تصاویر بہم کرنے کے لئے میرے ساتھ ہمارے بلیکشن انچارج بشیر اختر نے کافی لگن سے کام لیا ہے۔ میں اُن کا شکر گزار ہوں۔

محمد یوسف ٹینگہ

سری نگر، نومبر ۱۹۸۲ء

پیش گفتار

پروفیسر عبدالقادر سوری کی تصنیف "کشمیر میں اُردو" کا دوسرا حصہ پیش خدمت ہے۔

سوروری کی شاندار تصنیف کا پہلا حصہ اکادمی کی طرف سے پچھلے سال شایع ہوا ہے۔ اُس جلد کو سوروری نے کشمیر میں اُردو کی آمد اور اُبھار کا پس منظر اُجاگر کرنے کے لئے لکھا ہے۔ ایک دیدہ ور ادب شناس اور ماہر لسانیات کی حیثیت سے وہ یہ بات جانتے تھے کہ ایک نئی زبان کا چلن اور اُس میں ادب کی تخلیق کوئی الگ تھلگ وقوع نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک تہذیبی عمل کا تسلسل ہوتا ہے اور اُس کے تانے بانے ارد گرد کے تواریخی، سیاسی، سماجی اور لسانی حقائق سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب ان تقاضوں کے زیر اثر مختلف نسب کی زبانیں اور مختلف اقسام کے ذوق ایک دوسرے کے ساتھ ہم بغل ہوتا شروع کر دیتے تو ایک نئی تہذیبی تولید کے سامان ہم ہو جاتے ہیں۔ اُردو تو خیر اپنی خصلت میں ہی دو تہذیبی دھاروں کے معاشقے کی خوبصورت اولاد ہے۔ کشمیر میں اس کی آمد اور پیش قدمی بڑے زمانے تک محدود رہی اور اُس کی وجہ صرف کشمیر کا جغرافیہ نہیں ہے۔ یہ بات مسلم ہے کہ کسی قوم کی تواریخ اُس کی جغرافیہ کے بندھنوں میں جکڑی رہتی ہے۔ کشمیر کے کبھی جات

تک پہنچنے کے لئے اُس کے دُشوار گزار راستوں کے ظلمات سے گزرنا پڑتا ہے۔ اُردو جیب
 حیدرآباد دہلی، لکھنؤ اور لاہور کی موافق اب ہوا میں پنپ رہی تھی۔ اُس وقت بھی شرفاً
 یا زیادہ سے زیادہ بگڑے نوابوں کی زبان تھی۔ مہم بازوں یا حکمرانوں کی نہیں۔ اسی لئے
 میر اور غالب کے یہاں کشمیر کا ذکر اور اس کی توصیف تو نظر آتی ہے لیکن خود انہیں کیا
 ان کے زیادہ فارغ البال ہم عصروں یا شاگردوں کو کشمیر آنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ بڑے ادیب
 اور تہذیبی شخصیات تحریکوں کے تیز دھار سرے (SPERR HEADS) ہوتے ہیں۔ وہ جہاں
 بھی اپنا خیمہ گاڑیں، ماحول کو اپنے رنگ میں رنگ لیتے ہیں کشمیر میں اُن کی آمد و رفت کا
 سلسلہ بہت مدت تک محدود رہا۔ اس طور اُردو کے اثر و نفوذ کی صورت حال بھی آگے نہ
 بڑھ سکی۔

لیکن اس سے بڑی بات یہ ہے کہ کشمیر میں اُردو کی نشوونما کے لئے ایسی موافق فضا
 موجود نہیں تھی، جیسی جوں یا دہلی کے اطراف و اکناف میں تھی۔ سروری نے زیرِ نظر حصے میں
 لکھنا ہے کہ جوں اور اُس کے نواح میں پنجابی، لہنا، پہاڑی یا ڈوگری جو زبانیں رائج ہیں،
 وہ اُردو کی ہمزاد ہیں۔ اُن میں صرف لفظی سرمایے کا اشتراک ہی نہیں بلکہ لسانی قالب
 اور جملوں کی ساخت پر داخت کی مشابہت بھی موجود ہے۔ اس لئے اُردو ان علاقوں میں
 پہنچتے ہی ابتدائی جان پہچان کے بعد اُن کی ہجولی بننے لگی۔ کشمیر میں صورت حال ذرا مختلف
 ہے۔ کشمیری زبان اپنی سرشت اور گرائمر میں اُردو سے بہت دور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو بولنے
 والے دوستوں کو کشمیری سمجھنے میں بے اندازہ دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سروری کو اس
 صورت حال کا پورا اندازہ ہے اور اسی لئے انہوں نے اُردو کے درود کی کہانی کو کشمیر کی تواریخ
 اور لسانی صورت حال سے جوڑنے کے لئے اس کے سوادِ اعظم کے ساتھ ذیلی بھرنوں پر بھی روشنی
 کی کرنیں مرکوز کیں۔ اس بات کا اس لئے ذکر کیا جا رہا ہے کہ پہلی جلد کی اشاعت کے بعد کچھ
 حلقوں میں یہ ہلکی ہلکی سرگوشیاں ہوئیں کہ اس جلد کا کشمیر میں اُردو کی تواریخ سے کیا تعلق ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ اگر اردو کی کشمیر میں آمد اور عروج کو تدریسی سطح سے ادھر اٹھا کر اس کے صحیح
تہذیبی تناظر میں دیکھنا ہے تو پہلی جلد اس کتاب کے لازمی جز کی حیثیت رکھتی ہے۔ سونے
پر شہاگہیہ ہے کہ اپنی خود مختار صورت میں اس حصے کے مختلف باب عام اردو قاری کو
متعلقہ گوشوں کے بارے میں بے حد قیمتی معلومات بہم کرتے ہیں۔

سروری کا یہ بیان صحیح ہے کہ اردو کشمیر میں فارسی کی تہذیبی لہر کی رُو میں پہنچی۔
فارسی جب کشمیر میں آئی تو وہ ایک تازہ دم تہذیبی لہر اور ایک ابھرتے ہوئے سیاسی اقتدار کی
اتحادی تھی۔ کشمیر میں صورت حال اس لئے اور زیادہ شدید ہو گئی کیونکہ یہ اسلامی تعلیمات کی
قاعدہ اور سفیر بھی تھی۔ سیاسی اقتدار اور مذہبی اعتقاد جیسے کلیدی اہمیت کے عوامل نے
اس کی پشت پناہی کی اور یہ کشمیر کی تہذیبی زندگی پر چھا کر رہ گئی۔ اس کا یہ جلال چھ سو
سال تک قائم رہا۔ چھ سال بہت طویل زمانہ ہے اور اس زمانے میں فارسی طبقہ عالیہ
کی حدود سے نکل کر کافی برگ و بار لائی۔ واقعہ یہ ہے کہ فارسی کشمیر میں عوامی زبان اور
کشمیریوں کی مادری زبان تو نہیں بنی لیکن گزشتہ پانچ چھ صدیوں میں کشمیر کی تہذیبی
اور ادبی تواریخ فارسی زبان کی آغوش میں ہی موجود ہے۔ اس کے رُسوخ کا نتیجہ یہ ہوا کہ
کشمیری زبان کی شکل و شمائل پر فارسی کا گہرا رنگ چڑھ گیا۔ اس کی پارینہ لفظیات کا
سارا خزانہ دگرگوں ہو گیا اور اُس پر فارسی نے اپنے جھنڈے گاڑ دیئے۔ یہ بات کشمیر
میں اردو کے فروغ کے لئے غالب کے الفاظ میں "خدا ساز" ثابت ہوئی اور یہ بات بلا خوف
تردید کہی جاسکتی ہے کہ کشمیر میں اردو فارسی کی تہذیبی پرورش کی زائیدہ ہے۔ پچھلی صدی
کی ابتداء سے ہی یورپ کے صنعتی انقلاب کی دستک بھی دیر اور تاخیر سے ہی سہی اسات
سندوں اور نو سلسلہ ہونے کوہ تک پہنچے پھر کہ کشمیر میں بھی سمجھنے جلنے لگی۔ ذرائع آمد و
رفت میں آسانیاں فراہم ہونے لگیں اور کشمیر آنا صرف بادشاہوں اور ان کے مشیروں و
مصاحبوں کا ہی شغل نہیں رہا۔ دوسری طرف فارسی کے چراغ کا روغن سوکھنے لگا۔ جو

تلاوار اس کو بامخالف سے محفوظ رکھنے کے لئے سپرین گئی تھی۔ وہ سمجھنے لگی۔ تیسرا اہم واقعہ یہ رہا جو کہ مسلمانوں کا بہت ساندہی سرمایہ اردو میں بھی ہم ہونے لگا۔ ان تمام عناصر و عوامل نے کثیر کو اردو کے محور میں پھینک دیا۔ آہستہ آہستہ مدرسوں اور مکتبوں میں بھی اردو فارسی کی جگہ لینے لگی۔ کثیر سے جو تاجر اور طلباء پنجاب وغیرہ جاتے تھے۔ وہ بھی اس زبان کی شدہ بدھ حاصل کرنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ کہ اب اس خطے میں رابطے کی زبان یہی تھی جد تو یہ ہے کہ وہ مزدور جو کثیر کے اہم شعار جاڑے سے بدک کر میدانوں میں تلاشِ رزق کے لئے جاتے رہے ہیں وہ بھی یہ زبان سمجھنے اور ٹوٹی پھوٹی اردو بولنے لگے۔ جب یہ صورت حال پیدا ہو گئی تو دگرہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے اس صدی کے اوائل میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا۔ اردو پٹوار خٹانے سے لے کر عدالتوں اور سپردفتروں اور دربار ہر جگہ پر دخل انداز ہو گئی۔ اردو مدرسوں میں پڑھائی جانے لگی اور اس کی تعلیم و ترویج میں دوسرے عوامل نے بھی اہم حصہ ادا کیا۔

ان عوامل میں ایک یہ تھا کہ ریاست کے نظم و نسق کے لئے بیرون ریاست سے جو اعلیٰ افسر اور وغیرہ لائے گئے ان کی بڑی تعداد ایسے اصحاب پر مشتمل تھی جو یا تو اردو کے اچھے ادیب تھے یا اردو کے بہت اچھے فارسی جن کا اردو کے اہم ادیبوں سے یارانہ یا رابطہ تھا۔ اس بائے میں سردری نے تفصیلات بہم کی ہیں جن پر اضافہ کرنے کی گنجائش موجود ہے۔

اردو کا کثیر میں کس قدر اثر و نفوذ ہونے لگا تھا۔ اُس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ مہاراجہ زبیر سنگھ (۱۸۸۵-۱۸۵۶ء) نے ڈوگری زبان کو سرکاری زبان بنانے کے جوش سے انہیں اٹھا کر اردو کے عظیم الشان پرداز مولوی محمد حسین آزاد سے ڈوگری حکومت کی تاریخ لکھوانے کی بڑی کوشش کی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ شمس العلماء آزاد کی کتاب دربار اکبری کے دلکش طرزِ تحریر اور اس کی شہرت سے مہاراجہ کے منہ میں پانی

بھر آیا تھا اور وہ شمس العلماء کے قلم کے رُتھ پر سوار ہو کر اپنی نیک نامی کی تمنا کرنے لگے تھے۔ چنانچہ "مکاتیب آزاد" میں اُن کا ایک خط میجر سید حسین بلگرامی کے نام موجود ہے۔ جو ۸۔ اپریل ۱۹۸۲ء کو تحریر کیا گیا تھا۔ آزاد کا کہنا ہے کہ میں نے یہ پیش کش ٹھکرا دی کیونکہ بقول اُن کے "میری اپنی کتابیں ناتمام پڑی ہیں کہ میری جان اور لوگوں کی سگمیں ان میں لگی ہیں۔ میں کسی کی کتاب لکھوں۔ طبع کا مُنہ کالا۔" اُردو کی تردید کے سلسلے میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد کی ابتداء میں جموں میں احمدی پریس کے قیام کا ذکر کئے بغیر نہیں رہا نہیں جاسکتا۔ اس میں سرکاری کاغذات۔ نام وغیرہ اُردو میں بھی چھپتے تھے۔ انہیں سے ہر گوپال کوئل خستہ تحفہ کثیر نام کا سرکاری اخبار نکالتا تھا۔ بعد میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کے ہی دور کے اخیر میں جموں میں وکرم بلاس پریس قائم ہوا۔ جس میں "بدیا بلاس" نام کا اُردو ہندی کا مشترکہ اخبار چھپنا شروع ہو گیا۔

بعد میں اُردو زبان کے اس افسان کا چادو مہاراجہ پرتاپ سنگھ پر بھی چل گیا۔ جب کیفی نے چوہدری نوشی محمد ناظر کے تذکرے میں لکھا ہے کہ جب ناظر کا اُن کے اعلیٰ منصب ایک درباری سازش کے خیانے میں تنزل کر دیا گیا تو مہاراجہ نے ان کی نظم "جوگی" کا شہرہ سنا چنانچہ اُن سے فرمائش کر کے جب یہ نظم پرتاپ سنگھ نے سُنی تو وہ اتنا خوش ہوا کہ ناظر کو اپنے منصب پر بحال کر دیا گیا۔ پرتاپ سنگھ کے زمانے میں کامیونہ کے اجلاسوں کی روئداد اُردو میں ہی ظہور پاتی تھی اور ان پر مشتمل کچھ ضخیم مخطوطات آرکائیوز میں محفوظ ہیں۔

اُردو کثیر میں سیاسی بیداری کی نقیب بھی بن گئی۔ لاہور کے اخبارات کوہ نور "زمیندار" "اخبار عام" "پیسہ اخبار" وغیرہ کے قابل اب بھی کثیر کے کچھ گھروں میں محفوظ ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا "الہلال" بجلی کا ایک کمر کا تھا۔ جس نے سائے ہندستان کی طرح کثیر کے اہل دل اور اہل دل حضرات کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ "الہلال" کی زبان اُردو تھی۔ اس نے کثیر میں اُردو نوازی کے ہی نہیں، حریت پسندی کے تحم بھی پڑے۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ الہلال کے شماروں میں ایک کثیر تاجر کا اشتہار بڑے نمایاں

۲۰
انداز سے شایع ہوتا تھا۔ جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس اخبار کی کشمیر میں خاصی اُست
تھی اور اس کے ساتھ ہی اس کا اثر بھی کافی تھا۔ "محرر" کا ذکر تو سردی صاحب کر چکے
ہیں اور اُس میں لکھنے والے کشمیریوں کا بھی۔

اس صدی کی ابتداء سے ہی کشمیریوں کو غلامی کے خوابِ غفلت سے جگانے کے لئے
بھی اُردو میں ہی پہلی تکبیریں بلند ہوئیں۔ علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے آغاز میں ہی انہیں
یوں للکارا۔

پنجہ ظلم و جہالت نے بُرا حال کیا
بن کے مقرض نہیں بے پروا کیا
توڑ اُس دستِ جفا کیش کو یا رب جس نے
روح آزادی کشمیر کو پامال کیا

سو تدابیر کی اے قوم یہی ہے تدبیر
چشمِ اغیار میں ملتی ہے اسی سے توقیر
دُر مطلب ہے اُخت کے صدف میں پنہاں
دل کے دُنیا میں رہو مثلِ حروفِ کشمیر

محمد الدین فوق نے اُردو کو کشمیریوں کی مظلومیت کی زبان بنا دیا اور اُن کی فریاد
کا آواز صوتِ الجہر۔ اُن کی ادبی خدمات کی تفصیل سردی نے درج کی ہے۔ لیکن اس بات
کو بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ فوق نے کشمیر سے باہر کشمیریوں کی آواز بلند کرنے کے لئے
کئی اخبارات یکے بعد دیگرے نکلے۔ یہ اخبارات کشمیر میں بھی پہنچتے تو یہاں دلوں میں
ایمان بپا کرتے۔

اس صدی کی چوتھائی دہائی کشمیر میں سیاسی اور تمدنی بیداری کا صبح صادق تھی کہ یہ دونوں رجحانات ایک دوسرے کے ہمراز اور دمساز ہوتے ہیں۔ علامہ اقبال اسی دہائی کی ابتدا میں کشمیر آئے اور یہاں دِل پر زخم کھا کر چلے گئے۔ یہ زخم بعد میں کشمیری نجات کے گلشنِ رازِ جدید کا شگوفہ ثابت ہوا۔ اُن کے دلیس لاہور پہنچتے ہی وہاں کے اُردو اخبارات نے کشمیریوں کے بارے میں انکشافات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اور یہ بات اب خفیہ نہیں رہی کہ ان مضامین کی جنگاری علامہ اقبال کے حُبِ وطن سے نکلتی تھی۔ ادھر شیخ محمد عبداللہ لاہور کے اسلامیہ کالج میں پہنچ گئے اور انہوں نے وہاں حالات کا مشاہدہ کر کے اپنے سینے کی منقل دھکالی۔ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ عبدالجید سالک اور غلام رسول ٹہر کا "انقلاب" کشمیر کی تحریک کا ہر اول دستہ بن گیا۔ اس اخبار نے کشمیر دربار کی بے ہریوں کو بے نقاب کرنا۔ اور کشمیر میں مسلمانوں کی مظلومیت کا بالخصوص پردہ چاک کرنا شروع کیا۔ یہ مضامین شیخ محمد عبداللہ ہی کی مسائی سے وہاں پہنچتے تھے چنانچہ آج یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ۱۹۳۱ء میں کشمیر کی تحریک آزادی کے رسمی آغاز سے پہلے جن واقعات نے کشمیر کے ساحلِ پانیوں میں پتھر پھینک کر ارتعاش پیدا کر دیا۔ ان میں واقعہ اُن کے ابتدائی مہینوں میں انقلاب کے داخلہ کشمیر پر پابندی تھا۔ لیکن دہائی پر کشمیر اور کشمیر کے باہر بڑا غل چلا۔ لیکن خود ادارہ "انقلاب" نے اس کا توڑ بول کیا کہ اُن نے مکتوب کشمیر کے عنوان سے ایک اور اخبار نکالا اور اس میں اور زیادہ شدت سے مہاراجہ اور اس کی حکومت پر برس پڑا۔ اس پر بھی پابندی عاید کر دی گئی۔ تو فوراً "کشمیری مسلمان" کے نام سے ایک اور اخبار نکالا گیا۔ اس سلسلے کا تیسرا اخبار "مظلوم کشمیر" تھا۔ الغرض یہ کھیل اتنے استقلال اور شاقی سے کھیلا گیا کہ دربارِ کشمیر کی سانس بھولی گئی اور وہ عاجز نظر آنے لگا۔ ادھر ان اخبارات کی کشمیر میں مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ بقول شیخ محمد عبداللہ، یہ اخبارات جن کی قیمت ایک پیسہ تھی پر چسپ ہوئی تھی۔ ایک دو بلکہ پانچ پانچ روپے میں بکتے تھے۔

مئی۔ جون ۱۹۳۱ء میں تحریک کشمیر کا دھارا دلوں کے چشموں سے اُبل کر چار سو میں
گر بجے لگا تو اس کی ترجمانی میں اُردو زبان آگے آگے تھی۔ شیخ محمد عبداللہ کی خوش
نوائی نے تحریک کی حُدی خوانی کا کارنامہ انجام دیا۔ انہوں نے جامع مسجد سرینگر میں اپنی
سب سے پہلی تقریر کے آغاز میں آغا حشر کاشمیری کی نظم غ

آہ جاتی ہے فلک پر دم لانے کے لئے

بادلوں ہٹ جاؤ دید و راہ جانے کے لئے

سے شروع کی۔ بعد میں بھی وہ اقبال اور دوسرے اُردو شاعروں کی نظمیں، گانے گائے، تحریک
کا دل گرماتے رہے۔ انہوں نے اپنے دوسرے ساتھیوں محمد رجب، غلام تھڑی وغیرہ کے ساتھ
مل کر پہلا دارالمطالعہ قائم کیا۔ جو تحریک کی آگ سلگانے کے لئے دیا سلائی کے طور پر کام آیا۔
اس دارالمطالعہ میں تقریباً سو فی صدی جرائد و اخبارات اُردو میں ہی رکھے ہوئے ہوتے
تھے۔ بعد میں ۱۲ جولائی ۱۹۳۱ء کے خونین ڈرامے کے بعد جب حکومت نے عوامی نمائندوں
سے اُن کے مطالبات کی فہرست طلب کی۔ تو انگریزوں کے ساتھ ساتھ اُردو میں بھی میموریل
پیش کیا گیا۔ میموریل حکومت جموں و کشمیر کے آرکائیوز میں محفوظ ہے۔

۱۹۳۱ء کے بعد کشمیر میں تحریر و تقریر کی آزادی کا دور شروع ہو گیا چنانچہ

سیٹج سے اُردو کے بہترین مقررین نے تقریریں کیں۔ ان میں مولانا

منظہر علی اظہر، مولانا ظفر علی خان، مولانا سید حبیب (ایڈیٹر ریاست)

مرتجع بہادر سپرو، مولانا علم دین سالک وغیرہ شامل تھے۔ سفیظ جالندھری

اور مولانا ظفر علی خان نے کشمیر پر نظمیں لکھیں۔

ادھر کشمیر کا پہلا اخبار پنڈت پریم ناتھ بزاز نے "دستا" کے نام سے اُردو میں

نکلانا شروع کیا۔ تحریک آزادی کا تقریباً سارا لٹریچر اُردو میں تیار ہونے لگا۔ اسی

مسلم کانفرنس اوریشنل کانفرنس کے صدارتی خطبات، قراردادیں اور دوسری اہم دستاویزات شامل ہیں۔ ادھر کشمیر میں اردو ادیبوں کا ایک بڑا کاروان سامنے آنے لگا۔ ان میں پنڈت نند لال طالب، پنڈت پریم ناتھ بزاز، پریم ناتھ پردیسی (جو ابتداء میں رونق بھی تخلص کرتے تھے) میر غلام رسول نازکی، نجم الدین عشرت، سدھیشور درما وغیرہ شامل تھے۔ ادھر جوں و کشمیر میں اردو اخبارات کا ایک کاروان بھی جاری ہو گیا۔ ان میں رعیم، چاند البرق، ہمدرد، صداقت، اصلاح، جمہور، پاسبان، جاوید، خدمت وغیرہ شامل تھے۔ ان اخبارات نے مولانا محمد سعید مسعودی، پنڈت پریم ناتھ بزاز، پنڈت کدیش بندھو، اللہ رکھاساغر، عبد المجید قرشی، نرسنگھ داس نرگس، میر عبد العزیز، نند لال داتل، غلام احمد کشفی، مولوی عبدالواحد جیسے صحافیوں کو سامنے لایا۔

کشمیر میں اردو کی تحریک کو ریاست کے باہر سے آنے والے نامور ادیبوں نے بھی بڑا عروج بخشا۔ وہ کشمیر آتے، تو انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ ان کی شہرت ان سے پہلے ہی کشمیر پہنچی ہوتی تھی۔ اس لئے انہیں کچھ ایسے ہی اشتیاق سے دیکھا جاتا جس طرح بڑے قومی رہنماؤں یا آج کل کے فلمی ستاروں کو دیکھا جاتا ہے۔ ایسے شاہیر میں پنڈت برجہ من کیفی بھی تھے۔ جو کشمیر دربار کے اسٹینٹ فارن میگزین بن کر آئے۔ اور نواب جعفر علی خان آثر بھی، جو یہاں ذریعہ رہے، حفیظ جہاندہری تو تحریک آزادی کے رہنماؤں کے قریبی دوست بن گئے۔ اور انہوں نے کشمیر کی تحریک آزادی کی حمایت میں اپنی کم مشہور مگر معرکہ الارا نظم تحریر

شیر سے محروم ہے مالک ہے جوئے شیر کا

ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

لیکھی فیض احمد فیض بھی برابر یہاں آتے رہے۔ ان کی بیوی ایلس کے ساتھ ان کا نکاح کشمیر میں ہی پڑھا گیا اور شیخ محمد عبداللہ نے قاضی کے فرائض انجام دیئے خلیفہ عبدالمکیم

عبد السبع پال، اثر صہبائی اور محمد الدین تاثیر کشمیر میں ملازمت اختیار کر کے یہاں کی ادبی محفلوں کا محور بن گئے۔ احسان دانش اور روش صدیقی بھی آتے رہے اور محفلوں میں حصہ لیتے رہے۔ روش کا تو کشمیر پر بھی بڑی نظروں کا ایک مجموعہ خیاباں خیاباں کے نام سے کلچرل اکیڈمی نے شائع کر دیا ہے۔ کشمیر اُس وقت برصغیر کی بڑی اُردو تحریک سے باضابطہ جڑ گیا۔ جب ۱۹۴۷ء میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق جوں تشریف لائے۔ انہوں نے یہاں کے ایک ادبی اجتماع میں اُردو کے حق میں بڑی زوردار تقریر کی۔ اس جلسے کے اختتام پر انجمن ترقی اُردو (ہند) کی شاخ پہلی بار ریاست میں قائم کی گئی جس کے پہلے صدر جموں کے ایک سخن نواز سمن پنڈت بہاری لال بھاکڑی سیشن جج مقرر ہوئے۔ حلیب کیفوی اس کے سیکرٹری مقرر ہوئے اور اُن کے بیان کے مطابق اس مرکزی شاخ نے ریاست کے طولی عرض میں انجمن کی شاخوں کا جال پھیلادیا۔ ڈاکٹر عبدالحق نے پرجا سمجھا (ریاست کی اسمبلی کے اجلاس کا مشاہدہ بھی کیا۔ وہ سمجھا میں اُردو تقاریر کے معیار سے اس قدر خوش ہوئے کہ انہوں نے دہلی میں کل ہند اُردو کانفرنس کی تقریب پر اپنی رپورٹ میں ان تقریروں کے بارے میں لکھا:

”شاید ہندوستان کے کسی صوبے میں اُردو اس قدر مقبول اور رایج نہیں جس قدر کشمیر میں ہے۔ ہمارے میں اُردو پڑھائی جاتی ہے اور ذریعہ تعلیم اُردو ہے۔ دفاتر کی زبان بھی اُردو ہے اور ہیئت اچھے اُردو کے ادیب اور شاعر موجود ہیں۔ دہلی کی اسمبلی کے اجلاس کو بھی جا کر دیکھا ہے سب ممبر بلا استثناء اُردو میں بلا تکلف تقریریں کرتے تھے۔ یسٹن کو آپ کو تعجب ہو گا کہ پنجاب اسمبلی میں ایسی اچھی اُردو کی تقریریں نہیں ہوتیں۔“

کاش مولوی صاحب اپنی عمر دراز کو کچھ اور دراز کر سکتے۔ اس طرح سے انہیں اسی اسمبلی میں مرحوم شمیم احمد شمیم، مولانا محمد سعید سعودی اور پنڈت درگا پرشار

نکاح : کشمیر میں اُردو از حلیب کیفوی شائع کردہ مرکزی اُردو بورڈ، گلبرگ لاہور

لارڈ ریلے کی گیلانی کے دفعہ کے لئے جو تیار کیے گئے تھے ان سے شرا اور تقاریر سننے کو ملتیں۔ اور وہ دیکھنے کو ان اصحاب نے جس طرح اُردو بولنے کے فن کو باہم عروج پر پہنچایا۔

ریاست میں اُردو کے وجود پر بیرون ریاست کی لسانی صورت حال کا اثر پڑنا لازمی تھا۔ ہندوستان میں سیاسی تحریک کے بہاؤ نے لسانی اُن کی کارنگ بدلنا بھی شروع کر دیا۔ ہندی اور اُردو کا مسئلہ شدت سے سامنے آگیا۔ ہندی کے دوستوں نے حکومت پر اثر انداز ہو کر پرجا سمجھا میں ہندی کے حق میں قواعد بنوانے کی کوششیں کیں لیکن عامی نمائندوں نے بحیثیت مجموعی اُردو کی پاسداری کی۔ ریاست میں ذریعہ تعلیم کی زبان کا تقرر کرنے کے لئے اُس وقت کے ناظم تعلیمات خواجہ غلام السیدین کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی گئی۔ کمیٹی نے ۱۹۲۶ء کے لگ بھگ اپنی رپورٹ میں کہا:

"وہ زبان جو تواریخی اور تعلیمی اسباب کی بناء پر ریاست کی عام زبان ہے، وہ اُردو ہے جو ریاست میں پہلے درجے سے لے کر اوپر تک کیلئے ذریعہ بھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اُردو ریاست میں رہنے والوں کی اکثریت کی مادری زبان نہیں ہے لیکن یہ ڈوگری، لہندا اور پنجابی سے بہت قریب ہے۔ اور ایک حد تک پہاڑی اور گوجری سے بھی ملتی جلتی ہے۔ لہذا اُن لڑکوں کے لئے جو یہ زبان نہیں جانتے ہیں۔ اُردو کا ذریعہ تعلیم ہونا کوئی دشواری کا سبب نہیں۔"

اس کے ساتھ ہی حکومت نے اعلان کیا کہ سکولوں میں "آسان اُردو" ناگری اور فارسی رسم الخط میں پڑھائی جائے گی۔ یہ اُردو اور ہندی کے درمیان ایک مصلحت آمیز سمجھوتہ تھا اور اس کے ذریعے اُردو کے ساتھ ساتھ ہندی کے وکیلوں کو بھی خوش کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن یہ آویزش عوامی زندگی کی مختلف سطحوں پر ابھرتی رہی نیشنل کانفرنس کے مروجہ صدر شیخ محمد عبداللہ نے ۸ جنوری ۱۹۲۱ء کو شاہی مسجد سرنگری میں کہا:

نیشنل کانفرنس اس بات پر بھی یقین رکھتی ہے اور واقعات چمکتے ہوئے سورج کی طرح اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے جس پر ریاست کے تمام لوگ سالہا سال سے تعلیمی اور درباری ضرورت کے لئے اتفاق کر چکے ہیں۔ آئندہ بھی یہی زبان اُن کی ترقی کا وسیلہ بننے کی اہلیت رکھتی ہے۔“ (اعلانِ حق، صفحہ ۲۶-۲۷)

اس معاملے پر نیشنل کانفرنس کی ہائی کمان میں زبردست اختلاف رہا اور پنڈت کیشپ بندھو، پنڈت پریم ناتھ بناراز اور پنڈت جیا لال کلم کے نیشنل کانفرنس سے الگ ہونے کی وجہ یہ اختلاف رائے بھی بنا۔ اس صورتِ حال کے باوجود تقسیم ہند کے وقت اُردو جموں و کشمیر میں رابطے کی سب سے مضبوط زبان تھی۔ یہاں کے تقریباً ننانوے فی صد اخبارات اسی زبان میں شائع ہوتے تھے۔ اگرچہ سرکار کے اعلیٰ صیغوں کی خط و کتابت انگریزی میں ہوتی تھی۔ لیکن عدالتوں، محکمہ مال وغیرہ میں اُردو کا زبردست چلن تھا۔ کشمیر کے اکثر اور جموں کے قابلِ لحاظ مدرسوں میں آسان اُردو اور وہ بھی فارسی رسم خط میں پڑھائی اور پڑھی جاتی تھی۔ ریاست کی سب سے بڑی عوامی جماعت نیشنل کانفرنس (جو ۱۹۳۷ء کے بعد یہاں مسکران جماعت بننے والی تھی) نے اپنے مستقبل کے لئے تیار کئے ہوئے آئینی منصوبے "نیا کشمیر" میں اُردو کو ریاست کی سرکاری زبان بنائے رکھنے کا اعلان کر دیا اور اُردو میں جموں اور کشمیر کے بہت سے ہونہار شاعر اور ادیب سامنے آئے۔

لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد صورتِ حال میں تبدیلی آنا شروع ہو گئی اور یہ بھی تواریخی عوامل کا نتیجہ تھا۔ اُردو اگرچہ بدستور دفاتر اور مدرسوں کی زبان بنی رہی لیکن کشمیری اُردو کی اور دوسری علاقائی زبانوں نے اپنے بولنے والوں کے قومی شعور کی انگڑائی کے ساتھ ساتھ اپنا حق معوانا شروع کر دیا۔ کشمیری میں چھ سو سال کا ادبی ذخیرہ موجود تھا۔ اس کے علاوہ یہ ایک ملحق اور متصل خطِ زمین کے تیس لاکھ سے زیادہ لوگوں کی زبان تھی۔ مغربی پاکستان

کے اردو مراکز سے جدائی اور ہندوستان میں اردو کے پس منظر میں چلے جانے سے کشمیر میں اس کی نشوونما متاثر ہونے لگی۔ ادھر قومیتوں اور زبانوں کے تقاضے میں کشمیریوں کو اپنی پہچان (IDENTITY) اور شخص کے گم ہو جانے کا اندیشہ ستانے لگا۔ اس بڑھتے ہوئے سیلاب کے آگے پشتہ تعمیر کرنے کے لئے انہوں نے کشمیری زبان کی ڈھال اٹھالی۔ اردو زبان کے چند تجربہ کار سخن گو مثلاً میر غلام رسول نازکی، محمد امین کامل، دینا ناتھ ناڈم وغیرہ کشمیری کا رخ اختیار کر گئے اور اس طرح سے کشمیری زبان ہی ان کے اظہار کی معتبر آواز بن گئی۔ ڈوگری زبان میں اگرچہ قدیم تحریری سرمایہ کم ہی تھا لیکن جموں کے ادیبوں نے آزادی کے بعد سے کچھ اس شدت کے ساتھ اس کے ادبی سرمایے کی ترویج شروع کر دی کہ چند دہائیوں میں یہ پنجابی کی ایک بولی کے درجے سے اٹھ کر ایک سنجیدہ زبان کی حیثیت سے اپنے حقوق طلب کرنے لگی۔ یہی عمل کم و بیش پہاڑی، گوجری زبانوں میں بھی جاری ہے۔ یہ زبانیں اب ذریعہ تعلیم میں بھی مناسب تبدیلیوں کی طلبگار ہو رہی ہیں۔ لیکن اردو زبان کے لئے اُمید کا پہلو یہ ہے کہ یہ ریاست میں اس وقت بھی رابطے کا سب سے معتبر اور موثر ذریعہ ہے اور موجودہ لسانی اور سیاسی صورت حال پر ایک سری نظر ڈالنے سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ ابھی بہت مدت تک اس میں تبدیلی کا کوئی سوال نہیں۔ اسی طرح عدالتوں اور محکمہ مال کی نجلی سطحوں پر اب بھی اردو کا بلا شرکت غیرے سبک چل رہا ہے۔ ریاست میں اس وقت بھی صحافت کی تقریباً کُل زبان اردو ہی ہے اور اس میں شائع ہونے والے اچھے اخبارات کی اشاعت رو بہ ترقی ہے۔ اردو ریاست میں کاروبار کی زبان بھی ہے اور اس کے چھاپے خانے بھی خوب کھل پھول رہے ہیں۔ اردو میں ریاست کے دونوں حصوں میں کچھ بہت ذہین اور بہت باصلاحیت ادیب لکھ رہے ہیں اور ریاست کے علاوہ ریاست سے باہر بھی دیکھیں حاصل کر رہے ہیں۔ ان عوامل کی بناء پر یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ اردو بہت عرصے

۲۸
 تک ریاست جموں و کشمیر میں ایک اہم ترین تہذیبی اور سماجی رول ادا کرتی ہے گی۔

مرحوم سرور کی اس شاندار تصنیف کا دوسرا حصہ پیش کرتے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جلد کے پہلے باب "ابتدائی آثار" کے صفحہ ۶۰ پر شیخ نصیر الدین غریب کے تذکرے کے بعد کے صفحے ہمیں مسودے میں دستیاب نہیں ہوئے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سروری صاحب نے لکھ تو لے ہوں لیکن بعد میں گم ہو گئے ہوں۔ ہم نے اس باب کو کسی طرح مکمل کرنے کی سعی کی ہے۔ اس میں عرق ریزی کی ضرورت تھی اور وہ ہمارے بس کی بات نہیں تھی۔ اسی لئے اس کا عالم یوں ہو گیا ہے۔

مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

اس حصے میں جن شخصیات، ادیبوں وغیرہ کے تذکرے آئے ہیں۔ ہم نے ان کی تصاویر حاصل کرنے کی بہت کوشش کی۔ کچھ حالات میں ہم کامیاب رہے اور کہیں پر ناکام۔ انشاء اللہ آئندہ حصے میں اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

سرینگر۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۸۲ء

محمد یوسف ٹینگٹ

ابتدائی آثار

سنسکرت زبان کا کثیر سے جو گہرا تعلق رہا ہے۔ اس کی تفصیل پچھلے باب میں گزر چکی ہے۔ سنسکرت کو مذہبی علوم و فنون کے واسطے کے طور پر اور تہذیبی تصورات کے اظہار کے ذریعہ کی حیثیت سے خاطر خواہ فروغ نصیب ہوا تھا۔ سنسکرت، جدید ہندو آریائی بھاشاؤں کا، جس میں اردو بھی شامل ہے، قدیم شائستہ روپ مانی گئی ہے۔ لیکن علمائے لسانیات کے پاس یہ بات مسلم ہے کہ جہاں تک جدید ہندو آریائی زبانوں کی نشوونما کا تعلق ہے۔ اس میں سنسکرت سے زیادہ ان پراکرتوں کو دخل رہا، جو عوام کی بول چال میں رایج تھیں اور کتابی شکبے میں بکڑی جا کر، ارتقاء سے محروم نہیں ہو گئی تھیں۔ کثیر میں قدیم زمانے میں، کھڑی بولی ہندی یا اردو کی ماخذی پراکرتوں کے رواج کے آثار کا پتہ نہیں چلتا۔ کچھ قدیم قواعد نویسوں نے پیشا جی پراکرت کا تعلق کثیر سے، اس کا اطلاق لہندا اور پنجابی پر تو کیا ہے، لیکن کثیر پر اس کا اطلاق موثق نہیں۔ اس کے علاوہ کثیر کے وسط ایشیا اور خاص طور پر دروستان اور بلتستان سے ثقافتی، لسانی اور کسی حد تک لغوی

۱۔ نواح سندھ کی ایک زبان

حلقات کی بناء پر اس کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکا کہ کشمیری زبان کی نشوونما پر دروی اور بلتی کا اثر کس حد تک ہے۔

بُدھ مت کا تعلق بھی کشمیر سے گہرا رہا اور اشوک کے عہد میں بُدھ مت کی چوتھی مجلس جو کشمیر میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کے نتیجے کے طور پر 'مہایان شاخ' کا آغاز ہوا۔ بُدھ مذہب کے مصنف کی زبان پالی تھی۔ چنانچہ بُدھ مذہب ہندوستان سے باہر مثلاً چین، جاپان، تبت، برما اور سیلون، جہاں جہاں پھیلا، پالی بول چال کی زبان کے طور پر نہیں بلکہ کتابی مقدس زبان کے طور پر کشمیر پہنچی، اسی لئے ان علاقوں میں پالی میں تصنیف تالیف کے نمونے ملتے ہیں۔ لیکن جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے، یہ حیرت کی بات ہے کہ یہاں پالی کے کوئی تحریری آثار نہیں ملتے۔ اس کے مقابلے میں بُدھ متی علماء کی تصانیف سنسکرت میں ملتی ہیں۔ یہ بات قابل فہم ہے کہ کشمیر میں بُدھ مت کے حاملوں نے پالی کو سرے سے نظر انداز کر دیا ہوگا۔ پالی کی کچھ تصانیف اگر یہاں پہنچی تھیں اور ان کا چلن بھی یہاں رہا تھا۔ تو اب اس کا پتہ چلانا ہمارے لئے دشوار ہے۔ کشمیر کے ایک مؤرخ پر تھووی ناتھ کول بامزئی نے اپنی تاریخ کشمیر میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور صرف یہ کہہ کر گذر گئے ہیں کہ — "اشوک کے عہد میں جب بُدھ مت وادی میں پہنچا۔ اس نئے مذہب کے مصنف اور اس کا ادب یہاں ہندوستان کے دوسرے حصوں کے برخلاف جہاں پالی میں لکھتے تھے، سنسکرت میں لکھا گیا۔" بامزئی نے اس کے اسباب پر روشنی ڈالنے کی کوشش نہیں کی، تاہم ان کے بیان سے کشمیر میں سنسکرت کی تصانیف کی روایت کے گہرے اثر کی نشان دہی ہوتی ہے۔

پالی کے بول چال کے روپ کو بعض علمائے لسانیات نے مغربی پراکرت کی حیثیت سے، کھڑی بولی، ہندی اور اردو کا ماخذ مانا ہے۔ بامزئی نے سنسکرت کے کشمیر میں رواج پر بحث کرتے ہوئے ان کی سند پر پراکرت کا بھی تذکرہ کیا ہے اور ملے، یہ کافرٹس راجہ کشک کے عہد میں ہوئی اور بعض مورخ اسے تیسری کانفرنس کہتے ہیں۔

کتاب کے کثیر میں خواتین بھی سنسکرت اور پراکرت روانی سے بولتی تھیں۔
 لیکن جہاں تک پراکرت کا تعلق ہے یہ بیان مبہم ہے، ظاہر ہے سنسکرت کی طرح
 پراکرت کا معیار ایک نہیں تھا، اسی لئے سنسکرت کے مقابلے میں پراکرتیں یعنی بول
 چال کی زبانیں کئی تھیں۔ اس اعتبار سے کثیر میں پراکرت کے مفہوم وسیع ہو جاتے ہیں۔
 ہندو آریائی کے علماء کے لحاظ سے ہندوستان کا شمال مغربی علاقہ پیشاچی پراکرت علاقہ
 متعین ہوتا ہے جس سے لہندا اور پنجابی کی نشوونما ہوئی۔ یہ صحیح ہے کہ پُرانی
 تاریخوں میں کثیر کو پیشاچی علاقہ بتایا گیا ہے، لیکن پیشاچی کی حقیقی بیٹی، لہندا
 اور کثیر میں کچھ ظاہری مماثلتوں سے قطع نظر کئی بنیادی اختلافات ہیں، جن کے
 پیشاچی پراکرت کے کثیر میں رواج کا امکان دور از قیاس ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہ ماننا
 پُر تبہ ہے کہ یہ کثیر پراکرت، یعنی بول چال کی زبان تھی۔ اس سلسلے میں کثیر کے آغاز
 کے بارے میں گریسن کا نظریہ ہماری مدد کرتا ہے۔

کثیر میں جو بھی پراکرت رائج رہی ہو اس میں کسی زمانے میں بھی تصنیف
 تالیف کے آثار دستیاب نہیں ہوتے اور یہ کثیر مزاج اور اہل کثیر کے تصنیف تالیف
 کے بڑھے ہوئے شوق کے متافی معلوم ہوتا ہے۔ ایک ضعیف روایت پراکرت تصنیف بلند
 پنچھو کے بارے میں یہ ملتی ہے کہ اس کا مصنف ناگ سین، کثیر کی سرحد کے قریب ایک
 مقام ناگ سین کا رہنے والا تھا۔ لیکن یہ نسبت نام کی مناسبت کی سمجھائی ہوئی معلوم
 ہوتی ہے اصل میں کثیر میں پراکرت میں تصنیف تالیف کے دستیاب نہ ہونے کا سبب
 بھی سنسکرت میں لکھنے کی روایت کا زبردست اثر معلوم ہوتا ہے۔
 کثیر کی تاریخوں میں قدیم زمانے کے نظرونسق وغیرہ کی تفصیلات میں کچھ لفظی
 ضرور ملتے ہیں جن کا روپ کھڑی بولی ہندوستانی کا ہے جیسے :
 ہٹ (نوہٹ) ناڈ، اندھ، کوٹ، ناک، چھاوٹی، گھاٹ، بدھ

بیگ، گنبد، چھا، مسور، مونگ وغیرہ۔ ۳۲

ان میں سے بعض لفظوں کے کثیر کی مقامی پیداوار ہونے کے بارے میں شبہ ہے۔ ان میں سے کچھ لفظ اشیاء کے ساتھ آئے اور کچھ اس قدیم پراکرت سے نشوونما پائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں جو قدیم زمانے میں یہاں رایج رہی۔

اُردو کی قدامت کی کھوج لگانے والے محققین نے قدیم ترین آثار میں اُن تک کا تذکرہ خاص طور پر کیا ہے جو کشمیری تھا اور ایک نالی لڑکا تھا۔ "تاریخ بیہقی" کے مصنف کی سند پر اس نے قاضی حسن شیرازی کے پاس فارسی کی تکمیل کی تھی، وہ سنسکرت بھی بخوبی جانتا تھا۔ کثیر پر اپنے ایک حملے کے دوران "محمود غزنوی" اس سے واقف ہوا تھا۔ اور اس کی قابلیت سے متاثر ہو کر اسے اپنے ساتھ غزنین لے گیا تھا۔ یہاں وہ فارسی اور ہندی کے ترجمان کی خدمت انجام دیتا تھا۔ لیکن عرب اور ایرانی مصنفین کے یہاں "ہندی" کے استعمال کو اس زمانے کی لسانی صورت حال کے مد نظر احتیاط سے قبول کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ مصنفین عموماً ہند سے متعلق ہر چیز کو "ہندی" سے موسوم کرتے ہیں۔ اور زبان کے سلسلے میں جہاں وہ "ہندی" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس سے اکثر سنسکرت مراد ہوتی ہے۔

ایک اور روایت راجا نند (شاہنشاہ) کی بھی تاریخوں میں ملتی ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ محمود سے پہلے ہونے کے بعد راجا نے ضلع کی درخواست کی اور تحفے، تحائف کے ساتھ ایک شعر بھی محمود کی تعریف میں ہندی میں لکھ بھیجا تھا۔ جس پر محمود بہت خوش ہوا اور پیر غلام حسن مصنف "تاریخ کشمیر" نے لکھا ہے کہ راجہ کو پندرہ قلعوں کی حکومت عطا کی۔

بعد کے ادوار میں شہمیری سلاطین میں سے سلطان زین العابدین کے بارے میں

سودھنوی کا کہ ہے کہ سلطان بزبان فارسی و ہندی دہلی خوب تکلم می کردہ۔ (۱۵۹۹ء)

۳۲
اس میں شبہ نہیں کہ پندرہویں صدی عیسوی تک ہندوستانی ہندی اور اردو
کی تشکیل ہو چکی تھی۔ چنانچہ پندرہویں صدی کے اواخر تک خاص طور پر دکن کی جہتی قلمرو
میں حضرت گیسو دراز اور ان کے بعد شاہ میراں جی، اس سیال زبان کو اپنے تصنیفات
خیالات کے اظہار کے لئے برتنے بھی لگے تھے۔ تاہم اس کی تفصیلات ہماری پاس موجود ہیں
کہ زبان کا وہ کیسا روپ تھا۔

سلطان زین العابدین کے جانشینوں میں سلطان حسن شاہ (۱۴۴۲ء-۱۴۸۴ء)
موسیقی کا بڑا دلدادہ تھا۔ چنانچہ اس کے بارے میں مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس نے ہندوستان
سے بارہ سو ماہرین موسیقی کو بلوا کر اپنے دربار میں ملازم رکھا تھا۔ بعض مؤرخین نے
یہ بھی لکھا ہے کہ سلطان نے فن موسیقی پر ایک کتاب "فارسی زبان ہندوستان" میں
تصنیف کی تھی۔ بیجاپور کے سلطان علی عادل شاہ ثانی نے بھی موسیقی کی دھنوں پر
اردو میں منظومات موزون کئے تھے جسے "نورس نامہ" یا "کتاب نورس" کے نام سے موزوں
کیا تھا۔ اور فارسی کے مشہور شاعر اور افسانہ پرداز ظہری نے اپنی "سرنثر" اسی کے دیباچے
کی صورت پر لکھی تھی۔ سلطان حسن شاہ کی کتاب کا اب پتہ نہیں چلتا۔

جوں اور اس کے ملحقہ علاقے، پنجاب سے متاثر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ دوگرانی
جوان علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ وہ خود اردو اور ہندی کی جن اور جدید ہندو آریائی کی
ایک شاخ ہے اور ان زبانوں کا لفظی سرمایہ مستند المآخذ اور متجاسن ہے۔ پنجاب کے اثر
سے اردو کا اس علاقے سے روشناس ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں لیکن یہ علاقہ عموماً
فوجی کاروائیوں کا مرکز رہا اور علم و ادب کی تحریکیں یہاں بعد میں اٹھیں۔

قدیم ترین تحریری آثار جو ہم کو کشمیر میں دستیاب ہوتے ہیں، وہ سترہویں صدی کے
اواخر سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ عموماً ریختہ کا انداز رکھتے ہیں۔ اس زمانے تک نقل و فوج کا
رہنما کشمیر سے قائم ہو چکا تھا۔ سلطان یوسف شاہ چک فارسی کا خوش گوشت تھا لیکن

اس کے بارے میں مورخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ ہندی میں بھی شعر کہتا تھا۔ حسن لکھتے ہیں: "طبع موزوں داشت" اشعار فارسی ہندی، کشمیری بدریہ می گفتند۔ (۱۹۶۲)۔ یوسف شاہ کے فارسی اشعار تو دستیاب ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کے ہندی اشعار نہیں ملتے۔ اس کی ملکہ جہ خانوں، موسیقی میں دستگاہ رکھتی تھی اور خود یوسف کو موسیقی سے گہرا لگاؤ تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایک شاعر کا دل اور احسن نظر رکھتا تھا۔ اکبر کے دربار سے اس کا واسطہ رہا تھا۔ جہاں ہندی شعرا کی قدر تھی۔ اس طرح کوئی تعجب نہیں کہ یوسف شاہ کو بھی ہندی میں شعر کہنے سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہو۔

یوسف شاہ کا کلام نہیں ملتا۔ تو ہم کو اس کے ایک مصاحب خواجہ ابوالقاسم جمل کے فرزند خواجہ محمد سومن جیل کار ریختہ کلام مل جاتا ہے۔ یہ خاندان کشمیر کے معتبر خاندانوں میں سے تھا۔ خواجہ سومن کی تعلیم اچھے پیمانہ پر ہوئی تھی۔ ان کے پہلے استاد ملا محمد جوہر نامت اپنے عہد کے فضلاء میں بڑا تھا۔ لکھتے ہیں: "بعد میں مولوی خواجہ حیدر چرخ کی خدمت میں بھی خواجہ نے تعلیم کی تکمیل کی اور ذری میں خوب شعر کہتے تھے۔"

حضرت بابا نصیب الدین غازی سے انہیں عقیدت تھی اور اسی عقیدت ہندی کے انہار کے طور پر غازی متخلص اختیار کیا تھا۔ علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد خواجہ سومن غازی نے دنیا ترک کر دی اور مرشد کامل کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ اس سفر میں فریضہ ج سے بھی فارغ ہوئے۔ اس وقت تک حضرت نصیب الدین کی خدمت میں وہ حاضر نہیں ہوئے تھے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ جب وہ مدینہ منورہ میں، روضہ نبویؐ پر استغراق کی حالت میں بیٹھے ہوئے تھے انہیں بشارت ہوئی کہ ان کے مرشدان کے وطن میں ہیں۔ وطن لوٹ کر، بابا نصیب الدین غازی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ روحانی فیض کا اکتساب کیا۔ بابا نصیب الدین کے انتقال کے بعد خوب سے خوب تر رہا۔

اور ج سے فارغ ہونے کے بعد بغداد گئے جہاں ۵۲۰ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

فارسی شاعری میں غلامیوس کا پایہ بلند ہے۔ ریختہ میں ان کی فکر کے آثار میں سے صرف ایک رباعی دستیاب ہوتی ہے جو اپنے ایک دوست کو دیوہ سر میں لکھ بھیجی تھی۔ رباعی میں 'باد شمال' کے ذریعے دوست کے نام پیام بھیجا ہے۔

اے باد اوتر گر گذری دیوہ سر از من خبری نیز بہ آں دلبر بر
کثیری و فارسی اگر گوش نکرد ہندیش بگوی کہ "اوتر میرا تر"

یہاں سے فارسی کے کئی اچھے متعارف ہو گئے۔ ان میں سے چندتہ ٹھاکر داس ناٹو اور ٹھاکر راز داں کا تذکرہ بہار گلشن کشمیر میں آتا ہے۔ دیوہ سر کو لکام کے قریب ایک قصبہ ہے۔ رباعی میں "باد اوتر" اور "اوتر میرا تر" میں تجنیس کا جو حسن ہے، اس سے رباعی کے معنوی لطف میں بڑا اضافہ ہو گیا ہے۔

خواجہ محمد جبل کے کلام کا یہ نمونہ، ہندوستان میں اردو کے تشکیلی دور کے ریختوں اور ملفوظات سے مشابہ ہے،

اکبر کے بعد شاہ جہاں کا عہد، ہندوستان کی طرح کشمیر کا بھی ایک اوج تھا۔ مگر گریسوں کی وجہ سے ممتاز ہے۔ اکبر اور جہانگیر کے زمانے تک بھی کشمیر، فارسی علماء کو مذہب اور تصوف سے لگاؤ رہا۔ شاہ جہاں کے عہد میں 'فارسی کے چوٹی کے شاعر اور دانش پرور از ہندوستان آتے رہے اور ان میں سے اکثر کتبہ حسن فطرت کشمیر کی زیارت کے لئے، یہاں بھی آئے۔ ان شعراء کو کشمیر کی دعوت دینے کا بڑا اہم سبب اس زمانے میں کشمیر کے ناظم، ظفر خان احسن کا دربار اور اس کی ادب دوستی اور علماء اور شعراء کی مسرت تھی۔ چنانچہ میرزا، صائب اس کے ساتھ ہی کشمیر آئے اور بعد میں ابو طالب کلیم، محمد جان قدسی، ملا طغر مشہدی، محمد قلی سلیم، جلال طابا، خورشید نقاب، فخر الدین اور شاعرانہ کیا اور ان میں سے بعض نے اس کے لئے بڑا کام کیا۔

۳۶
 طغرفان احسن فارسی کا قابل ترین شاعر تھا۔ اس کی اصل تربیت (خراسان) سے تھی، لیکن اس کی ولادت ہندوستان میں ہوئی تھی اور وہ ان علاقوں میں رہا تھا، جہاں کھڑی بولی نشوونما پا رہی تھی۔ اسی لئے، اس کے فارسی کلام میں، ہم کو کئی لفظ اس زبان کے بھی ملتے ہیں۔ مثلاً کچھ شعر ہیں:

ز تبولی داز بقال و عطار	بسر گرم است در کوچہ بازار
زنی مشکل کہ خیزد دیگر آہنگ	ز رشک بانسلی دارد دل تنگ
نہال مولسی آں زیب گلشن	کرد و گل میتوان بردن بخرمن
ز گلاب کیوڑہ مگر دیدمتاز	درد و پیچیدہ بوجوں نقد در ساز
ز طوطی وزینا وزیر کوں	ز ہریل آنکہ آہنگش برد دل
ز لمرک بزمستان گشت روشن	ز شمع او گلستان گشت روشن

احسن دومرتبہ کشمیر کا ناظم رہا۔ پہلی مرتبہ ۱۶۳۳ء میں وہ اپنے باپ کا نائب مقرر ہو کر آیا تھا۔ ۱۶۳۲ء تک یہاں رہا۔ دوسری مرتبہ ۱۶۴۵ء سے ۱۶۴۹ء تک وہ کشمیر میں رہا۔ اسے کشمیر سے عشق تھا۔ چنانچہ اپنے اکثر اشعار میں اس کا اظہار کیلئے ایک شعر ہے:

اگر فرستم بخشدم روزگار

کشم رشک فردوس کشمیر را

ایک اور شعر میں زاہد کو بہشت بریں سویتا اور خود کشمیر سے تعارف کرتا ہے:

بہشت بریں از شمار ابدان

بہ حسن گزراید کشمیر را

اپنی شہنشاہی، جلوتہ ناز اور میخانہ راز میں بھی کشمیر اور اس کے مناظر کی تعریف

کرتا اور کشمیر کے رشتہ کی تفصیل پر بھی ایک شہنشاہی ہفت منزل کے نام سے لکھتا ہے۔ اس نے اپنی شہنشاہی کی تعریف میں ایک شہنشاہی کے نام سے لکھتا ہے۔ اس نے اپنی شہنشاہی کی تعریف میں ایک شہنشاہی کے نام سے لکھتا ہے۔ اس نے اپنی شہنشاہی کی تعریف میں ایک شہنشاہی کے نام سے لکھتا ہے۔

مضی یا غات کی باز تعمیر کی اور خود بھی کئی نئے باغ بنائے اور ان باغوں میں ایران اور ترکستان سے پھل اور پھول منگوا کر لگوائے۔

اس سے بڑھ کر ایک اور کام اس نے کشمیر کی ذہنی ترقی کا یہ کیا کہ اس زمانے کے سربراہ دروہ فارسی شعراء کو کشمیر میں جمع کر دیا۔ اور ان کی سربو رستی کی۔ ان شعراء کے نام اور دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے تقریباً ہر ایک نے کشمیر کی مدح سرائی کی ہے۔

احسن کے کشمیری معاصرین میں، ملا محمد حسن، فانی کا بڑا مرتبہ ہے۔ وہ سربراہ دروہ عالم اور شاعری کے فن میں بھی استاد کا مرتبہ رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کی تربیت سے غنی کا کشمیری، نافع جیسے شاعر اُٹھے۔ فانی کے احسن سے ابتداء میں اچھے مراسم رہے لیکن بعد میں کہتے ہیں کہ ایک رقاہہ بھی یا بجھی کے سلسلے میں ان میں شکر رنجی ہو گئی اور فانی کشمیر سے دہلی چلے گئے، جہاں شاہ جہاں نے ان کی قدس کی اور الہ آباد کی سدارت کے عہدے پر انہیں فائز کیا۔ اس سے پہلے فانی بخارا میں بھی رہ چکے تھے۔ آخری عمر میں وہ کشمیر لوٹ آئے اور درس و تدریس میں زندگی گذادی۔ فانی غزل اور مثنوی دونوں کے استاد تھے اور اپنی مثنویوں میں وہ اردو یا ہندی لفظ بڑے حسن کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ذیل کے شعر ہیں:

نوبہار آمد بسیر گلشن ہندستان	زیب دار طوطی بجائے پر برآرد برگ پال
در چمن ہر صبح مینا می کند راگ لبنت	نیست طوطی را بجز کلیاں چو بلبل بر زبان
چنبہ میگردد چو زنگست گلچیں بزمیر	لالہ می بند حنا چوں گل بیاباغبان
گل ز شبنم ہر چنبیلی بگردن افگند	تا تواند شد حریف شاہ ہندستان

یہ اس قصیدہ کے شعر ہیں، جو شاہ جہاں کی مدح میں لکھا گیا تھا۔ بعض مثنویوں میں بھی انہوں نے اردو لفظ استعمال کئے ہیں۔ ایک مثنوی کے یہ شعر ہیں:

۳۸
 بود مرکب خاص اس ملک بہل
 کز دسیر عالم شود بود تو سہل
 لب گل رخاں سُرخ از پیاں شود
 گہرائے دندان چو مرجان شود
 بخون ریزی عاشقاں ہر سحر
 زدہ شجر سیرۂ پال در کمر
 فانی کا انتقال ۱۶۰۰ء میں ہوا۔

میرزا داراب جو یا، غنی کے معاصر تھے اور ان کا شمار کشمیر کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔
 میرزا صائب کا ان کی شاعری پر بڑا اثر تھا۔ اور اسی کے انداز میں شعر کہتے تھے۔ ان کے
 بھائی میرزا کامران بیگ گویا بھی، اپنے زمانے کے اچھے شاعروں میں شمار ہوتے
 تھے۔ جو یا ابراہیم خان ناظم کشمیر سے متوسل ہے۔ ابراہیم خان کے ساتھ دو شاعر
 ملا محمد سعید اشرف اور ملا علی تجلی، ہندوستان سے کشمیر آئے تھے اور دونوں نے جو یا
 کی شاگردی اختیار کی تھی۔ جو یا کے بارے میں تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ انہوں نے
 کچھ ریختے بھی کہے تھے۔ جواب دستیاب نہیں ہوتے۔ جو یا کا انتقال سالانہ نہیں
 ہوا۔

جو یا کے معاصرین میں ملا نصیب بھی خوش فکر شاعر گذرا ہے۔ وہ صاحبِ دیوان
 تھا۔ اور اس نے اپنے کئی اشعار میں اردو لفظ استعمال کئے ہیں۔ مثلاً ذیل کا شعر ہے۔
 آشفستہ تر از ماست بسی انجمن بی نور شودش طرب در لگن ما
 شاہ جہاں کے عہد میں شہزادہ دارا شکوہ کا کشمیر کی نہندہ جی اور علی زندگ
 سے گہرا تعلق رہا۔ وہ اور اس کے پیرا خونہ ملا محمد شاہ بدخشان، جو عام طور پر ملا شاہ بدخشی
 کے نام سے مشہور ہیں کشمیر میں عرصے تک رہے۔ ملا شاہ تصوف میں ایک خاص مسلک
 "کسبِ ماہ" کے بانی تھے اور ان کے اور ان گروہ صوفیاء کے مشاغل چاند راتوں میں ہوا
 کرتے تھے۔ اس مقصد کے لئے دلا شکوہ اور اس کی بیگم پری بیگم اور بہن جہا آرا
 کی مٹائی سے چشمہ شاہی کے قریب کوہ زبرون کے ڈھلوان پر ایک عمارت تعمیر

کرائی گئی تھی، جواب پری محل کے نام سے مشہور ہے۔ اس عمارت میں تصوف کی کتابوں کا کتب خانہ تھا اور ملا شاہ اور ان کے برادران طریق کے مراقبے، اور اداد وظایف بھی یہیں منعقد ہوتے تھے۔ پری محل کے نام نے، آج بھی اس اجڑی ہوئی عمارت کے اطراف ایک رومانی ہمسار بنا رکھا ہے، چنانچہ کثیر کے اکثر شاعروں نے پری محل کو موضوع بنا کر تخیل کی بلند پردازی دکھائی ہے اور نفیس نفیس نظمیں لکھی ہیں۔ قیصر قلندر نے پری محل کا خواب کے عنوان سے ایک عمدہ غنائیہ لکھا ہے، اس کے کچھ حصے یہ ہیں :

یہ شرف گاہ تمدن جو ہے ویراں ویراں
جس کی آنکھوں میں کج لایا ہے نور دانش
جس سے تباہاں تھے کبھی کوشک و قصر حکمت
یہ درد بام پیر اسرار غموشی کے امیر
رقص و نغمے کی اداؤں کا جو ہر لہجہ لئے
جیسے رنماۃ کلف ام ٹھنک رہ جائے

ملا شاہ کچھ کھڑی بولی کے کلام کے راوی تھے، جو ان کے پیروں میں میرے منسوب ہے۔ میاں تیر شاہ جہاں کے عہد کے بڑے صوفی درویش ہوئے ہیں ان کا پورا نام میر محمد بن سائیں داتا ہے اور وہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ دوسرے فرقوں میں بھی بہت احترام رکھتے تھے۔ شاہ جہاں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ سکھوں کے چھٹے گرو، ہر گوبندہ ان کے متقدّم تھے اور امرتسر کے گوردوارہ کا سنگ بنیاد انہیں کے ہاتھوں رکھوایا تھا۔ مگر ہر گوبندہ کی نقل و حرکت پر، جہاں بیکر کو شبہ ہوا اور اس نے انہیں گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کر دیا تھا، تو میاں میر نے سفارش کمر کے

گرد کو رہا کر دیا تھا۔ ان کے ملفوظات کو ملّا شاہ نے کشمیری میں داراشکوہ کو سنایا تھا۔ اور داراشکوہ ان سے ایسا تاثر برداشتھا کہ ان کو جمع کر کے ہم مفہوم قرآنی آیتوں اور حدیثوں اور فارسی اشعار کے ساتھ ایک رسالے کی صورت میں مرتب کر کے ایماً للتحقیق اس کا نام رکھا ہے چند ملفوظات ذیل میں منقول ہیں:

دو گھ جگ انتر بڑ ہے اور گھٹ گھٹ انتر جیو
جو پیو ہے ایکہیں جیو کو بھاوے پیو

بیت

مائی کا پتلا کیو اور آپی بیٹھو آ
نہیں بھیتر بیٹھ کے آے آپ دکھا
آپ کہت اور آپ سنت اور آپھی کرتا یا
پگ پر آپھیں ڈولتا اور آپ ڈلائے بات

کشتواڑ جس کی کچھ تفصیلات تاریخی حصے میں دی جا چکی ہیں، کشمیر کے توابعات میں ہونے کے لحاظ سے، کشمیر پر مغلوں کے تسلط کے بعد، کشمیری مغل تہذیب کے زیر اثر آ گیا تھا۔ اور اس ادبی ذوق کا حصہ دار بن گیا تھا۔ چنانچہ کشتواڑ سے کچھ فارسی کے اور چند اردو کے بھی اچھے شاعر وقتاً فوقتاً اُٹھے۔ کشتواڑ کے راجاؤں میں بھی شعرد ادب کا ذوق رہا۔ چنانچہ سترہویں صدی کے وسط میں راجہ ہاسنگم پیدا ہوا تھا (۱۶۵۱ء) اس کی تعلیم فارسی میں ہوئی تھی۔ لیکن ہندوستانی زبان اپنے اطراف بول چال کی زبان کی حیثیت سے وہ جانتا اور اس میں شعر میں موزون کر لیتا تھا۔ چنانچہ شیوجی دہنے اپنی "تاریخ کشتواڑ" میں اس کے کچھ شعر نقل کئے ہیں۔ اس سے یہ روایت بیان کی ہے کہ ہاسنگم عدل و انصاف سے حکومت کرتا تھا اور سخاوت

میں بھی وہ اطراف و اکناف میں مشہور تھا اس کی سخاوت کا شہرہ سن کر کجبات
 قوم کا ایک فقیر اس کے پاس آیا۔ راجہ نے اسے ایک لاکھ روپیہ دیا اور ساتھ ہی یہ بھی
 پوچھا کہ "پہاڑی راجاؤں میں سے کسی کو مجھ جیسا سخی پایا ہے؟" یہ سنتے ہی
 فقیر نے روپیہ پھینک دیا اور اس کی ڈھیر پر پیشاب کر کے بولا۔ "مجھ جیسا بھی
 کسی کو دیکھا ہے، جو ایک لاکھ روپیہ پر پیشاب کر سکتا ہے۔"

یہ کہہ کر فقیر چلا گیا اور لکھا ہے کہ بارش ایسی بند ہوئی کہ خلق خدا عذاب
 میں پڑ گئی۔ راجہ نے کشتوار کے مشہور نیک کنٹھ جی کے مندر میں جا کر یہ مناجات نہایت
 درد اور عجز کے ساتھ پڑھی:

سو کن لاگی ستر سو جھن	مرگہ سب بن میں سوئی رہیں رومی کی
ہلی ہل بہائی حیراں بھوئی	گہنیں مون کچھ رسوں!
اب کب برسو گے کھوئی!	بنی بہاجان بورن کی ہا ہا سنو!
پر بوسری نیک کنٹھ رہی سولی کی	پر جا کی پروگہن ہاں سبھا کی کر سنجھا

دیکھئے بہاراج مہرباں ہوئی کی

مناجات ختم ہوئی اور آسمان سے پانی برسنے لگا اور سارا علاقہ سیراب ہو گیا۔
 چندر بھان برہمن کا تذکرہ جس سے قدیم اردو کا یہ شعر منسوب ہے:

خاٹنے کس شہر اندر ہمیں کیوں لائے ڈالہے

نہ دہر ہے، نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے، نہ پیازا ہے

ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی نے اپنی تاریخ "کشیر" میں کشیر کے فارسی گو شعرا میں
 شامل کیا ہے اور مولفین "بہار گلشن کشیر" نے ریاست گوالیار کے کتب خانے میں محفوظ
 ایک کتاب "شاعران کشمیر" کی سند پر یہ لکھا ہے کہ برہمن کا خاندان دوسو برس پہلے
 دہلی اور پھر آگرہ جا کر بس گیا تھا۔ شاہ جہاں نے اس کی فارسی میں قابلیت کی بنا پر

۴۲
اسے اپنا منشی خاص مقرر کیا تھا۔ بعد میں وہ داراشکوہ کا میر منشی ہو گیا تھا۔ فارسی میں اس کا ایک دیوان اور کلیات برہمن قابل قدر کارنامے ملنے جاتے ہیں۔ آخری عمر میں وہ ترک دنیا کر کے بنارس چلا گیا تھا۔ شاہ جہاں اور داراشکوہ کے ہمراہ وہ کشمیر آیا اور یہاں کچھ عرصہ رہا بھی تھا۔ فارسی میں برہمن اپنے زمانے کا استاد مانا جاتا ہے اور اس کی ذہنی صلاحیتیں متنوع تھیں۔

میر کمال الدین حسین اندرابی رسوا سے کشمیر میں اردو کے ترقی یافتہ روپ کا آغاز ہوتا ہے۔ رسوا ادنگ زیب کے آخری عہد کے کشمیری انشا پردازوں اور شاعروں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ وہ کم و بیش شمالی ہند کے ابتدائی دور کے لکھنے والوں جعفر زنگی، افضل اور فضل کے معاصر تھے۔ انشا میں وہ اپنے عہد کے سب سے زیادہ مشہور علمائے سہ میں۔ ان کی انہی صلاحیتوں کی وجہ سے اکثر امراء اور نظائے کشمیر ان کے قدردان تھے اور مکتوب نگاری کی خدمت ان کے تفویض کرتے تھے۔ فاضل خان، ناظم کشمیر (۱۶۹۸ء - ۱۷۰۱ء) نے ان کی سرپرستی کی۔ فاضل خان کے بعد عبداللہ خان ناظم (۱۷۱۲ء - ۱۷۱۳ء) سے بھی ان کا توسل رہا۔ چنانچہ حج کے سفر سے اس کی واپسی کے بعد رسول نے اس کی مبارک باد میں ایک نفیس رقعہ لکھا تھا۔

رسوا دہلی میں رہے تھے، جہاں ان کے فن کی قدر ہوئی اور شہزادہ اکبر شاہ کی سرکار میں وہ ملازم رہے، لیکن جب معظم نے اکبر شاہ کو شکست دی تو وہ کشمیر لوٹ آئے اور یہاں اپنے فن کی خدمت اور نوجوانوں کی اس فن میں تربیت کرتے ہوئے زندگی گزار دی۔ چنانچہ اس فن میں ان کے بہت تلامذہ ہوئے۔ ایک شاگرد لچھی رام نے ان کے رفات کو، ان کے فارسی اور اردو کلام کے ساتھ ایک مجموعے کی صورت میں اکٹھا کر کے "رفات خاتم الکمال" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس کے غلط محکمہ تحقیقات، سری نگر کے کتب خانے میں موجود ہیں۔

رسوا کا اردو کلام ریختہ، نظموں اور غزلوں کی شکل میں لکھا ہے۔ ان کی
ایک ریختہ نظم خوب ڈیل ہے۔

امشب قسم کے واسطے جان و تنم در جنگ ہے
ساز طپیدن آہنگ ہے

از دیدہ خونبار من و زنا لہائے زارِ من !
اندر سرے تار من امشب جوش ہے سب رنگ ہے

وری کرا ز چشم ترم و ز چشم زاد سر . . . !
اما دل غم پرورم تجھ ننگ دل کے ننگ ہے

باغیر اُلفت تا کجا از یار وحشت تابگی !
سب سول و فائز سول جفا ہے وفا کیا دھنگ ہے

کو باش اصدد عاشقان مجھ سا بلا گرداں ہے
ہر چند از عشق چو من تجھ بے وفا کونگ ہے

تارفتہ از دیدہ ام با کس نبا را میدہ ام
از جملہ جگ رنجیدہ ام، با کامیابم جنگ ہے

غزل خوانی کا یہ انداز، ان کے بعض معاصرین، دہلی، اورنگ آباد خاص طور پر
بعد کے شعراء جیسے یک رنگ، ناجی وغیرہ کے یہاں ملتے ہیں۔ ایک ریختہ مناجات
بھی لکھی تھی۔

شُدفِ شیطاں رہبرم اندمیاں تیر اکرم
از ہر چہ گوئی بدترم اندمیاں تیر اکرم

غیر از تو موجودے نہیں میرا سب نایتب
خالق تہیں، رزاق تہیں، اندمیاں تیر اکرم

۱۴۔ سردی صاحب نے مصرع اسی طرح نقل کیا ہے۔

۴۴
 در خلوتی در انجمن ماں باپ اور فرزند و زن !
 سچ بن نہیں آرام من ، اللہ میاں تیرا کرم
 ناکردنی کردم بسی ناخوردنی خوردم بسی
 با خود گئے کردم بسی ، اللہ میاں تیرا کرم
 ہستیم ہمچوں تر بیگی از فعلی بے ہودہ فعل
 مارا بنفیس ما مہل اللہ میاں تیرا کرم
 یہ مناجات طویل ہے اور سولہ اشعار پر مشتمل ہے۔ ایک اور ریختہ غزل قابل
 مطالعہ ہے۔

محبت پیت معشوقوں میں کم ہے
 نہ از عشاق پرواہ ہے نہ غم ہے
 رسوا کی ایک غزل ہے۔

محبت پیت معشوقوں میں کم ہے
 نہ از عشاق پرواہ ہے نہ غم ہے
 نہیں یک لمحہ از یاد تو غافل
 تہلکے نہہ میں دل دمبدم ہے
 بہت مشتاق ہیں تیرے ولیکن
 ٹھکانے سے محبت دو ٹوک کم ہے
 ارے کوئی جہاں میں یار کم ہے
 اگر ہے یار ، بے آزار کم ہے
 ندیدم بے جفا یک بے وفا را
 دریں گلشن گل بے قمار کم ہے

۴۵
 دلِ دادم و غمہا را خسریدم
 جگت میں پست سا بیچار کم ہے
 ایک اور غزل کے کچھ شعر ہیں:

دل و جان اس لٹک اور پیرِ نسا ہے
 ستم گر بے وفا، یہ کیا ادب ہے
 بیک نظارہ دلِ دادیم از درست
 وفا دشمن، جفا خور ہے، بلا ہے
 بمسکینِ دل، بدہ دیدار کی بھیک
 گدا ہے، بے نواب ہے، بے خُلا ہے

ایک غزل کا شعر ہے ۵

گر بستی بخونِ بے گناہاں!
 خدا میں ڈر، خُلا میں ڈر، خُلا میں

شاہ جہاں کے عہد سے اکثر اہلِ سخن، قدر دانی کی وجہ سے، کشمیر سے دہلی جانے لگے تھے۔ جہاں حکمرانوں اور متوسلِ امار کے درباروں میں، ان کی قرار واقعی قدر ہوتی تھی۔ میرزا عبد الغنی بیگ قبول، کشمیر کے اساتذہ فارسی میں شمار ہوتے ہیں۔ غنی، کشمیری کے معاصر مرزا داراب جو یا کے تلامذہ میں ان کا مقام بلند ہے۔ اپنے زمانے میں وہ استاد مانے گئے جن میں محمد علی حشمت اپنے زمانے کے اساتذہ میں شمار ہوئے۔ عبدالحی تاباں، انہیں کے شاگرد تھے اور ان کی صحبتوں سے کئی خوش فکر شاعر اُٹھے۔ بھگوان داس ہندی نے انہیں ملاشاہ بخشی کے اقربا میں بتایا ہے کہ پیر غلام حسن کھنویہ ہامی، مصنف "تاریخ کشمیر" ان کی صلاحیتوں کے بارے

میں رقمطراز ہیں۔

”مجلس طرازی شعر و سخن، و دقیقه پر طرازی این فن لا بد رجہ کمال
رسانید و مرجع ارباب معنی شد۔“

ایہام گوئی، اس زمانے میں ہندوستان کے شعراء میں بہت مقبول تھی۔ قبول پر بھی اس کا اثر تھا۔ عالمگیر کے زمانے میں وہ دہلی گئے اور ہریت خان کی مصاحبت میں نایب وزیر کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ بندرا بن داس خوشگو نے اپنے ”سفینہ ہندی“ میں ان کے بارے میں مفصل لکھا ہے۔ اس وقت قبول نواب مہم صام الدولہ سے متول تھے۔ نواب کی مدح میں انہوں نے قصیدے بھی لکھے ہیں۔ غرض سر کے عہد میں انہیں صلابت خان کی مصاحبت حاصل رہی۔ خوشگو اشراں کی صحبتوں میں شریک ہے۔ ایک دفعہ کا واقعہ لکھا ہے کہ خوشگو اپنی غزل سنا ہے تھی۔ قبول نے ایک مصرعہ کے بارے میں مشورہ دیا کہ اس کو دوسرا مصرعہ کہہ کر مطلع بنا دیا۔ خوشگو نے یہ مشورہ قبول کر لیا۔ آخری زمانے میں قبول نے فقر کی زندگی اختیار کر لی تھی اور شاہ جہان آباد میں مرجع خلائق بن گئے تھے۔ اس زمانے میں وہ پُرانے نند میں رہا کرتے تھے۔

قبول فارسی کے علاوہ اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ لیکن ان کا زیادہ کلام نہیں ملتا۔ تذکروں میں صرف ایک شعر نقل کیا گیا ہے۔ جو حسب ذیل ہے۔

دل یوں خیال زلف میں پھر تاپے نعرہ زن

”تاریک شب میں جیسے کوئی پاسبان پھرے

قطب الدین باکھن نے ان کا نام مرزا علی بیگ اور شیفہ غنی بیگ لکھا ہے لیکن پیر غلام حسن اور علی ابراہیم خاں خلیل نے ان کا پورا نام میرزا عبدالغنی بیگ قبول لکھا ہے۔

قبول کا انتقال ۱۲۵۷ھ میں ہوا۔ ان کے فرزند میرزا گرامی بھی فارسی کے شاعر تھے اور اردو میں بھی کچھ کلام چھوڑا ہے۔ میر نے اور قاضی نے طبقہ دوم کے شعرا میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور لکھتے ہیں کہ :

”چیز لمبے چند از قبیل شعبده ویز لگات بدست آوردہ عالمی را
 بآب میراند و بطور ملاحظہ و زنا..... باکمال، بے معنی و بے باکی
 میزلیت، ہموارہ مطعون زمان ارباب تحقیق می بود در آخر
 سلطنت، حضرت فردوس آرا مگاہ حرف وجودش کز تک فنا از صفو
 روزگار برداشت۔“

ذیل کا شعر گرامی کی فکر کا نتیجہ ہے :

حاضری بن محل نہیں کھاتا بیگمی ہے پینیر منع کا !

افغان عہد کے فاضل پنڈتوں میں، پنڈت دیارام کا چر و خوشدل اونچا مقام رکھتے ہیں۔ وہ فارسی کے شاعر اور اچھے انشاء پر طرز تھے۔ خوشنویسی میں بھی نہیں مہارت تھی۔ ان کی ولادت سری نگر کے محلہ رینہ واری میں ۱۲۴۲ھ میں ہوئی تھی۔ افغان ناظم عطا محمد خاں کے عہد (۱۸۰۷ء۔ ۱۹۱۰ء) سے ان کا عروج ہوا۔ مغلیہ دور کے بعد، فارسی ادب اور شاعری کی ترقی کے لحاظ سے افغان دور ”دور ثانی“ کہلاتا ہے۔ افغان حکمرانوں نے، خوشدل کے علم و فضل اور انشاء میں کمال کی وجہ سے، ان کی قدر دانی کی۔ چنانچہ تیمور شاہ کے میرنشی مقرر ہو کر وہ کابل گئے۔ کچھ عرصہ زماں شاہ درانی کے امیر الامار رحمت خان المخاطب بہ دفا دارخان کے میرنشی بھی رہے۔ اپنے مرثیوں کی مدح میں انہوں نے کئی قصیدے بھی لکھے ہیں۔ وہ غزل بھی اچھی کہتے تھے اور دو رسلے ”بہارِ سخن“ اور ”گلزارِ سخن“ بھی ان کی یادگار ہیں۔ خوشدل نے کچھ مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ ایک مثنوی میں اپنے سری نگر سے کابل تک

سفر کا حال اور راستے میں جوشہرہ بید۔ ان کی تفصیل اور خاص طور پر لاہور اور
کابل کی توصیف کہے۔ کابل میں ان کا قیام عرصہ تک رہا مگر کشمیر کی انہیں
اکثر یاد آتی تھی۔ ایسے ہی ایک موقع پر انہوں نے یہ شعر کہے تھے :

مرا یادِ وطن آشفہ تہِ کرد نمی دانم چرا قسمت بدر کرد
ز جوشِ گریہ چشمِ اچھول شد بہت شد، مار شد تالابِ لُٹل شد

خوشنود کی دلچسپاں وسیع موضوعات پر عادی تھیں۔ شعرواِ نثا اور
خوشنویس کے علاوہ انہیں موسیقی سے بھی لگاؤ تھا۔ انہوں نے موسیقی پر ایک رسالہ بھی
لکھا تھا۔ ان کا یادگار کارنامہ ایک بیاض ہے جو بہت ضخیم ہے اور متنوع اندازِ جاتا
پر عادی ہے۔ اس میں انہوں نے اپنی پسند کے منتخب اشعار، اساتذہ کی مشنیاں،
تاریخی قطعے، مکاتیب، سب اکٹھے کئے ہیں۔ موسیقی کے راگوں اور راگنیوں کے
سلسلے میں کئی اشعار اور ریختے بھی لکھے ہیں۔ مثلاً ایک ”فرہندی ہے۔“

کگئے تھے، مثلِ شبنم، سیرِ گلشنِ کرچلے
باغیاں تو دیکھ لے اپنا چمنِ ہم گھر چلے

دو ابیات ہیں :

خود فنا ہو کے ذاتِ سوں ملنا یہ تماشاِ جناب میں دیکھا
آپ کوں سوز اور کوں لذت یہ صفت کوں کباب میں دیکھا
ذیل کا قطعہ بھی بیاض سے ماخوذ ہے۔

مدارِ دارِ دنیا در سفر ہے بہ آبِ زر لکھا ہے بعلی نے
کہ عمر بے وفائے اندر گزر ہے کہ سونے سے مسافر کوں خطر ہے

موسیقی سے لگاؤ کے سبب انہیں اردو اور ہندی شاعری کا ذوق پیدا ہو گیا
تھا۔ کچھ اشعار اور قطعات کے علاوہ انہوں نے کئی گیت بھی لکھے ہیں۔

ذیل میں ایک گیت درج ہے۔

اٹھو میرے لالہ مدن گوپالہ
آیا تیرا بالہ بلاوندہ کو
دودھ، مکھن، روٹی چوپٹ کی
دیوانی بنی بجاونہ کو
جاگید گوپالہ، لالہ پنچھی بند بولے
جاگیو پنچھی بولہ لالہ پنچھی ہنسے
”سرتارہ کی“ میں یہ شعر لکھے ہیں۔

جس باغ میں جہلی گئی !
اوس باغ میں جانا پڑا
اوس باغ میں پانی نہیں
خون جسگر کھانا پڑا

افغان عہد میں جو شاعر منظر عام پر آئے۔ ان میں سے بعض کی سرپرستی
سکھ جیون مل کھتری نے کی۔ وہ لاہور سے افغان ناظم عبداللہ خان (۱۶۷۱ء) کا صاحبکار
مقرر ہو کر کثیر آیا۔ سکھ جیون مل میں اور عبداللہ خان میں کچھ خصوصیت ہو گئی تھی۔ اس نے
اس نے ایک ذی اثر شخص، ابوالحسن بانڈے کی مدد سے رات کے وقت عبداللہ خان
اور اس کے دو بیٹیوں کو قتل کر کے، حکومت خود اپنے ہاتھ میں لے لی اور احمد شاہ درانی
نے جب اس کے خلاف فوج بھیجی تو اس کو شکست دے کر، پادشاہ دہلی کے نام
کا خطبہ مسجدوں میں پڑھوایا اور بقول حسن والا گوہر اور بقول ڈاکٹر غلام محی الدین
صوفی عالمگیر ثانی کی خدمت میں تحفے تحایف بھیج کر راجہ کا خطاب حاصل کیا۔ ابتداً
میں اس نے عدل و انصاف سے حکومت کی۔ لیکن بعد میں میر غلام علی آزاد بلگرامی
کے بیان کے مطابق مسلمانوں سے تعصب برتنے لگا تھا۔ آخر درانی نے نور الدین خان
بامزئی کی سرکردگی میں فوج بھیج کر اس کا قلع قمع کیا۔ اس کی تفصیل تاریخی حقتہ
میں گزر چکی ہے۔

اپنے عروج کے زمانے میں، سکھ جیون مل کو نام و نمود کی بھی خواہش پیدا
ہو گئی تھی۔ فارسی شاعری اور ادب سے اُسے لگاؤ تھا اور وہ خود بھی فارسی میں شعر کہتا

تھا۔ اس نے کئی شعرا کو اپنے دربار سے منسلک کر لیا تھا۔ جن میں ملاعل محمد توفیق،
 ملارنج ماٹینی، میرزا محمد جان بیگ ساسی، عبدالوہاب شایق، رحمت اللہ بانڈے
 نوید، محمد علی خان تیلن، ملاراج شامل تھے۔ اپنے نام کو کثیر کی تاریخ میں زندہ
 رکھنے کے لئے اس نے ایک "شاہنامہ کثیر" کی تجویز بنائی تھی اور اس کے مختلف حصے
 مختلف شاعروں کے ذمہ کئے تھے۔ لیکن یہ "شاہنامہ" نامکمل رہ گیا۔ توفیق شایق
 وغیرہ نے اس کے جو حصے نظم کئے تھے، وہ محفوظ ہیں۔

توفیق فارسی کے اچھے غزل گو شاعر تھے۔ ان کا دیوان موجود ہے۔ اس کے علاوہ
 "شاہنامہ کثیر" کے بھی کچھ حصے انہوں نے نظم کئے تھے۔ اور وہ محفوظ ہیں۔ ان کی دو
 اور تصانیف "رسالہ شبی" اور "سراپا" بھی قابل ذکر ہیں۔ ان کی ایک رباعی
 میں ہندوستانی زبان کے کئی لفظ آئے ہیں۔ یہ رباعی توفیق نے سکھ جیون مل کے
 دورہ پر گد و لر کے موقع پر کہی گئی تھی۔ سکھ جیون مل پاکی میں سوار تھا اور توفیق اس
 کے ساتھ تھے۔ توفیق نے یہ رباعی اس کے سامنے پڑھی تھی۔

اب پاکی طاق کہ مطبوع نکوست !

چشمی است کہ از بانس خرازس اید مست

چترش فلک دیدہ و مشرکاں جالر

پول مردیکہ دیدہ بہار اجد در مست

توفیق ملا ساطع کے شاگردوں میں سے تھے، بعد میں انہوں نے محمد
 رضا شاق سے بھی مشورہ سُن کر لیا تھا۔ پیر غلام حسن نے لکھا ہے۔ انہیں اپنے عہد میں
 ملک الشعراء کا مرتبہ حاصل تھا اور ملا طاہر غنی کے بعد ان کے مرتبہ کا شاعر اور کوئی پیدا
 نہیں ہوا۔ "شاہنامہ کثیر" کے لئے انہوں نے یوسف شاہ چک سے لے کر عالمگیر کے عہد
 تک کے حالات، دہزار اشعار، دہزار فقرے لکھے تھے۔ حسن نے یہ بھی لکھا ہے کہ —

۱۵
 "در مجلس سکھ جیون سر دفتر شعرائی مجلس می بود"

میرزا محمد جان بیگ سامی کے سکھ جیون مل کے حلقہ شعرائیں داخل ہونے کا ایک دلچسپ واقعہ پیر غلام حسن نے اپنی تاریخ کے حصہ چہارم و در ذکر شعرائی مل میں لکھا ہے۔ ایک دن سکھ جیون مل کے درباری شعراء کی محفل جاری تھی۔ سامی اس وقت تک درباری شعراء میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ محفل میں سکھ جیون مل نے حافظ کا مصرعہ: اے فروغِ ماہِ حسن از روئے زخاں شما: طرح کے طور پر دیا تھا۔ اور شعراء اس پر طبع آزمائی میں مصروف تھے۔ سامی جب وہاں پہنچے تو ایک کاغذ پر یہ شعر لکھ کر اندر بکھجوا دیا۔

سامی از راہِ حیا بیرون در افتادہ است

باز گردو یا در آید، پچیت فرمانِ شما

سکھ جیون مل نے انہیں اندر بلایا۔ اس وقت سے وہ مجلس کے رکن بن گئے۔ پیر غلام حسن نے ان کا مختصر حال لکھا ہے، لیکن حکیم قدرت اللہ قاسم نے تفصیل لکھی ہے۔ ان کا خاندان قساق کا رہنے والا تھا۔ ان کے والد انہیں لے کر کشمیر آئے۔ سامی نے عبدالرشید مینوا سے تلمذ حاصل کیا اور جلد منظر عام پر آ گئے۔ قاسم اور شیف نے جنہیں سکھ جیون مل کی تجویز، شاہ نامہ کشمیر کا علم نہیں تھا، لکھا ہے کہ سامی نے شاہ عالم کے عہد میں فردوسی کے شاہنامہ کے انداز پر مثنوی لکھنی شروع کی تھی۔ لیکن عمر نے وفات کی۔ اور یہ شاہنامہ ادھر وارہ گیا۔ یہ دراصل اس "شاہنامہ کشمیر" کی طرف اشارہ ہے جس کا ایک حصہ سامی کے بھی تعویض ہوا تھا، سکھ جیون مل کے سقوط کے بعد سامی کچھ عرصہ خرم خان، افغان ناظم کشمیر (۱۷۶۶ء - ۱۷۷۱ء) سے بھی متصل رہے۔ خرم خان کی مدد میں انہوں نے ایک قصیدہ لکھا تھا، جس میں یہ صفت رکھی ہے کہ اس کے ہر شعر سے ڈونار بخیس برآمد ہوتی ہیں۔ آخری زمانے

میں وہ پہلی چلے گئے تھے اور اردو کے مشہور استاد خواجہ میر درد کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے تھے۔ چنانچہ اپنے پیر کی مدح میں سامی نے کئی رباعیاں، ترجیع بند اور ترکیب بند لکھے تھے۔ قاسم کا بیان یہ بھی ہے کہ اعظم الدولہ محمد میر خان بہادر نے سامی سے اپنے اشعار میں اصلاح لی تھی۔

سامی کا اردو کلام کافی بل جاتا ہے۔ ان کی طبیعت میں چہل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی زبان سے اور ایرانیوں کی طرح، ہندوستانی لفظ صاف ادا نہیں ہوتے تھے۔ اس کی معذرت میں انہوں نے یہ قطعہ کہا تھا۔

ہندی میں زبان نہیں الٹنی گو لاکھ کہوں مُغل پسر ہوں
مگر سہو بھی ہو تو کیا اچھنبا بے غیب خدا ہے میں بشر ہوں
ایک اور ایرانی نے کہا تھا۔ "بہندی و رندی زبان لٹ پٹ است"

سامی کی ایک غزل کے شعر حسب ذیل ہیں :

افسوس کہ اختیار ہوئے یا تمہارا غماز بنے محرم اسرار تمہارا
مرفانِ قفسِ دن کو ترپتے ہیں لیکن دن رات ترپتے ہیں گرفتار تمہارے
ہم گھر میں تمہارے کہو کس راہ سے نہیں دشمن ہیں ہمارے درد دیوار تمہارے
جب گرم غضب لگتے ہو تم لیتے ہیں بوسہ ڈرتے نہیں آتش سے گنہگار تمہارے

معارفین بائیسویں، میرامن اللہ شہید کے تلامذہ ہیں تھے۔ عربی علوم کی

تکمیل انہیں سے کی تھی۔ بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔ کچھ عرصہ امیر الامرا صمصام الدولہ کی ملازمت میں بھی رہے۔ ایک موقع پر حسن طلب کے طور پر ایک بیت لکھ کر امیر الامرا کے پاس بھیجی تھی۔

ہاں محیط کرم گرچہ آشنا دارم کفم چوکا کہ گریب از گھر خالی است

اس پر امیر الامرا نے ایک ہزار روپے انہیں عطا کیا تھا۔ آخری زمانے میں وہ مسک جیون مل سے

وابستہ ہے۔ سکھ جیون مل کے حلقے کے شعراء شعر کہنے کے لئے نئی نئی تقریریں ڈھونڈتے تھے۔ ایک موقع پر "شکر سنگ" کی ردیف میں قصیدہ کہنے کی طرح نکلی۔ سب نے اس پر طبع آزمائی کی۔ طارقیہ نے ایک طویل قصیدہ لکھ کر "سکھ جیون مل" کو پیش کیا تھا۔ اس کا ایک شعر ہے:

ای کر اک عالم آیت از درگوش یا بد رو وقت،

دال، چاول، ماشا و برنج روغن و شکر نمک

سکھوں کا عہد کشمیر کی تاریخ میں ظلم و استبداد، لوٹ کھسوٹ کے لئے بدنام ہے۔ اس دور کی بدعنوانیوں کے بارے میں بعض شاعروں اور ادیبوں نے لکھا ہے۔ لیکن حمید اللہ شاہ آبادی نے نظم و نثر دونوں میں جس فنزیرہ انداز سے اس عہد کی پچھتی اڑائی ہے۔ وہ کشمیر کی تاریخ کا ایک حصہ بن گئی ہے۔ حمید اللہ پرگ پرنگ میں پیدا ہوئے تھے۔ بعد میں اسلام آباد، اذیت ناگ میں منتقل ہو گئے تھے۔ رس و تدریس ان کا مشغلہ تھا۔ بلا لیکار شاعر اور انشا پرداز تھے۔ فارسی میں، ایک مزاجیہ شغریٰ سعدی کی بوستان کے جواب میں "شکرستان" لکھی تھی۔ ان کا چلے نامہ "بہت مشہور ہے۔ ایک تاریخی مثنوی "اکبر نامہ" بھی لکھی تھی۔ ایک رسالہ "رد شیعہ" بھی ان کے افکار سے موجود ہے۔ لیکن اپنے عہد پر موثر سب سے زیادہ دلچسپ ان کا "بیرون نامہ" یا "ناپرسان نامہ" ہے۔ جس میں سکھ نظم و نثر کی ایسی ہجو کی ہے کہ جس کی مثال ادب میں کم ملتی ہے۔

لکھتے ہیں:

"ان ایام حسرت فرجام میں چرخ ستمگر و سفلہ پروردی گردش سے خطہ
کثیر جنت نظیر میں فاشخا نان کے تصرف سے نواب عادل خاں تبدیل ہو کر
حکومت سلطان شہر ناپرساں، راجہ راجگان تاراج سنگھ کے قبضے میں آئی
اور جہاں سنگھ جو رعیت پروردی اور عدالت گسری میں نامی تھا۔ کشمیر کی

۵۴

صوبہ داری پر شرف ہوا۔ چونکہ راجہ راجکال کو رعایا پر ہمدی اور شفقت
منظور تھی۔ اس لئے ہدایت کی کہ عدل اس طرح کیا جائے کہ اہلیانِ کامنہ
حکایت و شکایت سے بند کر دینا چاہیئے۔ ہر رہزن کو اذنِ عام ہو کہ
بے محابا اپنے کام میں مشغول رہے۔ برف میں قلیہ کاری کی جائے اور بہار
میں وصولیات کی جائیں۔ گریزخان میرٹھ شیرادر ادبارخان بخشی فوج،
شامت سنگھ چہرہ نویس، مردار سنگھ قاپچی، چرکین سنگھ آتش پز
رہزن بانڈے دربان، مقری سنگھ دفتری

اس اجماعیہ بیان میں جگہ جگہ اشعار اور نظمیں بھی آگئی ہیں۔ پنجاب کے
یہ سنگھ، اہلِ کشمیر کے لئے، ہندوستانی تھے۔ چنانچہ آج تک بھی سارے ہندوستانیوں کے لئے
پنجابی ہی کا لفظ اہلِ کشمیر کے یہاں مستعمل ہے اور ظلم و استبداد کی جو سوغات پنجابی لائے
تھے۔ وہ ہندوستانی تحفے بن گئے۔ حمید اللہ کہتے ہیں:

اسی آید بجلئے قمر ہندی ترشروئی ز ہندوستان بخردار
یہ جذبات نفرت جو سکھوں کی تباہ کاریوں کا نتجہ تھے۔ آج بھی اہلِ کشمیر کے دلوں میں
باقی ہیں۔ حمید اللہ نے اسی لب و لہجہ میں ایک نظم "ناپرسان نامہ" میں لکھی ہے۔ جو
حسب ذیل ہے:

گشت بیکرنگ کشور و دادی	ہوم در شہر کرد آبادی!
گر شنالی بکوچہ می نالید	ایچ سگ مانفش نیگر وید!
در مساجد بجای بگاہ لبیب!	چند داعظ نشست زانغ طیب!
گلو راگز باغ کس میراند	بر جگر زانغ منتظر می ماند
بود درم زبان اہل خوراج	دھرم کا راج ملک کا تاراج

آخری شعر کے دوسرے مصرعے میں حمید اللہ نے مذہبی عقیدوں کو حکومت کا

اصول بنانے میں جو بربادی مضمون ہے۔ اس کا بڑا ترقی پسند تصور پیش کیا ہے۔ اس شعر کے پہلے مصرعے کو قاضی ظہور الحسن سیوہاری نے اپنی "نگارستان کثیر" میں اس طرح لکھا ہے۔ — "ہے یہ درد زبان اہل خراج۔"

ان حالات میں کوئی تعجب نہیں جو لوگ اپنا وطن عزیز ترک کر کے، امن کی تلاش میں ہندوستان اور پنجاب چلے گئے ہوں۔ چنانچہ اردو شعراء کے تذکروں میں اس عہد کے بہت سے شعراء کے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو وہ کشمیر میں پیدا ہوتے تھے۔ اور دہلی یا اور مقامات کو چلے گئے تھے۔ یا ان کا خاندان دہلی منتقل ہو گیا تھا۔ جہاں وہ پیدا ہوئے۔ انہیں میں ایک بڑے ایسے شاعر خواجہ احسن اللہ خاں بیان ہیں۔ یہ دہلی کے ابتدائی دور کے شعراء، ناجی، بیکرنگ، فغاں وغیرہ کے معاصر تھے اور فغاں کے دوست بھی تھے۔ بیان آخری زمانے حیدر آباد چلے گئے تھے۔ جہاں نواب ارسطو جہاں وزیر اعظم نظام علی خاں، حکمران حیدر آباد کے درباری شعراء میں داخل ہو گئے تھے۔ بیان بڑے قادر کلام شاعر ہوئے ہیں۔

سودا کے معاصرین میں محمد علی حسنت، اپنے عہد کے سربراہ اور سنسنی اور سرور آور شعراء میں سے عبدالحی تاباں کے استاد تھے۔ وہ "مخزن نکات" کے مصنف قایم چاند پوری کے ہم عصر تھے۔ اور قایم نے انہیں "مردم کثیر" میں شمار کیا ہے۔ حسنت دو سال قطب الدین علی خان کی رفاقت میں رہے اور انہیں کے ساتھ ۱۸۵۷ء میں مراد آباد گئے اور خان مذکور کے ساتھ علی محمد روہیلہ کے خلاف جنگ میں لڑتے ہوئے مارے گئے۔ حسنت عبد الغنی بیگ قبول کے شاگرد تھے اور صاحب دیوان ہیں۔

سودا کے ایک اور معاصر رنگین کا ذکر خلیل نے کیا ہے اور لکھا ہے کہ کیشوری نژاد ہیں۔ ان کا ایک شعر یہ دیا ہے :

مت ہوئی ہم اس میں کچھ بھی اثر نہ پایا اس واسطے دعا سے آخر کو ماتمہ اٹھایا

خواجہ محمد اسحاق، ابن کشری۔ سے پیش کیے گئے تھے۔ علی ابراہیم خاں خلیل نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ۱۱۹۷ھ میں وہ نواب خیر رضا خان مظفر جنگ کی ملازمت میں تھے۔ یہ صاحب تھے اور فارسی میں بھی ایک دیوان ان کی یادگار ہے۔
 رائے سید رام عمدہ ابتدائی دور کے شعرا میں اہمیت رکھتے ہیں۔ امرتھال آبادی نے لکھا ہے کہ وہ کشمیر میں پیدا ہوئے تھے اور انہیں انام اللہ خاں یقین کا متبع بنایا ہے۔ ان کا کافی کلام ملتا ہے۔ دو شعریں ہیں :
 کسو کے سینے میں ہرگز مر ساداغ نہ تھا

مرے چراغ سا روشن کوئی چراغ نہ تھا

چمن میں کینچ کے لانے میں لکڑیاں بچھ کر

وگرنہ سیر چمن کا مجھے جرم غناغ نہ تھا

منتاب رائے تائب کے بارے میں ذکر آنے لکھا ہے کہ وہ کشمیری خاندان سے ہیں اور شاہ عالم ثانی کے استاد حافظ عبدالرحمن خاں احسان سے انہوں نے شعر کا فن سیکھا تھا۔ اسی طرح گنگا داس تسکین، ابو دھیا پرشاد حیرت، اور حافظ محمد حنیف کشمیری کا ذکر بھی ذکا کے یہاں ملتا ہے۔ یہ قدرت اللہ قائم کے شاگردوں میں تھے اور مرثیہ میں شہرت رکھتے تھے۔ تائب کا تخلص شلیفۃ نے تائب لکھا ہے۔ حیرت لکھنؤ میں مقیم تھے اور شیخ قلندر بخش جرات سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ ایک مختصر دیوان قیدر دیا ہے۔

علی ابراہیم خاں خلیل نے میرزا مظہر جانجاناں کے معاصرین میں ایک سخن گوشتی کشن چند مجروح کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ ان کی اصل کشمیر سے ہے اور خود ان کی ولادت دہلی میں ہوئی۔ میرزا مظہر جانجاناں سے وہ شور سخن کرتے تھے۔ ان کے کلام میں کچھ نہیں دیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ اس وقت کہ ۱۱۹۷ھ ہے۔ مجروح لکھنؤ میں غزت

کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

کچھ اور شعراء یہ لڑیا :

غلام ناصر جراح جن کا خاندان دہلی میں بس گیا تھا اور یہ وہیں پیدا ہوئے
تھے۔ شیفتہ نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ :

”نظر پر پیشہ اس تخلص پذیرفتہ والحق و سنگا ہی نیکو داشت جس طرح
پیشہ کی رعایت سے انہوں نے تخلص چنا تھا۔ تخلص کی مناسبت سے شعر بھی کہتے
تھے۔ ان کا ایک شعر ہے :

جراح ٹانگے دینے میں مت کر درنگ تو

اس واسطے کہ زخم مرے یار گرم ہیں

محمد عبداللہ خاں خستہ، میر جیون کے عرف سے مشہور تھے اور دہلی میں رہتے
تھے۔ ان کے والد کے بارے میں شیفتہ نے لکھا ہے کہ محمد الدولہ، عبداللہ خاں کے منویلیں
میں سے تھے۔ پنڈت امر ناتھ شعلہ لکھنؤ میں قیام پذیر تھے۔ خواجہ بینکا جو شیدائے تخلص کرنے
تھے اور علاقہ بندی کے فن میں ماہر تھے۔ شیفتہ نے ان کے یہ دو شعر نقل کئے ہیں
جانیں مشتاقوں کی لب تک آئیاں !

ہمے ہے بلجے ظالم تیری لا پرواہیاں !

جاگان میں باتوں کے بہانے لیا بوسہ

دیوانہ ہوں شیدا میں بڑا کام کیا ہے

ان کے بیٹے منعل علی منل بھی شاعر تھے۔

فیض اکبرپاکر شن کا تخلص تھا۔ جو لکھنؤ میں بس گئے تھے۔ مرزا علی خاں عسکر کے
بارے میں شیفتہ نے لکھا ہے کہ جب لکھنؤ میں تھے۔ ان میں اور جرات کے شاگرد میرزا علی

۵۸
 مہلت میں نزاع تھی۔ آخر دونوں نے گومتی کے کنالے کے ذریعے نزاع کا تصفیہ
 ٹھہرایا۔ مہلت زخمی ہوئے اور زخموں سے جانبر نہ ہو سکے۔ محشر غوف قصاص میں دہلی
 بھاگ گئے اور وہاں پہنچ کر خواجہ میر درد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کچھ عرصہ کے بعد
 جب لکھنؤ لوٹے تو مہلت کے ورثا نے قصاص میں ان کو قتل کر دیا۔ محشر کے دو شعر
 ہیں ۹

جاں منتظر ہے آنکھوں میں وقتِ حبل ہے
 جلدی پہنچ کر ترے ہی آنے کی ڈھیل ہے

دور میں اس چشم کے گردوں کو آسائش نہیں
 کس گھڑی، کس دم، نئے قفسے کی فرمائش نہیں
 میر محمد علی نادر بھی دہلی کی شعرو سخن کی محفلوں میں روشناس تھے۔ شیفیت نے ان کا نام
 محمد عارف علی لکھا ہے۔ ان کا ایک شعر ہے :
 سو طرح سے بات اگر کیجئے تو گھلتا ہی نہیں

مجھ میں اور اس میں نہ جاؤں پڑ گئی کیسی گرہ
 قاضی خواجہ امین الدین خاں امین، قاضی وحید الدین خاں کے بیٹے تھے۔ جوالی اللہ مراد
 نجیب الدولہ کے زمانے میں قاضی القضا کے عہدہ پر مامور تھے۔ امین شہزادہ جہاندار
 شاہ کی سرکار میں ملازمت رکھتے تھے۔ عشق نے لکھا ہے کہ وہ پہلے منشی ہلا اس رائے اصلاح
 سے مشورہ سخن کرتے تھے اس زمانے میں وہ پٹنہ میں رہتے تھے۔ فارسی میں ان کا کلام
 زیادہ ہے اور وہ فارسی کے اچھے شعراء میں شمار ہوتے تھے۔ لیکن آخری زمانے میں اردو
 سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ شورش اور عشق نے ان کے بہت سے شعر نقل کئے ہیں۔
 اگ لگا سرشاد نقد لکھنؤ کے متوطن تھے۔ ایک اور گنگا پرشاد رند تخلص کا ذکر

بھی تذکروں میں آتا ہے لیکن غالباً یہ ایک ہی شاعر تھا۔ کثابت میں عدم وضاحت
کی سبب اعداء زند پڑھا گیا۔ سرور نے ان کا تخلص زند لکھ لیا ہے۔ یہ شعر دن کا ہے۔
آپ غیروں ساتھ یوں ہر دم ہنسنا بولا کریں
اور ہم دیکھا کریں، تڑپا کریں، رویا کریں

امیر بخش خاں شہرت دہلی میں رہتے تھے اور حکیم شہداء اللہ فراق کو اپنا کلام دکھاتے
تھے۔ آخر عمر میں یہ حیدر آباد چلے گئے تھے اور مہاراجہ چند لال شاد آل وزیر اعظم ریاست
کی سرکار میں ملازم ہو گئے تھے۔ قدرت اللہ قاسم کے بیان کے مطابق اس زمانے میں
وہ میر فرید الدین آفاق سے شورہ کرتے تھے۔ آفاق بھی انہیں کے ساتھ حیدر آباد گئے
میاں عسکری نالائ اور ان کے بیٹے طالب حسین خاں طالب دونوں شاعر تھے۔ نالائ
دہلی میں نواب ذوالفقار الدولہ کے زمانے میں اعتبار رکھتے تھے۔ طالب بعد میں لکھنؤ
گئے اور انشاء اللہ خاں انشاء کے شاگردوں میں شامل ہو گئے۔ اس زمانے میں وہ
شہزادہ سیلمان شکوہ کی سرکار میں داروغہ کے عہدہ پر مامور تھے۔ قاسم نے یہ دو شعر لکھے
ہیں:

اشک یوں جم گئے ہیں اپنے بھی مڑگاں سے لپٹ

اوس جیسے کر رہے خار مغیلاں سے لپٹ

دشت میں آہ، میرے یار، جو طالب نے بھری

ایک شعلہ گیا خاشاک بیاباں سے لپٹ

ابتدائی دور کے شعراء میں محمد عارف، عارف کا نام بھی ملتا ہے۔ جو رفوگری کے فن

میں ماہر تھے۔ غالباً اکبر آباد میں بھی رہے تھے۔ اس لئے خلیل اور عشق نے انہیں

اکبر آبادی لکھا ہے۔ عارف، میر اور سودا مناصر تھے اور مصحفی کے بیان کے مطابق
 شرف الدین مضمون اور شاہ مبارک آبرو سے اصلاح لیتے تھے۔ یہ صاحبِ دیوان تھے اور
 خود ان کے کئی شاگرد ہوئے۔ ایک شاگرد نے ان کا دیوان مرتب کیا تھا۔
 شیخ نصیر الدین غریب، دہلی میں رہا کرتے تھے۔ قاسم نے ان کے اخلاقِ عادات
 کی بڑی تعریف کی ہے۔ فارسی میں ان کی شہرت تھی اور کبھی کبھی اردو میں بھی شہرت تھی۔
 قاسم نے ان کی ایک غزل پوری نقل کی ہے جس کے تین شعر یہ ہیں:

جس جاگہ قدم رکھتے ہیں سرتن سے جدا ہو
 جاتے ہیں اوی کو چہیں ہم، دیکھئے کیا ہو!
 مت چھڑ تو اس زلفِ بیہ فام کوں ناداں
 دیکھا نہیں کاٹا کوئی کالے کا جیسا ہو

حکیم مومن خان اردو کے ممتاز شاعروں میں سے ہیں۔ اُن کے
 والد حکیم احسن خان احسن کا شمار دہلی کے رئیسوں میں ہوتا تھا۔ حکیم احسن خان خونی
 رشتے سے کشمیری تھے۔ اور یہی خون مومن کی رگوں میں دوڑتا تھا۔ اردو کے اتنے بڑے
 شاعر کے ساتھ کشمیر کی وابستگی اردو اور کشمیر کے تعلق کو ایک دلچسپ موضوع بنا دیتا
 ہے۔ مومن خان سیاسی طور پر بڑے باشعور تھے۔ اور وہ حضرت شاہ اسماعیل شہید
 کی تحریک سے بھی ربط رکھتے تھے۔ اسماعیل شاہ نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز شمال
 مغربی ہند کو بنایا تھا۔ وہ کشمیر کے معاملات سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ اور
 مرکزِ بالا کوٹ میں ان کی شکست نے کشمیر کو رنجیت سنگھ کے حلقہ اثر میں پھینک
 دیا۔

حافظ محمود کشمیری نے میر پور کے ایک شاعر: غلام علی الدین کی مثنوی

۶۱
 ”گلزارِ فقر“ کا ذکر کرتے ہیں۔ جو بقول اُن کے ۱۱۳۱ھ میں لکھی گئی۔ حافظ صاحب
 نے لکھا ہے کہ یہ لوگ نہ ہندوستان گئے اور اُردو دانوں سے تعلق میں آئے لیکن
 اُردو میں اپنی تصنیفات لکھ رہے ہیں۔ انہوں نے مثنوی کے کچھ اشعار بھی نقل کئے
 ہیں۔ جن میں چند یوں ہیں

غلام محی الدین ایک فقیر	جس کا حضرت آپ ہے پیر
حق کی راہ میں سب کچھ دیا	سب کچھ دے کر حق مول لیا
یہ نسخہ جب تھپا تمام	گلزارِ فقر ہوا نام

ہندوستان کے اُردو دان طبقے نے پچھلی صدی کے اواخر سے ہی کشمیر میں پھیلی
 لینا شروع کر دی تھی۔ مرزا غالب کے تلامذہ میں چند کشمیریوں کے نام بھی ملتے
 ہیں۔ جن کا مالک رام نے غالب کے شاگرد ”میں تفصیلی ذکر کیا ہے۔ انجمن حمایت
 کے سرپرستوں میں کشمیر کے مشہور رئیس خواجہ عبدالصمد ککرو بارہولہ دلتے بھی تھے۔
 وہ سرسید اور شبلی کے بھی دوست تھے اور محسن الملک اور مولانا حالی کے بھی۔
 خواجہ عبدالصمد اُردو کے ایک بہت اچھے خطیب تھے اور شعر بھی کہتے تھے۔ وہ قبل
 تخلص کرتے تھے۔ عبدالصمد ککرو اقبال کے اولین قدر دانوں میں تھے۔ جب اقبال نے
 انجمن حمایت الاسلام کے جلسے میں اپنی مشہور نظم ”شکوہ“ پڑھی تو وہاں مرحبا
 مرحبا کے نعرے گونجنے لگے۔ خواجہ عبدالصمد نے شاہ قوس کا ایک بیش قیمت دو شالہ
 اقبال کے شانوں پر رکھا جس کا موقع پر ہی نیدام ہوا۔ بیلانی سے حاصل ہونے والی
 خاصی رقم انجمن کے بیت المال میں جمع کرائی گئی۔

اس صدی کے ابتداء میں جن شاعروں نے اُردو میں ابھر کر اپنا مقام بنالیا۔
 اُن میں شوکت علی خان فانی بدایونی بھی شامل ہیں۔ فانی کا دل غم و حزن کا گنجینہ
 تھا اور اُن کا کلام آنسوؤں میں بھیکا ہوا نظر آتا ہے۔ فانی کشمیر آئے۔ تو انہوں نے

کشمیر کے خوبصورت مناظر سے زیادہ یہاں کے عوام کی حالتِ زار کی طرف نظر ڈالی۔
 اُن کا جاسِ دل زخمی ہو گیا اور انہوں نے ان الفاظ میں اپنی دردمندی کا اظہار
 کیا:

اس باغ میں جو کھی نظر آتی ہے
 تصویرِ نسر دگی نظر آتی ہے
 کشمیر میں ہر حسین صورت فانی
 بٹی میں ملی ہوئی نظر آتی ہے

کشمیر میں حالِ اہلِ کشمیر تو دیکھ
 ہر پاؤں میں افلاس کی زنجیر تو دیکھ
 سمجھے ہم کیا تھے، دیکھتے ہم کیا ہیں
 کشمیر کے خواب اپنی تعبیر تو دیکھ

پھولوں کی نظر نواز رنگت دیکھی
 فِلسُوق کی دل گداز حالت دیکھی
 قدرت کا کرشمہ نظر آیا کشمیر
 دوزخ میں سموی ہوئی جنت دیکھی

کشمیر کے طالب علم اس صدی کے ابتدائے ہی پنجاب اور یو۔ پی کی درسگاہوں
 میں تعلیم کے لئے آتے رہے اور اسی طرح یہاں کے مزدور اور بیوپاری بھی سلسلہ معاش
 میں ان تغلات پر آتے تھے۔ ان دنوں یہاں اُردو کا بول بالا تھا۔ اخبارات اُردو

۶۳
میں نکلتے تھے۔ اور کاروبار کی زبان اُردو تھی۔ یہ لوگ بھی اُردو پڑھتے اور اُردو میں
خط و کتابت کرتے۔ اس وقت بھی سری نگر میں پچھلی صدی کے اواخر اور موجودہ صدی
کی ابتدا میں لکھے ہوئے خطوط نظر آتے ہیں جو باہر گئے ہوئے کشمیریوں نے کشمیر
میں اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو لکھے۔ یہ خطوط اُردو کی مروجہ طرز میں ہیں۔
عبارت آرائی کی کوشش کئے بغیر لکھنے والا اپنے مطلب کی ساری باتیں بخوبی
ظاہر کر لیتا ہے۔

پہلی عالمگیر جنگ نے ساری دنیا کی طرح کشمیر میں بھی جھٹکے پیدا کئے۔ مہاراجہ
کشمیر نے تاج برطانیہ کے ایک دوست کی حیثیت سے اپنی فوج کے کئی دستے ہندوستان
سے باہر لڑنے کے لئے بھیج دیئے۔ اس کے علاوہ انگریزوں نے کشمیر کے جنگ جوتیاں
سُدھنڈ راجپوت وغیرہ میں برہم راست بھرتی کی اور یہ "رنگروٹ" مختلف محاذوں پر
لڑتے رہے۔ ان کا گھر سے نام و پیام اُردو کے ہی ذریعہ ہوتا تھا۔ اُن دنوں سیاست
میں بھی جنگ کی خبروں کے متعلق بڑا تجسس پایا جاتا تھا۔ ریڈیو ابھی منصفہ
شہود پر نہ آیا تھا اس لئے لوگ تنازعہ خبروں کے لئے پنجاب سے شائع
ہونے والے اخبارات کے لئے بے تاب رہتے تھے۔ جو کبھی ڈاک سے پہنچتے اور کبھی
آتے جلتے مسافروں کے ہاتھ۔

کشمیری پنڈت کشمیر سے لہروں کی صورت میں باہر گئے۔ وہ بڑے تعلیم یافتہ
اور شعور یافتہ تھے۔ وطن سے باہر جا کر بھی وہ اپنی برادری کو نہ بھولے۔ اور نہ
رسم و رواج اور عقاید و ضوابط کو — وہ انجمنوں کے اجلاس بُلاتے اور رسالے
نکالتے۔ ان رسالوں میں "کشمیر دپن" وغیرہ مشہور ہوئے اور ان میں کشمیر اور کشمیر
سے باہر کے کشمیری پنڈتوں کی کیفیات و احوال درج ہوتے۔ شادی غمی کی
اطلاعات، رشتوں کی تلاش، اصلاح رسوم وغیرہ۔ ان رسالوں سے سر تیج بہادر

۶۴
 سپروانشی دیارام بنگم، اور دوسرے اہل نظر کشمیری پنڈت وابستہ تھے۔ یہ سائل
 کشمیر بھی پہنچتے اور یہاں بالواسطہ طور اُردو کی ترویج کا ذریعہ بھی بنتے۔
 کشمیری پنڈت کے اس سلسلے میں بڑا ممتاز نام پنڈت برج نارائن چکیت
 کلہے۔ برج نارائن ۱۸۸۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے اور لکھنؤ میں تعلیم حاصل
 کر کے واپس آباد ہو گئے۔ انہوں نے قانون کی ڈگری لی اور جلد ہی وکالت کے
 پیشے میں نام پیدا کیا۔ چکیت اُردو میں حب وطن کی شاعری کے بانیوں میں
 سے تھے۔ وہ کشمیر بھی آئے اور شاید اسی سفر کی بازگشت میں انہوں نے یہ دالہا
 شعر کہا :

ذرہ ذرہ ہے میرے کشمیر کا مہمان نواز
 راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے
 کشمیر پر اُن کی ایک اور نظم ملتی ہے جس کے چند بند یوں ہیں :
 ہر لالہ کو ہمارے شکل گلِ راحت !
 داغ اس کے یاہیں خالِ رخِ خورِ مسرت
 کیا سبزۂ خوش رنگ ہے سرمایۂ عشرت
 دل کے لئے ٹھنڈک ہے جگر کے لئے فرحت
 ایسا نہیں قدرت نے کیا فرس کہیں پر
 اس رنگ کا سبزہ ہی نہیں بونے زمیں پر
 وہ طائر کہ سار لبِ چشمہ کہ سار
 وہ سرد ہوا وہ کرم ابرِ گہر بار
 وہ میوۂ خوش رنگ وہ سرسبز چین زار
 اک آن میں صحت ہو جو برسوں کا موبار

یہ باغِ وطن روکش گلزارِ جہاں ہے

سرمایہ نازِ چین آرائے جہاں ہے

پھوٹے ہوئے اس باغ کو گزرا ہے زمانہ

تازہ ہے مگر اس کی محبت کا فسانہ

عالم نے شرفِ جن کی بزرگی کہے مانا

اُٹھے ننھے اسی خاک سے وہ عالم و دانا

تن جن کا ہے پیوند اب اس پاک نہیں کا

رگ رگ میں ہے ہماری رداں غولِ انہیں کا

ہاں میں بھی ہوں بلبلِ اسی شادابِ چمن کا

ہے چشمہٴ فردوس یہ عالم ہے دہن کا

کس طرح نہ سرسبز ہو گلزارِ سخن کا

ہے رنگِ طبیعت میں چمن زارِ وطن کا

تلنے ہیں مضامین بھی طبیعت بھی ہر جگہ

ہاں گلشنِ قومی کی ہوا سر میں بھری ہے

برجِ نارائن چکبست نے اپنی مختصر عمر میں زادِ سخن دے کر ۱۹۲۶ء

کو انتقال کیا۔

پنڈت دیاشنکر نسیم کی شہنوی، گلزارِ نسیم کا تذکرہ اردو میں میر حسن

دہادی کی "سحرالبیان" کے ساتھ ساتھ کیا جاتا ہے۔ نسیم بھی کشمیری تھے اور اپنے

۱۔ تصویرِ مناظر۔ حصہ اول۔ تاجور نجیب آبادی۔ عطرچند کپور لاہور۔

کشمیری نسب پر نازاں، دیگر کشمیری پنڈت شاعروں کا مفصل تذکرہ "بہارِ گلشنِ کشمیر" کی دو جلدوں میں مفصل طور پر ملتا ہے جو پنڈت کشن کول نے ۱۹۳۲ء میں لاہور سے شائع کی ہے۔

اُردو کے ریاست میں ابتدائی چلن کے سلسلے میں مذہبی تحریکوں کا حصہ رہا ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں دلی میں دہلی تحریک کا غلغلہ تھا۔ یہ تحریک اپنے اصلاحی جوش میں تحریکِ آزادی کا ساروپ اختیار کرنے لگی تھی۔ اور اس کے حامیوں میں اُردو کے کچھ ادیب اور صحافی بھی پیش پیش تھے۔ یہ تحریک پچھلی صدی کے اواخر میں کشمیر پہنچی اور اس کے ساتھ اس کا اُردو میں لکھا ہوا لٹریچر بھی۔ عیسائی مبلغوں نے کشمیر میں اُردو میں ہی لکھے مسیحی لٹریچر سے ابتداء کی اور بعد میں کشمیری کا رُخ کیا۔ احمدیت کے بانی مرزا غلام احمد اُردو میں مہارت رکھتے تھے اور اُن کی کتابیں بھی کشمیر کے کچھ دانشوروں کے پاس پہنچ گئی مہرزا صاحب کے پہلے خلیفہ سونوی نور الدین، مہاراجہ زنبیر سنگھ کے ایک معتمد شیر تھے اور ان کی وجہ سے بھی اُردو کو کافی سہارا ملا۔ سوامی دیانند کی آریہ سماج تحریک بھی کشمیر میں اُردو کے ذریعے ہی پہنچی اور یہاں کے کشمیری پنڈتوں نے اس کی طرف خاص رغبت دکھائی۔

استقلال

ڈوگر حکومت کا قیام - ہند سے روابط کے عوامی پہلو - پارسی
تعمیراتی کمپنیوں کی مقبولیت، گلاب سنگھ کے دور کی مراسلت کا مخطوطہ
رنبیر سنگھ کے عہد کے نئے تقاضے - تعلیم کی اصلاح - رنبیر سنگھ کے
دربار کے نو ترقی - گلاب نامہ کے قطعات تاریخ - ہندوستانی نقیب
دارالترجمہ اور اس کی خدمات - نظم و نسق کی رپورٹ - مہاراجہ شری سنگھ
کا سفر نامہ - رپورٹ مجموعی، رسالہ "پیداوار اور انواران لداخ" دیوان
شیو ناتھ کول منتظر - ٹھاکر پرشاد داسچو مہنتوں - پرمانند کی وانی
داس دیو جی - ویشن کول عنادل - نرنجن ناتھ رینہ - لچھی ناراین
بھوان عاتجز - حسن ڈار - اند بنش دردی - رحیم بخش شیدا - سید
محمد انور شاہ اور زینب بی بی مہجوب، رسول میر -

چند تواریتیں :

"تواریخ حسن" از مادھو بھان کا شمیری - سردار دیونی سہائے کی
"ہند کلاسیکل ڈکشنری" - "تاریخ جدول معصومی" - پنج باب
حنفیہ "سرکاری پریس - ہدیہ مہاراجہ، سرکاری ہفتہ وار "بدیابلاں"

اخباروں کے اجراء کی ممانعت ۔ بیرون ریاست کے کشمیری
منفادات کے اجارات ۔

کشمیر سے باہر !
انشاء ، دیا شنکر نیسم ۔ حکیم مومن خاں مومن ۔ غالب
مفتی صدر الدین آزر دہ ۔ غالب کے کشمیری شاگرد ۔

سکھوں کے دور حکومت کے ابتداء سے گزرنے کے بعد ہمارا راجہ
 گلاب سنگھ کے زیرِ اقتدار نئی ریاست کی تشکیل کے نتیجے کے طور پر ریاست جموں و کشمیر کے
 سیاسی اور کسی حد تک سماجی حالات ایک صورت میں ڈھلنے لگے۔ اور علم و ادب کی کچھ روایات
 قائم ہونے لگی تھیں۔ لیکن جیسا کہ تاریخی خاکے سے واضح ہے، خود گلاب سنگھ کے
 ماہ و سال زیادہ تر کچھ متحدہ علاقوں کو سر کرنے اور خود سرداروں کو زیر کرنے اور نئی نئی
 قائم کی ہوئی ریاست کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں صرف ہو گئے۔ انہوں نے کوئی دس
 برس حکومت کی اور اس علاقے میں امن و امان اور سیاسی استحکام قائم کرنے میں
 انہیں کامیابی ہوئی۔ دربار اور نظم و نسق کی حد تک، ان کے زمانے میں، اگلے دور کی
 روایات قائم رہیں۔ فارسی ان کی درباری زبان تھی، گو اُردو عوام کی بول چال اور
 تعلیمی اداروں میں راہ پانے لگی تھی۔ فارسی کے شعرا میں اس زمانے میں پنڈت ٹھاکر
 داس رازدال نامی، پنڈت راج، پنڈت ست رام بقایا، پنڈت گوپال کول
 غبوری منظر عام پر آئے۔ انشا پر دانوں میں میرزا احمد اور ان کے فرزند میرزا سیف ^{الدین}
 قابل ذکر ہیں، جو ریاست میں وقایع نگاری کے عہدہ پر مامور تھے اور آخر الذکر نے

۱۹۲۶ء سے ۱۹۴۷ء کے دوران کے جو قائل لکھے ہیں، وہ آٹھ دس جلدوں میں محفوظ ہیں۔ اس کے علاوہ میرزا سیف الدین نے کشمیر کی ایک تاریخ "خلاصۃ التواریخ" کے نام سے فارسی میں لکھی تھی۔

سیکھوں کے عہد میں ریاست کے تعلقات پنجاب سے گہرے ہو گئے تھے، جہاں بڑے بڑے شہروں، خاص طور پر صوبہ کے صدر مقام لاہور میں اردو ادب اور شاعری کا ذوق خاصہ نشوونما پا چکا تھا۔ سرسکھ دربار سے جنوں و کشمیر کے الحاق کے سبب، پنجاب سے اردو ادب اور خاص طور پر صحافت کی نئی تحریکیں اُمٹھتیں، وہ جنوں اور کشمیر میں بھی راہ پالیتیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان سے بھی اردو شعروادب کی روایات مختلف ذریعوں سے جنوں و کشمیر سے روشناس ہوئے لگی تھیں۔ گلاب سنگھ کے آخری زمانے میں برطانوی ساسراج کے خلاف آزادی خواہوں کی جنگ کونام بنانے اور آزادی خواہوں کو چلنے کے لئے ریاست سے، جو قرونِ دہلی کو بھیجی گئی تھی، دہلی میں عرصہ تک مقیم رہی اور اس کے لوٹنے تک اپنی قوم کو اردو سے اچھی خاصی واقفیت پہنچی تھی۔ لیکن اس سے بھی ایک اور زیادہ مؤثر ذریعہ موسیقی تھی۔ اس سے پہلے ریاست میں اردو کی اشاعت اور مقبولیت کے سلسلے میں موسیقی کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اس عہد میں موسیقی میں ایک اور نیا عنصر داخل ہوا۔ اور یہ عوام پسند عنصر تھا۔ پہاڑی سارنگی، نواز، ڈھول، گیت، اور غزلوں اور گیتوں کے پہنچ چکی تھی اور وہ گلوں کو عوام کو سنا کر بھرے ہوئے تھے۔ جنوں اور کشمیر دونوں جہاں بہت مقبول ہو گئے تھے۔ عوام الگ الگ اور غزلوں کو سننے کے بعد انہیں ذوق و شوق سے گنگنائے رہتے تھے۔ غزلوں کے کچھ شعر جو عام لوگوں میں زبان زد تھے۔ وہ

۱۔ سرور: صاحب سے شہد ہوا۔ اصل میں ۱۸۱۶ء اور ۱۸۳۸ء میں چلے گئے۔

یہ ہیں:

کیا خبر تھی انقلاب آسماں ہو جائے گا

یار سے بلنا نصیب دشمنان ہو جائے گا

دفن کرنا مجھ کو کوٹے یار میں قبر بلبلی کی بنے گلزار میں

جوں میں اور کسی حد تک کشمیر میں بھی راس لیدا اور رام لیدا کے تماشے مقبول ہونے لگے تھے۔ یہ تماشے کرنے والے، ہندوستان کے مختلف شہروں میں گھومتے پھرتے جوں اور کشمیر بھی آتے تھے اور تماشے دکھاتے تھے۔ یہ تماشے بھی مقبول تھے اور ان کے گانے خاص طور پر لوگوں کے زبان زد ہو جاتے تھے۔ ایک مقبول گیت کا ترجمہ ہے:

اے مرے پیارے برادر! بن کو جانا چھوڑ دے

بن کو جانا چھوڑ دے اور

یہ غزلیں اور گیت ایسے مقبول ہو گئے تھے کہ لوگ ان کو بار بار پڑھنا چاہتے تھے۔ اس لئے ہندو ریشہ کے والد نے ان گیتوں کا ایک مجموعہ بھی تیار کیا تھا، جو پچھپا بھی تھا۔

"ان گیتوں اور غزلوں کے ٹکڑے کشمیری موسیقی میں بھی پیوست ہونے لگے تھے۔ کشمیری بھانڈوا اپنے کرتب اور فن میں سارے ہندوستان میں شہرت حاصل کر چکے تھے، اردو، ہندوستانی گیت گاتے تھے اور کشمیر میں بھی بہت پسند کیے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ قوالی کا ذوق بھی اس زمانے میں عام طور پر پھیلنے لگا تھا۔ اور قوال اردو غزلیں گاتے تھے۔ راتہ رات قوالی کی محفلیں اتنی مقبول ہو گئی تھیں کہ کشمیر میں قدیم تر دور کا صوفیانہ شاعری کی جگہ انہوں نے لبنی شروع کر دی۔ اردو کے ایک کشمیری شاعر، سری نگر میں رہتے ہیں۔

کر دی تھی۔ بہت ہی ابتدائی دور میں جیسے شعر عام طور پر پسند کئے جاتے تھے اور
لوگوں میں مقبول ہو جاتے تھے، ان کی چند مثالیں ذیل میں درج ہیں:

مرا جان جاتا ہے یار و سنبھالو کلجے میں کانٹا چھپا ہے لکالو

یا یہ شعر:

اب لڑکپن چھوڑ دے ظالم شباب آنے کو ہے

ان جملوں کے کٹوروں میں گلاب آنے کو ہے

شعر، بس غزل کا ہے۔ یہ شعر، ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۲ء کے عوام میں مقبول آئی، بالخصوص
یہ طویل و غریب شعر، بہت تیزی سے منہ بولنے والی اور بکھرے ہوئے اس کا ذکر کیا گیا اور
وفا با شو نگاہ لگا کر اس کو چھوڑ دیا۔ یہ شعر، ۱۹۱۱ء کا گانا تھا۔ پھر یہ شعر

تو ہمارا ہے گلاب سنگھ کے ہے یہ سرکار، اس وقت اور پھر
بالقلم جو زیادہ تر فاضل اور افسر تھے، ان کے ہاں یہ شعر، بالخصوص
۱۹۱۲ء میں مدد مانجی رہا۔ اس کا مخطوطہ ڈاکٹر کرنل سب گار صاحب نے دیکھا
ریاست ہوں و کشمیر اور محال وزیر شہری ہوا بازی مرکزی حکومت کی ملکیت ہے
مراسلت نومبر ۱۹۱۶ء اور جولائی ۱۹۱۷ء کے درمیان گلاب سنگھ اور کانگرہ کے
برطانوی افسروں، مسٹر ٹیلر، مسٹر ایڈورڈ لیک اور مسٹر جاکسن کے مابین لالہ بٹال
کی معرفت ہوئی تھی۔ لالہ بٹال ریاست جموں و کشمیر کے ملازم تھے جنہیں دیوان
بنوالا سہاٹے نے کانگرہ میں وکیل مقرر کیا تھا۔ مخطوطہ میں شامل ایک تحریر کے
مطابق وہ ۱۹۱۱ء بمبئی (مطابقت ۱۹۱۲-۱۸۴۳ء) سے اس کام پر مامور تھے۔

۱۔ یہ بیان محل نظر معلیٰ ہوتا ہے۔ قوالی نے آج بھی صوفیانہ مضمون کی جگہ نہیں لی ہے۔

”زمین کا بیان جو چاہو ہونے کے لائق ہو“

اس رسالے کے ترقیمہ کی عبارت حسب ذیل ہے :

”ختم شدہ تحریر بتاریخ سی ام ماہ مانگھ ۱۸۵۷ء و سرت ۱۲۱۳ھ
مقام بہون کا شترٹھ میں از کتاب بید اچھری زبانی کالی پرشاد
کے لکھیا ہے۔“

جوں میں اردو کا ابتدائی نمونہ ہونے کے دوران ’زمانے کے لحاظ سے اور اس اعتبار سے
کہ یہ اردو میں اس موضوع پر غالباً پہلا رسالہ ہے اس کی بہت اہمیت ہے۔

گلاب سنگھ نے برسر اقتدار آنے کے دوسرے سال ڈوگری اور فارسی کی طلبہ
کے لئے ایک ’مطبعہ ریدیا پرکاش پریس‘ کے نام سے قائم کیا تھا جس میں سرکاری خزانہ
ڈاک کے ٹکٹ اور اسٹامپ اور قانون کی کتابیں چھاپی جانے لگی تھیں۔ ان کتابوں
کی چھاپائی کے سلسلے میں ان کے عہد میں کچھ نمایاں کام نہیں ہوا تھا۔ اس سلسلے میں
دیا کرشن گروہی کے ایک مضمون کے اقتباس آگے درج کئے جا رہے ہیں۔

گلاب سنگھ کے نظم و نسق کے کاموں سے کنارہ کشی اختیار کرنے کے بعد ڈوگری
سنگھ نے براہ راست یہ کام اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس کے پہلے ہا پسٹے ان کی تربیت
کے لئے انہیں مختلف ٹکڑوں سے متعلق کر رکھا تھا۔ اور گلاب سنگھ کے انتقال تک
وہ بے کو اہم امور میں مشغول رہتے رہے تھے۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد ڈوگری سنگھ
کو حالات کے اتھکا کے مطابق نظم و نسق میں اصلاح کرنے کی ضرورت داعی ہوئی۔
پہلے ان کے زمانے میں ریاست کے نظم و نسق کو برطانوی ہند کے سیکڑوں پر لانے
کی کوشش شروع ہوئی۔ اس نئے نظام کا واسطہ اردو زبان تھی جو اس وقت تک
برطانوی ہند میں فارسی کی جگہ لے چکی تھی۔

خود بہادر رام زبیر سنگھ کو ہندو مذہب کے فروغ اور سنسکرت زبان اور

علوم و فنون کی اشاعت میں گہری دلچسپی تھی۔ اس مقصد کی پیش رفت میں انہوں نے کئی مندر بنوائے اور پاٹ شالے قائم کئے تھے۔ جنوں میں ان کا بنوایا ہوا گھونٹا مندر اور اس سے متعلق قائم کیا ہوا سنسکرت پاٹھ شالہ جس کو اس سلسلے میں مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی تھی، ان کی ہندو تہذیب کے احیاء کی سعی کی بلیغ شہادت ہے۔ پاٹ شالہ شری سنسکرت مہا ویدیالیہ کے نام سے موسوم تھا۔ اس پاٹ شالہ میں برہمن لڑکوں کو مفت تعلیم دی جاتی تھی اور ان کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کے علاوہ ان کے ذاتی اخراجات کی کفالت بھی حکومت کی جانب سے کی جاتی تھی۔ رگھوناتھ مندر کے اطراف کئی اور مندر بنوائے گئے ایک مرکزی حیثیت دے دی گئی تھی۔ پارٹ شالہ سے ملحق سنسکرت مطبوعات اور مخطوطات کا ایک وسیع کتب خانہ بھی قائم کیا گیا تھا، جس میں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے مخطوطات سنگھرا کر محفوظ کر دیئے گئے تھے۔ یورپ کے کچھ علماء جیسے ڈاکٹر اسٹاین اور ڈاکٹر بولہ نے اس کے مخطوطات استفادہ کیا تھا اور کہا جاتا ہے کہ کئی مخطوطات وہ ساتھ لے گئے تھے۔ رنیر سنگھ نے ایک اور کام یہ کیا تھا کہ تہوں اور کشیر کے قدیم ہندو مقامات، مندروں اور تیرتھوں کا ایک جائزہ مرتب کروایا اور ان کے تحفظ اور تنظیم کے لئے ایک وقف بھی قائم کیا تھا، جس کے قواعد و ضوابط فارسی میں آئین دھرم راتھ کے نام سے مدون کئے گئے تھے۔ رنیر سنگھ کے عہد میں انگریزی حکومت کے استحکام کے نتیجے کے طور پر، ریاست کے نظم و نسق کی طرح، اس کی علمی اور ادبی روایات کو بھی فردوں و سطوں کے دھڑے سے نکل کر، نئی راہوں پر گامزن ہونا پڑا۔ نیا تعلیمی نظام اور نئے علوم و فنون جو ہندوستان میں رائج ہونے لگے تھے، ان سے ریاست کو رو نہیں رہ سکتی تھی۔ نئے نظم و نسق کے لئے ہم نے تعلیم یافتہ عہدیداروں اور اہلکاروں

کی فردت تھی۔ اسی تقاضا کے مد نظر، مہاراجہ رنبیر سنگھ ریاست میں انگریزی تعلیم کے مدرسے قائم کرنے پر مجبور تھے۔ اس کے ساتھ، فارسی اور عربی کے مدارس بھی قائم کرنا ضروری تھا، کیونکہ دفتروں اور دربار کی زبان ابھی تک فارسی تھی لیکن ہندوستان کے اور علاقوں کی طرح جموں اور کشمیر میں بھی فارسی اب افادی زبان اور علم و ادب کا محرک وسیلہ نہیں رہی تھی اور عہد کے تقاضوں اور ضرورتوں نے اُردو کو آگے بڑھانا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ ریاست کے مدرسوں میں اُردو پڑھائی جا رہی تھی اور اس کا لٹاب عموماً وہی ہوتا۔ جو ہندوستان کے اور علاقوں میں اس وقت رایج تھا اور وہی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں اُردو عربی اور فارسی مدارس اور سکولوں میں بھی تعلیم کے ذریعہ کے طور پر رایج تھی۔ ریاست کے پڑھ لکھے لوگ سب فارسی سے واقف تھے اور ان کے لئے اُردو میں تعلیم و تدریس کا کام آسان تھا۔ مہاراجہ نے نئے علوم و فنون کو اُردو اور کچھ اور زبانوں میں منتقل کرنے کے لئے جو دارالترجمہ قائم کیا تھا وہ دراصل ایسی حالات کے تقاضے کا نتیجہ تھا۔

ڈاکٹر غلام محی الدین صدیقی نے اپنی تاریخ، کشمیر میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے پیش ہندو خاطر، اکبر اعظم کی علمی سرپرستیاں تھیں اور وہ اس کا نمونہ اپنے دربار میں پیش کرنا چاہتے تھے، لیکن ظاہر ہے کہ ان کا مذاق عام پسند اور ان کے وسائل محدود تھے۔ اس لئے جس طرح کے پڑھ لکھے لوگوں کو انہوں نے اپنے دربار میں جمع کر لیا تھا ان میں دو تین سنسکرت کے علما کے سوا باقی اوسط معیار کے تعلیم یافتہ تھے۔ اس سلسلے میں ایک بات یہ بھی اہمیت رکھتی تھی کہ اس عبوری دور میں، جب قدیم علوم و فنون کی طرف سے توجہ ہٹنے لگی تھی اور نئے علوم و فنون کمال کے

۷۷
مواقف عام نہیں تھے۔ علم و فضل کے اگلے معیار قائم نہیں رہ سکتے تھے۔ اس لئے
رنبیر سنگھ کے یہ علماء، جنہیں اکبر کے ابتاع میں بعض وقت "نورتن" سے تعبیر
کیا گیا ہے۔ علم و دانائی کی پوری آب و تاب نہیں رکھتے تھے۔ اس کے باوجود مہاراجہ
رنبیر سنگھ کی یہ کوششیں ہیں، ان کے دادا ترجمہ کی طرح ایک قابل تحسین کارنامہ
ہے۔ یہ سارے علماء اُردو سے واقف تھے اور اکثر انہوں نے اُردو میں لکھا ہے۔

ان علماء میں سے سب سے پہلے قابل ذکر دیوان کرپارام ہیں۔ جو مہاراجہ
کے دیوان اور معتقد علی تھے۔ انہیں فارسی پر اچھا عبور تھا، اور فارسی میں چار
پانچ کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ ان کی تصانیف "گلاب نامہ"، "تاریخ کشمیر"،
"ہدیۃ التوحیق"، "تحقیق تناسخ" اور "رد اسلام" ہیں۔ ان میں سب سے
زیادہ اہم "گلاب نامہ" ہے جو مہاراجہ گلاب سنگھ بانی ریاست جموں و کشمیر کے
حالات اور ان کے عہد تک کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب بڑی قیطع کے تقریباً
ڈیڑھ سو صفحات پر، نہایت اہتمام کے ساتھ سرکاری مطبع شری رنبیر پکاش
جموں سے ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کی عبارت آرائی کا انداز ہندوستان
کے فارسی النشاء پردازوں کا مرقع انداز ہے۔ یہی اسلوب دیوان کرپارام کی
دوسری تصانیف میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صوفی نے یہ بھی لکھا ہے کہ
دیوان کرپارام، مہاراجہ رنبیر سنگھ کی "نورتن" سمجھا کے ابوالفضل تھے۔
لیکن ابوالفضل کی وسعت نظر کے مقابلے میں ان کی تصانیف سے ہندو
نرمہب کی پاسداری عیاں ہے، اس لئے انہیں ابوالفضل کی "فندہ کہنہ"
زیادہ زیادہ ہے۔

"گلاب نامہ" کی تصنیف ۱۹۲۲ء بمبت (۱۳۶۵ء) ہے۔
اس تصنیف کے "اُردو کے شعراء میں سید اسماعیل حسین میر احمد ان کے فسرزد

ابو محمد بدر نے جنہیں رنبیر سنگھ کے دربار سے تعلق رہا تھا۔ قطعات تاریخ کہے
تھے۔ منیر رام پور کے دربار سے منسلک تھے۔ ان کا پہلا قطعہ ہے:
گلاب سنگھ مہاراجہ عظیم الشان

زمین ہند میں خورشید آسمانِ خرد
گلاب نامہ میں احوال ان کا ہے مرقوم
اسی سبب سے یہ نسخہ ہر بوستانِ خرد
علاوہ ان کے ہے حال اور بھی رئیسوں کا
جو تھے زمانہ پیشین میں قدردانِ خرد
خدیو عصر مہاراجہ زمانہ تھمال!
کہ جن کے عہد میں عالی ہوئی ہے شانِ خرد
پسہر مرتبہ رنبیر سنگھ عالی جاہ
کہ ان کی مدح میں ہے دُر شاں زبانِ خرد

منیر میں نے یہ تاریخ پائی سمت میں

گلاب نامہ بہار بہشت جانِ خرد
۱۹۲۲ بکرمی

ایک اور تاریخ کا شعر ہے:

گلاب اگر صحیفے کا ہے جزو نام
زبانے میں ہے یہ جوابِ رام
تیسرے قطعہ کا تاریخی شعر ہے:
گلاب نامہ ہے نام اس کتابِ زیبا
در اس میں ذکر مہاراجہ عظیم کا ہے

چوتھی تاریخ کا یہ شعر ہے :

مُشتاقِ گلاب نام رہیں اہلِ غرد کیا نام خدا دفترِ جان بخش چھپا
پانچویں قطعہ تاریخ کا آخری شعر ہے :

بھلا اس نسخہ بے مثل کی ہم قدر کیا جانیں

رہمسواں کے ہے قابلِ تذکرہ نامی رئیسوں کا

ایک چھٹی تاریخ کے تین مصرعے یہ ہیں :

پچھپی نور کی یہ کتاب مُصنّف ہوئی عینکِ دیدہ پاک بیناں

یہ زیبا ہے تاریخ مسندِ لٹینداں

ممنین کے فرزند اور شاگرد ابو محمد بدر نے بھی "گلابِ نادر" کے لئے تاریخ لکھی تھی،
جس کے دو شعر یہ ہیں :

واہ کیا تالیف کی دیوانِ کرپا رام نے

ہر ورقِ خوش آئند : خوش جوہرِ پنجاب ہے

بدر نے تاریخ چھپنے کی یہ سمت یوں کی

تشریح : اخبارِ بلادِ کشورِ پنجاب ہے

کرپا رام کی دوسری تصنیف "ہدیتہ التّیقین" کے لئے تاریخ کشمیری کے ایک مشاعر
پنڈت شوناتھ کو ل منتظر نے کہی تھی :

واہ تحقیقِ تہِ تاریخ کیا چھپی تیرگی کے درجس نے جہل کی

کوئی کیا تاریخ اس کی لکھ سکے اتنی غیبی سی جب خود یہ کہے

دیوانِ کرپا رام کے علاوہ دوسرے مساجدِ علم میں ڈاکٹر بخشِ رام، پنڈت گنیش
کو ل شاستری، پنڈت صاحبِ رام، مولوی فلام حسین طالب لکھنوی، مولوی عبداللہ
مجتہد العصر، حکیم ولی اللہ شاہ لکھنوی، حکیم نور الدین قادریانی اور بابا نصر اللہ عیسائی

پر نورتن کی بہرست کمٹن ہو جاتی ہے۔

اس بہرست پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے اس بات کا اہتمام کیا تھا کہ اس حلقہ میں مختلف مذاہب اور نقطہ خیال کے لوگ اکٹھے کر لئے جائیں۔ پنڈت گنیش کول اور پنڈت صاحب رام - سنسکرت کے یقیناً اچھے عالم تھے۔ چنانچہ سنسکرت کے یورپی عالم سٹائین نے پنڈت صاحب رام کو گزشتہ چند سالوں میں سنسکرت کا سب سے بلند عالم بتایا ہے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ان کے زور جوں کشمیر میں تیسرے تھوں کے جائزے اور ان کی ایک توضیحی بہرست تیار کرنے کی خدمت کی تھی۔ حکیم نور الدین قادیاہی، میرزا غلام احمد قادیاہی کے خلیفہ تھے اور میرزا صاحب کے انتقال کے بعد وہی ان کے جانشین اور امام مقرر ہوئے۔ انہوں نے اپنی خوشنویس اردو میں لکھی ہے اور اس میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کی بہت سی سرائی کی ہے۔ بابو نصر اللہ عیسائی نے کشمیر کے بارے میں ایک انگریزی کتاب کا انگریزی ترجمہ کیا تھا جس کی کچھ تفصیل آگے مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دارالترجمہ کے سلسلے میں آ رہی ہے۔

”بہار گلشن کشمیر“ میں کشمیر کے پنڈت شعراء کا اردو میں ضخیم تذکرہ ہے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے نورتن کے جو نام دیئے ہیں، ان میں ڈاکٹر صفی سے اختلاف ہے۔ وہ نام یہ ہیں:

۱۔ دیوان کمر پارام ۲۔ ذر بر پڑوں ۳۔ پنڈت بہانند جودر

۴۔ پنڈت رام جودر ۵۔ دیوان بدوی ناتھ مدن ۶۔ پنڈت صاحب

جیو (صاحب رام) ۷۔ پنڈت طیب رام کول اور خواجہ ثناء اللہ

اس حلقہ کے مناظرہ نگار کے روزنامہ کو مہاراجہ کی صدارت میں منعقد ہوئے تھے جن میں

ان اصحاب کے علاوہ دوسرے پنڈت اور مولوی بھی حصہ لیتے تھے۔ مسلمان علماء میں

مولانا قندر علی پانی پتی بھی ان مناظروں میں شرکت کرتے اور اہم مذہبی مسائل جیسے تقدیر، تدبیر، تناسخ، جبر و اختیار وغیرہ پر مباحث ہوتے اور اس طرح مہاراجہ کی معلومات میں اضافہ کی ایک صورت نکلتی آتی۔ دیوان کو پارام کا رسالہ غالباً انہیں مباحث کا نتیجہ تھا۔

اکبر کے دربار سے مماثلت کی تکمیل کے سلسلے میں، مہاراجہ رنبیر سنگھ کی اس خواہش کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ جب شمس العلماء آزاد کی دربار اکبری شیل ہو گئی، تو انہوں نے آزاد کو دُگرہ خاندان کی تاریخ لکھنے کی دعوت دی تھی۔ اور اس کے شایان شاں صلہ کی پیش کش بھی کی تھی۔ لیکن آزاد نے اس پیش کش کو قبول نہیں کیا۔ تاہم یہ واقعہ خود اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے۔ اور اگر آزاد اس خدمت کے لئے تیار ہو جاتے تو یقیناً دُگرہ خاندان کی ایک یادگار تاریخ ہماری دسترس میں ہوتی اور دربار اکبری کی مماثلت میں، یہ دربار رنبیری کی تاریخ بنتی۔

رنبیر سنگھ کے زمانے میں سلطنت کے استحکام نے فطرتاً ان کے دل میں اور باتوں کے ساتھ ساتھ دربار کی شان و شوکت اور رعبدادب کی روایت قائم کرنے کا خیال پیدا کیا اور اس مقصد کے لئے انہوں نے ہندوستان سے نقیبوں کو بلوا کر دربار میں ملازم رکھا۔ یہ نقیب دہلی سے آئے تھے اور مغلیہ دربار کے روایات سے واقف تھے۔ چنانچہ جب دربار منعقد ہوتا تو مہاراجہ کی آمد پر، مغلیہ درباروں کے انداز میں اس کا اعلان کرتے اور اہل دربار کو متنبہ کرتے تھے۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کی یہ ساری دلچسپیاں، ریاست میں اُردو کا ذوق پیدا کرنے کے سلسلے میں اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ مہم بالشان کارنامہ ان کا قائم کیا ہوا دارالترجمہ یا محکمہ تالیف و ترجمہ تھا۔ جو مغربی علوم کو ریاست کی زبانوں اور خاص طور پر اُردو میں منتقل کرنے کے مقصد سے قائم کیا گیا تھا۔

کشمیر کے مشہور سخن پرداز، قیصر قلندر نے اپنے ایک مضمون "کشمیر میں اُردو" (شاعر بھٹی ۱۹۶۱ء) میں اس کی وضاحت کی ہے کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد حکومت سے آج تک اُردو زبان سکولوں میں تعلیم و تفہیم کا ذریعہ رہی ہے۔ اور ریاست کے طالبانِ علم کی دسترس میں نئے علوم پہنچانے کے لئے، محکمہ تراجم کی جانب سے اُردو میں بہت سی علمی کتابوں کے ترجمہ کئے گئے۔ محکمہ تراجم مہاراجہ رنبیر گج کے نشیبی علاقے، جہلم کے کنارے اس عمارت میں قائم کیا گیا تھا، جہاں اب ہسپتال ہے۔ مہاراجہ کی سنسکرت سے دلچسپی نے اس کام کو زیادہ وسعت بخش دی تھی۔ اس کی پیش رفت میں کچھ نئے مغربی علوم کی کتابوں کے ترجمے سنسکرت میں بھی کرائے گئے تھے۔ سنسکرت اور اُردو کے علاوہ چند کتابوں کے ترجمے میں ڈوگری میں بھی کئے گئے۔ لیکن کشمیر کی طرف توجہ نہیں ہوئی۔ اس ادارہ کے کام کی ساری تفصیلات اب ہماری دسترس میں نہیں ہیں۔ لیکن اس کی باقیات الصالحات اور نظم و نسق کی ایک دوپڑ میں جو ہل سکی ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ترجمے ایک سے زیادہ زبانوں میں کئے جاتے تھے اور بعض کتابوں کے ترجمے بیک وقت دو یا تین زبانوں میں بھی کئے گئے ہیں۔ زیادہ ترجمے اُردو میں ہوئے۔

دارالترجمہ کے ناظم پنڈت گوہند کول تھے اور مفتی رشید الدین کی بہم پہنچائی ہوئی معلومات کی بناء پر مولانا محمد عزیز الدین مفتی اعظم اس کے صدر تھے۔ ان کے فرزند مفتی اعظم محمد شریف الدین بھی مترجمین میں شامل تھے۔ انہوں نے "اخوان الصفا" کا ترجمہ فارسی میں کیا تھا اور ان کی مدد سے ایک پنڈت نے اس کا ترجمہ سنسکرت میں بھی کیا۔ کچھ سنسکرت کتابوں کا ترجمہ عربی اور فارسی میں کرایا گیا تھا۔ اس ادارہ کے کام کے بارے میں پنڈت اننت رام شاستری کے ایک مضمون "ریاست میں سنسکرت زبان کا ارتقاء" سے روشنی پڑتی ہے۔ جو

شمارہ ۱۶۶۲ء میں شائع ہوا۔ دہرکتے ہیں :

سازمان میں بوتھیمی کتب تیار کی گئیں۔ ان کی فہرست بہت
 بڑی ہے، مختلف مضامین مثلاً علم طبقات الارض، کا ترجمہ انگریزی
 سے ہندی میں، جیوگرافیا اور فزیکس کا انگریزی سے ہندی میں
 جامع العلوم کا عربی سے فارسی میں، تاریخ فتح آسام کا فارسی ہندی
 میں، تاریخ کشمیر، تاریخ روم کا انگریزی سے ہندی میں، تاریخ قادریہ
 کا ترجمہ فارسی سے ہندی میں اور جرن کھنڈ کا سنسکرت سے
 ہندی میں ترجمہ کروایا گیا۔

اننت رام شاستری کا یہ مضمون ظاہر ہے کہ دارالترجمہ کے کام کے ایک خاص حصہ
 پہلو کے بارے میں ہے اور وہ ابتدائی دور کے لکھنے والوں کی طرف، اردو کو بھی ہندی
 سے موسوم کرتے ہیں۔ شاستری نے اس کا بھی ذکر کیا ہے کہ ترجمہ کی ہوئی کتابوں کو
 چھپوانے کے لئے چھاپہ خانہ بھی قائم کیا گیا تھا۔ جو ریاست میں پہلا چھاپہ خانہ تھا۔
 یہ چھاپہ خانہ دریا ولاس پریس کے نام سے موسوم تھا۔ اور اس میں اردو، فارسی
 کتابیں اور ناگری رسم خط کی کتابیں چھاپی جاتی تھیں۔

رنبیر سنگھ کے جانشین، ہزاراجہ پرتاپ سنگھ کو علمی امور سے دلچسپی نہیں
 تھی، اس لئے کام کا یہ سلسلہ مسدود ہو گیا اور مخطوطات کا بچا کچھا ذخیرہ جو سری نگر
 میں محکمہ ریسرچ کے کتب خانے میں پہنچا۔ اس کے تحفظ اور اس کی تہذیب میں
 محکمہ کے سابق ناظم صاحب زادہ حسن شاہ نے دلچسپی لی اور اس کے اردو مخطوطات کی
 فہرست تیار کرنے اور تفصیلات جمع کرنے میں، میں نے بھی ہاتھ بٹایا۔ یہ ذخیرہ
 "رنبیر کلکشن" کے نام سے موسوم ہے اور اس میں کافی تعداد میں اردو مخطوطات
 موجود ہیں۔ یہ ساری کتابیں زیادہ تر انگریزی سے ترجمہ ہوئی ہیں۔ ان میں علم

طَب سے متعلق ترجموں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ صہبہ میٹریا ٹریکا۔ ایسیا لوجی^{۸۴}
علم تشریح، ادویہ، علم قابلہ اور امراض اطفال پر کئی مخطوطے ہیں۔ طَب کے علاوہ
ایک دو ترجمے علم حرب اور فوجی علوم سے متعلق ہیں، تاریخ اور سوانح پر بھی ایک
دو مخطوطات موجود ہیں۔ ایک رسالہ منطق پر اور کارآمد فنون میں کاغذ سازی اور
باد چڑھی گری پر بھی رسالوں کے ترجمے ہوئے تھے۔

میٹریا ٹریکا پر تین مخطوطات محفوظ ہیں، جو انگریزی سے اردو میں ترجمہ
کئے گئے ہیں۔ لیکن اصل میں کتابوں کے نام کا ذکر نہیں ہے مخطوطہ ۱۹۱ میں عرفیہ اس
کا ذکر ملتا ہے کہ یہ انگریزی کا ترجمہ ہے مخطوطہ ۲۱۳ نہایت ضخیم اور تین جلدوں میں
ہے۔ ۱۷۱ کے علاوہ ایک اور مخطوطہ ۱۹ بھی ہے۔ یہ تینوں ترجمے سلیس اور عام فہم
زبان میں ہیں اور اردو اور ناگری دونوں رسم خط میں لکھے گئے ہیں۔ انگریزی اصطلاحات
عموماً جو کی توں برقرار رکھی گئی ہیں جیسے سپرٹ، فنل وغیرہ۔ ان کی شرح اردو
میں کر دی گئی ہے۔ جہاں طَب یونانی کی اصطلاحیں مل سکیں وہ بھی دے دی
گئی ہیں مثلاً مخطوطہ ۱۹۱ سے چند مثالیں یہاں پیش ہیں۔

بڑائی، ٹیوریشن : اس لفظ کے معنی سفوف کرنے کے ہیں۔

گریڈیشن : جملہ اشیاء از قسم دعوات کے دلنے اس ترکیب سے
بناتے ہیں کہ دلنے بھی بنتے جائیں۔

اسی طرح سفٹنگ، ملٹری شن، خاسفارک ایڈ، پوٹاشیم وغیرہ کی بھی شرح
کر دی گئی ہے۔ انگریزی اصطلاحوں کو اردو حروف میں لکھتے ہوئے ایک اچھا طریقہ
یہ اختیار کیا گیا ہے کہ اس کا آٹا "رکمنی" انداز پر لکھا گیا ہے۔ مثلاً ڈی کاک شن،
سبلی من شن، لکسی وی شن وغیرہ۔ انگریزی کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں لاطینی
اصطلاحیں بھی درج کر دی گئی ہیں مثلاً، کارگل، "کارگا"۔ بعض شکل یونانی

طبی اور انگریزی اصطلاحوں کے معنی ہندی میں بھی لکھ دیئے گئے ہیں۔ مخطوط ۱۹۰ میں طب کے موضوع پر ہے جس کے آغاز میں موضوع کے بارے میں تفصیلات درج کر دی گئی ہیں۔ انگریزی اصطلاحوں کے ساتھ ساتھ اردو میں جو اصطلاحیں مروج ہیں، وہ بھی لکھ دی گئی ہیں۔ مثلاً تیزاب، سونٹھ، قتیل، کافور، مثلث وغیرہ، جہاں انگریزی اوزان اور پیمانے لکھے ہیں، ان کے مقابل ہندوستانی اوزان بھی لکھ دیئے گئے ہیں۔

مخطوط ۴۱۳ کے آغاز کی حسب ذیل عبارت سے، ان ترجموں کی خصوصیات پر روشنی پڑ سکتی ہے:

”اس گرنٹھ کا نام ہے میٹریا مڈیکا۔ اس فن کا نام ہے جس سے نائیدہ اور استعمال دوا کا معلوم ہوتا ہے اور جب تک اس فن سے واقفیت کا حقد نہ ہو، تب تک بیماری کا علاج نہیں کیا جاتا ہے۔ اس واسطے تشریح الامراض سے پیشتر مدارس طبی میں اس فن کو سکھاتے ہیں۔ لیکن فقط دوا کی خاصیت، قایدہ اور استعمال کا جاننا کافی نہیں ہے۔ ان کے ملانے اور وزن کرنے کی ترکیب سے بھی واقفیت پیدا کرنی بس ضروری ہے۔“

مخطوط ۱۹۱ سے بھی ایک اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے۔ اس کی عبارت میں ہندی کا بھی استعمال ہوا ہے۔

”تیسری قسم گوند کی اکیٹیا روے کا نامک ہے کہ جس کو سنکرت میں گرسند کہتے ہیں اور ہندوستان میں جو وہ بول کا درکش واولیہ کر کے ہوتا ہے اس کے گوند کی خاصیت بھی اسی طرح ہے۔“

۱۰۔ "نوی" (۴۵۸) پر ایک مخطوط محفوظ ہے، جو دیوناگری رسم خط میں لکھا گیا ہے۔ ایک اور مخطوط "علم الامراض" پر اردو اور دیوناگری دونوں رسم خط میں لکھا ہوا ہے۔ زبان علم طور پر ایک ہی ہے، صرف کہیں کہیں الفاظ بدلے ہوئے ہیں۔ علم طب کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"طب وہ علم ہے جس سے انسان (آدمی) کی تندرستی اور بیماری کا حال دریافت ہوتا ہے اور اس کے قاعدوں پر عمل کرنے سے صحت کا قیام اور مرض کا زوال ہو سکتا ہے۔"

تعریف تشریح کی -- تشریح وہ علم ہے جس کے ذریعہ سے اعضا کی ساخت، شکل اور مقدار، عدد اور وضع دریافت کی جاتی ہے۔
تعریف، فریالوجی: فریالوجی اس علم کا نام ہے، جس میں انسان کے زمانے کی صحت کے احوال، مثل پردر شس جسم اور خرد و رطوبات اور دوران خون اور حرکت تنفس اور کیفیت قوت باضمہ، اور جاذبہ اور حقیقت تولد انسان اور پیدائش ہر عضو بدن اور ان کے افعال وغیرہ بیان کئے جاتے ہیں۔"

۱۱۔ ترجمہ شرح اسباب "دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں مہام امراض کی تفصیل ہے اور دوسری جلد میں امراض کبیر جیسے سوا مزاج جگر، ضعف الکبد وغیرہ کی تفصیلات شامل ہیں۔ اس کے مترجم حکیم فدا محمد خاں ہیں۔ مترجم نے ایک طویل دیباچہ قلمبند کیا ہے، جس میں اپنے کچھ حالات اور مترجم کے بارے میں تفصیلات بیان کی ہیں۔ دیباچہ کا اقتباس حسب ذیل ہے:

"اما بعد احقر العباد ادر الصمد فدا محمد ابن اشرف الحکماء حکیم محمد یوسف خاں مرحوم ابن زبده الحکماء بطلمیوس دوران حکیم

غلام حسن خاں مغفور شاہ جہاں آبادی بخود مت شالائق و ماہران
 علم طب کے التماس کرتا ہے کہ کتاب شرح اسباب علامات بحکم
 نجیب الدین سمرقندی کی شرح ہے اور شارح اس کے جالینوس
 وقت فیثاغورث ثانی حکیم نفیس الدین کرمانی ہیں۔ یہ شرح
 غایت اشتہار سے محتاج تعریف و توصیف کی نہیں ہے۔ مگر چونکہ
 زبان عربی میں ہے، اکثر عوام اس کے فوائد مغذیہ سے محروم تھے۔ لہذا
 حسب الحکم ہندوگان عالی مقامی، حضور نفیس گنجور، داد گستر
 عالی گوہر، رعیت پرور، قدر دان علم و ہنر، برہمیں رتبہ،
 کیوان منزلت، نیتر اعظم آسمان عظمت، ماہ منیر سپہر رفعت
 محدن جود الاحسان، فیاض زمان، معالی نشان، راجہ راجگان،
 بہاراج دھیراج، راجیش مری بہاراجہ رنبیر سنگھ بہادر دالی ملک
 جوں و کشیر کہ سناوت اور بخشش اون کی شہرہ آفاق ہے اور
 سب سے زیادہ اون کو شوق ترقی علم و کمالات ہے اور تین صاحبزاد
 والا تبار اگر دوں وقار، حضور لامع النور، چوں موالیہ ثلاثہ عام
 اجسام فردری الوجود و چوں ہر سہ ارواح بدن انسان مطلوب
 مقصود۔۔۔۔۔

اگے بہاراج کے تینوں فرزندوں کی تفصیل لکھی ہے :

‘سب سے بڑے صاحبزادے، سری میاں صاحب میاں
 پرتاپ سنگھ ولی عہد ریاست اور دوسرے صاحبزادے۔۔۔۔
 میاں صاحب میاں رام سنگھ اور تیسرے صاحبزادے۔۔ میاں
 صاحب میاں امر سنگھ دام اقبالہم و حشمتہم۔۔۔۔۔’

جیم فدا محمد خاں یہ بھی لکھتے ہیں کہ میں پہلے دیوان جوالا سہلے کی خدمت میں حاضر ہوا، جن کی سفارش سے دیوان کرپارام نے مجھے سرکاری ملازم کر دیا۔ یہ ترجمہ ۱۲۸۷ھ میں جموں میں مکمل ہوا۔

۱۰ اسباب الامراض " (۱۹۵۷ء و ۱۹۶۷ء) دیوناگری اور اردو دونوں رسم خط میں لکھا گیا ہے۔ ابتداء میں امراض صدمات اور ان کی قسموں کی تفصیل فارسی میں لکھی ہے۔ اور ماخذوں کا تذکرہ کیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تالیف ہے۔ امراض نزلہ و زکام کی تشریح سے ایک اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے :

آتش یا گرمی حمام یا گرمی سوکھنے چیزوں گرم، مثل مشک و عنبر و جندہ اور زعفران یا مالش کی جاوے سرکوں ساتھ ساتھ کسی گرم پیز کے تویہ علیہ ہوتا ہے فقط۔

"علامات : علامت اس کی ظاہر ہونا سرخی آنکھوں کی خارش اور سوزش ہونا بینی کو اور زیادہ ہونا مرض کا باعث گرمی تب سے اور ہونا پیاس کا زیادہ"

۱۱ اسباب الامراض والعلاجات " (۱۹۸۷ء) کا دست نامہ نے اردو اور دیوناگری دونوں میں ترجمہ کیا ہے۔ زبان اردو، ہندی اور پوٹھاری (پوٹھاری) کا آمیزہ ہے۔ کتاب کی ابتداء میں ایک دیباچہ دیوناگری میں لکھا ہے، جس میں مترجم نے اپنے کچھ حالات بھی لکھ دیئے ہیں۔ اقتباس ہے :

"ہم لاجہ جموں و کشمیر دی آگیا تے میں نے دست رائے برہمن بیٹے شری لالہ بھولانا تھ دادے دلش نور محل نگر باشی نے چار کتابوں یونانی چکتیا پوٹھاری بھاشا میں ایک جگہ اس پستک دیکھے کارنگ ناس سوت ۱۹۲۵ تے پر آرمہد کر کے جیٹھ ماس

۱۹۲۶ اس آٹاڑھ ماس کے دسے پورن کیا۔ . . .

کتاب حمد و ثنا سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد مترجم نے کتاب کی تالیف کا حال لکھا ہے اور مہاراجہ رنبیر سنگھ کی مدح سرائی میں حکیم فدا محمد خان سے بازی لے جانے کی کوشش کی ہے۔ لکھتے ہیں :

"اما بعد، حقیر پُر تعصیر بخد مت ارباب فرست واصحاب کیا
گزارش پرداز ہے کہ اس زبان سعادت نشان کی از بسک طبع
اقدس بندگان دارا زمان نثر یا جاہ کیواں مکاں در یکتا عظمت
بختیاری امدۃ التاج ربہت و کامکاری، بہار گلشن عدل و
انصاف، آب و تاب چمن بدال و الطاف، حذیو دریا دل، عادل
بازل، سری مہاراجہ صاحب بہادر، ابدان اجلاہم و اقبالہم رات
اور دن ترقی علوم غریبہ و فنون عجیبہ در کافہ برآیا
و خشنودی رعایا میں مصروف ہے، لاجرم آجکل اس ریاست میں
وہ ترقی اور افزائش علم و ہنر ہوئی ہے کہ کبھی زبان سلف میں
بدیدہ خیال نہ آئی تھی۔ چنانچہ بنظر افادہ عام نسبت اس مور
ضعیف کے ارشاد فرمایا کہ اگرچہ اسباب و علامات امراض بدنی
کی تشریح کتب متقدمین وغیرہ مندرج ہے۔ مگر چونکہ اکثر
عبارات اون کی عربی و فارسی ہیں۔ مبتدی کی سمجھ میں آنا، اون
عبارات کا ذرا آسان نہیں۔ اگر کوئی رسالہ صرف اس باب میں
بہ زبان اردو تالیف ہو تو البتہ خالی از لطف نہ ہوگا۔ لہذا اس
پیچ مدان نے بحکم المامور معذور کتب مثل قانون و تشریح اسباب
و نفیس و سدیدی و طب اکبر وغیرہ سے تالیف رسالہ ہذا کر کے

”اسباب الامراض والعلاجات“ نام رکھا۔

”علاج الامراض“ کا ترجمہ وسنت رائے (بنت رائے) نے پڑھائی
میں اور فضل الدین نے اُردو میں کیا۔ اور دونوں ترجمے ایک ساتھ
سطر بہ سطر لکھے گئے ہیں۔ ترجمہ ۱۹۲۵ء۔ ۱۹۲۶ء بکرمی میں ہوا۔ رسالہ
کا آغاز ”ادبھار اور بخاروں کے بیاہ سے ہوتا ہے۔ اقتباس حسب
ذیل ہے :

”— اون امراض میں اکثر میدانی زہر بدن کے اندر سرایت کر جاتا
ہے اور وہ یہ بیماریاں ہیں۔ اول دیداولا یعنی چیچک، دوم روپی
اولا یعنی خُسرہ سیوم اسکارلٹ فیور یعنی سُرخ بخار، چہارم
ایلی سلیس یعنی حمزہ“

دیباچہ میں یہ بھی بتایا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف و تالیف اور ترجمہ تصنیف اور
طباعت میں ”درجہ اول کے نیٹو ڈاکٹر مرزا امیر بیگ“ سے بڑی مدد ملی ہے۔
طب میں ان کی مہارت کی بھی تعریف کی گئی ہے اور لکھا ہے کہ اس کتاب میں
جتنے یونانی علاج شامل ہیں۔ وہ حکیم فضل الدین کے مجموعہ ہیں۔ تالیف میں جن
کتابوں سے مدد لی گئی ہے ان کی تفصیل بھی درج ہے۔ سی پی چارلس ایلڈ ڈپٹی
کمشنر ضلع لدھیانہ اور میجر سر ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ کی امداد اور دلچسپی کا بھی
اعتراف کیا گیا ہے۔

امراض کی تفصیل، تشخیص طریقوں کو صاف اور سلیس زبان میں لکھا ہے
اصطلاحیں عربی اور فارسی کی جو اُردو میں رائج ہیں، انہیں استعمال کیا ہے اور کہیں
کہیں انگریزی اصطلاحوں کو بھی برقرار رکھا ہے۔ بعض الفاظ میں املا کا اختلاف
ہے مثلاً ”چوہتی“ (چوہتی) عطی کہ (حتی کہ) ”چہڑ آوتا ہے“ (چڑھ آتا ہے) اس کے

علاوہ کہیں کہیں مقامی الفاظ بھی برتے گئے ہیں، جیسا کہ ذیل کے اقتباس سے ظاہر ہوگا :

"ان دونوں کے لٹکنے کے تیسرے روز ایک لطوبت مثال پانی کے جس کو جس کو شیرم بولتے ہیں بھر جاتی ہے۔ یہ رطوبت بہری والہ طب انگریزی میں ویسی کل کہلاتے ہیں۔ بڑا ان دونوں کی خوب سخت اور متفرق ہوتی ہیں۔ سرے ان دونوں کے ہمیشہ دیئے ہوئے ہوتے ہیں اور یہی خاص کر ان دونوں کی شناخت ہے۔"

"ترجمہ تشریح البوق" (۱۹۵۸ء) اردو اور دیوناگری دونوں رسم خط میں ہے۔ اس کے مترجم بھی لالہ دست رے (بنت رائے) ہیں۔ ان کی زبان میں گنگولک ہے۔ آغاز کرتے ہیں :

"بعد حمد و سپاس عظیم علی الاطلاق واضح ہو کہ یہ کتاب بیان تشریحات میں ہے اور تشریح عبارت ہے۔ اظہار شئے اور کشف کرنے حقیقت اس شئے کی تمامہ جو اس میں کچھ شبہ ہوئے جیسا کہ تشریح ہے کہ اول لطفہ بنایا خون بستہ پھر بنایا ادس کو پارہ گوشت پھر ادس میں بنائیں استخوان اور پہنایا ادن پر گوشت اور پوست اور بخشی صورت۔ نقطہ"

مخطوط کے کاتب رام چندر رینہ ہیں اور اس کے اختتام کا سنہ ۱۲۸۵ھ ہے۔ ترقیمہ کی عبارت حسب ذیل ہے :

"بہ اتمام رسید و بہ انجام انجلید رسالہ ہذا فی التشریح بک اللان حسب الایمانی سید احمد شاہ کہ از صاحب مکملے اجلہ و اکابر روزگار است تحریر بتاریخ دویم ماہ مبارک ہک

سمت ۱۹۲۸ء مطابق ۱۲۸۵ ہجری مقدسہ راقم را مچند ررینہ۔۔۔
 "ہدایت پیدائش بچہ" اور "امراض البصیان" پر ایک ایک مخطوطہ رنمبر
 کلکشن میں محفوظ ہے۔ ان کے مترجمین یا مترجمین کا پتہ نہیں چلتا۔ غالباً یہ بھی
 انگریزی سے ترجمہ کئے گئے ہیں۔ "ہدایت پیدائش بچہ" ناقص آلاخر ہے۔ اس
 کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

"فصل اول۔۔۔ جاننا چاہیے کہ جب لڑکا پیدا ہوا تو اس کے
 بدن کو ہولے سرد سے محفوظ رکھیں۔ بعدہ نان کی آنت کہ جس
 کو نال بھی کہتے ہیں اور وہ شمشہ یعنی آنول سے لگی ہوتی ہے اس
 کو انگوٹھے اور سبابہ کی انگلی سے پکڑ کر بچے کے پیٹ سے آنول کی طرف
 نرمی دلائی اچھی طرح دوہیں تا خلط و ریح وغیرہ سے جو کچھ
 کہ اس میں ہوتا ہے، خوب صاف ہو جائے۔ پھر سوت کے نرم
 دھانگے کو کسی مناسب روغن میں چرب کر کے ناف کی انٹری کو
 دو جگہ سے بخوبی باندیں۔ ایک ناف کے نزدیک دوسرا اور اس
 سے ایک بالشت کے فاصلے پر۔۔۔۔۔"

"امراض البصیان" (۲۳۶) اردو اور ناگوری دونوں رسم خط میں لکھا گیا
 ہے۔ اصطلاحیں اردو، فارسی، ہندی اور انگریزی سب استعمال کی گئی ہیں۔
 بعض اردو لفظوں کے مترادف ہندی لفظ بھی لکھے گئے ہیں۔ جیسے "درت"
 استری، بیان، درن، رسالہ چھ مقالوں اور چار حصوں پر منقسم ہے۔ زبان
 سلیس اور صاف ہے۔ بچوں کی ہڈی ٹوٹنے اور اس کے علاج کی تفصیل لکھی

ہے

"ہڈی ٹوٹ جانا۔ اصطلاح میں اس کو فرا کچر بولتے ہیں۔ بچوں

۹۳
 کی ہڈی مثل جوانوں کے ٹوٹ کر دو ٹکڑے نہیں ہو جاتی بلکہ خم کھا کر
 آدھی جڑجڑ جاتی ہے اور آدھی بل کھا جاتی ہے۔ علاج اس کا
 معمولی طور پر کریں اور اسپلنٹ کو دو یا تین ہفتے باندھ رکھیں
 مگر چمڑے یا موٹے کاغذ کا اسپلنٹ بہ نسبت لکڑی کے بہتر ہے۔
 ”دستورِ قابلہ“ (۱۹۴۷ء) بھی اردو اور دیوناگری دونوں میں ہے۔ ابتداء
 میں ناگری خط میں فصلوں کی فہرست درج ہے۔ اصل متن کا آغاز اس طرح
 ہوتا ہے:

مقدمہ : پہلی فصل - پلوس کی ہڈیوں کے بیان میں
 دافع ہو کر کوکھ اور چوڑ اور پیرو اور قطن اور دُمچی کی ہڈیوں سے
 ریل کر ایک شکل مجموعی سلفی کے مانند بنتی ہے۔ اس کو انگریزی
 میں پلوس بولتے ہیں۔

پلوس کی تشریح - پلوس چار ہڈیاں ہیں۔ دو ہڈیاں کولے کی جس
 کو رس انانیتا کہتے ہیں اور تیسری ہڈی قطن جس کو انگریزی
 میں سیکرم بولتے ہیں اور چوتھی ہڈی دُمچی کی جس کو عربی میں
 عُصَص اور فارسی میں استخوان، شصت گاہ اور انگریزی
 میں کالیکٹس کہتے ہیں۔“

یہ مخطوط ۲۰۴ اوراق کا ہے :

مدرسہ طبیبہ کے طلباء کے فائڈے کے لئے ایک رسالہ ہدایت الاطباء کے
 نام سے مرتب کیا گیا تھا۔ یہ رسالہ ایک تقریر پر مشتمل ہے جو غالباً کسی انگریز
 عہدہ دار نے مدرسہ طبیبہ کے طلباء کے لئے ان کی تعلیم کے اختتام کے موقع پر کی
 تھی۔ تقریر میں پیشہ طلب کی اہمیت اور نزاکت اور نوجوانوں کو کسی بڑے وفاہی

مفسد کے پیش نظر رکھنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ اس کے مطالب مفید اور عبارت دلچسپ ہے۔ ایک اقتباس درج ذیل ہے :

” ہم زاہر ریاکار اور حاکم ظالم کی بہ نسبت طیب نامعتبر کا منہ دیکھنا زیادہ ناپسند کرتے ہیں۔ اس لئے کہ زاہر ریاکار اپنے ظاہر کو پاکی کے لباس سے آلاستہ رکھتا ہے اور اوس کے روبرو ہر وقت دروازہ توبہ کا کھلا رہتا ہے۔ لیکن طیب کا کام بذاتِ خود اس قدر مخفی ہے کہ اوس کے ہم پیشہ لوگوں کو بہت کم پتہ لگتا ہے کہ اوس نے اپنی دیانت کو کیونکر نیا بنا۔ اور عوام بہ سبب نہ ہونے کسی معتبر پہچان کے جس کے ذریعے سے اوس کے کام کی کجی دریافت کر لیں۔ اپنی کسی خیالی دلیل پر اکثر اوس کی عزت کرتے ہیں۔ یہ اس لحاظ کہ وہ اون کو ظاہر میں لائق معلوم ہوتا ہے اور اوس کی گفتگو شناسی سے ہے یا کسی شخص کو اتفاقاً ایسے مرض سے آرام ملتا ہے کہ جب بعض اطباء دست بردار ہوئے ہوں۔۔۔۔۔“

طب کے علاوہ دوسرے افادی علوم میں ایک رسالہ ”مورچہ بندی“ پر ہے جو کمی انگریزی رسالے کا ترجمہ ہے۔ اس کے مترجم مہاراجہ رنیر سنگھ کے دربار کے رکن پنڈت بخش رام ہیں۔ یہ رسالہ ۱۴۱ اوراق پر مشتمل ہے اور اس کی تکمیل کی تاریخ ۲۶ سادون ۱۹۲۵ء کی ہے۔ رسالے کے آغاز میں اصطلاحوں کی تشریح کی گئی ہے اور مسائل کو سمجھایا گیا ہے۔ مثلاً :

۱۔ کل عمارت حفاظت سے مطلب یہ ہے کہ تقوڑی فوج ایسی مفید جگہ پر رکھی جائے کہ وہ بہت سی فوج کا مقابلہ کر سکے۔“

۲۔ صلابت کو سنجہ۔ ایک لمبی اڑکھتے ہیں، جس سے پیچھے کے آدمیوں

کی حفاظت بر آسانی ہو سکے یا اس سے دشمن دور رکھے اور یہ
 دو طرح کی ہے۔ ایک قدرتی دوسری تیار کی ہوئی۔
 رسالہ کے سرنامہ پر یہ عبارت درج ہے۔۔۔۔۔ "یہ کتاب ترجمہ کردہ پنڈت بخشی رام
 جی از کتاب انجیری انگریزی"

فوجی فنون سے متعلق ایک اور رسالہ "علم تیر اندازی" ہے جسے غلام غوث
 خان نے تصنیف کیا ہے۔ غلام غوث خان جنوں کے رہنے والے تھے۔ علم تیر اندازی
 وہ غالباً ولی عہد ریاست پرتاپ سنگھ کو سکھایا کرتے تھے اور مہاراجہ رنبیر سنگھ
 کی فرمائش پر انہوں نے یہ رسالہ لکھا تھا۔ چنانچہ ابتداء میں پرتاپ سنگھ کی تعریف
 انہوں نے جس طرح کی ہے اس سے ہی اندازہ ہوتا ہے۔

"در صفت خورشید آسمان شجاعت و سخاوت ماہ منبر سپہر
 رفعت و عدالت، سری میاں صاحب پرتاپ سنگھ جیو صاحب
 بہادر دام اقبالہ و اجلالہ، می گوید"

ریاست کے حکمران خاندان میں "میاں" کا لفظ راجکار اور خاص طور پر ولی عہد
 کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ غلام غوث خان نے مہاراجہ رنبیر سنگھ کی تعریف میں
 ایک نظم بھی لکھی ہے۔ حمد، نعت، مہاراجہ رنبیر سنگھ اور میاں پرتاپ سنگھ کی
 توصیف کے بعد لکھا ہے کہ مہاراجہ نے ان سے علم تیر اندازی پر ایک رسالہ لکھنے
 کی فرمائش کی تھی، جس کے اتباع میں یہ رسالہ مرتب کیا گیا ہے۔ رسالہ پچیس
 کلیات پر مشتمل ہے اور آغاز حضرت پیغمبر اسلام کی سنت کے اس واقعے سے
 ہوتا ہے کہ آپ منبر پر اکثر اوقات یہ آیت تلاوت فرماتے تھے۔ "و اعدوا
 لہم ما استطعتم من قوت۔۔۔" اور یہ بھی فرمایا کرتے تھے۔ "الآن
 قوت المرح۔" اس لئے علماء کہتے ہیں کہ علم تیر اندازی کا سیکھنا ادب بلکہ سنت ہے۔

۹۶
علم تیر اندازی کا آغاز انہوں نے حضرت آدم سے بتایا ہے لکھتے ہیں:

علم تیر اندازی کا رب نے جو بھیجا درجہاں
ہوا نزول آدم کو یک تیر بے گمناں
حضرت جبریل نے سکھلایا ادن کو یہ پھنر
تب مروج درجہاں ہوا ہنر تیر و کماں

غلام غوث خاں غالباً اس فن کے اچھے ماہر تھے، لیکن وہ اچھے شاعر تھے اور نہ
اچھے انشاء پرداز۔ جبکہ انہوں نے اردو اور فارسی اشعار داخل کئے ہیں لیکن
یہ سب تک بندی ہے۔

پکوان کی ہدایات پر مشتمل ایک رسالہ رہنمائے رسوئیاں ناقص الآخر
ہے۔ اس کے مصنف کا پتہ نہیں چلتا۔ رسالے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :
”چونکہ یہ امر قابل لحاظ تصور کیا گیا ہے کہ جب کبھی کوئی لطیف یا
یا نفیس یعنی تکلف دار اور مزیدار کھانا بنوانا ہو تو ایسے ہر طرح
کے کھانے بنانے سے پیشتر یعنی، شوربا، آب جوش اور آب
گوشت بنانے کی بہت ضرورت ہے۔ مگر جس حالت میں کہ روزمرہ
کے طور پر کھانے بنوانا ہو تو اس حالت میں اون شوربوں کے بنانے
کی ضرورت نہیں۔“

فنون مفیدہ میں ایک رسالہ کاغذ سازی پر اہم ہے، جو کسی انگریزی کتاب کا
ترجمہ ہے۔ یہ رسالہ ”رسالہ کاغذ سازی“ کے نام سے موسوم ہے اور کاغذ کی تیاری
میں جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان سب کی تفصیل اس میں درج ہے۔ اس
کے ساتھ ساتھ مشینوں کے خاکے بھی دیئے گئے ہیں۔

سوانح پر دو کارنامے قابل ذکر ہیں۔ ایک تذکرہ حالات اعیانہ اور دوسرا

”ذکر اولیائے ہنود“ اول الذکر رسالے کے مصنف کا نام محفوظ ہے میں درج نہیں ہے۔
رسالے میں حضرت آدم سے لے کر حضرت محمد صلعم اور ظہور و انیال تک سائے اہم
پیغمبروں کے مختصر حالات لکھے گئے ہیں۔ جن انبیاء کے حالات رسالے میں درج ہیں
وہ یہ ہیں :

آدم، قابیل، شیث، عوج بن عنق، ادریس، نوح، ہود
صالح، ابراہیم، اسماعیل، داؤد، سلیمان، عزیز خضر، یعقوب
یوسف، لوط، ایوب، عمران، موسیٰ، ہارون، عیسیٰ
یوشع، کالوب، سموئیل، محمد الرسول اللہؐ۔ ظہور و انیال۔

آدم کے حال میں لکھا ہے :

”آدم سب سے پہلے پیغمبر ہیں، محرم کی دسویں تاریخ، جمعہ کے
دن بعد زوال کے آپ کے جسم مبارک میں روح داخل ہوئی بعد
اوس کے فرشتوں نے سجدہ کیا اور یہ سبب کھانے گھسیوں کے
بہشت سے نکالے گئے۔ ان کی پسلی کو چیر کر خوا کو نکالا۔ ان سے
ہی تمام دنیا کی آبادی ہوئی۔“

قابیل اور قابیل کی روایت تفصیل سے بیان کی ہے، جو ایک دلچسپ مختصر قصہ کی
حیثیت رکھتی ہے۔ زبان اور اسلوب سیدھا سادہ ہے۔

”ذکر اولیائے ہنود“ ناچھ داس کی ”بھکت مال“ کا ترجمہ ہے۔ مترجم کے
نام کا پتہ نہیں چلتا۔ کتاب کا اسلوب سلیس اور واضح ہے اور کہیں ادبی
جھلک بھی ملتی ہے۔ میرا دھوکے حال میں لکھا ہے :

”میرا دھو جی“ عابد الہی مشہور و معروف ہیں۔ اول امیر کبیر تھے
مذہب محمدی رکھتے تھے۔ رہبر و مقربا برندا بن میں پہنچے، اپنے

۹۸
 مٹھی سے جو بھگوت کا معتقد تھا۔ اس لیلہ کی بڑائی سن کر تماشا
 دیکھنے کا شوق ہوا۔ منشی نے بدریافت غلبہ شوق امیر کے بعد
 اقرارِ محبت و پرستش وغیرہ کے اس کرنے والوں کو بلایا اور
 امیر نے بہ ادب و شوق تمام اذکارِ آہنی کو دیکھا۔ جان و دل سے
 عاشقِ اصلی صورتِ نندندن برنابین چند کا ہو گیا اور تمام مالِ
 خزانہ خدائے تعالیٰ کے نذر کیا۔ بعدِ لباس و دنیا کو بھی ترک کر دیا۔
 سری کرشن، گویاں جنگل و کوچر ہٹے سری بندربن میں طالب
 اصل مطلوب عزیز کا پھرنے لگا۔

آگے اس کی کرامات اور بھگوان کرشن کی اس پر عنایات کی تفصیل ہے۔ ان کے
 ایک فارسی قصیدہ کا مطلع بھی لکھا ہے جو حسب ذیل ہے :

تا کے زخود رانی سخن سری کرشن گو سری کرشن گو
 بگذا کر کبر ما دمن سری کرشن گو سری کرشن گو

علم منطق پر ایک رسالہ کتابِ کبریٰ در علم منطق کا ترجمہ ہے۔ اصل
 فارسی کے ساتھ، ترجمہ اردو اور سنسکرت میں سطر بہ سطر لکھا ہے۔ سب سے پہلے
 فارسی نہایت خوش خط، اس کے نیچے سنسکرت اور اس کے نیچے اردو رسم خط
 میں، زبانِ پر سنسکرت کے علاوہ بولی کا اثر بھی ہے۔ جیسا کہ اس آفتاب سے
 ظاہر ہے :

”جانو سما دھان ہوے کہ منشیہ کو ایسا چیتنا والا بل ہے کیا کہ
 جیسا تس میں دستور کیا مورتیاں لکھنے آدیتاں ہیں۔ پرنتو
 درین میں محسوساتوں کیاں مورتیاں ہی کیوں دیکھنے میں آدیتاں
 ہیں“

یہ رسالہ اپنے موضوع، مطالب اور ترجمے کے طریقے ہر لحاظ سے اہم ہے۔ اس کے علاوہ لسانی آمیزش کے مطالعے کے اعتبار سے بھی اہم مواد رکھتا ہے۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار کے علماء میں بابو نصر اللہ عیسائی کا نام آچکا ہے۔ نصر اللہ نے ڈاکٹر جان اسن کی تصنیف "کثیر ہینڈ بک" "تدریج رہنمائے کثیر" کے نام سے اردو میں منتقل کیا تھا۔ اس کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں کہ یہ ترجمہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے حکم سے اردو میں کیا گیا اور مکمل ہونے کے بعد ان کی درمت میں منظوری کے لئے پیش کیا گیا۔ ترجمہ کا سنہ ۱۸۷۴ء ہے۔ اس ترجمہ سے وادی کثیر کے بارے میں ایک اقتباس یہاں درج ہے :

"کثیر خصوصاً ایک ہی بڑی وادی ہے جو کہ ہر طرف سے بلند اور برفانی پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے، جس میں دریاے جہلم موجزن ہے اور علاوہ اس بڑی وادی کے اور بھی چھوٹی چھوٹی وادیاں ہیں، جن سے چاروں طرف سے اس دنیا میں پانی پڑتا رہتا ہے مگر وادی کثیر ان تمام وادیوں میں سے بڑی اور مشہور و معروف ہے۔"

مترجم نے لکھا ہے کہ یہ کتاب خاص و عام کے استفادہ کے لئے مشہور کی گئی لیکن اس کے مشہور کئے جانے کی تفصیل نہیں ملتی۔ اس کا صرف ایک مخطوط دستیاب ہوتا ہے جو محکمہ ریسرچ، سری نگر کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

رنبیر سنگھ کے اس دارالترجمہ کے بارے میں نظم و نسق کی کچھ رپورٹوں سے جو اردو میں چھپتی تھیں، ٹھوڑی بہت تفصیلات ملتی ہیں۔ مثلاً ۱۸۸۲-۱۸۸۳ء کی ایک رپورٹ میں اس کے بارے میں یہ کیفیت درج ہے :

"سال حال کوئی کتاب جو انگریزی سے شاستری (سکرت) اور شاستری سے بدیشا اور عربی سے اردو میں ترجمہ ہوئی میں ختم نہیں ہوتی۔"

رپورٹ میں ترجموں پر جو مصارف سالانہ ہوتے تھے ان کی تفصیل لکھی ہے :
 "۴۵.۲ روپیہ، اُجرت ترجمہ اس سال میں صرف ہوا۔"

اس دارالترجمہ سے ہٹ کر کبھی ریاست میں علمی اور ادبی کوششیں نہ ہتی تھیں۔
 ان میں ریاست کی سرکار کی جانب سے جو کام ہوا تھا۔ اس میں ایک اہم رسالہ
 قابل ذکر ہے۔ جو "پیداوار اور جانورانِ لدانخ کے" نام سے موسوم ہے۔ یہ رسالہ
 وزارتِ لدانخ ریاست جوں د کشمیر کی جانب سے ۱۸۸۵ء میں مرتب ہوا تھا۔ اس
 زمانے میں سردار محمد اکبر خان وزیرِ لدانخ تھے۔ رسالہ مرتب ہونے کے بعد سردار نے
 اسے دیوانِ لکھپت رائے کے پاس پیش کیا تھا۔

رسالے میں زمینی پیداوار کے عنوان کے تحت، اکھروٹ (اخریٹ) ہاڑی
 توت، انگور، سیب اور کچھ اور میوؤں کی تفصیل لکھی ہے اور ان کی پیداوار کے
 رقبوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اسی طرح درختوں اور ان کی مختلف قسموں کا ذکر
 ہے۔ جو اس دور دراز علاقے میں اُگتے ہیں۔ جانوروں میں جنگلی بیل، جنگلی
 بکری، ہرن، گرگ، جنگلی کتا، لونبڑی، سانپ، جنگلی چوہا، خرگوش، مچھلی
 اور یاسگ آبی، مرغ آبی، بگلا خورد، لام چکرا، ویشک جو بٹیر چایا ایک
 پرندہ ہے، بھوتر، بوگوا (ایک چڑیا) چکھا (چڑیا) کا ذکر ہے۔ کانوں کی تفصیل
 سے ایک اقتباس ذیل میں درج ہے :

"علاقہ لوبراہ میں موضع پنامیسک کے نزدیک ایک میدان ہے
 جس سے پھول پیدا ہوتے ہیں اور یہ جگہ لدانخ سے پانچ منزل پر
 ہے اور علاقہ اس کے ایک کان پھولی علاقہ مانجی گوگرہ میں بھی ہے
 مگر اس جگہ سے لانے سے خرچ زیادہ اور آمدنی کم ہے۔ اس واسطے
 اس جگہ سے مائی نہیں جاتی۔"

یہ رسالہ ایک سرکاری دفتر کی حیثیت رکھتا ہے اور اس زمانے میں مرتب ہوا تھا جب
 اور ابھی سرکاری زبان تسلیم نہیں کی گئی تھی اسی نوعیت کی ایک اور اہم دستاویز
 مہنت شیر سنگھ کا سفر نامہ ۱۹۶۶ء میں مرتب ہوا تھا۔ مہنت شیر سنگھ رام پور
 و کشمیر کے سچے دانے تھے، اور زمبیر سنگھ کی سرکاری ملازم تھے۔ زمبیر سنگھ کو ریاست
 کی تجارت کو فروغ دینے کا بہت خیال تھا، اس لئے انہوں نے مہنت شیر سنگھ کو ریاست
 کے پڑوسی ملکوں اور مقامات کا سفر اختیار کرنے اور مقامات اور راستوں کی
 کیفیت مرتب کرنے پر مامور کیا تھا۔ اسی کے اتباع میں 'مہنت شیر سنگھ ۱۹۶۷ء میں کلابل
 بلنج، بنجارا، وغیرہ کا سفر کیا اور منزلوں کی تفصیل اور ایک منزل سے دوسری
 منزل تک کے راستے کی کیفیت، مقامات اور شہروں کے حالات پر مشتمل یہ
 رپورٹ تیار کی تھی، جو سفر نامہ کے نام سے موسوم ہے۔ دیباچے میں وہ کچھ اپنے بائے
 میں اور اس سفر نامے کے تحریک کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

• واضح ہو کہ یہ نسخہ پروردہ قدیمی حضور انور سری مہاراجہ صاحب
 بہادر فیاض زماں والی جنوں و کشمیر سکنے خاص رام پور کا مہنت
 شیر سنگھ نام قوم کا برہمن اور بنظر نک خوری و خواہش آب و
 دانہ مقررہ بہ روانگی واسطے کرنے دریافت حال تجارت ملک
 شاہ اوس و امیر خوقند و امیر بنجارا شریف کے خاص شہر سرہنگر
 سے یعنی پایہ سخت حضور پُر نور بہ بدرقہ لطف الہی روانہ ہوا۔
 چنانچہ یہ نیاز مند بتاریخ ۱۲ ماہ سادون ۱۹۲۳ بکر ماجیتی مکان
 مذکور سے بعد حصول قدمبوسی حضور انور براہ مظفر آباد و ہزارہ
 و لاک پشاور و کابل و بلنج و بنجارا شریف و سمرقند و طاش قند
 و خوقند لطیف و کاشغار و یارقند و لدکھ و غیرہ گردش کر کے بعد

شانزدہ ماہ بتاریخ ۱۲ ماہ کانٹک ۱۹۲۴ء قادیان پایہ تخت کشمیر
جنت نظیر کا ہوا۔

جن جن مقامات کو شیر سنگھ گئے، وہاں کی سابق حکومت، حال فرمانروا، اور
مقامی حالات سب کا تذکرہ کیا ہے۔ کل ۱۲، مقامات کی تفصیل سفرنامہ میں درج
ہیں۔ بعض چھوٹے چھوٹے مقامات کا ذکر سرسری طور پر کر دیا ہے، کچھ سرائیات قائم
کئے اور ان کے جوابات بھی لکھے ہیں۔ سفرنامہ مرتب ہونے کے بعد یکم فروری ۱۹۶۸ء
کو دیوان نہال چند کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

اس زمانے تک اردو کے ریاست میں پھیلاؤ اور سرکاری اور دفتری
کاموں میں اس کا استعمال عام طور پر رائج ہو چکا تھا۔ جس کا اندازہ لداخ کے
بارے میں رسلے اور مہتہ شیر سنگھ کے سفرنامے سے ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ اس
زمانے میں ریاست کے نظم و نسق کے بارے میں جو رپورٹیں شائع ہوتی تھیں،
وہ بھی اردو میں شائع ہوتی تھیں۔ دارالترجمہ کے سلسلے میں ایک رپورٹ کا اقتباس
درج کیا جا چکا ہے۔ ایک اور مکمل رپورٹ جو "رپورٹ مجموعی" کے عنوان سے
مرتب ہوئی تھی۔ اور جس کی تفصیلی سرخی ہے:

"انتظام ممالک ریاست جموں و کشمیر ابتداء ۱۹۲۹ء لغتہ
ماہ گھ ۱۹۳۱ء بمقامی، حسب الحکم سری بہاراجہ بہادر دام اقبال
بہ اہتمام کی گئی۔"

کئی غلاموں پر مشتمل ہے۔ خلاصہ (الف) کے تحت حسب ذیل عنوانات کے
بارے میں کیفیت درج ہے:

"رقبہ، مردم شماری، تعداد وزارت و پرگنات جموں، پیمائش
بندوبست معہ اوسط پرتہ، تعداد وزارت و پرگنات سرینگر

تعداد پر گنت لداغ واسکر دو گلگت، تجارت، احوال تجارت
پشمینہ۔

ان تفصیلات کے علاوہ رپورٹ میں مقدمات فوجداری، مقدمات دیوانی احکامات
گورنمنٹ عالیہ، جہلخانہ جات، پولیس، ملٹری یعنی جنگی، لٹاک خانہ جات،
ترقیات، صاحبان عالی شان سیاحان کثیر، ترجمہ علوم، ہسپتال و شفا خانہ جات
نہر دریائے چناب واقع اکوڑ، رپورٹ انتظام، غرض ریاست کے نظم و نسق
کی ساری تفصیلات جو ۲۷-۱۸۷۳ء سے متعلق ہیں، مندرج ہیں
جہوں کے مختلف علاقوں کے موسمی حالات کے بارے میں رپورٹ میں ذیل
کی معلومات درج ہیں:-

۱۔ علاقہ جات جہوں میں بارش متوسط ہوئی مگر علاقہ کچھلستان میں بارش
کم چھال میں کم بارش اور بے وقت ہوئی۔ فصلیں سال ۱۹۲۰ء میں
میں ناقص ہوئیں و نرب غلہ گراں رہا۔ ۲۔ علاقہ سری نگر و لداغ و
اسکر دو و گلگت میں بارش برعکس ہوئی، فصلیں اچھی ہوئیں اور
نرب غلہ ارزاں اور آفت مٹی و خانی سے (یعنی صدمہ ہوائی از حد
گرم یا سردی سے مادہ پیدائش غلہ مثالی ناقص ہو جاتا ہے) ممالک
سری نگر محفوظ رہا یہ حدی ممالک گلگت وغیرہ جو ان میں بہر طور
امن رہا۔

ایک اندراج کا اقتباس جو صاحبان عالی شان کی سیاحت کثیر سے متعلق ہے، حسب
ذیل ہے:

۳۲۲ کس صاحبان عالی شان و ۶۳ میم ولیدی صاحبہ
واسطے گلگت کے سری نگر تشریف لائے۔

۱۰۲
 رپورٹ کے سال میں مختلف مدارس میں طلباء کی جو تعداد تعلیم پا رہی تھی۔ ۱۵۳۳
 درج ہے۔ تجارت کے بارے میں ذیل کا اقتباس قابل مطالعہ ہے :
 ' بعد انتقال محمد شاہ بادشاہ چغتائے کشمیر بہ قبضہ افغانہ ہو گئی۔
 اکثر بیوپاری دکن حیدرآباد و برودہ وغیرہ
 راجپوتانہ سے برائے تجارت پشیمینہ مال بک مانند شال قدرار
 و شاہ پسند خرید کر ہندوستان لے جا کر دو چند نہ چند فروخت
 کرتے تھے۔ "

جہاں تک ادبی جدوجہد کا تعلق ہے۔ اس عہد میں کئی ایسے شاعر
 اور انشاء پرداز منظر عام پر آئے۔ پنڈت دیوال شیو ناتھ کول منظر، جن کا قلم
 تاریخ دیوان کرپارام کی تصنیف، ہدیتہ التعمیق کے بارے میں درج کیا جا چکا
 ہے، اچھے شاعر تھے۔ وہ ۱۸۳۸ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے اور تعلیم سے
 فراغت پانے کے بعد لاہور چلے گئے تھے جہاں محکمہ تعلیم میں انہوں نے ملازمت کی
 پھر کشمیر لوٹ آئے اور سب رجسٹرار اور نائب محکمہ صدر الصدور عدالت جموں کے
 عہدہ پر مامور رہے۔ کوئی ستر برس کی عمر میں انہوں نے انتقال کیا۔ وہ فارسی اور
 اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ ان کے قدروان تھے۔
 "بہار گلشن کشمیر" کے مرتبین نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی چند تصانیف ہندی نظم
 میں بھی تھیں۔ فارسی میں وہ حافظہ خاص طور پر ممتاز تھے۔ جیسا کہ ان کے اس
 شعر سے ظاہر ہے :

گو منتظر تو امیجوح افظ یارب شب غلستم سحر کن

اسی غزل کے دو شعر اور ہیں :

گر لذت در عشق خواہی از وصل صنم دلا، حذر کن

کس نیرت بجز جمالت میں جا بے پردہ بچشم من گذر کن
منتظر نے فارسی میں کافی کلام چھوڑا تھا اور اردو میں ایک کلیات ان کی یادگار ہے جو
کئی قصیدے، مناجاتیں اور ایک ممدس شکوہ چرخ شہر آشوب کے انداز پر لکھا تھا۔
انہوں نے کئی غزلیں غالب کی زمین میں لکھی تھیں۔ ایک غزل کے دو شعر ہیں :
دہن زخم اپنا دانہ ہوا بلے حق نہرک ادا نہ ہوا
دل کو اپنے ہے جستجو اس کی جو کبھی صورت آشنا نہ ہوا
ایک اور غزل کے دو شعر ہیں :

کیا یہی شرط محبت ہے کہ اب میرے رونے پہ ہنسی کرتے ہیں
دیکھ کر شوق عنایت کا ان کو دل ہزاروں کے پرستے ماکرتے ہیں
پنڈت ٹھاکر پرشاد دانیچو مفتون بھی ملازمت کی تلماش میں لاہور گئے تھے۔
اور عدالت دیوانی میں ملازمت اختیار کی تھی۔ عرصہ ازیں وہ وظیفہ حاصل کرنے کے بعد دہلی چلے
گئے تھے۔ غزل انہیں کہتے تھے اور کبھی کبھی جدت سے بھی کام لیتے تھے۔ ان کے اشعار کا اقتباس
ہے :

ستارہ چمکے ہے جوں آب چاہ میں مفتون
چمکتا خال ہے محبوب کا ذقن کے بیچ

شراب ناب سے ناباں ہے ہر مہر میں
شکستہ ہوئے تو بن، جلے خضر مرین
پنڈت نندرام جو پرائند کے نام سے مشہور ہیں، ایک تارک الدنیا سنیا سی
اور صوفی شاعر تھے، جنہوں نے ایشور بھکتی کے گیت ہندوستانی اور پنجابی ملی جلی زبان میں لکھے
وہ مٹن کے رہنے والے تھے۔ ان کی ولادت سپر میں مشکانہ میں ہوئی تھی۔ ان کے والد سری کرشنا

پنڈت مٹن کے ایک گاؤں سیر میں پڑاری تھے۔ والد کے انتقال کے بعد وہ اس خدمت پر
 مامور ہوئے لیکن ان کی طبیعت کو تصوف اور بھکتی سے لگاؤ تھا۔ چنانچہ آخری عمر میں ملازمت
 ترک کر دی تھی۔ لالہ دید اور نور الدین ریشی کے علاوہ، گورونامک کی تعلیمات سے بھی وہ متاثر
 تھے۔ تعلیم انہوں نے فارسی میں پائی تھی، اس لئے فارسی سے بھی لگاؤ تھا۔ ابتداء سے انہیں
 مذہبی کتابوں اور دیدانت کے مطالعے کا شوق تھا۔ کچھ مسلمان صوفی درویشوں کی صحبتوں سے
 بھی انہوں نے استفادہ کیا تھا یہی لئے مجلے اثرات، ملی جلی زبان میں جسے وہ "بھاکھا"
 کہا کرتے تھے، انہوں نے شاعری کی ہے۔ ماسٹر زندہ کول نے جو اردو اور کشمیری کے شاعر ہوئے
 ہیں، ان کے کلام کو تبصرہ اور حواشی کے ساتھ تین جلدوں میں مدون کیا ہے۔ مقدمہ اس
 پر انگریزی میں لکھا ہے:-

پرمانند کا آخری زمانہ تکلیفوں میں گذرا۔ بیوی کی بدمزاجی اور لڑکے کی
 موت نے زندگی سے ان کا جی سیر کر دیا تھا، تاہم الیٹور کی وجہ لگی ہوئی تھی اس میں کمی نہیں
 ہوئی بلکہ اس میں اضافہ ہو گیا تا آن کہ ان کا انتقال مسلمانوں میں ہو گیا۔ ان کے کلام کے کچھ
 اقتباسات ذیل میں درج ہیں:

کیا ہے جگ کوئی جانتا ناہیں	گیان ہن پہچانتا ناہیں
ست سنگ گنگ انسان کھے	نہ آدن تیر تھ تن نہاے
پرمانند اس سادی سے	لے ہوئے ست وادی سے

کھاؤ، پیو، سو، جاگو، آجودا، پیار لاؤ، یاد، راتیں دن میں کر لیہو سب دیوار
 پر جانو اس کو مانو اس کو سونپو بارم بار
 نہ کر، نہ کر، نہ کر، نہ کر کے کر ! کر موم کو نہ چھوڑ !
 من مانی سے من نہ لہو ابھی مانی سے من نہ موڑ !

پیر پساد، اکھیاں میٹھوا ! ہاتھ اٹھا کر جوڑ !

سنتوں کے پرنام

پرماند نے فارسی میں بھی شعر کہے ہیں اور فارسی میں وہ غریب تخلص کرتے تھے۔

ویدوں سے یہ حکم چلا ہے ! جو آتما شیووشی کلا ہے

اپنا اپنا کرموں کا پھل مائی ایک دو بھائی !

بند راجن میں راس رچا لولا نام ہو گویا

رکھی نے کیا بات سُنا یا چوراں کو سدساہ بنایا

چور وہی تا پکڑے کوئی ناکم رکھن روی آوی

کشمیری میں پرماند نے "رادھاسوئم" اور "سودام چرتتر" دو طویل نظمیں لکھی ہیں۔ جو گیان پرکاش کے عنوان سے اکٹھی شائع ہوئی ہیں۔ ماسٹر زندہ کوں ثابت نے ان کے کلام کو بسیط مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔

پرماند کے معتقد اور شاگرد، سوامی لکھن جو بلبیل، کشمیری اور اردو دونوں میں لکھتے تھے۔ ان کی ایک نظم "سری راما گیتا" جو کشمیری میں ہے، پنڈت نرنجن ناتھ رینے نے مرتب کر کے شائع کی ہے۔ بلبیل، سندھ رازدان کے فرزند تھے، پہلے سری گری میں رہا کرتے تھے، پھر دوسری شادی کے بعد ناگام چلے گئے تھے، جہاں کچھ عرصہ تک تجارت کرتے رہے۔ فارسی میں انہیں اچھی دستگاہ تھی۔ اس لئے آخر میں تجارت ترک کر کے فارسی پڑھانے کے لئے مکتب قائم کر لیا تھا۔ پرماند کے اثر نے انہیں بھکتی کی طرف مائل کیا اور کشمیری لیلائیں اور بھجن لکھنے رہے۔ ایک چائے نامہ اور قصہ نل دمن اور ایک رزمیہ نام نامہ بھی منظوم کیا تھا، جس کا ماخذ فردوسی کا شاہنامہ تھا۔ بلبیل کا انتقال ۱۸۸۶ء میں ہوا اپنی موت سے پہلے انہوں نے یہ قطعہ تاریخ کہا تھا:

بیا اے باغیاں بابل نفس انداخت و گلشن
 ز آب شبنم غلی ز برگ گل کفن انگس
 چمن کے بیچ میں ہنرے کے تنختے پر لٹا دینا
 پھر اک گلشن کی شاخوں سے مس اس کا کوروش
 صبا از عند لیب گوگل از لبوں نوا بر کو
 کہ زیر پاست غورام جی آمد شرین لکھن

برنماند کے ایک اور عقیدہ تندر پٹنٹ واسد یوجی بھی تھے۔ ان کی کچھ نظموں اور
 صوفیانہ اشعار کو پنڈت نرنجن ناتھ پرمنہ نے "گیان پرکاش" کے ساتھ شائع کیا ہے۔
 اسی سلسلے کے ایک صوفی دلشہ کوٹیاں یا ڈشہ پاتھ کول مناول بھی تھے جن کا ذکر
 کشمیری کے حصے میں کیا گیا ہے وہ اردو میں بھی کہتے تھے۔ ان کے بطور جلو زبان میں لکھے ہوئے
 کچھ شعر یہ ہیں :-

پریم آتمن پرکھو آیا !	بر کشمیری زبان رلایں آیا
سنکرت اور کشمیری ہندی	بہ اردو فارسی اور ہندی
مرتب اس میں انگریزی مکمل	مرتب سات علویں بہر کمال

پنڈت نرنجن ناتھ رینہ، جن کا تذکرہ اوپر آیا ہے، شاعر اور مصنف تھے اور انہیں بھی
 دھیان، لوگ اور تصوف سے لگاؤ تھا۔ اس دلچسپی کے باعث پرانند، پنڈت لکھن ج
 بکس اور پنڈت واسد یوجی کی نظموں کو مرتب کیا تھا۔ اور "گیان پرکاش" سے موسوم
 کیا تھا۔ اس کتاب کے تعارف کے طور پر سرنامہ پرانند نے یہ شعر موزون کر کے لکھے ہیں !
 تشنہ لبوں کے واسطے ساگر اسے کہو کم گشتگان راہ کار ہر اسے کہو
 ویرانت کا یہ سار ہے سدھ سیکھرا اندھوں کے واسطے نور ہر اسے کہو
 رینہ منتر بھی اپنی لکھ لیتے تھے "گیان پرکاش" کے دوسرے ایڈیشن کا دیباچہ انہوں نے

متر میں لکھا ہے جس کا اقتباس حسب ذیل ہے:

”ناظرین کرام! آج احقر کا دل بلیوں، مچھل رہا ہے کہ احقر کو ایک بار پھر اپنی ترمیم شدہ پوستک کے ذریعے، جو گیان، دھیان، یوگ اور سادھن کے طریقوں سے سزا پا بھرا ہوا ہے، اپنے قومی بھائیوں کے دربارِ دربار میں پھر حاضر ہو کر باریابی کا موقع ملا ہے۔ پوستک کیا ہے وہی پُرانی سے معرفت سے آتش کر کے بوتلوں میں بند کی گئی ہے جس کے دو چار بوند چھکنے سے وہ سستی مصداق:

مست مٹی بسیدہ اگر دو نیم شدی

مست ساقی روزِ مٹشیر بامداد

طاری ہوتی ہے جس کا نشہ دائمی سورت اختیار کر کے طالبِ حق کو مت است بنادیتا ہے اور عالمِ خیال میں محو کر کے اس کو دنیا و مافیہا سے بے خبر کرتے ہوئے خوفِ نرگ سے آزادی بخشتا ہے۔“

آگے رقمطراز ہیں:

”اس پونک میں سو دام چتر، رادھا سونم اور شیوہ لگن کے علاوہ

سرچشمہ حقیقت سوامی لکھن جو المخلص برہمن کے پاکیزہ خیالات اور

پنڈت واسدیوجی وغیرہ کے ارشادات و کنایات درج کئے گئے ہیں۔“

اسی زمانے کے ایک اور فقیر منش شاعر، پنڈت لچمن نارائن بھان عابرنسخ، جن کی

فکر کا محور زیادہ تر ایشور بھکتی رہی۔ اس تعلق سے ان کے کلام میں بھی بہت سے ایسے

لفظ آج ملے ہیں جو عام ادبی زبان سے مانوس نہیں ہیں مثلاً:

پر پنجم میں گنیش جی کے دھادڈن چرنوں میں انہوں کے سرنواؤں

جاسوں مجھے نرم گیان ہووے ست کرم میں میرا دھیان ہووے

ان کی مناجات کے کچھ شعر ہیں :-

گنہ بخشو مرے سیتا کی عصمت کے تصدق میں
 گنہ بخشو مرے رادھا کی اُلفت کے تصدق میں
 سراپا جرم ہوں افعال سے میں اپنے نادم ہوں
 مری بخشش ہو محبت کی محبت کے تصدق میں
 ایک شعر میں اپنی آنا د فطرت کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے :
 نہیں مُنعمانِ دہر کی پروا ذرا ہم کو !
 ہمیں عابِ جز گدائی درِ رگھویر کافی ہے

محمد الدین فوق نے حسن ڈار کا تذکرہ اپنی تاریخ میں لکھا ہے اور بتایا ہے کہ ان کا
 خاندان افغانوں کے عہد میں ان کے ظلم و استبداد سے بچنے کے لئے ۱۸۱۶ء کے قریب
 لاہور چلا گیا تھا۔ حسن بغاوت پسند طبیعت کا نوجوان تھا۔ پنجاب میں اس خاندان نے کافی
 ترقی کی جس کو شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی چنانچہ اس نے ایک نظم لکھی تھی جس میں کشمیر
 میں افغانوں کے ظلم و تشدد اور لوگوں کی بے بسی کا تذکرہ کیا ہے شعر ہیں :

جب کابل کے افغانوں کا اس ملک میں آکر راج ہوا
 اس راج کے ظلم و تشدد سے کرتا ہی رہا فریاد حسن
 لیکن نہ فعال افغان نے سنی اور جو بڑے عظیم بھی کم نہ ہوا
 اس عالم جبر و تعدی میں آخر کو ہوا برباد حسن

فوق نے لکھا ہے کہ پنجاب جا کر حسن نے محنت مزدوری کی اور کچھ کمایا پھر تعلیم بھی حاصل کی
 چنانچہ اس کی اولاد میں کئی پڑھے لکھے فرد ہوئے جن میں سے بعضوں نے اہم عہدے بھی
 پائے جن کے ان اشعار سے اس تفصیل کا تھوڑا بہت اندازہ ملتا ہے۔ کہتے ہیں :

آدیکھ کر اب کس شان سے ہے وہ ادبِ فلک کی چوٹی پر
 رکھی تھی جس تعمیر کی تو نے غربت میں بنیا دُحسن
 کثیر کی ارضِ پاک میں تیری خاک کے ذرے مہربنے
 پنجاب میں وہ اقبال پڑھا ہیں صاحبِ عدل داد حسن

۴۴

حسن کا انتقال ۱۸۵۵ء میں ہوا۔

حسن نے کثیر سے پنجاب جا کر نام و نمود حاصل کیا تھا، تو لاہور کے ایک صاحب
 علم اقد بخش دردی لاہور سے کثیر آئے اور دیوانِ پلھمن داس گورنر سے متوسل رہے۔ وہ
 فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ گوان کے معیار اونچے نہیں تھے۔
 دردی نے کچھ قصیدے دیوانِ پلھمن داس کی مدح میں لکھے تھے اور کچھ نظمیں بھی کہی تھیں۔
 لیکن ان کا ایک مسدس جو ۱۸۸۴ء میں لالہ تارا چند کے بیٹے دیوانِ چند کی شادی کے موقع
 پر کہا گیا تھا۔ بعض ایسی تفصیلات پر حاوی ہے جن سے اس زمانے کی تہذیب اور زیلتگی
 پر روشنی پڑتی ہے، محفلِ شادی کے اہتمام کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اطلس و کنوایا کا تھا فرش ہر جانب بچھا

شامیانہ سُرخِ مخمل کا تھا پھر اوس پر تنہا

گرد اُس کے منیوں کی جھالوں کی تھی منیا

ہر بشر بے ساختہ ہو بول اٹھا، حجب

جشنِ جمشیدی کی ہے جلوہ نمائی ان دنوں اپنے دیوانِ جمی محفلِ سجائی ان دنوں

رقص و سرود کے انتظامات کا حال لکھتے ہیں:-

بہنِ بجا بھی دکھاتا تھا عجائب رنگ و ہنگ

لو ملک و طنبور و ڈھولک، طبلہ و طاؤس چنگ

بالسری عود و آگہی اور چکارن جل ترنگ

مغفل اندر پکارے اوس جگہ پر جو کہ دنگ

جشن شیدی کی ہے جلوہ نمائی ان دنوں آپ نے دیر ان ہی مغفل سجائی ان دنوں
محمد الدین فوق نے اپنے بزرگوں میں، بابو رحیم بخش شیدہ کا تذکرہ تاریخ اقوام مشرق میں کیا
ہے جو دیوان پٹھن داس کی جائیداد کے مہتمم تھے۔ شیدہ اعرصہ تک لاہور میں رہے اور بلوچستان
کی ریاست لُس بیل میں نائب تحصیلدار کے عہدہ پر بھی مامور رہے۔ آخر میں وہ کشمیر میں مقیم
ہو گئے تھے۔ شیدہ، فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے لیکن فوق نے ان کا کلام
نقل نہیں کیا ہے۔

سید محمد انور شاہ، غالباً بیچ بہارہ کے رہنے والے تھے اور بابا انصیب الدین غار
کی زیارت سے ان کا تعلق تھا۔ وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ملازم
سلسلے میں وہ رامپور چلے گئے تھے اور نواب کلب علی خان کی سہکار میں ملازم تھے۔ ان کے
اردو اشعار دستیاب نہیں ہوتے۔ ان کی صاحبزادی زینب بی بی، محبوب بھی شاعر سن
سے وابستگی رکھتی تھیں۔ لیکن لغت اور منقبت کہتی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے احوال
کا ایک مجموعہ ”گلبن لغت“ کے نام سے ۱۲۹۷ء مطابق ۱۸۷۷ء میں مرتب کیا تھا۔
وہ شری بھی لکھ لیتی تھیں۔ ”گلبن لغت“ پر انہوں نے ایک طویل دیباچہ ”منقبت کی گزارش“
کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس میں اپنی بیماری کی تفصیل لکھتی ہیں کہ:-

”یہ عاجز تیرا سال کی عمر سے ایسے مرض میں مبتلا ہے کہ یہاں جس کا

ذکر، تکالیف و تشریح تعب نامناسب ہے۔“

یہ بھی لکھا ہے کہ شاعر سے انہیں ابتداء سے دلچسپی تھی۔ لیکن والد شعر کہنے سے منع
کرتے رہے۔ کہتی ہیں:-

”اگرچہ طبیعت پہلے سے غزلیات و اشعار کے مہر و تھی، لاکن ان کی

تشبیہ کرنے سے باعث امتناع والد ماجد کے مہبور اور روکی رہی۔“

۱۱۳
 مذہبی موضوعات پر بلند پایہ کلام سرانجام کرنے کے لئے جس تربیت کی ضرورت ہے اس سے زینب بی بی محروم تھیں تاہم ان کے اندازِ تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی تعلیم اچھی ہوئی تھی۔ اس مجموعے کی تخلیق کے بارے میں لکھتی ہیں :

”اسی اثناء میں، میں خواب میں دیکھتی ہوں کہ سیدالابرار علیہ الصلوٰۃ والسلام مع دیگر انبیاء نامدار مثل حضرت آدم، حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ تشریف فرما ہیں۔ جناب رسالت مآب صلعم نے ارشاد فرمایا کہ اے محبوب کچھ سُنا۔ ایک نعت رو رو کر سُنائی۔ حضرت سرورِ کائنات نے محفوظ اور منبسط ہو کر مجھے پیار کیا۔ آنکھ کھل گئی۔ چہرہ آنسوؤں سے اسی طرح تر تھا۔ مجھے جو شوق اور قلق اس وقت عارض ہوا اس کے بیان سے زبان عاجز ہے۔ اسی روز سے نعت گوئی کا شوق دامگیر ہوا۔ یہاں تک کہ پندرہ روز میں یہ کتاب ”گلبنِ نعت“ مرتب کی۔

اس طرح یہ مجموعہ جو محبوب کی عقیدتِ تمندی کی یادگار ہے، مرتب ہوا جس کے بارے میں خود کہتی ہیں :

”محبت اور سوز و گداز اور حال کچھ اور چیز ہے اور سخن گوئی و سخن فہمی و قال کچھ اور چیز۔“
 ان کی ایک نعت کے کچھ شعر ہیں :-

عیال و اللیل سے ہے وصفِ گیسوئے معبر کا
 سراسر و الفنی تعریفِ رخسارِ منور ہے
 ترا وصفِ مقدس ہے الم نشرک لک، مدرک
 تری مدح و ثناء میں سورہ و النجم و کوثر ہے
 ہوا ہے شوقِ بیماری میں تری نعت گوئی کا

۱۱۴
تسالی اللہ کہ سیدھا آجکل میرا مفارقت

ایک اور نعت کے چند شعر ہیں :-

یار رسولِ عربی شاہسوارِ مدنی دیکھ لے اگر مری خشکی و دل شکنی
دیکھ کر گوہرِ لعلِ لبِ دندانِ نبی ہیں نخلِ گوہرِ یاقوتِ عقیقِ مینی
جوشِ عشق سے محوِ خیالِ آتہے اب مدینہ کو چلوں ڈال گلے میں کہنی
نعت کے علاوہ حضرت عبدالقادر جیلانی کی منقبت میں بھی کچھ نظمیں کہی ہیں۔ گلبنِ نعت
کا مخطوط جنوں و کشمیر محکمہ آرکائیوز میں محفوظ ہے۔ بابا عبدالرحمان متوطن سیح بہاڑہ
نے ۱۲۹۸ھ میں لکھا ہے، بابا عبدالرحمن حضرت بابا نصیب الدین غازی کی درگاہ کے
مستولی تھے۔

محمد انور شاہ نے اس ثبوت کے لئے دو قطعے فارسی میں لکھے ہیں اور ایک قطعہ
اُردو میں لکھا ہوا ضرور کا ہے۔ انور شاہ کے قطعے کے کچھ شعر ہیں :-

نیک طینت، زندہ دل، محبوب پاکیزہ کلام
ز در قم اس نسخہ در لغتِ حبیبِ کبریا
غذیبِ طبع اور از پے تاریخِ سال
گفت دلکش گلبنِ نعتِ محمد مصطفیٰ

سرور کے قطعے کے شعر ہیں :-

گلبنِ نعتِ نبی محبوب سے کر لیا جب حضرت حق نے قبول
مصرعہ تاریخِ سرور نے کہا مرحبا، صلی علی، نعتِ رسولؐ

ایک نعت جو بطورِ مساجات کے کہی ہے۔ اس میں نواب کلب علی خاں کی توصیف کی
ہے اور اپنے والد کی سخن پر داری کا نواب کلب علی خاں کی مدح میں یہ شعر کہے ہیں :-
جنابِ کلب علی خاں محیطِ بخشش و داد

ہو سر پر اس کے سدا سایہ شب بغداد
 کہ ہیں وہ والی دمدوح میرے والد کے
 کہ جس کے فیض کرم سے ہے اک جہاں آباد
 وہی ہیکل ملک فراست و شوکت !
 اسی کا چاکر ادنیٰ ہے۔ یونہی اس و قباد
 فلک سر پرز و ملک خو، بلند مرتبہ ہے
 مطیع شرع محمد رئیس نیک نہاد
 جہاں کے جتنے ہیں مشہور و نامور شعراء
 اسی کے شعر و سخن پر کیا ہے سب نے صداد
 اپنے والد کے لئے دعا کرتی ہیں :-

ہمیشہ عزت دنیا ہو میرے والد کو کہ ہیں وہ فن سخن میں لیکار و استاد
 انہیں کے فیض سخن سے ہوئی ہوں میں اوتھوں نے شعر و سخن کا دیا مجھے ارشاد
 ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ محمد انور شاہ شعر و سخن میں ایک پایہ رکھتے تھے اور
 محبوب نے جس سیاق میں ان کی شاعری کا تذکرہ کیا ہے اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے
 کہ وہ نواب کلب علی خاں کی دربار سے شعراء کے زمرہ میں منسلک تھے۔

رسول میر، کشمیری کے سربراہ اور وہ غزل سرا، جن کا تذکرہ کشمیری کے حصے میں گذر چکا
 ہے، سری نگر اور اس کے شعر و سخن سے دور قصبہ ڈورڈ شاہ آباد میں مقیم ہے اور ۱۸۶۷ء
 سے قبل وفات پائی۔ عشق و محبت کے اس لغزہ سخن نے کشمیری کو مالا مال کیا، لیکن کچھ

لے: یہ بامز تازہ تحقیق کی رو سے غلط ثابت ہو گیا ہے۔ اب اس بات کی مقبضہ شہادت ملی ہے
 کہ وہ ۱۸۶۷ء کے بعد بھی زندہ تھے۔ (ط)

تبرکات ان کے اردو میں بھی ملتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اردو شاعری کی روایت سے واقف تھے، اور کچھ مہرے کشمیری میں شعر کہتے ہوئے ان کے قلم سے بے ساختہ نکل پڑتے تھے۔ ایک عظیم شاعر کی باقیات ہونے کے اعتبار سے یہ قابل قدر ہیں۔ فرمایا ہے :-

جب آیا تو نے گھبرایا ہمارے من اُلا جانو
دیا دل تو پہلے ساتھ رلائے تن اُلا جانو

پیر غلام حسن گھوہیہا کی مشہور فارسی تاریخ کشمیر موسوم بہ "تاریخ حسن" کا ترجمہ پنڈت مادھو جان کشمیری نے اردو میں کیا تھا۔ لیکن یہ مکمل تاریخ کا ترجمہ نہیں، بلکہ دوسری جلد کا ترجمہ ہے اور وہ بھی مکمل نہیں ہے۔ "تاریخ حسن" چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد کشمیر کے جغرافیائی حالات اور مشہور مقامات کے بارے میں ہے۔ دوسری جلد سیاسی تاریخ ہے، تیسری جلد اولیائے کرام کشمیر اور چوتھی جلد شعرائے کشمیر کے بارے میں ہے۔ تیسری جلد "اولیائے کشمیر" کا اردو ترجمہ مولوی محمد ابراہیم نے کیا تھا جسے نور محمد تاجر کتب، سری نگر نے شائع کیا ہے۔ مادھو جان نے اپنے ترجمہ کو "تواریخ حسن" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس ترجمہ کا صرف ایک مخطوط سری پرنسپ پبلک لائبریری، سری نگر میں محفوظ ہے۔ اس کے مخطوطے میں ترجمہ یا کتابت کا سنہ درج نہیں ہے اور ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مخطوط خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

ترجمہ سلیس اور سادہ زبان میں ہے، لیکن جملوں کی ساخت پر جبکہ جگہ فارسی کا اثر نمایاں ہے۔ راجہ سوسل کے حالات سے ایک اقتباس اس ترجمے کا ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ اس قسم کے ریختہ رسول میر سے پہلے کبھی کشمیری زبان میں ملتے ہیں (ٹ)

”راجہ سوسل دوسری دفعہ ۱۱۸۸ ہجری (۱۷۷۲ء) میں پادشاہی تاج سر پر رکھ کر تخت پر بیٹھا اور بکھ جرنے پہاڑی راجوں سے امداد حاصل کر کے بیج پہاڑ میں دشمنی کا بھنڈا بلند کیا۔ اس طرف سے سوسل نے لشکر نکالا، لڑائی میں مل گئے۔ سوسل کی فوج سے بہت سے مارے گئے، بکھ جرنے چکر کی عسارتوں میں آگئے، بہت سا مال و اسباب انسان اور چار پائیہ ضائع کئے۔“

زمبیر سنگھ اور ان کے جانشین پر تپ سنگھ کی ہندو مذہب کی نہر مت کا جوش اور دلولہ ان کے ہندو ذریعوں اور امراء میں بھی نمایاں تھا۔ ذریعوں میں دیوان کرپارام کی مساعی کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ زمبیر سنگھ کے آخری زمانے کے ایک وزیر ”سردار دیوی سہلے“ بھی اس سلسلے میں بہت نمایاں ہیں۔ لیکن ان کا کام کرپارام کے مقابلے میں زیادہ علمی اور دیرپا اہمیت رکھتا ہے۔ انہوں نے ایک اہم تصنیف ”ہندو کلا“ بیکل ڈکشنری کے نام سے لکھی ہے جو ۱۸۸۰ء میں مکمل ہوئی۔ اور ۱۸۹۴ء میں ”خانہ خادمہ تعلیم لاہور سے چھپی۔ کتاب کے سرنامہ پر اس کے موضوع اور اس کے احاطے کی تفصیل لکھی گئی ہے۔

”دیوتوں اور اوتاروں کے ویک اور پرانک حالات اور راکشوں رشیوں، راجاؤں اور مصنفوں کے پرانک سوانحات عمری۔۔۔“
مصنف نے کتاب کی تصنیف اور اس کی ضرورت کی تصریح کرتے ہوئے دیا ہے کہ:

”مقصداً اعظم اس تصنیف کا یہ ہے کہ عام اشخاص اہل ہند کو اپنے قدیمی دیوتوں، رشیوں، مصنفوں اور راجاؤں کے حالات سے بخوبی آگاہی ہو۔“

اگرچہ یورپ میں اس قسم کی تصنیفات کا بہت رواج ہے، الا سنکرت ہندی یا کہ اُردو میں ایسی تصنیف دیکھی نہیں گئی۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہندوؤں کی قدیم تاریخ مکمل اور سلسل نہیں مل سکتی۔

. اگرچہ اس باب میں بہت سعی اور جدوجہد کی گئی کہ مُصنّفوں کے پورے حالات لکھے جاویں اور کتاب ہذا کو زیادہ دلچسپ بنایا جائے مگر یہ مراد پوری نہ ہو سکی۔ کیونکہ مُصنّفوں کی کوئی تاریخی کتاب نظر سے نہیں گذری۔ علماء سلف کو شوق و قیاسِ نویسی رہا تو راجاؤں، رشیوں وغیرہ کے حالات لکھنے کا شوق رہا کسی کی طبیعت اس طرف مایل اور راغب نہیں ہوئی کہ ان عاملوں اور مُصنّفوں کے حالات بھی بطور سوانح عمری یا تحریر کئے جاویں۔

سنکرت ناموں کے صحیح تلفظ کے مقصد سے مُصنّف نے الفاظ کی نقل یا خط بدلی (TRANSLITERATION) کی تجویز بھی "قواعد" کے عنوان کے ماتحت ابتداء میں دے دی ہے۔ یہ تجویز اس اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے کہ یہ اس نوع کی ابتدائی کوششوں میں سے ہے سنکرت کے حروف (اصوات) کے لئے اُردو حروف عام طور پر آسانی سے تجویز کئے جاسکتے ہیں لیکن سنکرت کی مخصوص اصوات جیسے حلقی ن، (ञ) کوڑی یا سکوسی رفتی ن (ण) اور صغیری ش (ष) اور انقی (अ) کے لئے مُصنّف نے جو علامتیں تجویز کی ہیں، وہ جاذبِ توجہ ہیں:-

ञ = न - ण = त - ष = श اور अ = कھ۔

اس میں 'ہ' کے تلفظ کے لئے 'اُردو' کی جو علامت دی ہے، وہ 'ہ' کے مقابل کی ہے۔ لیکن مصنف کی تجویز کی ہوئی علامت۔ اس حرف کے تلفظ کے اختلاف کو ظاہر کرتی ہے۔ چنانچہ پراکرتوں میں یہ صوت یا ضابطہ طور پر 'کھ' کی طرح ملفوظ ہوتی تھی۔ جیسے 'ش'۔ 'کھی' اسی طرح (کُش) بھی 'کھ' کی طرح ملفوظ ہوتی تھی جیسے 'کثیر'۔ 'کھیر' وغیرہ۔ مصنف نے اپنی تجویز کے سلسلے میں کچھ تصریحات بھی درج کر دی ہیں۔

کتاب اس اعتبار سے معلومات آفریں ہے اور اس سے اُردو میں ہندو مذہب پر تصانیف میں ایک شائستہ اضافہ ہوا۔ اس سے نہ صرف ہندو بلکہ عام علماء بھی یکساں طور پر استفادہ کر سکتے ہیں۔

سیف الدین پنڈت نے ایک تاریخ "جدولی معصومی مشہور بہ موجز النواہج" کے نام سے لکھی تھی۔ جو خادم پنجاب پریس لاہور سے شائع ہوئی تھی۔

ریسرچ لائبریری سری نگر میں ایک رسالہ ۱۲۸۸ھ (م ۱۸۷۲ء) کا مرتبہ محفوظ ہے، جو "پنج باب حنفیہ" کے نام سے موسوم ہے۔ اصل رسالہ فارسی میں لکھا گیا ہے، لیکن اس کے آخر میں ایک قطعہ تاریخ اُردو میں درج ہے، اس سے مصنف اور سنہ تصنیف کا پتہ چلتا ہے۔ یہ رسالہ حافظ سعد اللہ کا مصنف ہے اور اس کی تکمیل پران کے کسی دوست نے اُردو میں یہ قطعہ تاریخ کہا تھا۔ قطعہ پنج درج ہے:-

"پنج باب" حافظ سعد اللہ کی نام نظم اور نام ناظم دیکھ
ہوں ہوئی تاریخ خوش و خواہ دیکھ پنج باب حافظ سعد اللہ دیکھ

ریاست میں پریس کے قیام اور اخبار کے اجراء کی اجازت ڈوگر اہمرانوں کی مطلق الغلٹی جاری رہنے تک نہ مل سکی تھی۔ حالانکہ ہندوستان میں اخبار شائع ہوتے تھے۔ اہل ریاست میں بھی اخبار پڑھنے کا مذاق ترقی کر چکا تھا اور خود ریاست میں اخبار نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ تر پنجاب اور لاہور سے شائع ہونے والے اُردو اخبار ریاست میں

۱۲۰
 منگوانے ملتے تھے۔ خود ریاست کے بعض اصحاب نے اخبار جاری کرنے کی اجازت کیلئے
 مہاراجہ رنبیر سنگھ اور ان کے بعد ان کے جانشین، پرتاپ سنگھ کے دربار میں درخواست
 پیش کی لیکن نامنظور ہوئی۔ یہ حکمران اخبار کو اپنے اقتدار میں مزاحم بلکہ اخبار جاری
 کرنے کے خیال کو اپنے اقتدار کے خلاف بغاوت کے مترادف سمجھتے تھے لیکن جب مسلسل مطالبہ
 ہوتا رہا تو خود مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ۱۸۵۸ء میں ایک پریس قائم کیا۔ یہ پریس جو دیا بلاس
 پریس کے نام سے موسوم تھا، پہلے پہل ان کے دارالترجمہ کی کتابوں کو چھاپنے کے مقصد سے
 قائم کیا گیا تھا۔ اس کام کو خوش اسلوبی سے انجام دینے کے لئے پانی پت سے مولوی
 قلندر علی خان کو طلب کیا گیا تھا۔

مولوی قلندر علی خان نے مہاراجہ رنبیر سنگھ کی خدمت میں پیش کرنے کے
 مقصد سے منطق اور کچھ علوم کے مباحث پر مشتمل ایک کتاب مرتب کی تھی جو "ہدیہ مہاراجہ"
 کے نام سے موسوم تھی۔ پنڈت دیا کرشن گردیش اپنے مضمون "ریاست جوں و کثیر
 میں فن تحریر و طباعت" میں اس مجموعے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ کتاب رنبیر سنگھ کی
 زندگی میں مکمل نہ ہو سکی، بلکہ ۱۹۲۹ء ہجری میں مطبع دویا بلاس کے افسر اعلیٰ میزنا کے
 اہتمام سے طبع ہوئی۔ یہاں سنہ میں کچھ تسلیح معلوم ہوتا ہے، کیونکہ مہاراجہ رنبیر سنگھ
 کا انتقال ۱۸۸۵ء میں ہوا اور ۱۹۲۹ء ہجری کے مطابق ۱۸۷۳ء میں ہوتا ہے۔ گردیش نے
 "ہدیہ مہاراجہ" کے بارے میں مزید معلومات یہ فراہم کی ہیں کہ یہ کتاب بڑی تقطیع کے
 ۲۲ صفحات پر مشتمل تھی۔ زبان کے بارے میں لکھا ہے کہ اسے سمجھنے کے لئے فارسی
 اور عربی میں کامل مہارت کی ضرورت تھی۔

دویا بلاس پریس سے ایک ہفتہ دار اخبار بھی "دیا بلاس" نام سے جوں
 سے شائع ہونے لگا تھا اور یہ سرکاری اخبار کی حیثیت رکھتا تھا۔ اخبار کی نوعیت
 کی یہ پہلی چیز تھی جو ریاست سے شائع ہونے لگی تھی۔ پہلا اخبار ۱۸۶۶ء میں شائع

ہوا۔ اس کے پہلے مدیر پینٹ گوپی ناتھ گروٹھ^{۱۲۱} یہ اُردو اور ناگری دونوں رسم خط میں لکھتا تھا۔ اس کے نامہ نگار ہندوستان کے اکثر بڑے شہروں سے خبریں بھیجتے تھے۔ اس اخبار کے مقصد اور طریقہ کار کے بارے میں ذیل کا اقتباس قابل مطالعہ ہے :

”صدائقِ اساس اخبار بدیا بلاس ہفتہ وار شنبہ کو نصف اُردو، نصف ناگری بنظرِ فائدہ عام بہ اہتمام تمام طبع ہو کر اس مطبع سے شائع کیا جاتا ہے اور دوسرے بروز بجمعات فیض آباد ناظرین و الا تمکین بھیج دیا جاتا ہے۔ عبارت اس کی زبانیڈ سے مُبرا ہے اور حشو سے مُعرا۔ اخبار صحیح غلط نہیں، صفحات خوش خط بدخط نہیں جو خبر ہے کار سپانڈنٹس صدق مقال کی زبانی ہے یا خلاصہ اخبارات انگریزی و ہندوستانی ہے۔ بایں ہمہ بنظرِ خریداری قیمت مختصر ہے۔“

شمارہ ۱۵۔ اکتوبر ۱۸۷۰ء (جلد ۴، شمارہ ۴۸) کی ایک خبر اور سُرخِ ذیل میں

درج ہے :-

”شاہیقین حج بیت اللہ و زائرین مدینہ منورہ کو ظاہر ہو کر سر بارٹل فریزر نام کا آگھوٹ جو مضبوطی اور تیز رفتاری اور صفائی وغیرہ میں بہت مشہور ہے ماہ شعبان کی پانچویں تاریخ تک حاجیوں کو لے کر بندرگاہ جدہ روانہ ہوگا۔ حاجی محمد صدیق بن صاب نے اس کا ٹھیکہ کر لیا ہے۔ جن صاحبوں کو واسطے حج کے جانا منظور ہو تو ادا اپنے خطوط مع چھارم قیمت کرایہ بمعینہ تفصیل ذیل کے موافق بمبئی کے محلہ ناگپارہ فدیم مولوی نظام الدین صاحب کے مکان پر حاجی محمد صدیق کے پاس روانہ کریں۔“

یہی خبر ناگری میں بھی چھپی ہے

اخباریں کچھ دلچسپی کی خبریں بھی شامل ہوتی تھیں۔ مثلاً اسی اخبار میں "خدا کی قدرت" کے عنوان سے ایک خبر شائع ہوئی ہے جس کا اقتباس ذیل میں درج ہے:-

"نامہ نگار منیر اکبر بدایوں سے تحریر فرماتے ہیں کہ ایک غریب آدمی کی عورت حاملہ تھی اور اس کے رہنے کا مکان پُرانا اور بوسیدہ تھا۔ کثرت بارش سے ٹپکنے لگا۔ اس کے خاوند نے چھت پر مٹی وغیرہ ڈال کر درست کیا، لیکن اسی حالت میں بارش کا یہ زور ہوا کہ مکان کی ایک دیوار گر گئی اور اسی حالت میں عورت کے بچہ پیدا ہوا.....

کیا شان الہی دیکھیئے کہ وہ بچہ اور اس کی ماں سچ گئی....."

اسی شمارہ میں امیر کابل کے نام روس کے ایک مراسلہ کا تذکرہ کیا گیا ہے اور جنوں کی ایک خبر یہ شائع ہوئی ہے کہ مہاراجہ کے سرنگریستہ جنوں آنے کی خبر گوم ہے اور انتظامات ہو رہے ہیں۔ ایک خبر سری دیوی جی کی جاترہ کے لئے مختلف مقامات سے لوگوں کے جنوں میں آنے کے بارے میں ہے۔

لیکن مہاراجہ اور ان کے دربار کی اس کوشش کے باوجود ایک عوامی اخبار جاری کرنے والا اور پڑھے لکھے عوام میں ایسے اخبار پڑھنے کی جو خواہش پیدا ہو گئی تھی اس کی تسکین اس سرکاری اخبار سے نہیں ہو سکی۔ چنانچہ کئی ایسے اصحاب جو ریاست کے ملحقہ صوبے، پنجاب کے شہروں اور لاہور میں عوامی زندگی اور اخباروں کی چہل پہل، دیکھ چکے تھے، ریاست میں پریس قائم کرنے اور اخبار جاری کرنے کے لئے کوشاں رہے اور جب مہاراجہ کے دربار سے ان کی درخواست مسترد کر دی گئی تو ایسا بھی ہوا کہ کچھ اصحاب ریاست سے ملحقہ شہروں، جیسے پاکوٹ، جالندھر یا لاہور جا کر اخبار لکالنے لگے تھے۔ ان میں سے اکثر اخبار خود ریاست میں مرتب ہونے اور چھپائی اشاعت کے لئے باہر بھیج دیئے جاتے تھے۔ اس سلسلے میں

پنڈت ہرگوپال کوں خستہ اور ان کے بھائی پنڈت ساگرام سالک کی کوششوں کی طرف ان کے حالات میں اشارہ کیا گیا ہے انہوں نے مہاراجہ رنیر سنگھ سے پریس ٹائم کرنے اور اخبار جاری کرنے کی اجازت مانگی تھی، جب ان کی درخواست مسترد ہو گئی تو انہوں نے لاہور اور پنجاب کے دوسرے شہروں سے بھی اخبار وقتاً فوقتاً جاری کئے۔ ان کے علاوہ بھی لاہور میں کئی اور کشمیری پنڈت بھی تھے جنہوں نے ایک سبھاسی قائم کر لی تھی اور اپنے طبقے کی فلاح و بہبودی کے لئے اخبار اور رسالے بھی جاری کرتے رہے۔ پنڈت گوپی ناتھ گروہن کا ذکر "بدیا بلاس" کی ادارت کے سلسلے میں کیا گیا ہے اس اخبار کے بند ہو جانے کے بعد وہ لاہور چلے گئے تھے جہاں سے وہ اور ان کے فرزند پنڈت بال کشن گروہن "اخبار عام" نکالتے رہے۔ یہ پہلے ہفتہ وار تھا، لیکن بعد میں ۱۸۸۱ء سے اسے روزانہ کر دیا گیا تھا۔ یہ اخبار ۱۹۳۸ء تک جاری رہا۔

ایک اور اخبار "مراسلہ کشمیر" کے نام سے ۱۸۸۰ء سے نکالا جانے لگا تھا۔ اور یہ بھی کشمیری پنڈتوں کا اخبار تھا، جو لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ پنڈت ہرگوپال خستہ نے ۱۸۸۲ء میں "خبر خواہ کشمیر" ہفتہ وار جاری کیا تھا۔ اس زمانے میں وہ اور ان کے بھائی پنڈت ساگرام سالک دونوں مہاراجہ کے مقرب تھے اور ان کی سیاسی اور مذہبی سرگرمیوں کی وجہ سے ریاست سے نکال دیئے گئے تھے۔ اس اخبار کو وہ مہاراجہ اور ان کے دربار پر تنقید کرنے کے لئے استعمال کرتے رہے یہ اخبار ایک سال سے زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا۔ پنڈت خستہ نے ایک اور ہفتہ وار "راوی بینظیر" بھی لاہور سے کچھ عرصہ کے لئے نکالا۔ اس کے علاوہ ایک اور اخبار "پیبلک نیوز" کے نام سے بھی وہ نکالتے رہے۔ لاہور سے نکلنے والا اخباروں میں ایک اور اخبار "رفیقہ ہندوستان" بھی تھا جو ۱۸۸۵ء میں جاری کیا گیا تھا اور کشمیر کے معاملات کے بارے میں لکھتا تھا۔

۱۹۸۵ء میں کشمیری پنڈتوں کی تقلید میں مسلمانوں کو بھی اخبار جاری کرنے کا خیال پیدا ہوا لیکن سب سے پہلا اخبار جو ایک مسلمان بابو غلام محمد کی ادارت میں ۱۹۸۶-۸۵ء میں شائع کیا گیا۔ وہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ ادران کے ہمدردوں کا جاری کیا ہوا اخبار تھا۔ چنانچہ اس میں انگریزی حکومت کے ان کے خلاف اقدام کے بارے میں سخت تنقید مضامین چھپتے تھے۔ ریاست میں جو کونسل قائم کی گئی تھی، اس کے خلاف بھی اس میں مضامین چھپتے رہے۔ ۱۹۸۷ء تک یہ اخبار جاری رہا۔

کشمیر سے باہر

علم و فن، تجارت یا مذہبی عقیدہ تہندی کے عروج کے زمانے میں قوموں میں اکثر اُبھار کا ایک جذبہ پیدا ہوتا ہے جس کے بل بوتے پر وہ اپنی قومی یا جغرافیائی سرحدوں کو عبور کر کے دور دراز ملکوں میں پھیلنے کی طرف مائل ہو جاتی ہیں۔ بودھ مبلغ، مذہبی تبلیغ کے جوش میں جسے وہ بنی نوع انسان کی بھلائی اور نجات کا ذریعہ جانتے تھے، ہندوستان سے نکل کر اطراف کے دور دراز ملکوں تک پہنچ گئے۔ مسلمانوں کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی۔ سترھویں اور اٹھارویں صدی عیسوی میں تجارت کے جذبے نے پوری قوموں کو ناپسندیدہ کنارسندروں کو پار کر کے مشرقی ملکوں میں پہنچ جانے کا حوصلہ عطا کیا۔ اپنی تجارت کے عروج کے زمانے میں کشمیری تاجروں کا ایک طرف وسط ایشیا کے ملکوں کو جاتے تھے دوسری وہ ہندوستان کے مختلف شہروں پہنچتے اور سندروں کو عبور کر کے پڑوس کے ملکوں کو بھی جاتے تھے۔ کشمیری تاجروں کے انڈونیشیا اور جاپان پہنچنے اور وہاں کے حالات پر تحریری دستاویزیں چھوڑ جانے کی مثالیں انہی صفحات میں کہیں ملیں گی۔ ایک اور سبب جو کسی ملک کے جوہر قابل کے جلا وطنی اختیار کرنے کا

اپنے ملک میں مذہبی یا کسی اور طرح کی نارواداری یا استبداد بھی ہوتا ہے کثیر کی صورت میں یہاں کی سرد آب دہوا بھی صاحب ثروت لوگوں کو موسم سرما میں اطراف کے ملحقہ علاقوں میں چلے جانے پر مجبور کر دیتی تھی۔ اس کے علاوہ یہاں کی جلد جلد بدلنے والی سیست بھی خاندانوں کو وقتاً فوقتاً باہر جانے یا ہجرت کر جانے پر مجبور کرتی رہی۔ لاہور اور اس سے زیادہ اتر سر اور سیال کوٹ قریب ہیں۔ چنانچہ ان دونوں شہروں میں اہل کشمیر کی نوآبادیاں سی بن گئی تھیں۔ سیال کوٹ قدیم کشمیری راجاؤں کے زیر نگین بھی رہ چکا تھا۔ ان راجاؤں کی آخری کمزور حکومت کے زمانے میں، بہت سے چھوٹے چھوٹے راجے اپنے علاقے میں مستحکم قلعے یا کوٹ بنوا کر، خود مختار ہو گئے تھے۔ اور یہ دور کشمیر کی تاریخ میں کوٹہ راج یا قلعہ یا قلعہ والوں کی حکومت سے موسوم ہے۔ اندر کوٹ، لوہر کوٹ اور کٹی کوٹ اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ انہی میں سیال کوٹ بھی شامل تھا۔ اس احمق نوعیت کے شواہد حال کے زمانے تک بھی ملتے ہیں۔ کشمیر کے اکثر اہل ثروت کی سیال کوٹ اور اتر سر میں کوٹھیاں اور جائیدادیں موجود ہیں۔ کشمیر کا ریڈیٹ، سربرا میں جہوں کی بجائے سیال کوٹ کو اپنا مستقر بنانا تھا۔ تو دراصل اس تعلق کے لحاظ چکوں کے عہد کی مذہبی نارواداری کے زمانے میں کئی علماء جن میں ملا کمال الدین اور ملا جمال الدین شامل ہیں۔ سیال کوٹ ہجرت کر کے چلے گئے تھے۔ یہ دونوں عالم اپنے عہد کے سائے اسلامی دنیا کے علماء میں اونچا مقام رکھتے تھے۔ سیال کوٹ میں ان کے درس مدرسہ مسجد میاں وارث میں ہوتے اور اطراف و اکناف کے تشنگان علم ان سے استفادہ کرتے تھے۔ انہیں میں تین سربرا درہ علماء، ملا عبداللہ، ملا علی، مولانا شیخ احمد سرہندی المعروف بہ مجدد الف ثانی اور نواب سعد اللہ خان علانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ملا عبداللہ، منطق، فلسفہ، فقہ، حدیث، اور تفسیر میں اپنا عدیل نہیں رکھتے تھے۔ نواب سعد اللہ خان دہلی میں شاہ جہاں کے وزیر اعظم ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ

علوم اور خانہ طور پر ریاضی میں انہیں محققانہ مہارت حاصل تھی۔
یہی ساکھٹ علامہ اقبال کا بھی مولا تھا۔ اردو کے کچھ اور قابل ذکر شاعر اور
ادیب بھی یہیں سے اٹھے تھے۔

میالکوٹ سے ہٹ کر ہندوستان کے اڑیسہ ہندو جیسے دہلی، لکھنؤ وغیرہ میں جو
کشمیری خاندان آباد ہو گئے تھے۔ ان میں بھی وقتاً فوقتاً سرور آوردہ ادیب اور شاعر
اُٹھتے رہے۔ اس دور میں سب سے پہلا نام انشاء اللہ خان انشاء کا آتا ہے جن کے بارے
میں صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کشمیری خوب جانتے تھے اور اس زبان میں شعر بھی کہتے
تھے۔ ڈاکٹر رام بانو سکینہ کا بیان ہے کہ وہ:

"نرکی، پستو، پوربی، پنجابی، مارواری، مرہٹی، کشمیری اور ہندی

بھی خوب جانتے تھے۔ اور ان سب میں شعر کہہ سکتے تھے۔"

انشاء کی ذہانت اور طباعی کا اندازہ کرتے ہوئے ان کے ہندوستان کے کئی زبانوں کو جانتے
کے بارے میں کوئی شبہ نہیں لیکن کشمیری زبان میں شعر کہنے کی صلاحیت ان میں اس
وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی تھی جب تک کشمیر اور اہل کشمیر سے ان کا گہرا ربط نہ رہا ہو۔
انشاء کے کچھ بعد، پنڈت دیاشنکر نسیم ہیں، جنہوں نے اردو کی بڑی شائستہ
ذمت انجام دی اور اس پر اپنی فکر اور فن کے گہرے اثرات چھوڑے۔ پنڈت نسیم
خاص طور پر اردو مثنوی میں ایک بہت اونچا مقام رکھتے ہیں۔ میرسن کی "سحرالبیاء"
کلاسیکی اور مثنوی نگاری کے عروج کا انتہائی نقطہ مان لی گئی ہے لیکن اس
کے ساتھ ہی ساتھ نسیم کی "گلزار نسیم" بھی اپنے مخصوص اسلوب کے عروج کمال کی یادگار
ہے۔ اظہار میں ایجاز کے اس حسن کے ساتھ، اردو میں کوئی دوسری مثنوی، بلکہ کوئی
اور دوسرا شعری کارنامہ پیدا نہ ہو سکا۔ کلاسیکی اردو ادب میں یہ دراصل کشمیری
ذہانت کا ایک شاہکار ہے۔

۱۲۷
 نسیم کا خاندان لکھنؤ میں بس گیا تھا، جہاں ان کی ولادت ۱۸۱۱ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت
 عہد فوجہ حیدر علی آتش کے دہ شہ گرو تھے اور آتش کا اُردو غزل کے ارتقاء میں بڑا
 نمایاں حصہ ہے لیکن جہاں تک ایک منظم تجویز کے ماتحت ایک مکمل کارنامہ کی پیش کش
 کا تعلق ہے، ان کا قلم بھی "گلزارِ نسیم" کے انداز کا کوئی کارنامہ پیش نہ کر سکا۔
 نسیم کا انتقال بہت کم عمری ہی میں ہو گیا لیکن اپنی جوان سالی کی یادگار وہ
 ایک ایسا ہمیشہ بہار کا نام چھوڑ گئے، جو اردو شاعری کے شہ کاروں میں اپنا مقام رکھتے
 گار۔ نسیم کا انتقال ۱۸۴۲ء میں ہوا۔

ہندوستان پر انگریزی سامراج کے تسلط کے ابتدائی دور ابتداء میں چوٹی کا مقام
 رکھنے والے سمن سنگ، حکیم مومن خان مومن، کشمیری نژاد تھے۔ مومن حکیم غلام نبی خان کے
 بیٹے تھے۔ اور وہ حکیم نامدار خاں کے بیٹے، جو شرفائے کشمیر سے تھے، مغلوں کی حکومت کے
 آخری دور میں کشمیری دہلی آکر، شاہی طبیبوں کے زمرہ میں داخل ہو گئے تھے۔ نادر ولی
 انہیں جاگیر بھی عطا ہوئی تھی، جسے انگریزوں نے، ۱۵۰۰ء کی دہائی میں اپنے قبضے میں
 لے لیا اور اس کے عوض میں خاندانی وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ مومن ۱۸۰۰ء میں دہلی میں پیدا
 ہوئے تھے۔ شاہ عبدالعزیز سے ان کے خاندان کے عقیدتمندی کے تعلقات تھے۔ چنانچہ
 انہیں سے مومن نے عربی پڑھی۔ مولانا اسماعیل شہید ان کے ہم سبق رہے۔ مومن کی ذہانت
 اور طباعی کا یہ واقف شہور ہے کہ شاہ صاحب کی تقریر ایک بار سن کر لفظ بہ لفظ
 حفظ رکھتے تھے۔ نجوم بھی سیکھا تھا اور طب جوان کا خاندانی علم تھا۔ اس میں بھی دستگاہ
 رکھتے تھے۔ ان کی وضع داری ضرب المثل ہے۔ ۱۸۴۲ء میں مامس نے دہلی کالج کے فارسی
 کی پروفیسری کے لئے غالب کو طلب کیا اور وہ اپنی وضع داری کو قائم رکھنے کے لئے اس
 سے بغیر ملے لوٹ گئے۔ تو یہ عہدہ حکیم مومن خان کو پیش کیا گیا اور اسی روپیہ تنخواہ مقرر
 ہوئی۔ مومن نے بھی یہ تنخواہ قبول نہیں کی۔ مہاراجہ کپور خیلہ کی طلبی پر ان کے دربار میں

۱۲۸
 جانا اپنی آزاد وضعی کے خلاف سمجھا۔ دہلی میں ہی رہے اور اپنے فن میں گمن۔ ۱۸۶۸ء میں
 کوٹھے سے گر کر وفات پائی۔

مومن سید احمد شہید کے معتقد اور انگریزوں کے خلاف ان کی تحریک حریت
 کے ہمنوا تھے۔ ان کا شاعری میں جگہ جگہ اس کے شواہد ملتے ہیں۔ غزل کے وہ چوٹی کے اساتذہ
 میں سے ہیں۔ گو مختصر مثنوی میں بھی ان کا مقام اونچا ہے۔ غزل کے اظہاری سانچوں
 میں فنی گنجلک پیدا کرنے کے اس رجحان کو جو ناسخ نے شروع کیا تھا۔ مومن نے بہت
 سدھارا، بہت سنوارا اور نتیجتاً اس دلبستان کے امام کا رتبہ حاصل کر لیا۔ شاہ شہید
 اور شاعر ہر عہد غالب کے زندگی بھر بد مقابل رہے اور اپنے زمانے میں مقبولیت کے
 لحاظ سے ان سے برتر بھی سمجھے جاتے تھے۔

خود غالب کے باپے میں والدہ کی جانب سے ان کے کثیر سے رشتہ کا نظریہ ہے
 پہلے پہل میرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے خاندانی بزرگوں کی روایت کی سند پر سجایا
 تھا، غالب صدی کے سال ۱۹۶۹ء میں کچھ اور ضمنی تائیدی شہادتوں کے ساتھ ڈاکٹر
 یوسف حسین خان نے اپنی "غالب اور آہنگ غالب" میں بعض اور نقادوں نے اپنے
 مضامین میں جن میں کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے ترجمان "ادبیات" کے غالب نمبر
 (۱۹۶۹ء) کا ایک مضمون "غالب اور کشمیر" بھی قابل ذکر ہے، یہ نظریہ پھر ابھر ہے۔
 تائیدی شہادتوں میں سے ایک غالب کے نانا، خواجہ غلام حسین کمیدان کے نام
 کے ساتھ "خواجہ" کا احترامی سابقہ، جو کشمیر میں مغرزیں کے نام کے ساتھ علی العموم
 لگا ہوتا ہے اور اگرہ میں اس خاندان کا کشمیریوں کے گروہ میں قیام بھی ہے۔

غالب کے مخلص دوستوں میں مفتی صدر الدین خان آزرہ کا خاندان
 بھی کشمیری تھا۔ آزرہ اپنے زمانے کے سربراہ آزرہ علماء میں سے تھے ان کی
 ولادت دہلی میں ۱۸۹۱ء میں ہوئی۔ شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین اور

مولوی فضل امام جو مولانا فضل حق خیر آبادی کے والد تھے، تعلیم حاصل کی تھی، اور اپنے
عہد میں صاحبِ مسند ہوئے۔ جیسا کہ مالک رام نے لکھا ہے۔
ہندوستان نے اس جامعیت کے بہت کم شخص پیدا کئے ہیں۔
شاہی میں بھی مسندِ افتا پر فائز تھے۔ انگریزی عہد میں بھی صدر
الصدر رہے۔ ساری عمر درس و تدریس میں گزاری اور شاہ جہانی
مدرسہ دارالہقا کو کچھ سے زندہ کیا۔ طالب علموں کے اخراجات کے
خود کفیل ہوتے تھے۔“

مولانا کے شاگردوں میں سرسید احمد خان، مولانا خیر الدین (والد مولانا ابوالکلام آزاد)
نواب صدیق حسن خان اور مولوی فیض الحسن خان قابل ذکر ہیں۔ شعر و سخن کا
عمدہ مذاق رکھتے تھے۔ پہلے شاہ نصیر کو کلام دکھایا کرتے تھے، پھر عجم اکبر آبادی سے
مشورہ سخن کرنے لگے۔ اُردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ مجموعہ
کلام ۸۵۷ اشعار پر مشتمل تھا۔ شعر کا ایک تذکرہ بھی مرتب کیا تھا۔ آزرہ
کا انتقال ۱۸۶۸ء میں ہوا۔

غالب کے کشمیری الاصل شاگردوں میں، خواجہ عبدالغفار جو دفا اور اختر
دونوں تخلص کرتے تھے۔ نواب سید محمد ذکریا خان زکی، خواجہ فیض الدین عرب حیدر
جان شاہین قابل ذکر ہیں۔ خواجہ عبدالغفار کے بھائی خواجہ حفیظ اللہ شاہ اور شہینہ
کی تمہارت کرتے تھے۔ تجارت کے سلسلے میں وہ ڈھاکہ گئے اور وہیں رہ گئے۔ خواجہ
عبدالغفار اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ریختی میں بھی
شعر کہتے تھے اور نزاکت تخلص کرتے تھے۔ زکی کا خاندان دہلی کے معزز سادات میں
شمار ہوتا تھا۔ ان کے والد سید محمود خاں محمود بھی شاعر تھے۔ ”عمدہ منتخبہ“ کے
مؤلف اعظم الدولہ نواب میر محمد خاں سرور، جو کشمیر کے مشہور سخن سنج، محمد جان بیگ

سامی کے شاگرد تھے۔ ان کے نانا ہوتے تھے۔ رزکی نے مولانا امام بخشؒ سے بہائی اور پنڈت رام کشن لبسمل سے فارسی، عربی اور منطق پڑھی تھی۔ طلب بھی بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں دہلی بھڑک کر چلے گئے تھے اور عرصہ تک میرٹھ، گورکھپور، بریلی، الہ آباد اور بدایوں میں رہے۔ محکمہ تعلیم میں ملازم تھے۔ شایقہ، خواجہ خلیل اللہ خاں کشمیری کے فرزند تھے۔ اور یہ خاندان بھی ڈھاکہ چلا گیا تھا۔ میر عبد الغنی سے اس خاندان کی قرابت ہوتی تھی۔ شایقہ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ غالب کے قیامِ مملکت کے زمانے میں غالباً ان کی ملاقات ہوئی تھی۔

--

عروج

پہچلے عہد کے ناکافی اقدامات۔ پرتاپ سنگھ کی مغزولی اور اخباروں کی تحریکیں۔ نظم و نسق کو برطانوی سطح پر لانے کی ضرورت۔ برطانوی ہند سے عہدہ داروں کا تقرر۔ اردو کی مقبولیت۔ دو بھائیوں کا کشمیر کے اُفق پر نمودار ہونا۔ پنڈت ہرگوپال کول خستہ اور پنڈت ساگلم ساک۔ جن ابن علی۔ مولوی محمد عبداللہ وکیل۔

پیرزادہ محمد حسین عارف۔ منشی سراج الدین احمد خان۔ شیخ غلام لغت بند۔ قاضی عبداللہ منظور۔ چودھری خوشی محمد ناظر۔ حبش شاہ دین ہمایون۔ میرزا سعد الدین سعد۔ شبلی کا سفر کشمیر۔ منشی امیر الدین۔ منشی غلام محمد صادق۔ منشی غلام محمد خادم۔ مولانا عبد القدیر بدری۔ حکیم فیروز الدین طغرائی اور ان کے تلامذہ۔ وار کول اوگرہ بٹل۔ مجرم۔ عاجز۔ صبا۔ گنجور۔ ضیاء الدین ضیاء محی۔ بہائی۔ محمد الدین فوق۔ بسمل۔ میرزا مبارک مبارک۔ شیخ غلام حیدر خاں چشتی۔ پیرزادہ غلام احمد مہجور۔ ناز۔ سوشیلانکو۔ بشمب ناتھ رینہ۔ آنند لال رتن۔ سعد الدین چشتی۔ اسد میر۔ نیاز کشمیری۔

چند تواریخ۔ مولوی حسرت احمد کی تاریخ۔ کاہن سنگھ بلاوریہ۔
 پیر نجم الدین عشرت۔ تاریخ جادو۔ مفتی محمد شاہ سعادت۔
 تاریخ جموں۔ ایک مخطوط۔

حکومتی کونسل کی کاروائیوں کی ایک سہل۔ ایک روکاری کی نقل۔
 ایک خیر مقدمی تقریر۔
 ادارے۔

صحافت۔

کشمیر، باہر۔ اقبال۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ آغا حشر۔
 مسرتج بہادر سپرو۔

عروج

اس صدی کے ربع اول کے قریب ریاست جموں و کشمیر کی زندگی میں ہلکے سے ارتعاش پیدا ہونے لگے اور دھیمے انداز میں سہمی، عہد کے تقاضوں کے منشاء کے سبب آہستہ آہستہ قدم اٹھنے لگے۔ یہ عہد مہاراجہ پرتاب سنگھ کے عہد حکومت کے آغاز سے منطبق ہوتا ہے۔ ہندوستان میں برطانوی سامراج کے ماتحت اجتماعی زندگی میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں، ان کا اثر ریاست میں بھی محسوس ہونے لگا تھا۔ نظم و نسق کو جمہوری سطح تک بلند کرنے کے لئے کچھ اقدامات جو کچھ لے رہے تھے وہ عوام کی تلافی نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے جدوجہد برابر جاری رہی۔ نظم و نسق کو برطانوی ہند کے مسائل بنانے کے مقصد سے، برطانوی ہند سے کچھ عہدیداروں کی خدمات مستعار لی گئیں۔ ادیشن اتفاق ان میں سے اکثر اردو ادب اور شاعری کا ذوق رکھتے تھے ان کے اثر سے ادب اور شعر کا ایک نکھرا ہوا انداز نشوونما پانے لگا۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں اردو کی علمی، ادبی اور افادی اہمیت کے مد نظر اسے ذریعہ تعلیم اور ادبی اظہار کا وسیع موقف حاصل ہو چکا تھا۔ اور یہ دفتر، عدالت اور دربار کی زبان بن گئی تھی۔ اس زمانے میں کشمیری ادیبوں کے بیرون ریاست کے ادیبوں سے روابط میں بھی وسعت پیدا ہوئی اور بعض چوٹی کے ادیب کشمیر آنے جانے لگے۔ یہ صحیح ہے کہ مہاراجہ پرتاب سنگھ کی حکومت نے اپنے پیش رو کی طرح

اُردو کی ترقی کے لئے کوئی نمایاں کام انجام نہیں دیا۔ اس کے باوجود عوامی مقبولیت کے بل بوتے پر، اُردو پھیلتی اور پھلتی پھولتی رہی اور اجتماعی اور تعلیمی اور علمی اور ادبی زندگی کے ساتھ یہ زبان ایسی لازم و ملزوم ہو گئی تھی کہ پرتاپ سنگھ کے عہد میں اسے سرکاری زبان قرار دے کر پرتاپ سنگھ کے ہی عہد میں اس حقیقت کو تسلیم کیا گیا۔

مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی دلچسپیاں محدود تھیں۔ ہندو مذہب کی خدمت کا جذبہ انہوں نے والد سے ورثہ میں پایا تھا۔ وہ سناٹن دھرم کے عقاید کے سختی سے پابند تھے۔ انہی کی پشت پناہی سے ریاست میں ایک سناٹن دھرم سمجھا بھی قائم ہوئی اور وہ زمانہ دلچسپی میں اس کے صدر خود تھے۔ اور سیکرٹری پنڈت ساگلرام ساکٹا جو اُردو کے ادیب اور شاعر تھے جنہوں نے آئینہ کاغذ کے خلاف سناٹن دھرم عقاید کی تائید میں کچھ رسالے بھی شائع کئے تھے۔ اور کئی مناظروں میں حصہ لیا تھا، نظم و نسق کی حد تک پرتاپ سنگھ نے اس دھرم کو قائم رکھا، جو زمینیر سنگھ کے عہد میں قائم ہو چکا تھا۔ لیکن اطراف کے علاقوں میں حالات کی سرعت کے ساتھ تبدیلی کے باعث، ریاست کے قروین وسطی کے جاگیردارانہ نظام کو بدلنے کے مطالبے ہو رہے تھے جو مفادات کے مسائل میں سب سے اہم مسئلہ کاشتکاروں کی حالت کو بہتر بنانے کا تھا۔ سالہا سال سے یہ طبقہ استحصال کا شکار تھا اور محصولات کے بارے میں دبا جا رہا تھا۔ ۱۸۸۷ء میں برطانوی حکام کے اصرار پر اراضی کے نئے اصول پر بندوبست کی طرف توجہ ہوئی تھی اور اس کام کے لئے سٹرونگیٹ کا تقرر عمل میں آیا تھا۔ لیکن مورخوں نے لکھا ہے پنڈت طبقہ کی طرف سے اس کی شدید مخالفت ہوئی۔ کیونکہ بڑی زمینوں کے مالک پنڈت تھے۔ آخر سٹرونگیٹ نے مجبور ہو کر اس کام سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد ۱۸۸۹ء میں والٹر لارنس کا تقرر اس کام کے لئے عمل میں آیا۔ اور مورخ میر غلام حسن کھوپہا می کو ان کی اعانت کے لئے مقرر کیا گیا۔ لارنس اور میر غلام حسن کی

محنت اور کوشش سے اراٹھی کے نئے بندہ بلسٹ سے غریب مزارعین کی مشکلات
کچھ رفع ہو سکیں۔ پیر زادہ محمد حسین عارف نے جو اس زمانے میں عدالت کے جج تھے اور کثیر
کے بارے میں ایک نظم "آئینہ کشمیر" کے نام سے لکھی تھی، اپنے ایک شعر میں اس طرف اشارہ
کیا ہے :-

دعائیں جان کو لارنس کے دو یہ ہے طفیل اس کا

زمینداروں کی حالت کو جو کچھ سدا ہوا دیکھا

درباری سازشوں اور فاندانی ریشہ دوانیوں کے باعث ۱۸۸۹ء میں مہاراجہ
پرتاپ سنگھ کے اختیارات سلب کر لئے گئے تھے۔ اس پر ریاست میں اور زیادہ تر
ریاست سے باہر مہاراجہ کے طرفداروں میں شور و غوغا بلند ہوا اور اخباروں میں مہاراجہ کی
موافقت میں ایک مہم کا آغاز ہو گیا۔ باہر سے تحریک چلانے والوں میں زیادہ تر کشمیری پنڈت
تھے۔ جو ملازمت یا کاروبار کے سلسلے میں کشمیر سے باہر مقیم تھے۔ کیونکہ جیسا کہ بہار گلشن کشمیر
کے مرتبین نے لکھا ہے، کشمیری پنڈت ہندوستان میں جہاں کہیں تھے، کشمیر کو اپنا وطن
اور راجہ کو اپنے اقتدار کی علامت سمجھتے تھے۔ اور کشمیر سے باہر جو سرسرا آدردہ شاعر
تھے، جسے پنڈت شیا م لال مشران یکتا وغیرہ قصاید لکھ کر پرتاپ سنگھ کے حضور میں
اپنی عقیدت مندی کا اظہار کرتے تھے۔ پنڈت تر بھون ہجر نے جو اردو کے بلند پایہ
شاعر ہیں پرتاپ سنگھ کی وفات پر ان کا نوہ لکھا تھا۔ حالانکہ دد گرا حکمرانوں سے پنڈتوں
کو شکایت تھی کہ وہ ملازمتوں میں ڈوگروں کو کشمیری پنڈتوں پر ترجیح دیتے ہیں۔
اس کے باوجود جب کبھی مہاراجہ کے اقتدار اور حقوق کا مسئلہ اٹھتا، وہ سینہ سپر
ہونے کے لئے تیار ہو جاتے۔ کشمیر سے باہر پنڈتوں کی جو تنظیمیں تھیں وہ بھی مہاراجہ
پرتاپ سنگھ کی حمایت کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ پنڈت ہر گوپال خستہ اور پنڈت
سالگرام ساک نے مہاراجہ کی حمایت میں باہر سے اخبار جاری کئے۔ کجوباک

میں انجارجاری کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ان اخباروں میں انگریزی حکومت کے خلاف مضامین سخت لٹ لہجے میں لکھتے تھے۔ اُردو کے مشہور شعراء میں پنڈت برج نرائن چکبست اور پنڈت رتن ناتھ سرشار بھی اس مہم میں شامل ہوئے تھے کثیر کے استاد الشعراء منشی امیر الدین امیر نے اپنی ایک نظم میں مہاراجہ کے اختیارات کے سلب ہونے اور حکومت کے لئے کونسل کے قائم ہونے کی طرف اپنے ایک شعر میں اس طرح اشارہ کیا ہے :-

تختِ ایوانِ جلالت کی نہ کچھ پوچھ امیر
راجہ اٹھ بھی نہ تھا غیر سے بیٹھی کونسل

اخباروں کی پمپل کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۹۱ء میں مہاراجہ پرناپ سنگھ کے اختیارات بحال ہو گئے۔ مگر نظم و نسق میں ان کی مدد کرنے کے لئے ایک کونسل قائم ہوئی جس کے صدر خود مہاراجہ اور کونسل کے ایک رکن ان کے بھائی راجہ امر سنگھ تھے جن کے بارے میں بعض مورخین نے لکھا ہے کہ پرناپ سنگھ کے خلاف سازش میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس زمانے کے ایک سربراہ اوردہ شاعر، پنڈت سالگرام سالک نے ایک گیت کے انداز میں ان سازشوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس کا ذمہ دار انگریزوں کو ٹھہرایا ہے۔ گیت کا اقتباس ہے :-

بھوٹ پٹری راجہ کے گھر میں پیڑ لگا بڑھنے دن دن
بھائیوں کو کیا خوب لڑایا، وہی ہے راج فرنگی کا
لاکھوں سال دوشلے فردیں اب گیس کڑی کڑی ہیں
توشہ خانہ سارا لوٹا، وہی ہے راج فرنگی کا

نظم و نسق میں اصلاح کے مد نظر، برطانوی حکومت نے کثیر میں رزیڈنٹ کے تقرر کا مسئلہ اٹھایا۔ مسئلہ اس سے پہلے مہاراجہ گلاب سنگھ اور پھر مہاراجہ رنبیر سنگھ کے

لوگ جو حق آتے اور جب وہ کھیل دیکھ کر لپکتے تو غزلیں اور گیت اور ان کی لے کاڑن میں رچی ہوئی ہوتی اور گنگناتے جاتے۔ ان کمپنیوں میں الفرڈ پارسی تھیٹر لیکل کمپنی اور البرٹ پارسی تھیٹر لیکل کمپنی کے کھیلوں کی ریاست بھر میں اتنی شہرت تھی کہ لوگ ان کو دیکھنے کے لئے بے چین رہتے اور کھیل کے دن ٹھٹھکے ٹھٹھکے جمع ہوتے۔ ان کمپنیوں نے آغا حشر کاشمیری کے ڈراموں کو جموں و کشمیر کے عوام سے روشناس کرایا۔ اور ان کو مقبول بنایا۔ ان کھیلوں کے گانوں، غزلوں اور گیتوں میں راس اور بھانڈوں اور نوابوں کے گانوں سے زیادہ ادبیت ہوتی تھی۔ جن سے عوام اور خواص کے ادبی مذاق کو اونچا کرنے میں بڑی مدد ملی۔ کھیلوں کے مکالمے، ان کے انداز، غزلیں اور گیت عوام اور خواص میں اتنی مقبولیت حاصل کر لیتے تھے کہ شعر لوگوں کے زبان زد ہو جاتے۔ اسی طرح کی ایک مقبول غزل کا مصرعہ ذیل میں درج ہے :

نغاں بن کر ملال خاطر محزون عیاں کیوں ہو

ایک اور غزل جو مقبول تھی۔ اس کا مصرعہ ہے :

جی سے مر کر بھی نہ رشکِ بُتِ ناداں لکلا

غالب اور ان کی غزلیں بھی جموں اور کشمیر کے عوام سے اسی زمانے میں روشناس ہوئیں۔ انہیں لوگ سڑکوں پر گاتے پھرتے تھے اور محفلوں میں انہیں قوال اور دوسرے گانے والے گا کر سناتے تھے۔ غالب کے کلام کی مقبولیت اور اس کی اشاعت کا ایک اور اہم سبب، وہ صاحبِ ثروت لوگ، راج، اور بہاراج جو ہندوستان سے کشمیر کی سیر کو آتے تھے، ان میں سے اکثر گانے کے شوقین ہوتے تھے اور ان کے مذاق کی تشفی کے لئے موسیقی داں، غالب کے کلام کو ساز کے سناتے اور داد اور انعام پاتے تھے۔ معیاری شعراء کے کلام بہادر شاہ ظفر کا کلام اور خاص طور پر ان کی غزل جس کا مطلب ہے :

زمنے میں بھی اٹھایا گیا تھا۔ لیکن انہوں نے بہ لطائف الحیل اسے ٹال دیا تھا۔ اس وقت مہاراجہ کے خاندان اور دربار میں سازشوں کی وجہ سے اس کو ٹالنا ناممکن ہو گیا چنانچہ ۱۸۸۷ء میں کزنل ہندی کشمیر کے پہلے پولیٹیکل پرنسپل رٹ مقرر ہو کر آئے۔ رٹ پرنسپل کے دفتر میں فارسی میں مراسلت کی ضرورت کے مد نظر جو منشی اور عملہ مقرر کیا جاتا تھا ان میں اردو کے بھی کئی اچھے عالم جمع ہوتے گئے جن کو شعر و سخن کا بھی ذوق تھا۔ دو گرا حکومت خاص طور پر مسلمانوں کی کسی طرح کی تنظیم کو، خواہ وہ علمی اور ادبی ہی کیوں نہ ہو، روا نہیں رکھتی تھی۔ اس لئے رٹ پرنسپل کے دفتر کے صاحبان ذوق نے رٹ پرنسپل میں ادبی اجتماعوں کی صورت نکال لی۔ کیونکہ یہاں مہاراجہ کا اقتدار نہیں چل سکتا تھا۔ اس طرح 'رٹ پرنسپل اردو شعر و سخن کے ذوق کو پروان چڑھانے کا مرکز بن گئی۔

ریاست کے نظم و نسق کو برطانوی ہند کی سطح تک اٹھانے کی ضرورت کے مد نظر، نئے اور انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب کی ضرورت تھی، چنانچہ ابتدا میں پنجاب سے کئی اعلیٰ لیاقت رکھنے والے عہدہ داروں اور کچھ منشیوں کی خدمات بھی مستعار لی گئیں۔ عہدہ داروں میں سے چند اردو کے شستہ ذوق رکھنے والے بھی تھے۔ ان میں پیرزادہ محمد حسین عارف اور چودھری خوشی محمد ناظر کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں اصحاب اور خاص طور پر ناظر اردو کے سربراہ اور وہ شاعر تھے۔ ان صاحبان ذوق کے کشمیر میں قیام سے اردو شعر و سخن کے ذوق کو نکھرنے اور ترقی کرنے میں بہت مدد ملی۔

ریاست میں اردو کی مقبولیت اور اشاعت کا دوسرا دور جو انیسویں صدی کے ربع آخر سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں بمبئی کی پارسی تحصیلٹر ریکل کمپنیوں کا بڑا حصہ رہا۔ یہ کمپنیاں جنوں اور کشمیر میں اپنے کھیل دکھاتیں، جن کو دیکھنے کے لئے

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں

اور دوسری غزل جس کا مطلع حسب ذیل ہے :

پس مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلادیا

بہت مقبول تھی۔

جوں و کشیر کے اسٹیج پر جو ڈرامے مقبول تھے۔ ان میں سفید خون، خوبصورت

بلاء، اور چند راولی قابل ذکر ہیں۔ بیتاب کے ڈراموں میں مہا بھارت، کرشن سدا، یہودی کی لڑکی وغیرہ بہت مقبول رہے۔

ان تھیٹر پیکل کمپنیوں کی بدولت جوں و کشیر میں، آفاقی شہر کی شہرت اور

مقبولیت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ صاحبان ذوق اور ادب دوستوں نے ان کی یادگار

میں ایک دن منانے کی تجویز کی، چنانچہ، حشر ڈے، بڑے اہتمام سے منایا گیا۔

اور اس میں شرکت کرنے اور تقریر کے لئے لاہور کے کئی ادیبوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔

ان ادیبوں میں عبدالمجید سالک خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ یادگار تقریب سرنگر

میں ہیڈ و میسوریل اسکول، شیخ باغ میں منعقد کی گئی تھی۔ اور اس کے ساتھ ایک

مشاعرہ نہایت وسیع پیمانے پر منعقد کیا گیا تھا۔ جس میں مقامی شعراء کے علاوہ پنجاب

اور ہندوستان کے کئی شاعروں نے اپنا کلام سنایا تھا۔ اس مشاعرے اور دوسرے

مشاعروں کی روداد اور غزلیں، "پرتاپ" اخبار میں شائع ہوتی تھیں مشاعرے

کی محفلیں اور شائستگی کا ایک مجزہ ہیں۔ ہندوستان کے اور مقامات کی طرح

اُردو شاعری کو مقبول بنانے اور اس کا ذوق پیدا کرنے میں شاعروں کا نمایاں

حصہ رہا۔

ان سارے حالات اور اسباب نے بل جمل کر، کشمیر کو رفتہ رفتہ اُردو کا ایک

مرکز بنا دیا۔ اور اس میں کچھ لسانی اور کچھ تہذیبی ماسبتوں کا تقاضا بھی شامل تھا۔

۱۴۰
 جموں کی ڈوگرہ اُردو کی مُتجانس زبان ہے اور دونوں اپنا بنیادی لفظی سرمایہ ایک سرچشمہ سے پانی ہیں۔ کثیر میں کشمیری اور اُردو دونوں کا تہذیبی پس منظر ایک ہے۔ اس کے علاوہ لفظی سرمایہ میں بھی فارسی کے ماخذ اور ادبی روایات مُشترک ہیں۔

رنبیر سنگھ کے عہدِ حکومت کے آخری زمانے میں کشمیر کی فضاء پر دو بھائی نمودار ہوئے جن کی طرف پچھلے صفحات میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ یہ پنڈت ہرگوپال کول خستہ اور پنڈت سالگرام سالک تھے۔ ان کے والد رام چند کول کا تعلق کشمیر اور پنجاب دونوں جگہ سے رہا۔ چنانچہ یہ دونوں بھائی غالباً لاہور ہی میں پیدا ہوئے خستہ کی تعلیم و تربیت لاہور ہی میں ہوئی۔ یوں بھی اہل کشمیر میں سے اکثر اصحاب جو اپنی اولاد کو عصری ضرورتوں کے مطابق تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ انہیں لاہور ہی بھیجتے تھے۔ سالک کی ابتدائی تعلیم لاہور میں ہوئی۔ اس کے بعد خستہ کو پٹیالہ کے ایک سکول میں ملازمت مل گئی۔ اور یہ خاندان پٹیالہ چلا گیا۔

سالک نے پٹیالہ کالج میں تعلیم حاصل کی۔ کالج میں ان کے فارسی کے استاد مٹھور عالم مولوی امین الدین تھے جنہوں نے غالب کی "قاطع بُرہان" کے سلسلے میں جو لفظی جنگ چھڑ گئی تھی اس میں "قاطع قاطع" لکھ کر غالب کے خلاف نمایاں حصہ لیا تھا۔ سالک کے نوجوان ذہن پر پٹیالہ کے قیام نے جو تاثرات چھوڑے تھے ان کو انہوں نے رجب علی بیگ سرور کے "فسانہ عجائب" کے دیباچہ میں لکھنؤ کی توصیف کے انداز پر اپنی مُصنّف "داستانِ جگت روپ" کے دیباچہ میں قلمبند کیا ہے۔

پنڈت ہرگوپال خستہ پٹیالہ کے ایک سکول میں مدرس رہے یہاں اپنے ایک شاگرد کی تعلیم کے لئے انہوں نے حافظِ نذیر احمد کی "مرآۃ العُروس" کی طرز کا ایک مختصر قصہ نگارِ نواید کے نام سے لکھا تھا۔ اس میں ایک من میناں بیوی اپنی

۱۴۱
لو کی خوش قسمت کو مکالموں کی شکل میں عام معلومات کا درس دیتے ہیں۔ یہ قصبہ
۱۸۶۹ء میں لکھا گیا تھا۔ اس کے اختتام پر خستہ لکھتے ہیں :-

"اس بندہ گوپال عبودیت افعال لذ بہرہ مند رام چند ابن ہما دیو
کوئی خصوص خطبے نظیر کثیر وارد پٹیلالہ نے ان سفید ورقوں کو
حروف سیاہ کی پوشش دی۔"

اسی زمانے میں مہاراجہ رنبیر کی ہندو مذہب کی سرپرستی اور جیا کر سالک نے
لکھا ہے :- "دھرم کرم کے کاموں میں ان کی شہرت کی خبریں اخباروں میں پڑھ کر
دونوں بھائیوں کو کثیر لٹنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور کثیر لوٹ کر پنڈت ہر گوپال کچھ
عرصہ ایک اسکول میں مدرس رہے اور مطبع تحفہ کثیر کے منیجر اور تحفہ کثیر کے ادیٹر
بھی رہے۔ لیکن یہ خدمت انہوں نے جلد ترک کر دی۔ اور دیوان انت رام کی
محرفت مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار میں باریاب ہوئے اور وقایع نگاری یا اخبار
نویسی کی خدمت پر مامور ہو گئے۔ اس طرح انہیں رنبیر سنگھ کے قریب رہنے کے
سوانح نصیب ہوئے۔ مہجر ہینڈرسن نے جو اس زمانے میں کشمیر میں تھے، ان کی سفارش
کرنل ہنری کے پاس کی۔ اور حسب ضرورت ان کی خدمات سے استفادہ کا مشورہ
دیا۔ جس کے سبب خستہ کار سوخ رینڈیڈنسی میں پیدا ہو گیا اور اپنے اثر سے کام لے
کر انہوں نے سالک کو رینڈیڈنسی میں ملازم رکھوا دیا تھا۔

اس زمانے میں کشمیر میں سخت قحط پڑا تھا اور مہاراجہ رنبیر سنگھ کے خلاف
یہ منجبری کی گئی تھی کہ وہ لوگوں کے لئے غلہ کا انتظام نہ کر سکنے کے سبب انہیں بوزوں
سے بھر کر کشمیر میں بھجواتے اور دلر جھیل میں ڈبو دیتے ہیں۔ اس پر برطانوی ہند
کی حکومت نے مہاراجہ سے باز پرس کی اور مقدمہ غیر قبیحہ کی ان کے خلاف قائم ہو گیا۔
کسی نے مہاراجہ کو یہ سمجھائی کہ انگریزوں کے پاس منجبری کا کام ہر گوپال خستہ کا ہے۔

۱۳۲
جنہوں نے اپنے بھائی کے توسط سے جنہیں رزیدنسی میں اس غرض سے پہلے ہی نوکر رکھوایا
تھا۔ مہاراجہ کے خلاف بختری کی ہے۔ اس پر مہاراجہ دونوں بھائیوں سے بدظن ہو گئے
اور ان پر ایک مقدمہ قائم کر کے جوں میں باہو کے قلعہ میں قید کر دیا۔ لیکن سالک
ایک ترکیب سے قید سے بھگے۔ اور سالک کو پہنچے جہاں ہر گوپال بھی رہائی کے
بعد پہنچ گئے۔ اور ۱۸۸۲ء میں ایک ہفتہ دار خیر خواہ کشمیر کے نام سے جاری کیا جس میں
مہاراجہ رنبیر سنگھ کے خلاف مضامین لکھ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالتے رہے۔ آخر
۱۸۸۵ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کی وفات کے بعد دونوں بھائی کشمیر لوٹے اور یہاں
پنڈتوں کے سماج سدھار، بیواؤں کی شادی اور تعلیم نسوان کے کاموں میں حصہ
لیتے رہے۔

خستہ اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے اور گلزارِ فوائد کے علاوہ کشمیر کے ایک
جغرافیہ اور ایک تاریخی تصنیف "گلستہ کشمیر" کے بھی مصنف ہیں۔ شاعری میں
تخلص انہوں نے غالب کے چہیتے شاگرد میرزا ہر گوپال ٹفٹہ کے اتباع میں اختیار
کیا تھا۔ مولفین "بہارِ گلشنِ کشمیر" نے ان کا تذکرہ فارسی شاعر کی حیثیت سے کیا ہے۔
لیکن لکھا ہے کلام دستیاب نہ ہو سکا۔ خستہ کے اردو کلام کا ان مولفین کو پتہ نہیں
تھا۔ وہ غزل کہتے تھے اور کئی مثنویاں بھی لکھیں تھیں۔ ان کی غزل کے کچھ شعر ہیں:-
کیا بھر دسبے دم کا اے آدم! دم تو ہر دم گیا ہوا دیکھا
صعبتِ میرزاں دنیا میں آشناؤں کو ڈوبتا دیکھا
خوب ڈھونڈا جہاں میں اپنے خستہ خستگی کا نہ آشنا دیکھا

گلستہ کشمیر جو نشر میں ہے خستہ کا اہم کارنامہ ہے۔ اس کی تکمیل ۱۸۸۲ء
میں ہوئی۔ یہ تاریخ محمد حسین آزاد کے مرنے کے بعد ہلالِ ایشیہ کی نظر سے گزری تھی جو
اس زمانے میں پنجاب میں ناظمِ تعلیم تھے۔ یہ کشمیر کی ضمیمہ تاریخ ہے اور مہاراجہ رنبیر سنگھ

۱۴۲
 کے حالات پر ختم ہوتی ہے۔ رنیر سنگھ کے حال میں ان کی دلچسپیوں کا بیان لکھا ہے۔ اس سے ان کے کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ لکھتے ہیں :-

”چال چلن حضور مدوح کا یہ ہے کہ روزِ اول سے آج تک اپنے مذہب ہند میں نہایت پکے، ثابت قدم اور راسخ الاعتقاد ہیں۔ علی الصبح، اشان دھیان گیان سے فارغ ہو کر پوجا پاٹ نیت، دھرم کرم کر کے . . . برہمن سید خواں و شاستروں کے ساتھ گفتگو فرما کر اصل وقایق و نکات شاستر فرماتے ہیں۔ ایسا کوئی ہی علم ہوگا، جس کی ماہیت سے حضور والا ماہر نہیں۔ کشمیر و خاص جوں پر منڈل کوہستان جموں میں جہاں کوئی سادھو بیٹھ گیا، وہیں مندر اور دھرم ارتھ بنوا دیے۔“

گلدستہ کے دیباچہ میں انہوں نے اپنی اور تصانیف ”گوپال نامہ“ ”چہار گلزار“ ”شگفتہ بہار“ ”حزن اختر“ معروف برگل بہار اور ”سوانح عمری خستہ“ کا تذکرہ کیلئے۔ جواب دستیاب نہیں۔ ”گوپال نامہ“ جو قلعہ باہو میں قید کے زمانے میں لکھی گئی تھی کے کچھ اشعار ان کے متنبی نواسے پنڈت شیو نارائن فوطیدار صدر قانون ساز کونسل ریاست جموں و کشمیر کے حافظ میں مخصوص ہیں۔ ذیل کے شعر انہیں کی زبانی سن کر یہاں درج کئے جا رہے ہیں۔ اس میں اپنے باہو کے قلعہ میں قید کے لئے جانے کی تفصیل بیان کی ہے :-

سپاہی ہوئے پھر تو ہمراہ مرے کچھ ایدھر ادھر، کچھ دے کچھ پرے
 کوئی ہاتھ میں لے کے تیغ و دودم کوئی کر کے سنگین بندوق خم
 چلا تھا نہ راہی جو فرسنگ بھی تو چلنے میں گھبرا اٹھا اس کا جی

اس مثنوی میں مقدمہ غرقیدگی کی تفصیل بھی لکھی ہے اور اس کا آغاز کلاسیکی انداز میں اس طرح کیا ہے :-

۱۔ پنڈت شیو نارائن کا شہزادہ میں انتقال ہو چکا ہے۔

۱۲۲
 پلاساقیا محمد کو جام شراب کر ہوتی ہیں اب کشتیاں غرق آب
 خستہ کی ایک اور مشنوی "ہیہ مال دنگ رائے" بھی تھی، جو چھپ چکی تھی، لیکن اب
 دستیاب نہیں ہوتی۔ اس کا ایک شعر جو مٹر رام جو لائبریرین، ریسرچ لائبریری کے
 ذہن میں محفوظ رکھا ہے اور انہوں نے مجھے سنایا، وہ یہ ہے:
 رفیقو ہے یہ اب گوپال کا حال ہوا ہے خستگی سے سخت پامال
 سالک کی مشنوی "سندر برن" کے لئے انہوں نے تاریخ بھی لکھی تھی جو اس کے خطوط
 میں شامل ہے۔

خستہ کا انتقال جنوری ۱۹۲۳ء میں ہوا۔ صحافت سے ان کا گہرا تعلق رہا تھا۔ اور
 جس زمانے میں وہ کشمیر بدر کر دیئے گئے تھے اور بعد میں بھی کشمیر میں رہتے ہوئے کئی اخبار
 نکلے تھے، جو لاہور سے شائع ہوتے تھے۔ ان اخباروں کے نام حسب ذیل ہیں۔
 تحفہ کشمیر، راوی بے نظیر۔ ریفارمر۔ پبلک نیوز۔ دلش پکار۔ خیر خواہ کشمیر
 پنڈت سالگرام سالک خستہ سے دو برس چھوٹے تھے اور ۱۸۵۰ء میں پیدا
 ہوئے تھے۔ وہ اچھے شاعر، منتر نویس اور کئی قانونی کتابوں کے مصنف تھے۔ انہوں نے
 ایک ضخیم دیوان، ایک مشنوی اور ایک منتری داستان یادگار چھوڑی ہے۔ دیوان غزلوں
 کچھ نظموں، قصیدوں اور گیتوں پر مشتمل ہے۔ غزل وہ سلیقے سے کہتے تھے۔ ذیل میں
 چند شعر درج ہیں:

گر اب محبت سے ہوا کوئی نہ جاں بر
 یہ بحر وہ ہے جس کا کنارہ نہیں ہوتا
 بے وجہ نہیں کارِ زباں آنکھ سے بیتے
 خالی کوئی عیلت سے اشارہ نہیں ہوتا۔

۱۴۵
کعبہ دل میں مرے گھر ہے بتوں کا سالک
بُت ہے کعبہ میں مرے، کعبہ بُت خانے میں

دھڑلہ ہے دیا قبر پر مری کہ جلوں میں
اللہ رے کیف مرے مکار صنم کا

ایک نظم جس میں خدا کی قدرت کے کرشمے بیان کئے ہیں، کے چند شعر ہیں۔
 ذرا دیکھو تو تم قدرت خدا کی زمین کیسی بنائی اس نے خاکی
 سجایا ہر دم سے کیا فلک کو ضیاء پروین کو کیسی عطا کی
 کسی کو آب میں اس نے بسایا کسی کو مملکت بخشی ہوا کی
 غرض چھوڑی بڑی جو شے ہے موجود نشانی ہے وہ شان کبریا کی
 سمجھ کچھ بھی سمجھ سکتی نہیں ہے زباں گونگی ہے یاں فجر رسا کی
 اُن کی مثنوی "سندربن" کشمیر میں لکھی ہوئی کلاسیکی انداز کی مثنویوں میں اہم ہے۔
 یہ مثنوی انہوں نے قلعہ باہو میں قید کے زمانے میں لکھی اور اس کی تصنیف کے
 سلسلے میں انہوں نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک دن کسی کو میر حسن کی اس مقبول
 مثنوی کو بکاوازے سے پڑھتے سنا اور ان کے دل میں بھی اسی بحر میں مثنوی لکھنے
 کا خیال پیدا ہوا۔ سندربن اور بن موہنی کی یہ داستانِ محبت ۱۸۸۱ء میں
 کشمیر کے بکاواچی۔ سالک اور پٹنٹ، ہرگوپا اچھاری دو دنوں نے تاریخیں کبھی تھیں خستہ
 کی تاریخ غرض ہی میں "المحبوبہ و المکارم" سربراہ ہزار ہے۔

مثنوی نوذری تھاپر سے پڑ ہے۔ پری "دیپک علاوہ" ناگ اس کے اعموہ
 کردار ہیں بوکشیر کے کلاسیکی کاغذوں کے ساتھ خصوصیت لکھتے ہیں بکشیہ کی

دیو مالیں ناگ انسان بھی پیر، ایک قوم اور سانپ بھی۔ جیسا کہ کشمیر کی مشہور کلاسیکی داستان "ہی مال و ناگراے" سے ظاہر ہوگا۔ مثنوی کی زبان صاف اور اسلوب بیان دلچسپ ہے اور قصے کے ارتقاء کے دوران کئی دلکش مرقع اس میں کئے ہیں۔ مثال کے طور پر رتوں پری سندربدن پر عاشق ہو کر اسے پرستان اڑا لاتی ہے، لیکن بزرگوں کے خوف سے اسے ایک مورہت کر پاس رکھتی ہے۔ مور ایک فقیر کے منتر کی مدد سے انسان بن کر گھر بھاگ آتا ہے اور اپنی رانی من موہنی کے ساتھ بیٹھا ہوا محفل سرور جماتا ہے۔ ایسے ہی رتوں پری کی جاسوس پریاں اسے ڈھونڈتی ہوئی دال پہنچتی اور اسے اڑا کر پرستان لے جاتی ہیں۔ اس موقع پر رتوں پری کی شعلہ خونی قابل دید ہے۔ کہتی ہے:

غضب سے ہوئی شعلہ سی شوخ رنگ
ہو ارشک سے اس کا دل سخت تنگ
پھر اس نے یہ سندربدن سے کہا
کہ اے بد لحاظ اور اسبے حیا
دفا کی نہیں سمجھ میں کچھ ہو مگر!
ابھی خارِ رنجش سے ہے بے خبر
کلام بزرگاں نہیں ہے اثر
یہ سچ ہے مرکب، بہ شر ہے بشر
مردا، ہجر میں میں تھے اور تو
نرے سے لگا دے گلے غیر کو

سانک کی ایک اور مشہور مثنوی "مسی پنوں" ہے۔

نشریہ، انہی نے "فراتر" میں "کے انداز" ایک داستان "داستان

جنگت روپ کے نام سے لکھی تھی، جس میں جنگت روپ اور روپ دنتی کی محبت کی روداد ہے۔ جنگت روپ پر ایک کمار کی عاشق ہو کر اسے اپنے یہاں قید کر رکھتی ہے۔ یہاں بھی وہ ایک جوگی کے منتر سے قید سے چھوڑ کر بھاگتا ہے۔ داستان کے دیباچہ میں ساکنہ نے لاہور کی توصیف لکھی ہے جس کا اقتباس درج ذیل ہے :-

”اٹھ اٹھ شہر لاہور ہے کرتبلی ناز کوہ طور ہے۔ جب اس کے گلی کوچوں کی یاد آتی ہے، بے ساختہ ایک آہ نکل جاتی ہے اور درد جھڑائی سے آنکھوں سے آنسوؤں کی مالاگلے کا مار ہو جاتی ہے۔۔۔ ہند کی آبادی کی طرح و دفع کے ڈھنگ، یاروں کی دلشادی اور لنگوٹہ یاروں کی بچپن کی صحبتوں کے رنگ جب یاد آتے ہیں تو ہم کبھت، ہم کبھت کہہ کر بے تکاشا چلاتے اور بے ہوش ہو جاتے ہیں۔“

اسی انداز سے پٹیلہ کی تعریف بھی کی ہے۔ کشمیر کے مناظر پر انہوں نے کئی انشائیہ لکھے تھے جن کا مجموعہ ”گنجینہ فطرت“ یا ”مناظر کشمیر“ کے نام سے اکٹھا کیا تھا۔ ان انشائیوں کا انداز ماسٹر رام چندر اور ذکاء اللہ کے انشائیوں، حبیب اللہ ان کی مزید تصانیف حسب ذیل ہیں :-

- ۱۔ سوانح عمری مہاراجہ گلاب سنگھ۔ ۲۔ جنگت روپ کا عبرت ناک منظر۔ ۳۔ کشمیر کا مقدمہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی معزلی سے متعلق مضامین جو ”خیر خواہ کشمیر“ میں ضمیمہ کے طور پر شائع ہوئے تھے۔ ۴۔ تعلیم۔ ۵۔ شاستر ارتھو۔ ۶۔ مودتی مٹرن۔ ۷۔ کتاب دیانندوں کی مشکلات۔ ۸۔ دھرم اپدیش۔ ۹۔ تربید الہام۔

۱۰۔ رسالہ حق پرستی۔ ۱۱۔ کشمیری ریڈر تین حصوں میں۔ ۱۲۔ اُردو محاورات۔
 ۱۳۔ اُردو قواعد۔ ۱۴۔ خطوط جو سالگ نے اپنے عزیزوں اور احباب
 کے نام لکھے تھے۔

ان کے علاوہ انہوں نے قانونی شہر میں بھی لکھے تھیں :-

۱۔ شرح رمیر ڈنڈ بدھ۔ (قانون تعزیرات ریاست)۔ ۲۔ شرح
 ضابطہ دیوانی۔ ۳۔ شرح قانون میعاد سماعت۔ ۴۔ شرح قانون
 رسوم اور اسٹامپ۔ ۵۔ شرح قانون مطالبات خفیفہ۔ ۶۔ شرح
 قانون رسوم اور اسٹامپ۔ ۷۔ شرح قانون اجرائے ڈگری۔

صحافتی ماسعی میں وہ اپنے بھائی کے ساتھ شریک رہے۔

کشمیر کے اہل فکر اور اہل نظر مصنفین ہیں، جنہوں نے اپنے ذاتی شوق
 اور لگن سے علمی دنیا میں ایک اونچا مقام حاصل کیا۔ ابوالخامد نیشی حسن ابن علی تھے۔
 ان کے دادا محمد بیٹ شیخ پورہ تحصیل بڈگام کے رہنے والے تھے اور سارا گاؤں ان کی ملکیت
 میں تھا۔ سکھوں کی واروگیر کے زمانے میں وہ اپنا گاؤں چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ اور سرنگر
 میں محلہ نادپورہ میں مقیم ہوئے۔ یہاں اب تک یہ خاندان آباد ہے۔ جب سکھوں نے
 اس گاؤں پر اپنا قبضہ کر لیا۔ تو انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ عزت و آبرو سے
 بچ گئے۔ رنی نگر میں اپنی گذر بسر کے لئے انہوں نے شالباہی کا کاروبار اختیار کیا۔
 یہ کاروبار اس زمانے میں بھی منفعہ بخش تھا۔ دادا کے انتقال کے بعد ان کے
 دادا علی محمد کربانی نے یہ کاروبار سنبھالا۔ کاروبار میں اتنی فراخی نصیب ہوئی کہ
 تمام اپنے زمانے کے مشہور لوگوں بلکہ رئیسوں میں شمار ہونے لگے تھے۔ غالباً کشمیر
 کے دو پہلے مسلمان تھے جنہیں کربلے علی کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ اور کربلا
 سے لوٹنے کے بعد ان کے نام کے ساتھ خاندانی نسبت "ہاشمی" کی بجائے "کربانی"

کی نسبت استعمال ہونے لگی تھی حسن ابن علی اپنی خود نوشت میں لکھتے ہیں کہ مجھے شعور پیدا ہونے کے بعد میں نے اپنے والد سے "کربلائی" کی وجہ تسمیہ دریافت کی۔ جواب کچھ پہل سا ملا۔ اس سے میری تسلی نہ ہو سکی اور میں اس معاملے کی تہہ تک جاننے کے لئے اس قدر بے تاب ہوا کہ آخر الامر میری زندگی کی کش مکش کا یہی ذریعہ بن گیا اور یہیں سے اس کا آغاز ہوا۔

حسن ابن علی کی ولادت ۱۲۶۸ھ میں ہوئی تھی۔ ابتدائی عربی اور فارسی کی تعلیم مکتب میں حاصل کی اور اپنے شوق سے اردو سیکھی، انگریزی میں بھی تھوڑی بہت مہارت پیدا کر لی تھی اور سنسکرت سے بھی واقف تھے۔ لیکن اپنی ذہانت خداداد اور شوق سے علوم نقلیہ اور عقلیہ میں اتنی استعداد پیدا کر لی تھی کہ کئی اہم تصانیف کے مصنف ہوئے۔ کثیر کے مسلمانوں میں غالباً وہ پہلے شخص تھے۔ جنہیں اپنی قوم کی علمی اور اخلاقی زولوں حالی کا احساس پیدا ہوا۔ اور انہوں نے سرسید احمد خان کی طرح اپنی قوم کی حالت سدھارنے کے لئے اپنے بہت ہی محدود وسائل کے ساتھ وہ سب کچھ کرنے کی کوشش کی، جو سرسید نے اپنے ذاتی اثر و رسوخ، جدوجہد اور اپنے کئی اہم خیال اور مخلص احباب کی مدد سے وسیع پیمانے پر ہندوستانی مسلمانوں کے لئے انجام دیا تھا۔ سرسید اور حسن ابن علی کی کوششوں کے سمتوں میں کئی نقاط مشترک ہیں اور شاید اپنے ترقی پرور رجحانات میں وہ سرسید احمد خان سے کچھ آگے ہی تھے۔ ان کے سوچنے کے انداز میں انٹر اکیٹ کے شمولیتے ہیں۔ چنانچہ اپنی خود نوشت میں جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے اپنے والد سے "کربلائی" کی نسبت کے بدلے میں ناشانی جواب سن کر ان کے ذہن میں اس طرح کے خیالات پیدا ہونے لگے تھے۔

"انسانوں میں سرمایے کی وجہ سے ہی درجہ بندی ہو سکتی ہے اور

فات پات کا سارا دار و مدار اسی پر ہے۔ چونکہ میرے والد صاحب نے تجارت میں نمایاں ترقی حاصل کر کے بدلتی حکمت کے ساتھ درآمد برآمد کا کام چاری کیا۔ نیز ٹرانسپورٹ کی وقتوں کے باوجود اٹلیاں کشمیر میں سب سے پہلے زیارت کر بلائے معلیٰ کا شرف حاصل کیا۔ جس کی وجہ سے بڑا تو درکنار، کربلائی کا خطاب نام کے ساتھ دم تائے کی طرح لگ گیا۔ جو کہ ایک غریب کو حاصل ہونا مشکل ہے۔
آگے وہ سوچنے لگتے ہیں،

”اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیوں ایک غریب کو جو دنیا میں برابر کا حصہ دار ہے اور کاروبار میں امیر سے کہیں زیادہ پیش پیش ہے یہ مراعات نصیب نہیں؟ عام طور پر اس کے جواب میں لفظ قسمت آجاتا ہے، جس کی معقولیت میرے ذہن و ذکاؤ سے باہر ہے، کیونکہ ایسے عقیدے کی رو سے خداوند کریم کے صفات ثبوتیہ اور عدالت میں نقص لازم ہوتا ہے، حالانکہ وہ عادل ہے، ظالم نہیں۔ دنیا میں کچھ ہوا دکھ، سب انسانوں کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔ بہر حال میرے خیال میں امیر اور غریب دونوں طبقے اپنے اپنے اعمال کے لئے یکساں طور پر ذمہ دار ہیں۔“

یہ خیالات انیسویں صدی میں کشمیر کے ایک مسلمان کے قلم سے، بہت عجیب معلوم ہوتے ہیں۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد والد نے انہیں تجارت میں مشغول کرنا چاہا، لیکن کہتے ہیں کہ میرے دماغ میں اس قدر انقلاب آچکا تھا کہ ایسے کاموں میں سخت متغیر ہو گیا تھا کہ اس زمانے میں کچھ انگریز پادری اور ڈاکٹر کشمیر آنے لگے تھے۔

درگن میں، جہاں اب سینے کے امراض کا ہسپتال ہے، تبلیغی مشین کی جانب سے ایک ہسپتال بھی کھولا گیا تھا۔ حسن ابن علی کو انگریزی پڑھنے کا شوق ہوا تو والد سے چھپ کر ہسپتال کے ڈاکٹر کے پاس گئے اور اس سے اپنی خواہش ظاہر کی۔ ڈاکٹر اس شرط پر راضی ہوا کہ وہ خود اسے کشمیری زبان سکھائیں۔ غرض ہفتہ طور پر وہ دو سال تک انگریزی سیکھتے رہے اور اتنی استعداد بہم پہنچائی کہ انگریزی اچھی طرح لکھنے پڑھنے لگے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ خود ان کے الفاظ میں "ملاؤں کے فتوے کے مطابق انگریزی بولی ہی کو کفر سمجھی جاتی تھی۔" کچھ لوگ جب ان کے پاس انگریزی میں خطوط یا تار لکھوانے اور پڑھوانے کے لئے آئے لگے۔ تو گھر کے لوگوں پر یہ راز کھلا، اور ہر طرف سے لتاڑ پڑنے لگی، لیکن حسن ابن علی نے سب کو یہ یقین دلایا کہ انگریزی پڑھنے کے باوجود اپنے عقائد میں یکے ہیں۔

اپنے انگریزی سیکھنے کے سلسلے میں جو جنتیں اٹھانی پڑیں، اس کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"در حصول زبان انگریزی، بسیار تکلیف برداشت کرده ام
 کہ ذکر آن طولی میسر دارد آن وقت بسبب عدم
 مدرسہ و سامان آن بسیار مشکل بود چونکہ شوقی کامل و ذوقی
 تمام داشتہم بہ سبب آن تحمل تکالیف و مصارف آن برداشت
 کرده [چیزی حاصل کردہ ام]۔"

حسن علی کی پہلی ملازمت، عدالت صدر کے محکمے میں ہوئی تھی، لیکن دو سال کے اندر یہ ملازمت ترک کرنی پڑی۔ اس کا واقعہ یوں بیان کیا ہے کہ ایک مقدمہ میں ملازموں کی جانب سے رشوت آئی، جس میں سے پانچ سو روپیہ ان کے حصے میں بھی آئے، شام میں خوشی خوشی یہ رقم، لا کر جب والد کے سامنے رکھ دی۔ تو وہ ایسے

ناراض ہوئے کہ دوسرے دن سے ملازمت ترک کرنے کی ہدایت کی اور روپیہ لے جا کر
 کسی مکان کے حوالے کر دیا۔ اسی اثناء میں درگن ہسپتال میں ڈاکٹر نے ایک پادری
 سے انہیں بلایا، جو سرنگرم میں مشن اسکول قائم کرنے کے مقصد سے آئے تھے اور
 انہیں کسی استاد کی تلاش تھی۔ جب یہ خدمت حسن علی کو پیش کی گئی تو انہوں نے
 اسے خوشی سے قبول کر لیا۔ اب اسکول کے لئے مکان کی تلاش ہوئی۔ پادریوں کو کوئی
 مکان کرایہ پر نہیں دیتا تھا۔ حسن ابن علی نے مکان اپنے نام کرایہ پر لیا۔ اور مدرسہ
 قائم ہو گیا۔ ایسے مدرسے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ طلباء کی کافی تعداد اسکول میں داخل
 ہو گئی اور یہ سارے طلباء پنڈت تھے لیکن مہاراجہ رنبیر سنگھ گورنمنٹ سیکولر سے جو
 نفرت تھی۔ اس کا ایک واقعہ بھی حسن ابن علی نے اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک
 دن پنڈت سورج مٹھ مہاراجہ کے بھیجے ہوئے ان کے پاس آئے اور یہ حکم سنایا کہ
 مہاراجہ بہادر آپ کو تھوڑا بلاتے ہیں۔ لکھتے ہیں:-

”میرے حواس باختہ ہوئے کیونکہ میں سری سرکار والا، مہاراجہ رنبیر
 سنگھ صاحب بہادر کی طبیعت سے ابھی طرح واقف تھا۔ ہر چند
 میں پنڈت صاحب موصوف سے سرکار کے چھپے یاد کرنے کی وجہ پوچھتا
 رہا مگر وہ اپنی لاعلمی کا اس بارے میں اظہار کرتے رہے۔ الغرض
 مضطرب الحال میں ان کے ساتھ ہولیا۔ اور اقبال ذخیراں کسی
 طرح محل شاہی تک پہنچ کر دربار جلالت آثار میں حاضر ہوا اور
 آداب شاہی بجالایا۔ تو اشارتاً بیٹھنے کا حکم ہوا۔ تھوڑے وقفہ
 کی خاموشی کے بعد سرکار نے للکار کر مجھ سے کہا۔ ”تم شیعہ ہو اور
 مابعدیت نے بہتیرے احسانات تم لوگوں کے ساتھ کئے ہیں۔ پھر
 کیا وجہ ہے کہ تم مابعدیت کی احسان فراموشی کرتے ہو اور خلاف مذہبی

۱۵۳

ہمارے ہمارے احکام کی کھکے، انگریزوں کو یہاں مدرسہ قائم کرنے میں مدد دے رہے ہو۔ اگر تمہیں زکری کی ضرورت ہے تو میرے مدرسے میں یا کسی اور محکمہ میں، جہاں تمہاری مرضی ہو درخواست دے دو میں مستوری دے دوں گا۔

یہ حکم سن کر انہیں کچھ کہنے کی جرات نہیں ہوئی اور آداب بجا کر رخصت ہوئے تو سیدھے پادری صاحب کے بنگلے پر پہنچے اور یہ سارا واقعہ حرف بہ حرف ان کے سامنے دہرایا۔ پادری نے ریڈیٹرٹ کی معرفت اس کا افساد کروایا۔ یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ — ”یہ آپ میری خوش قسمتی سمجھیں یا بد قسمتی۔ میرے سر پر انگریزوں کی تہذیب کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ اس لئے میں حسب دستور مدرسے میں کام سرانجام دیتے رہا۔“ اسی انگریزی تہذیب کے شوق میں حسن علی نے انگریزی لباس بھی پہننا شروع کر دیا تھا۔ حالانکہ اس پر بھی ان کے کدھان بن جاتے کا بہت چرچا ہوا۔

انگریزوں کے ساتھ رہ کر کام کرنے کی وجہ سے حسن ابن علی، ان کی طرز معاشرت طریقہ کار اور مغربی علوم کی افادیت سے بخوبی واقف ہو چکے تھے اور اپنی تصانیف میں جگہ جگہ اس بارے میں اظہار خیال بھی کیا ہے مثلاً ”میزان التحقيق“ کے ابتدائی حصے میں وہ لکھتے ہیں :

”یہ امر کاشف فی النهار آشکارا ہے کہ اس زمانہ شریف و عہد مسعود میں کہ بہترین جہود اور خوشترین سنیں تصور کیا جاتے ہیں یکے علوم غریبہ و فنون شریفہ ظاہر ہو کر بنی نوع انسان میں عقل انسانی نے کیا عروج کیا ہے جس سے ”وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ“ کی بہار جلوہ گر ہو گئی ہے۔ طالب علموں نے علوم متنوعہ مثل ہندسہ

ہیت و حکمت و کلام و غیرہ معقولات میں یہاں تک ترقی کی ہے کہ ارب خلعت اشرف المخلوقات افراد بشر کے اجسام پر بہت اچھا معلوم ہوتا ہے اور اس ترقی علم کا بدیہی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کیے آلات غریب و اشیائے عجیب ایجاد ہو گئے ہیں جو کہ متقدمین کے جہور حکما کے ذہن ادراک سے خارج تھے غرض وہ فوائد و غوائد ، حکمائے یونان کو بھی کہاں نصیب ہے، جن سے آج کل انگریزی حکومت کی بدولت لوگ مستفید ہوتے ہیں اس میں کچھ جائے مبالغہ نہیں کہ اگر حکمائے سلف مثل سقراط و بقراط و غیرہم آج دنیا میں ہوتے تو طالب علم بن کر انگریزی مدارس میں تعلیم پاتے۔“

آگے علم کی اہمیت بتائی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ علوم عقلیہ کی ترقی نے لوگوں کے خیالات کو مرکز اعتدال سے منحرف، کبھی کمزور یا بے علم کی افادیت کے اسی شعور نے انہیں ان کے سیکھنے پر ابھارا تھا :

”در علوم عقلیہ مثل ہند و فلسفہ و ہیت و نجوم ہم از شوق و ذوق خود عبوری دارم چه انسان بے علم حکم داب است۔ و آموختن زبان چیزی دیگر است و علم چیزی دیگر۔۔۔۔۔“

حسن علی کی ساری زندگی، اس طرح طلب علم اور اس کے ساتھ ساتھ قوم کی فلاح و بہبودی کے وسائل سوچنے میں گزری۔ خود نوشت میں لکھتے ہیں :

”مگر از دیدن حالات و زوال قوم خود بسیار کبیدہ خاطر بستم، چرا کہ دریافت علمی و اخلاقی بسیارست شدہ اند چند بار بذرایع مختلف در اصلاح قوم خود مساعی شدہ بودم لیکن

انوس کے برسخن من گوش نکردهم خیال من نشده۔
 اس سے ایک سال پہلے خاص طور پر شیعیان کثیر کی ہدایت کے لئے انہوں نے
 مولوی حیدر علی کے ساتھ مل کر انجمن امامیہ قائم کی تھی جس کے بارے میں بتایا
 کہ — "از مخالفت سران قوم ترقی انجمن نشده۔" انہیں اس کا بھی
 احساس تھا کہ اصلاحی مساعی کی ہر زلزلے میں مخالفت ہوتی رہی ہے۔ "ایں
 گونه مخالفت در ہر زمانہ مصلحان را پیش آمدہ است۔" اس شعور نے انہیں
 آخری عمر تک فلاحی کاموں میں مصروف رکھا۔ چنانچہ ان کا تصنیفی سلسلہ کج
 اسی سعی کا ایک اہم رخ تھا۔

اُردو، فارسی اور کشمیری میں حسن ابن علی نے کئی قابلِ قدر تصانیف
 چھوڑی ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے کئی مضامین بھی لکھے تھے۔ خود نوشت میں
 رقمطراز ہیں:

"در علم کلام و مباحثہ بالنصاری ہم زمانے صرف کردم و در دنیا
 مضامین متعدده در اخبار و رسائل نوشتہ ام۔"

ان کی اہم تصنیف "میزان التحقيق" نصاری کے اسلام پر اعتراضات کی
 متضمن تصانیف کے جواب میں لکھی تھی۔ ان تصانیف میں پادری فنڈز کی
 "میزان الحق" اور مفتاح الاسرار پادری گادالدین کی "ہدایت المسالین" اور
 "نغمہ دہلیوری" تواریخ محمدی تحقیق الایمان "مولوی صفدر علی" نے
 زمانہ "اور" نبی معصوم "اور ایک ہفتہ اخبار میں "خطوط بنام جوانان ہند"
 کے نام سے جو سلسلہ شائع ہوتا رہا ہے ان سب کا مطالعہ حسن علی نے کیا تھا۔
 اسلام پر معتبر تصانیف کے حوالے سے مذکورہ کتاب تین سال کی خدمت سے
 پہلے کشمیری میں لکھی تھی اور انہیں خود اس کا ترجمہ اُردو میں بھی کیا۔ یہ کتاب

۱۵۶
 دو جلدوں پر مشتمل ہے اور عالماد کا نام ہے۔ اس کو پڑھ کر سر سید احمد خان کے خطبات
 امدیہ اور تفاسیر احمدیہ کا خیال ذہن میں آجاتا ہے۔

حسن ابن علی کا دوسرا اہم کارنامہ ان کی یادداشتیں یا ڈائری ہے، جو
 واقعات کثیر کے نام سے موسوم ہے اور ۱۳۰۵ (م ۱۸۸۶ء) سے لکھیں جانے لگی تھی۔
 اور ہر سال کے حساب سے ایک ایک جلد پر منقسم ہے، اسی طرح ۱۳۱۹ء —
 ۱۳۲۱ء تک اس کی چوبیس جلدیں ہوتی ہیں، لیکن ۱۳۱۹ء - ۱۸۹۲ء سے
 ۱۳۲۱ء - ۱۹۰۳ء تک کی بارہ جلدیں خوشخط لکھی ہوئی اور باقی متفرق مسودوں
 کی شکل میں ملتی ہیں، ہر سال کے ارکان حکومت اور عہدیداروں کی فہرست درج
 کرنے اور اہم واقعات کو لکھ کر ان پر تبصرہ کرنے کا بھی التزام کیا ہے۔ اس طرح
 یہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغازی برسوں میں ریاست کے اہم
 سوانحات کا یادگار کارنامہ بن گیا ہے جس سے ان برسوں میں کشمیر کی سماجی، سیاسی
 اور ذہنی زندگی کے بڑے مستند حقائق ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ڈائری میں جبکہ
 جسکے لیے اشارے بھی ملتے ہیں جن سے انگریزوں کی حکومت کے قیام اور انگریزی
 تعلیم کی اشاعت سے نوجوان نسل کے ذہنوں میں جو نئے خیالات کی پرورش ہو رہی
 تھی ان پر بھی بڑی اچھی روشنی پڑتی ہے یہ سب کچھ اس لئے لکھیں ہو سکا کہ حسن
 ابن علی روشن دماغ اور حس دل انسان تھے اور انہیں ایک ٹوٹے ہوئے سال
 کی جلد کو سلسلہ کلام برقرار رکھنے کے لئے وہ پچھلے سال کے واقعات پر غور
 واپس سے شروع کرتے ہیں اور ان میں سے بعض میں سر سید احمد خان کے "تہذیب الاخلاق"
 کے بعض تبصروں کا سا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ جلد ششم ۱۳۱۰ء کا آغاز اس
 طرح ہوتا ہے :-

" ۱۳۰۹ ہجری جس کو سال مجموعہ آفات کہنا، سوزوں نہ ہوگا، ہم سے

۱۵۷
نکل گیا۔ اور سال ۱۳۱۰ شروع ہوا۔ اور ہماری زندگی کے برس اور ایم
اسی طرح لکھتے جاتے ہیں اور ہم اس کے لئے کچھ خیال بھی نہیں
کرتے۔

اسی سال جولائی کے مہینے میں سپین کے سمندر میں ایک ستارے کے ٹوٹ کر گرنے
کا واقعہ درج کیلئے ہے :-

کہتے ہیں کہ جب یہ ستارہ آسمان سے گرنا تو بڑی سخت صدمہ ہوئی
اور اس کے سفید گرم جسم سے بڑی دور تک زمین اور سمندر پر روشنی
ہوئی۔ جب یہ پانی پر پڑا تو بڑی بھکاری بھیانک بھاپ کے بادل
اٹھے اور ابلنے کی آواز دوزخ سنائی دیتی رہی۔ پانی کی بہت
سی مقدار اڑی اچھلی تھی اور دور سے دیکھنے والوں کے لئے عجیب
نوبصورت نظارہ تھا۔ اتنی بڑی پانی کی مقدار، سفید بھلی کی روشنی
سے چمکتی ہوئی۔ یہ ستارہ اتنا بڑا ہے کہ سمندر میں پانی سے ۱۲
فٹ ہے، دور سے یہ چمکیلے چمکر کی چٹان دکھائی دیتی ہے۔ عالموں
کو اس سے بڑا فائدہ ہے اور تیاری کر رہے ہیں کہ اس کی تحقیقات
کریں۔ مگر معظہ کا حجر اسود بھی اسی قسم کا ہے۔ فقط۔“

اسی سال کے واقعات میں یورپ کے فلاسفر کی اس تحقیق کا بھی تذکرہ کیلئے ہے کہ
آفتاب کی روشنی کم ہوتی جاتی ہے۔ ۲۳۔ اکتوبر ۱۸۹۲ء کے اندراج میں جنوں سے
کشمیر تک ریلوے لائن تعمیر کرنے کی تجویز کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔

پندرہویں جلد میں مرزا غلام احمد قادیانی کے عروج کا تذکرہ کیلئے اور ان
کے عقاید پر بحث کرتے ہوئے اپنے ان خطوط کی نقل درج کی جو مرزا صاحب کے
اپنے گئے تھے۔ اس ساری بحث کو پھیلا کر کئی صفحوں پر لکھا ہے۔

جولائی ۱۸۹۳ء کے ایک اندراج میں سیلاب کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ مہاراجہ نے بڑی بے حسّی دکھائی۔ ایک اگلے گورنر دیوان لچھمن داس کو یاد کیا ہے کہ اس وقت وہ ہوتے تو بہت اچھا انتظام کرتے۔ ۱۲۔ اکتوبر کی یادداشت میں عہدہ داروں کی نوٹ کھسوٹ پر تبصرہ کیا ہے۔ ۱۰ دسمبر کے اندراج میں فتح کدل کی تعمیر کی تکمیل کا ذکر کیا ہے اور اس کے مصارف کا تخمینہ دو ہزار سات سو روپہہ بتائے ہیں۔ ماہ فروری ۱۸۹۴ء کے اندراجات میں ایک لطیفہ بھی لکھا ہے کہ:

”یورپ میں ایک مُنجم نے جس کا نام اوڈلف فاربہ ہے از روئے حساب علم نجوم یہ پیشین گوئی کی ہے کہ بتاریخ ۱۴ ماہ نومبر ۱۸۹۹ء کو دُنیا کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس نے حال میں اپنے لکچر میں یہ بیان کیا کہ ”ایک غضبناک سیارہ ۱۸۶۶ء میں وجود میں آیا تھا۔ اب ۱۸۹۹ء میں پھر ظی ہر ہو گا اور ۱۳ نومبر ۹۹ء یا ایک آدھ دن کے پھر میں کرّہ دُنیا سے آئے گا۔ اگر دُنیا کا خاتمہ نہ ہوا تو یہ ضرور ہو گا۔ ۱۲، ۱۱، ۱۵ نومبر کے ۲ بجے سے ۵ بجے تک ستارے بڑے بڑے برف کے ٹکڑوں کی مانند آسمان سے گریں گے۔“

اس کے اندراجات میں یہ لکھا ہے کہ ۱۳ نومبر سے پہلے لوگ ایسے خائف تھے کہ راتوں کو نیند حرام ہو گئی تھی۔ خود مہاراجہ پرتاپ سنگھ اپنے محلات اور خدم و حشم کے ساتھ اس تاریخ سے پہلے کشمیر آگئے تھے، کیونکہ منجوں نے کشمیر کو قدرے محفوظ بنا یا تھا۔ ۱۳ نومبر کا دن اور رات گذر گئی اور کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔ اس پر منجوں کا بڑا مضحکہ اڑا یا ہے۔ جون ۱۸۹۹ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے ایک حکم کا تذکرہ کیا ہے جس کی رو سے کشمیر کی ساری زمینیں اور جائیداد منقولہ و غیر منقولہ مہاراجہ کے نام پر آگئی تھیں۔ اور مالک و صرفہ تائبین بنائے گئے تھے اور اس

دن وہ انگریزی مدرسہ میں تشریف لائے تھے راقم الحروف کو ایک
عمدہ موقع ملا کہ رودر رو کھڑے ہو کر مشاہدہ عینی سے ان کے
سالات اور ادن کی تقریر اور ان کی حرکات پر ایک محیط نظر ڈالے۔
ان کی طبیعت سادہ و نفع اور نہایت سیدھی سادی ہے اور اس
طبیعت اور اس مزاج سے حکومت کا انتظام ہرگز نہیں ہو سکتا۔

اس کے مقابلے یہ لکھا ہے کہ — "ہاں البتہ حوصلہ حکومت راجا سرنگھ میں موجود ہے
مگر افسوس ہے کہ وہ رعایا پر ور نہیں۔"

اسی طرح کئی اندراج لیے دلچسپ اور معلومات سے پُر ہیں کہ ان کو چھوڑنے
کو جی نہیں چاہتا۔ اکثر تبصرہ دلچسپ ہیں اور جہاں انہوں نے خود تبصرہ نہیں کیا
ہے، واقعات خود تبصرہ بن جلتے ہیں۔ اس نوع کے کارنامے اور شخصی تاثرات بہت
دلچسپ ہوتے ہیں مگر ایسے کارنامے کہ دعوے میں بہت کم ہیں۔

حسن ابن علی کی دوسری تصانیف میں ایک رسالہ "عممت الانبیاء" بھی ہے۔ یہ
رسالہ "نبی معصوم" کے جواب میں لکھا گیا ہے جس میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ شفاعت صرف
حضرت یسوع مسیح کر سکتے ہیں جو نبی معصوم ہیں۔ اور بعض انبیاء کے معصوم نہ ہونے کے
بارے میں قرآن سے دلیلیں پیش کی ہیں۔ پادری نے حسن ابن علی سے اس کا جواب چاہا
انہوں نے عذر کیا کہ مجھے لکھنے کی فرصت نہیں، ہاں چند روز کچھ لکھنے کے ساتھ بیٹھیں تو
اس بارے میں بات چیت ہو سکے گی۔ لیکن پادری اس پر راضی نہیں ہوا۔ آخر انجیل
اور دوسرے صحائف کی مدد سے یہ رسالہ تیار کیا گیا۔ "ہدیت" پر ایک کتاب فارسی میں
"آئینہ ہدیت" کے نام سے لکھی ہے اور یہ بھی عالمانہ کارنامہ ہے۔ "جامع عباسی" کا ترجمہ
بھی کشمیری میں کیا تھا اور کشمیری میں حافظ نذیر احمد کی "توبۃ النصوح" کا بھی ترجمہ
کیا تھا۔

کشمیری زبان بکھانے کے مقصد سے کبھی حسن ابن علی نے رسالے مرتب کئے تھے، اور ان میں خاص طور پر کشمیر کی مخصوص اصوات کے لئے فارسی حروف میں نقطے اضافے کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔

حسن ابن علی اردو بہت صاف ستھری لکھتے تھے۔ اکثر جگہ ان کا انداز عالمانہ ہے اور کہیں کہیں ان کی تحریروں میں ادیبانہ جھلک بھی پائی جاتی ہے۔ وہ کشمیر سے باہر نہیں گئے تھے اور کشمیر میں رہ کر ایسی اچھی اردو لکھنے پر قدرت حاصل کر لی تھی کہ بعض وقت خود ہندوستان کے اردو مرکزوں کے بہت سے لکھنے والوں کے یہاں بھی ایسی عبارتوں کے نمونے کم ملتے ہیں۔

حسن ابن علی کے فرزند، منشی محمد اسحق بھی اردو میں کئی رسالوں کے مصنف ہیں۔ ان کا تذکرہ اگلے باب میں آ رہا ہے۔ ان کا انتقال ۱۳۴۲ھ میں ۶۵ برس کی عمر میں ہوا۔ آخری زمانے میں حضرت علیؑ کے حالات پر ایک کتاب کی تصنیف میں مصروف تھے۔

اس زمانے میں کشمیر کے مسلم علماء میں مولوی محمد عبداللہ وکیل بڑا پایہ رکھتے تھے۔ وہ عربی، فارسی اور اردو کے عالم تھے لیکن ان کی بڑی اہم خصوصیت ان کی آزاد خیالی تھی۔ چنانچہ پہلے وہ اہل حدیث کے مسلک پر چلتے تھے لیکن بعد میں مولوی نور الدین قادریانی کے ساتھ گرد ہو گئے تھے۔ جن کا تذکرہ مہاراجہ رنیر سنگھ کے دربار کے "نورتن" میں گزر چکا ہے۔ مولوی نور الدین میرزا غلام احمد کے خلیفہ تھے۔ اور میرزا صاحب کے انتقال کے بعد وہ ان کے جانشین ہوئے۔ لیکن مسلک کی دو شاخیں ہو گئی تھیں۔ ایک قادیان کی شاخ، دوسری لاہور کی شاخ۔ مولوی محمد عبداللہ نے دوسرے مسلک کو اختیار کیا تھا۔ لیکن اس پر بھی وہ آخر تک قائم نہیں رہے۔ بلکہ آخری زمانے میں یہاں مسلک کے پیرو ہو گئے تھے۔ ان کا قیام پہلے سری نگر میں

کا چھڑی سجدہ کے قریب تھا جس کے ایک کمرے میں وہ درس دیتے تھے۔ وہ بڑے فصیح بیان
مقرر بھی تھے۔ کثیری اور اُردو دونوں زبانوں میں بڑی روانی سے تقریر کرتے تھے ان کے
درسوں میں لوگوں کی بھاری تعداد شریک ہوتی تھی۔ بعض وقت جب مجمع زیادہ ہو جاتا
تو لوگ سڑک پر بیٹھ کر ان کی تقریر سنتے تھے۔

اس زمانے کی بعض تحریروں سے مولوی محمد عبداللہ کی گونا گوں مساعی کا پتہ چلتا ہے۔
ان کی قایمہ صلاحیتوں کی وجہ سے فطرتاً اجتماعی معاملات میں لوگ ان سے رجوع کرتے
تھے۔ ۱۳ جولائی ۱۹۲۱ء کے یادگار مقدمہ کی پیروی انہوں نے کی تھی۔ جس میں عبدالقدیر
پنجابی کے خلاف بغاوت کا الزام لگایا گیا تھا۔ عدالت میں مسلمانوں کے ہجوم کے ڈر سے
۱۳ جولائی کی سماعت سنٹرل جیل میں مقرر کی گئی تھی۔ لیکن وقت سے پہلے ہی مسلمان
وہاں بھی بڑی تعداد میں پہنچ گئے تھے اور جیل میں داخل ہونا چاہتے تھے۔ مولوی عبداللہ نے
انہیں سمجھا بھجھا کر ظہر کی نماز ادا کرنے پر آمادہ کر لیا۔ لیکن اس دوران ہجوم جیل کا
پھاٹک توڑ کر اندر گھس گیا۔ اس پر فوج نے گولی چلائی تھی اور کوئی سترہ اٹھارہ مسلمان
شہید ہوئے تھے۔ ۱۳ جولائی کا دن انہیں شہیدوں کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ اس
کے بعد جذبات جیسے مشتعل ہو گئے تھے اور جیسی افواہیں پھیلائی جا رہی تھیں
ان کو فرو کرنے میں بھی مولوی عبداللہ نے بڑا کام کیا۔ امن کے مقصد سے رضا کاروں
کی جماعت تشکیل دی اور جب ۵ اگست کو ہمارے مسلمانوں کی شکایات سننے کیلئے شریک ٹی میں دوبار منعقد کیا
انہیں بھی دعوت دی گئی اور ہمارے کمرے میں میر داغظ رسول شاہ اور میر داغظ ہمدانی کے بعد انکی نشست مقرر کی گئی تھی۔
مولوی عبداللہ کے خاندان میں آزاد خیالی، تحریر اور تقریر کا ملکہ قومی خدمت کا جذبہ
خداداد تھا۔ چنانچہ ان کے فرزند محمد ایوب علی صاحب اچھے الشاہ پر داز ہیں۔ وہ
۱۔ عبدالقدیر کے زاد و بوم کے متعلق کئی بیانات ملتے ہیں مثلاً یہ کہ وہ رام پور کے تھے، پشاور کے تھے یا امر دہر
کے تھے۔ پنجاب سے ان کی نسبت اس سلسلے کا نیا اضافہ ہے۔ ثلث۔ میر غلام رسول شاہ اُس وقت برسرِ بارس
پہلے انتقال کر چکے تھے یہ نشست میر داغظ یوسف شاہ کیلئے مخصوص تھی۔ سہ صاحب صاحب کی برس پہلے
پاکستان میں انتقال کر چکے ہیں۔ (ٹہینگے)

جب سری نگر میں تھے ایک ہفتہ دار البرق کے نام سے لکلا کرتے تھے۔ مولوی عبداللہ کے پوتے شیم احمد شمیم اڈیٹر آئینہ میں بھی دلا کے سارے اوصاف وراثتاً منتقل ہوئے ہیں۔ مولوی عبداللہ اپنی قومی خدمات کے ساتھ ساتھ تصنیف تالیف سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کچھ رسالے بھی لکھے تھے۔

پیرزادہ محمد حسین عارف کا خاندان جموں سے تھا۔ انہوں نے لاہور میں تعلیم پائی تھی اور ریاست میں عدالت کے جج ہو گئے تھے۔ انہیں خان بہادر اور سی۔ آئی۔ ای کے اعزاز بھی عطا ہوئے تھے۔ قانونی دیکھپیوں کے ساتھ ساتھ، انہیں شعر و ادب سے بھی لگاؤ تھا۔ ان کی ایک نظم جو "آئینہ کشمیر" کے عنوان سے لکھی گئی تھی۔ بہت سحرانگہ آرا ثابت ہوئی۔ یہ نظم انہوں نے راولپنڈی سے اپنے سفر سری نگر، یہاں کے فطری مناظر اور عوام کے رہن سہن کے طریقوں کے بارے میں لکھی تھی۔ نظم کا عام انداز اخلاقی ہے۔ یہ نظم اکتوبر ۱۹۰۶ء کے "مخزن" (لاہور) میں اڈیٹر سر شیخ عبدالغفار کے ایک نوٹ کے ساتھ "خطبے نظیر کشمیر" کے عنوان سے چھپی تھی۔ اڈیٹر کا نوٹ حسب ذیل ہے :

"ہمارے مكرم خاں صاحب پیرزادہ محمد حسین صاحب ام۔ اے حال میں
میں بہ ہمدردی کشمیر میں ماسور ہو کر تشریف لے گئے ہیں اور دہلی کے حالات
اور مناظر کا جو اثر ان کے دل پر ہوا۔ اسے ذیل کی نظم میں ظاہر کیا ہے۔
گو یہ نظم اخبارات میں بھی اتفاق سے چھپ چکی ہے۔ لیکن صحیح نہیں چھپی۔
اب پیرزادہ صاحب نے اسے نظر ثانی فرما کر "مخزن" میں درج کرنے کیلئے
روانہ فرمایا ہے۔"

نظم لمبیل تر اشعار کی ہے۔ پیرزادہ نے تانگہ پر سفر کیا تھا، سفر چھوٹا تھا، دوش اس کا مال
اس شعر میں بیان کیا ہے :

۱۔ شیم صاحب اولیٰ بنی ۱۹۰۷ء کو ۴۵ سال کی عمر میں سری نگر میں انتقال کر گئے ہیں۔

نہ پوچھو میری کیا حالت تھی اس دم دل کی دھڑکن کی
 اگر تانگہ کوئی ٹوٹا ہوا کھڑے میں پڑا دیکھا
 بارہولہ سے آگے دریائے جہلم بڑے زور شور سے بہتا ہے۔ اس کا منظر بیان کرتے ہیں:
 کبھی اس کے دہن میں جھاگ دیکھے مثل مستوں کے
 کبھی چلتا ہوا خاموش مثل پارسا دیکھا
 کشمیر کے "تیرتے کھیت" یہاں کی انوکھی چیز ہیں۔ عارف کو ان کھیتوں نے اچھنے
 میں ڈالا تھا۔ کہتے ہیں:

پڑھا تھا یہ کہ گھر اور کھیت ہیں سب غیر منقولہ
 مگر گھر اور کھیتوں کو یہاں چلتا ہوا دیکھا
 اس شعر میں "گھر سے مراد" ہاڈر بوٹ "ہیں۔ اہل کشمیر کے حسن و خوبصورتی کے
 ساتھ ان کے لباس اور ان کے بعض طریقوں کی طرف ان اشعار میں اشارہ کیا ہے۔
 ہیں حسن رنگ میں مشہور عالم یہاں کے باشندے
 لباس ان کا مگر میں نے بہت ہی بد نما دیکھا
 سوا اک ڈھیلے کمرے کے گلوں سے لے کے ٹخنے تک
 بجز رومال سر کے اور نہ کوئی پارچہ دیکھا
 نہ آسائش نہ زیبائش نہ پردہ اور نہ حفظِ اتق
 نہیں معلوم کیا واضح نے اس میں فائدہ دیکھا
 روال مگر گھر میں ہے پانی، مگر دھرتے ہیں کم کمرے
 ہزاروں میں کسی اک کے نہ کپڑوں کو صفا دیکھا
 میسر ہو نہ کھانے کو تو کچھ پردہ نہیں لی کو
 مگر وہ باش و شہری کو فدا لے آب چا دیکھا

۱۷۔ شاید کشمیر کی مشہور نگین چائے سے مراد ہے۔

پھر وہ غلط دہندگی طرف مائل ہو جاتے ہیں :

علاوہ صرف بے جا کہنے یہ نقصان اس چاد میں
کہ چہروں پر جو رنگت تھی اسے بالکل اڑا دیکھا
علاج اس ذلتِ افلاس کا پوچھ اگر مجھ سے
تو چلتا نسخہ اس کے واسطے تعلیم کا دیکھا
پنڈت سالگرام سالک بہ حیثیت وکیل کے عارف سے متعارف تھے۔ یہ نظم جب
چھپ کر آئی، تو عارف نے رسالہ "مخزن" انہیں پڑھنے کو دیا۔ سالک کو نظم کے وہ حصے
جن میں عارف نے لباس وغیرہ پر تنقید کی تھی، پسند نہیں آئے، اور اس کا جواب انہوں
نے اسی زمین میں لکھا تھا۔ سالک کی نظم بھی بہت طویل ہے۔ اس کے کچھ شعر یہاں
نقل کئے جاتے ہیں :

تماشا حضرت عارف نے جو کشمیر میں دیکھا !
بشکل نظم ہم نے اس کو مخزن میں چھپا لکھا
لباس بد نما کا عیب کیوں ہم پر لگاتے ہو
کہیں جائے فقیروں کا کسی نے خوش نما دیکھا

سالک کی نظم کا انداز آگے سیاسی ہو جاتا ہے اور وہ "لباس بد نما" اور افلاس کا الزام
کشمیر کے مطلق العنان حکمرانوں کے سر تھوپتے ہیں۔ لیکن ڈوگرا مان کی ثناء غوانی کرتے ہیں۔
سالک کی ڈائری میں اس نظم کے نیچے یہ جملہ بھی لکھا ہوا ہے اور اس کے ساتھ ایک
شعر بھی :

"عارف، پیرزادہ محمد حسین خان نچ، ٹائیکورٹ کا تخلص تھا۔ اور یہ
شخص متعصب تھا"

مگر کہ در تعصب دل سے رہنا جیسے حکم خدا عارف ہو کر تدر نہ جانے سالک کی تو بات ہی کیا

کسی اور شاعر نے بھی اس کا جواب لکھا تھا جو "۲۔د" کے نام سے منشی محمد الدین فوق کے
مکتبہ میگزین (اپریل ۱۹۰۸ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس کے دو شعر ذیل میں منقول ہیں:

یہ نظارہ مگر کشمیر کا ہے اک رُرخ روشن
ہے عارف وہ مرغِ ناریک کو بھی جس نے پا دیکھا
ہے اس اجڑے نگر کا رنگِ خونِ دل سا باطن میں
بظاہر سبزِ حضرت نے جسے مثلِ چمن دیکھا

عارف نے کشمیر کے مشہور صوفی بزرگ، بابا داؤد خاکی کے قصیدہ درد المریدین کا اردو میں
منظوم ترجمہ بھی کیا ہے۔ بابا داؤد خاکی حضرت مخدوم شیخ حمزہ کشمیری کے متقدمین میں
سے تھے اور خود اونچے درجے کے صوفی، عالم اور فارسی کے شاعر تھے۔ قصیدہ درد المریدین
انہوں نے اپنے پیسری کی منقبت میں کہا تھا۔ اور بعد میں اس کی شرح بھی فارسی میں
لکھی تھی۔ عارف کا اردو ترجمہ ادارہ سلطانیہ کے زیر اہتمام شائع ہو رہا ہے۔

عارف نے لالہ سر پریم کے تذکرہ "اردو شعراء" نختانہ جاوید پر ایک تقریظ بھی
لکھی ہے۔ یہ ان کی نثر کا نمونہ ہے۔ یہ تقریظ ۱۹۰۸ء کی مرقومہ ہے اور دوسری جلد میں
شامل ہے۔ لالہ سر پریم کی محنت کو سراہتے ہوئے عارف لکھتے ہیں:

سچ پوچھو تو مصنف نے اپنے دوست بید احمد دہلوی مصنف
فرہنگ آصفیہ سے کچھ کم کام نہیں کیا ہے بلکہ اس کتاب کو اس
ڈکٹری کا ایک ضروری جوڑا سمجھنا چاہیے۔

اس عہد کے صاحبِ ذوق اصحاب میں جن کا کثیر کی ادبی زندگی پر بڑا اثر پڑا، منشی سراج الدین احمد خان بڑا اونچا مقام رکھتے ہیں۔ ان کا تعلق کشمیر کے ایک ممتاز خاندان سے تھا۔ جو "دار" کہلاتا ہے۔ اس خاندان کے ایک فرد یحییٰ ڈار کی اولاد میں جعفر ڈار گذرے ہیں جن کا لڑکا رمضان دار کشمیر سے لاہور چلا گیا تھا اس کے بڑے فرزند منشی محمد اسماعیل ڈار نے لاہور میں تعلیم حاصل کی اور وہیں وکالت کا پیشہ اختیار کیا تھا۔ منشی سراج الدین اسی کے فرزند تھے۔ منشی محمد اسماعیل دار کا انتقال ۱۸۹۴ء میں ہوا۔

منشی سراج الدین احمد خان نے سیالکوٹ میں تعلیم پائی اور علامہ اقبالؒ کے ہم عصر ہے۔ اسی زمانے سے اقبالؒ میں اور ان میں راہ ورسم ہو گئی تھی جو آخر تک قائم رہی۔ منشی سراج الدین تعلیم ختم کرنے کے بعد کشمیر لوٹ آئے اور فارسی انشاء پردازی میں اپنی بہار کی وجہ سے ریاست کے ریڈیٹنٹ کے دفتر میں سرگزشت کے عہدے پر مامور ہوئے۔ منشی سراج الدین شعر و سخن کا بھی پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ اس زمانے تک کشمیر میں اور خاص طور پر مسلمانوں کو عام طور پر کوئی انجمن قائم کرنے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔ اس لئے ریڈیٹنٹ میں منشی صاحب نے ایک انجمن مفرح القلوب کے نام سے قائم کی۔ اتفاق سے اس زمانے میں ریڈیٹنٹ میں کئی منشی ایسے تھے جو شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے۔ وہ سب انجمن مفرح القلوب میں شریک ہو گئے اور ریڈیٹنٹ سے باہر کہ اصحابِ ذوق بھی اس کی محفلوں میں شرکت کرنے لگے۔ بعد میں انجمن کے جلسے ریڈیٹنٹ کے اندر نہیں ہوتے تھے بلکہ شہر میں خود منشی صاحب کے مکان پر بھی منعقد ہوتے تھے۔ اور ان جلسوں میں میرزا سجاد الدین معتمد، چودھری خوشی محمد ناظر، اور دوسرے سادہ صاحبِ ذوق ادیبان اور شاعر شرکت کرتے اور اپنے ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ انجمن ایک اچھا اتفاقاً ادارہ بن گئی تھی اور اس کا محور اور اس کی روح روادار خود شہر ہوتا تھا۔

اسی زمانے میں باہر سے جو علماء اور ادیب احمد شاعر کثیر آتے، ان کے اعزاز میں بھی انجمن کے جلسے منعقد ہوتے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر سر محمد اقبال، سر شیخ عبدالقادر سر محمد شفیع حبش شاہ دین ہما یون جب کبھی کثیر آتے۔ انجمن کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے۔ ملک نضر اللہ مزین نے جنہیں ان جلسوں میں شرکت کرنے کا موقع ملا تھا، ایک موقع پر منشی سراج الدین کی سخن فہمی کی داد دیتے ہوئے لکھا تھا:

”بڑے سخن فہم، سخن سنج، وسیع المطالعہ اور زندہ دل انسان ہیں۔“

ملک نضر اللہ نے ان محفلوں کے بارے میں جو تفصیل اپنے رسالے ”ایشیا“ میں لکھی تھی وہ آگے انجمن کے حالات میں درج کی جا رہی ہے۔ منشی سراج الدین احمد خان نے ۱۹۱۳ء میں چودھری خوشی محمد ناظر کی ایک نظم رسالہ ”نخزن“ میں اشاعت کے لئے ایک نوٹ کے ساتھ بھیجی تھی۔ نوٹ کا ایک حصہ منشی صاحب سے متعلق ہے لکھتے ہیں:

”بندہ حاضر، بیاض بردار انجمن مفرح الارواح، یادش بخیر انجمن مفرح الارواح کا زمانہ تھا، ناظر، حاضر، صادق، کاذب، مشک و عنبر کی مشک افشانی سے کثیر معطر تھا۔ ارباب ذوق کے رشحات فیض سے آبِ دل پر سحاب سخن اور بارانِ سرود برسنا تھا۔ لدر و ملی اور سبزہ و ملی کے سبزہ زاروں اور نسیم و نشاط اور شالامار کے گلزار اوراقِ نخزن کو گلزننگ کرتے تھے۔ مگر دورِ ایام نے اس مجمع کو پریشان کر دیا اور آبِ دل پر سکون کا عالم چھا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد حضرت ناظر کا ورود کثیر جنب بے نظیر میں ہوا، مناظر کثیر کی نگرانی ان کے سپرد ہوئی۔ سبزہ و گلزار نے شکرانہ ادا کیا۔ اور سر و چہانے خیر مقدم کیا۔“

”بیاض بردار“ کا اشارہ خود منشی صاحب کی طرف ہے، جو انجمن کے معتقد تھے۔ انجمن کا نام مفرح الارواح بھی لکھا گیا ہے۔ اس کی مٹھلیں موسم بہار میں باغِ نسیم، باغِ نشاط

اور باغ شالامار میں بھی منعقد ہوتی تھیں۔ اور بعض وقت شکاروں میں یا ڈوگوں میں منعقد کی جاتی تھیں اور یہ تیرتے ہوئے شاعرے کہلاتے تھے۔

منشی صاحب کا کلام اب دستیاب نہیں ہوتا، لیکن حالات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شعر کہتے تھے اور احمد تخلص کرتے تھے وہ شیریں بیان مقرر بھی تھے اور نہ صرف کثیر الملکہ باہر دور دور تک اور لاہور کے ادبی حلقوں میں ان کی جادو بیانی کی دھوم تھی اور لوگ انہیں شعری، ادبی اور علمی مغللوں میں صدارت کے لئے پکڑ پکڑ کر لے جاتے تھے۔ انجن نعرۃ الاسلام کے بھی منشی صاحب سرگرم رکن تھے اور اپنی خوش بیانی کی بدولت انجن کے "ہزار داستان" مشہور ہو گئے تھے۔ تقریر کی طرح ان کی شعر خوانی کا بھی بڑا موثر انداز تھا۔ ساری محفل جھوم اٹھتی تھی۔

شبلی منشی صاحب کے زمانے میں کثیر آئے تھے۔ شبلی کے علاوہ اردو کے مشاہیر ادب جیسے حالی، نذیر احمد وغیرہ سے بھی ان کے روابط تھے۔ میر علی آبادی بھی ان کے گہرے دوست تھے، اور انجن کے جلسوں میں شرکت کر چکے تھے۔ اقبال کے ساتھ منشی صاحب کی آخر تک مراسلت رہی۔ اقبال ان کی رائے کو بہت اہمیت دیتے تھے اور اپنی ہر تصنیف کو شائع ہوتے ہی منشی صاحب کے پاس بھیجتے تھے۔ جب "اسرارِ خودی" شائع ہوئی اور منشی صاحب کے پاس پہنچی تو انہوں نے اس پر ایک مختصر سی تنقید لکھی اور اقبال کے یہاں بھیجی تھی۔ اسے مرزا غلام حسین بیگ عارف ایڈیٹر گلریز نے شائع کر دیا ہے۔ اس مختصر سی تنقید سے منشی صاحب کی علمیت، ادبی ذوق، اور تنقیدی صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :

"کئی آٹھ دن ہوئے، جب میں گلرگ سے سری نگر آ رہا تھا اسرارِ خودی کا ایک نسخہ مجھے ملا۔ میرے یہاں ارہاب ذوق کا خاصہ مجمع

۱۴۰
 رہتا ہے۔ چنانچہ ساری مثنوی کو بالاستیعاب چند مجالس
 میں پڑھا گیا۔ تصنیف، تصوف، اور تخیل کی سہ گونہ
 شیرینی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔
 " مثنوی کا موضوع گو عقیقہ متقدمین کے خلاف ہے مگر نہایت
 لطیف ہے اور جس خوش اسلوبی سے آپ نے اسے بنایا ہے وہ
 مصنف ہی کا حصہ ہے، قدم قدم پر مولوی رومی علیہ الرحمہ کے کلام
 کا گماں ہوتا ہے۔ زمانے کی رنگت پہچاننے والے لوگ اس
 مثنوی کو پڑھا کریں گے اور سر دھنا کریں گے۔"
 " زمانے کے جدید فلسفہ کو جس نازک انداز سے کلام میں مصنف نے
 خوبصورت اشعار کی صورت میں ظاہر کیا ہے، یہ کوئی کھیل نہیں ہے
 اسے کاش کوئی رہنما مثزل اس زمانے میں روئے معافی سے
 پردہ اٹھا سکتا۔"

منشی صاحب کے ان تاثرات کو پڑھنے کے بعد علامہ اقبال نے منشی صاحب کو جو خط لکھا
 ہے، اس میں اس مثنوی کی تصنیف اور منشی مثنوی "رموز بے خودی" کی تجویز کا تذکرہ
 کیا ہے۔ یہ خط عام طور پر شائع نہیں ہوا۔ اس لئے اس کے مختلف حصے یہاں
 درج کئے جاتے ہیں :

"مخدومی! السلام علیکم، آپ کا نوازش نامہ ملا، جس کو پڑھ کر
 مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ الحمد للہ کہ آپ کو مثنوی پسند ہوئی آپ
 ہندوستان کے ان چند لوگوں میں سے ہیں جن کو شاعری سے طبعی
 مناسبت ہے۔ اگر نیچر ذرا فیاضی سے کام لیتی تو آپ کو زمرہ
 شعراء میں پیدا کرتی۔ بہر حال شعر کا صحیح ذوق شاعری سے کم

نہیں۔ بلکہ کم از کم ایک اعتبار سے بہتر ہے، محض ذوقِ شعر رکھنے والا، شعر کا دلیا ہی لطف اٹھالیتا ہے۔ جیسا کہ خود شاعر اور تصنیف کی شدید تکلیف اسے اٹھانی نہیں پڑتی۔^{۱۷۱}

یہ مثنوی گذشتہ دو سال کے عرصے میں لکھی گئی۔ مگر اس طرح کہ کئی مہینوں کے وقفے کے بعد طبیعت تامل ہوتی رہی، چند اقوال کے ذوق اور بعض بے خواب راتوں کا نتیجہ ہے۔ . . . اگر مجھے پوری فرصت ہوتی تو غالباً اپنی موجودہ صورت سے یہ مثنوی بہتر ہوتی۔ اس کا دوسرا حصہ بھی ہوگا۔ جس کے مضامین میرے ذہن میں ہیں، مجھے یقین ہے کہ وہ اس حصے سے زیادہ لطیف ہوگا، کم از کم مطلب کے اعتبار سے گوزبان اور تخیل کے اعتبار سے نہیں کہہ سکتا، کیا ہوگا۔ یہ بات طبیعت کے رنگ پر منحصر ہے، جو اپنے اختیار کی بات نہیں۔“

خط میں اقبال نے مسلمانوں میں مروجہ تصوف کے بارے میں اپنے ان خیالات کا اعادہ کیا ہے جو بعض اور موقعوں پر ظاہر کرتے رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام سے اور اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں۔ ان کے لٹریچر آئیڈیا بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی میں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں اس حقیقت کا سلام ہو، نقاب کوئی جس کی اشاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہوئی، صوفی لوگوں نے اسے تصوف پر ایک حملہ تمسیر کیا۔ اور یہ خیال کسی حد تک

درست ہے۔ انشاء اللہ دوسرے حصے میں ذکرِ ثبوت کا کہ تصوف کیلئے ہے اور کہاں سے آئے ہیں اور بابہ کی زندگی سے کہاں تک ان تعلیمات کی تصدیق ہوتی ہے۔“

اقبال کے اس خط میں بہت سی باتیں ایسی ہیں، جو کسی صاحب بصیرت انسان کے سوا وہ کسی کو نہیں لکھ سکتے تھے۔ ہندوستان کے جن صوفیوں کی مخالفت کی طرف خط میں اشارہ کیا ہے ان میں خواجہ حسن نظامی شامل ہیں۔ جن کے ساتھ ابرار آبادی بھی شامل ہو گئے تھے۔ اقبال کا یہ خط ۴ اکتوبر ۱۹۱۵ء کا مکتوب ہے۔ اقبال کے ایک اور خط سے جو ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۵ء کا لکھا ہوا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ منشی سراج الدین کا خط جو اقبال کا موسوم تھا، اخبار "زمیندار" میں چھپ گیا تھا۔ غالباً منشی صاحب کو اس کی اشاعت پسند نہیں تھی اور انہوں نے اقبال کی توجہ اپنے خط کے ذریعے اس طرف متغطف کرائی تھی۔ اس کے جواب میں جو ایک معذرت بھی ہے اقبال نے لکھا تھا:

"آپ کا دلائل نامہ ملا، "زمیندار" میں آپ کا خط چھپ جانے کی غلطی کا ذمہ دار کسی حد تک میں خود اور زیادہ تر دفتر زمیندار ہے۔"

"میں نے وہ خط مولوی عمادی صاحب کی خدمت میں اس واسطے ارسال کیا تھا کہ وہ اپنے ریویو میں اس تحریر سے مدد لیں۔ مولوی عمادی ڈیڑھ "زمیندار" خود ایک ریویو لکھ رہے ہیں جو ہنوز ناتمام ہے مقصد اشاعت نہ تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ غلطی سے وہ تحریر ہی چھاپ دی گئی۔ مجھے اس غلطی کے لئے سخت افسوس ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے ان کو یہ بھی لکھا تھا کہ یہ ریویو ایک پرائیویٹ خط ہے۔ اس میں بعض باتیں پتے کی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ مولوی صاحب کو ان کے پڑھنے سے مدد ملے گی۔ بہر حال اس ندامت کا بوجھ مجھ پر ہے۔"

اقبال کے خط سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ منشی سراج الدین احمد کی رائے کو وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

منشی صاحب کے ذوقِ سلیم کا اندازہ کرتے ہوئے، اس بات کا افسوس ہوتا ہے کہ ان کا تھوڑا سا کلام جو سراں انجام ہوا تھا، وہ اب دستیاب نہیں ہوتا۔ اقبال کو غالباً منشی صاحب کی شعر گوئی کا علم نہیں تھا۔ اور اپنے خط کا شائع ہونا، انہیں جب ناگوار ہوا تھا اس کو دیکھتے ہوئے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منشی صاحب کو اپنی اشاعت پسند نہیں تھی۔ پروفیسر نند لال کوں طالب نے مجھے بتایا کہ منشی صاحب شعر کہتے تھے۔ چنانچہ اس زمانے میں لالہ سرپر رام، مصنف "نمخانہ جاوید" جب کشمیر تشریف لائے تھے، ان کے اعزاز میں سری پرتاپ کالج، سری نگر میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا تھا اور مشاعرہ میں منشی صاحب نے غزل پڑھی تھی جس کا صرف ایک شعر طالب صاحب کو یاد رہ گیا ہے۔

شعر یہ ہے :

دکھائی ایسی ہمدردی کہ بے کھٹکے رقیبوں نے

سنادی داستانِ اپنی سمجھ کر رازِ دال مجھ کو

ایک اور شعر پنڈت جی لال ناگل نے سنایا :

صحنِ چمن سے اٹھ کر کے یوں باد بہار کا آتی ہے

جیسے کے دریا سے نہا کر کوئی کنواری آتی ہے

مرزا کمال الدین شیدا پر منشی صاحب کی بزرگانہ شفقتیں تھیں۔

شیدا، منشی صاحب کے محبِ صادق مرزا سعد الدین کے بھتیجے تھے۔ اور انہوں نے اسی زمانے میں شعر گوئی شروع کی تھی۔ شیدا نے ایک نظم جدید انداز کی بھی تھی۔ جو منشی صاحب کو سنائی۔ اس پر منشی صاحب بہت خوش ہوئے اور اس کی تعریف بھی کی تھی۔ اصل میں منشی صاحب مرزا سعد الدین کی طرح، ایک ترقی پسند تصور کے عالم اور ادیب تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی ذہنی تربیت، پُرانی روایات میں ہوئی تھی۔ لیکن وہ اپنے عصر کے تقاضوں سے بھی بے خبر نہیں تھے۔

منشی سراج الدین کا انتقال ۱۳۶۰ میں ہوا۔ مادہ تاریخ محمد امین درابو داراب نے "قمری بارغ ادب" نکالا تھا۔ حکومتِ برطانیہ کی جانب سے ان کی خدمات کے اعتراف میں منشی صاحب کو خان بہادر کا خطاب بھی ملا تھا۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد منشی صاحب اپنے تعمیر کردہ مکان واقع ناؤ پورہ، بشیر آباد میں مقیم رہے۔ اور ان کے ادبی مشاغل جاری رہے۔ منشی صاحب کے چھوٹے فرزند، امیر الدین کو بھی ادبی ذوق والد سے ورثہ میں ملا تھا۔ منشی صاحب کے خاندان سے ایک لڑکی اور دو عورتیں قیصر قلیندر کو بیاہی گئی ہے۔

شیخ غلام نقشبند، رسالہ "مخزن" (لاہور) کے ابتدائی دور کے لکھنے والوں میں سے تھے۔ جنوں ان کا وطن تھا۔ اور رزیدٹنسی میں ملازم تھے۔ منشی سراج احمد کی انجمن مفرح القلوب کے یہ بھی سرگرم رکن تھے۔ شعر و ادب کے علاوہ انہیں علمِ دین سے بھی دلچسپی تھی۔ "مخزن" میں انہوں نے "علم" کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ یہ ۱۹۰۳ اور بعد کے چند شماروں میں شائع ہوا ہے۔ مضمون میں انہوں نے جدید علوم کی تاریخ کے آغاز کا سراغ عربوں کی تحقیقات سے جوڑا ہے۔ اور پھر لکھتے ہیں :

"زمانہ کبھی ایک ڈھنگ پر نہیں رہتا۔ ان کی (عربوں کی) قومی ترقی کی بھی ایک عمر تھی، جب وہ عمر ختم ہوئی، زمانہ پلٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی ان کی عقل نے پٹا کھایا۔ جو عادتیں ترقی کا زینہ ہو کر ترقی ہیں، وہ ان سے پھیننے لگیں۔ جو خیالات خضر راہ ہوتے ہیں۔ انہوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ اگر دولت کا سہارا رہتا تو ممکن ہے کہ کچھ دنوں اور اس سڑک پر لنگھتے، چلتے۔ مگر دولت پہلے ہی منہ موڑ چکی تھی۔ پھر کیا ہوتا ہے۔"

۱۔ تختِ سلیمان کے دامن میں واقع..... مزار میں ان کے مزار پر یہ قطعہ تاریخ کندہ ہے۔

۱۴۵
صاحب زادہ محمد عمر جنہوں نے نور الہی کے ساتھ مل کر اردو ناولٹ اور اسٹیج کے موضوع پر یادگار کارنامہ "ناولٹ ساگر" لکھا تھا ان کے امور سردار دزر محمد خان کے ساتھ شامل ہو کر، نقشبند نے جموں میں بزمِ مشاعرہ قائم کی تھی۔ جس کا تذکرہ آگے اداروں کے ذیل میں آ رہا ہے۔

قاضی عبدالقادر خان منظور، ہندو لیت کے گرد اور کھجے۔ ملازمت کے سلسلے میں وہ عرصہ تک لدراخ میں بھی رہے۔ انہیں شعر و سخن کا ذوق تھا۔ اور اسی زمانے میں ان کا نظمیں کبھی کبھی رسالہ "مخزن" میں چھپتی تھیں۔ کچھ نظمیں محمد الدین فوق کے "کتیری میگزین" میں بھی شائع ہوئیں۔ منظور کی ایک نظم "جو" انجام بہار کے عنوان سے "مخزن" کے شمارہ اگست ۱۹۱۰ میں شائع ہوئی تھی۔ ذیل میں درج کی جاتی ہے :

تھے بھی کھلی 'میدنا بھی تھا ابر ساقی' میخانہ تھا
 بزم قلی آراستہ اور جاوید میر۔ انداز تھا
 پھول کھلنے سے ہوا سارا چین رشکِ جنان
 بلبلوں کا اس لئے انداز کچھ مستانہ تھا
 اپنی خوبی پر تھا اتراتا ہر اک غنچہ دہاں
 قمریوں کا سرد سے برتاو بے باکانہ تھا
 جھولنے لگی ہائے ترنہ زلفت کے جھولوں میں
 جب کہ خود چلیں بھی ان کچھ حسن کا دیوانہ تھا
 یک بیک جھونکا ہوائے شہد کا آیا دہاں سے
 کچھ نہ تھا گویا کہ اک ملت کا وہ دیرانہ تھا

دیکھتے اپنے وہ بکھر ایا شیرازہ دہاں
گل ہوتی وہ شمع جس کا اک جہاں پروانہ تھا
آشیانِ بیل بیکس جویوں درہم ہوا
زارخ کا اور بوم کا اب خاص خلوت خانہ تھا
دیکھ کر یہ حال دل منظور یوں گھویا ہوا
جو کہ دیکھا خواب تھا اور جو سنا تھا افسانہ تھا

پرتاپ سنگھ کے بھائی راجہ امر سنگھ جن کا انتقال ۱۹۰۹ء میں ہوا۔ ان کی وفات پر
منظور نے ایک مرثیہ لکھا تھا۔ جو کشمیری میگزین میں شائع ہوا۔ مرثیہ کا ایک
ہند ہے۔

فصل گل اب ہو چکی رونق پہ ہے بادِ خزاں
ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملتا کسی گل کا نشان
شاخ ہلے تر ہوئی افسردہ خاطر نیم جاں
گویا اپنی بیکسی پر جو رہی نوحہ خواں
ہے عجب عبرت فزا اس دم بہارِ گلستاں
یاسمن بھی اک طرف لیٹی ہے با آہ و فغاں

سر شیخ عبدالقادر کے رفیق اور خزاں کے ابتدائی دور کے ادیبوں میں چودھری
خوشی محمد ناظر کا مقام بلند ہے۔ وہ کشمیر میں گورنر کے عہدہ پر عرصہ تک فائز رہے
اور بعد میں وزیر مال بھی ہو گئے تھے۔ کشمیر میں ان کی ملازمت کا آغاز بلتستان کے
علاقے سے ہوا۔ جہاں وہ بہتم مال تھے اور دیگر حکومت نے انہیں اس عہدہ
کے لئے منتخب کیا تھا۔

ناظر کا وطن گجرات (پنجاب) تھا۔ جہاں وہ ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوئے تھے۔

ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر مولوی نور الدین کے پاس ہوئی تھی اور اعلیٰ تعلیم علی گڑھ میں پائی تھی۔ بی۔ اے کا امتحان ۱۸۹۳ء میں کامیاب کیا تھا۔ علی گڑھ میں قیام کے دوران وہ سرسید احمد خان کی مساعی سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ حالی سے اپنے کلام میں اصلاح لی تھی اور شبلی کی صحبتوں سے بھی فیض پایا تھا۔ لاہور لوٹنے کے بعد شیخ عبدالقادر اور سر محمد اقبال کی صحبتوں میں ان کا ذوق شعر و ادب پر دل چڑھا۔ شاعری کا شوق انہیں بچپن سے تھا۔ اور ابتدا میں کچھ غزلیں فارسی میں کہی تھیں لیکن جب وہ اردو میں کہنے لگے تو حالی اور آزاد کی شاعری کو اپنا نمونہ بنایا۔ غزل ناظر نے بہت کم کہی ہے۔ ان کی دو نظمیں ”جوگی نامہ“ اور ”مرثیہ سرسید“ ان کی معرکتہ آرا نظمیں مانی جاتی ہیں۔ اور ان کی بدولت ناظر کی شہرت بام عروج کو پہنچی اور اردو کے شعراء میں ان کے لئے مقام پیدا ہوا۔ کثیر میں ناظر کے قیام سے یہاں کی ادبی اور شعری محفلوں میں ایک نئی روح دوڑ گئی تھی۔ منشی سراج الدین احمد خان کی انجمن مفرح القلوب رونق پر تھی۔ اور یہاں کے اچھے لکھنے والوں میں منشی صاحب کے علاوہ میرزا سعد الدین سعد، پنڈت ہر گپال خستہ، پنڈت سالگرام سالک، مولانا عبد الصمد، مفتی محمد حسین کاشمیری موجود تھے۔ باہر سے بھی مشاہیر شعراء اور ادیب کثیر آتے رہتے تھے۔ اس طرح شعرو سخن کی خاص طور پر گرم بازاری تھی۔ ناظر کے مراسم ان سب سے گہرے تھے۔ وہ گنگری بل محلہ میں اس کوٹھی میں رہتے تھے جس میں اس وقت جناب خواجہ غلام محمد صادق چیف منسٹر کا قیام ہے۔ ایک دفعہ سالک ان کے یہاں بلینے گئے تھے۔ ملازم نے ناظر کو ان کے آنے کی اطلاع دی وہ مصروف تھے اور معذرت چاہی لیکن شاید کسی غلط فہمی کی بناء پر ملازم نے ان سے دو تین منٹ توقف کرنے کو کہا۔ آخر وہ گھنٹہ گزر گئے تو سالک گھر لوٹ آئے۔ اور یہ چند اشعار اس واقعہ پر اپنی ڈائری میں لکھے :

ساک جو پاس ان کے پاس ادب سے آیا
 دربان ایک دیکھا اسنادہ ان کے در پر
 ان سے رپورٹ ہوئی اندر سے حکم آیا
 ہم کام کر رہے ہیں فرصت نہیں دم بھر
 لیکن ستانے والا دیکھا عجیب انسان
 پیغام لایا ٹھہرو دو تین لمحے باہر
 دو تین گھنٹے گزرنے پر لمحے دو نہ گزرنے

باہر نہ کوئی پرساں، پرساں نہ کوئی اندر
 کثیر اور کثیر کے حسین مناظر خاص طور پر جمیل
 انہوں نے مکان کو تختِ سلیمان کے دامن میں ڈل کے کنارے بنوایا تھا۔
 لکھیں ہوئی ان کی ایک نظم مشہور و مقبول ہے۔ اس نظم کے کچھ شعر ہیں:

اللہ اللہ ہے کیا حسن چمن پانی میں
 بہنو دلالہ دگل سر و سمن پانی میں
 تو وہ بحیم ہے یہ ڈل کے خزانے میں نہاں
 برف کہار ہے یا عکس نگن پانی میں
 اک طرف کوہ پہ ہے تختِ سلیمان قائم
 اک طرف سبز پری کا ہے وطن پانی میں
 جلوہ برق سے ہے نور کا عالم شب کو
 طور منظر ہے مہاراج بھون پانی میں
 ہیں شکارے میں سیہ چنم تباہ کثیر

یا اترتے ہیں غزالانِ خُشن پانی میں
لبِ ڈُل آپ بھی کا شانہ بنالیں ناظر
موسمِ گل میں رہے لطفِ سخن پانی میں

آخری شعر میں 'انہوں نے ان مشاعروں اور شعری محفلوں کی طرف اشارہ کیا ہے، جو انجمن مفرح القلوب کے اہتمام سے کبھی کبھی ان کے مکان پر بھی منعقد کی جاتی تھیں۔ ان محفلوں میں منشی سراج الدین احمد خان کے علاوہ میرزا سعد الدین سحر، پنڈت سالگرام سالک اور مولانا عبدالصمد اور مفتی محمد حسین کاشمیری جو اس زمانے کے سربراہ اور صاحبِ فہم عالم تھے۔ اور کبھی کبھی باہر سے آنے والے شعرا شریک ہوتے تھے۔ منشی سراج الدین احمد خان نے 'آبِ ڈُل پر سحابِ سخن اور اربابِ سرود برتنا تھا' کے کلمات میں انہیں تیرتے مشاعروں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

چودھری خوشی محمد کا مذاقِ سخن شست تھا۔ حالی اور شبلی کے اثر سے وہ جدید انداز کی شاعری کو بہت پسند کرتے تھے اور سر شیخ عبدالقادر کے ساتھ مل کر 'خزن' کے ذریعے نئی شاعری کو مقبول بناتے ہیں۔ انہوں نے بھی اہتمام کیا تھا۔ ان کی مشہور نظم 'جوگی نامہ' کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جو جدید دور کی اچھی نظموں میں شمار ہوتا ہے۔

کشمیر سے ناظر کو جو دلی لگاؤ تھا۔ اس کا اظہار ان کی کئی نظموں سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے ذیل کے اشعار پیش کئے جاسکتے ہیں :

تسمت پر اپنی مجھ کو گر اختیار ہوتا	میں گلشنِ جہاں میں نخلِ چنار ہوتا
خمرین سے عاشقوں کے شعلے بلند ہوتے	اور حُسن کی نظر میں برقی شرار ہوتا
پیری میں میری ہوتا ک رنگِ جوانی	فصلِ خزاں بھی میرا رشکِ بہار ہوتا

ناظر نے کچھ غزلیں بھی کہی تھیں اور غزل میں بھی ان کا انداز نکھرا ہوا ہے۔ دو شعر

ذیل میں درج ہیں:

رعنائی خیال کو ٹھہرا دیا گستاخ
واعظ بھی کس قدر ہے مذاق سخن سے دور

اللہ نے حسن یاری کو خلی کر سب سے زنجینوں میں ڈوب گیا پیر بن کام

ذیل کا اقتباس کئی منظر رعنائیوں کا پس منظر رکھتا ہے۔

مستانہ ہواے گلشن تھی، جانانہ اداسے گلبن تھی
ہر وادی، وادی ایمین تھی، ہر کوہ پہ جلوہ طور ہوا
جب باد صبا مضراب بنی، ہر شاخ نہال رباب بنی
شمشاد و چنار رباب بنے، ہر سرو سمن پہ ظہور ہوا
سبز سے بساط بچھائی تھی اور بزم نشاط سجائی تھی
بن میں گلشن میں آنگن میں فرش بجا ہر سمور ہوا
ناظر نے ایک نظم "نغمہ فردوس" کے عنوان سے بھی تھی جس میں شہنشاہ نور الدین
جہانگیر کے عہد کی ایک محفل سرود کا نقشہ کھینچتے ہوئے کثیر کے بارے میں مشہور
فارسی شعر:

اگر فردوس بر روئے زمین است!

ہمیں است ہمیں است ہمیں است

کی تضمین بڑی خوبی سے کی ہے۔ نظم کے کچھ شعر ہیں:

ادھر اک دلرت اور نگ اکبر جلوس خسروی فسر مارا تھا

شہ جم جہا نور الدین جہانگیر شکوہ بزم جم دکھلا رہا تھا

۱۔ ایسا لگتا ہے کہ سرودی حساب سے تسلیج ہوا ہے۔ یہ دونوں اشعار حسرت موہانی کے ہیں۔ (ڈینگ)

۲۔ اصل معنی ہے عکس شمشاد و چنار تھا ہر کوہ سرو سمن کا۔ (ڈینگ)

ادھر ندر جہاں کا جلوہ سُسن درو دیوار کو چمکا رہا تھا
 ادھر محوِ نوا سرست مُطرب سرود آسمانی گارہا تھا
 یہ نقشہ دیکھ کر بزمِ شہی کا سر دُش غیب یہ فرمان تھا
 اگر فردوس بر روئے زمین است
 ہمیں است وہیں است ہمیں است

مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے اڈورڈ ہفتم کے انتقال پر ناظر سے ایک مرثیہ لکھنے کی فرمائش کی تھی، ناظر نے تین شعر کا ایک مرثیہ کہا تھا جو "مرثیہ شاہ کے عنوان سے رسالہ مخزن" لاہور شمارہ دسمبر ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا۔ مرثیہ کا تعارف کرتے ہوئے سر شیخ عبدالقادر اڈیٹر نے ایک نوٹ لکھا تھا جو درج ذیل ہے:

"آنجنہا فی قیصر ہند ایدورڈ ہفتم کے انتقال پر پہلے دیرینہ کرم فرما جناب چوہدری خوشی محمد ناظر صاحب بی اے المتخلص بہ ناظر گورنر ریاست کشمیر نے حضور مہاراجہ صاحب بہادر دالی جموں و کشمیر کے خاص فرمان سے یہ پُر درد مرثیہ لکھا ہے جس میں انگریزی طرز مرثیہ گوئی کا تتبع کیا گیا ہے۔ چوہدری صاحب بہ سبب اپنے عالی شان عہدہ کے اہم فرایض کے اب شعر و سخن سے کم سروکار رکھتے ہیں۔ ان کے کلام کے مشاق مدت کے بعد ان کی نظم کو دیکھ کر ضرور مطمئن ہوں گے۔"

مرثیہ کا اقتباس ذیل میں درج ہے:

ہائے یہ کیا سانچہ اے چرخ گرداں ہو گیا

جس سے نیلی پوش شرق و غرب یکساں ہو گیا

۱۸۲

آفتابِ سلطنت جس کا نہیں ہونا غروب
 آج وہ خورشیدِ عالمِ تاب پہنا ہوا ہو گیا
 ہلے ترے غم سے اے شیرازہ بندِ صلح کل
 ناگہاں مجموعہٴ ہستی پریشاں ہو گیا

ہے غم ایڈورڈ اعظم میں دلِ محزونِ نگار
 ہائے یہ کیا ہو گیا اے گردشِ لیل و نہار
 جو قدومِ شاہ نے بختِ تھا جوں کو شرف
 خطِ کشمیر کو بھی تھا اسی کا انتظار !

ناظر کے کلام کا مجموعہ "نغمہٴ فردوس" کے نام سے ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔ جو نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے۔

لالہ سرپریم کے تذکرہ "خمنخانہ جاوید پر ناظر نے بھی ایک تقریظ لکھی تھی جو خط کے انداز میں ہے اور جلد اول میں شائع ہوئی ہے۔ ان کی نشر کے نمونے کم ملتے ہیں۔ اس لئے یہ اہم ہے۔ تذکرہ کی تدوین پر رسمی توصیف و تحسین کے بعد آگے کی جلدوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

"فرمائیے اب اوقات کس طرح گذرتی ہے ؟ اور خمنخانہ کے کس قدر خم اور تیار ہو گئے ہیں اور آنے والی جلدوں کی کب تک توقع ہو سکتی ہے ؟ مجھے اندیشہ ہے کہ ناظر کا نمبر آنے تک کہیں باقی کا لشہ ہرن نہ ہو جائے۔"

یہ تحریر ۱۹۰۸ء کی ہے اور اس وقت ناظر کشمیر ہی میں تھے۔ ۱۹۲۵ء میں وہ وظیفہ پر

سبکدوش ہوئے۔ اور ۱۹۴۴ء میں ان کا انتقال ہوا، دفن اپنے دل کے کنارے والی کوٹھی میں ہوئے۔

ناظر کے دو فرزند تھے۔ چودھری حمید اللہ اور چودھری فیض اللہ۔ فیض اللہ بپا کی کوٹھی سے ملحق ہی اپنی کوٹھی بنوائی تھی۔ وہ مسلم کانفرنس کے سرگرم کارکن تھے اور تحریک آزادی کے بڑے جری سپاہی۔ ۱۹۴۷ء تک وہ جموں و کشمیر قانون ساز اسمبلی میں مسلم کانفرنس کے گروپ لیڈر رہے۔ بعد میں وہ لاہور چلے گئے تھے۔ جہاں ۱۹۵۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔ فیض اللہ ۱۹۴۷ء تک بارہولہ میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ انہیں ایمر جنسی کے تحت گرفتار کر لیا گیا تھا۔ بعد میں وہ رہا ہوئے اور جموں میں کسٹوڈین کے عہدہ پر کام کرتے رہے۔ آخری زمانے میں وہ پاکستان چلے گئے تھے۔ جہاں ان کا انتقال ہوا۔ ناظر کے بھتیجے نیاز احمد ریاست میں معتمد قانون کے عہدہ پر فائز رہے۔ ۱۹۴۷ء میں انہیں بھی ایمر جنسی کے تحت گرفتار کر لیا گیا تھا۔ رٹائی کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔ انہیں شعر و سخن سے دلچسپی ہے۔ لیکن کلام دستیاب نہیں ہوتا۔

جسٹس شاہ دیں ہمایوں، جو لاہور میں عدالت کے جج ہے، صاحب ذوق ادیب اور شاعر بھی تھے۔ چودھری خوشی محمد ناظر اور پیر زادہ محمد حسین عارف سے تعلقات کی وجہ سے وہ ڈاکٹر اقبال اور سر شیخ عبدالقادر کے ساتھ اکثر کثیر آتے اور یہاں قیام کرتے رہے۔ ان کی آمد پر شعر و سخن کی مخصوص مغللیں منعقد ہوتیں۔ ان کے فرزند میاں بشیر احمد نے اپنے ایک مضمون ”کثیر اور ہمارے ادیب کے عندان کے تحت“ کثیر میں شاہ دین کی ادبی سرگرمیوں کا حال لکھا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

”جب کہیں وہ کثیر جاتے، تو متعدد شعرا اور ادباء کو اپنے گرد جمع کر لیتے اور سیر و تفریح کے ساتھ علمی گفتگو اور شعر و سخن میں اپنا

حصہ۔ وہ ۱۹۴۷ء میں ریاست کے چیف سیکرٹری تھے۔

دقت گذارتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاید سالار پر نظم لکھتے وقت ان
کی محفل میں چودھری خوشی محمد ناظر اور شیخ عبدالقادر بھی موجود تھے۔
اور میاں صاحب کی خواہش تھی کہ ان کے دوست علامہ اقبال
بھی اس میں شریک ہوں۔

جسٹس شاہدین کی نظم "سالار" کا اقتباس ذیل میں درج ہے:

اے باغ لوگ کہتے ہیں تم سالار ہو	اور عظمت گذشتہ کی اک یادگار ہو
کہتے ہیں تم سے کھلتے ہیں راز دروں کے بیج	تم اک کلیہ فضل در روزگار ہو
ہاں کچھ بتاؤ اگلے زمانے کی کیفیت	تم واقعات دہر کے نامہ نگار ہو
خاموش کیوں ہو کچھ تو کہو اپنی داستان	کس سہر سر بھر کے تم راز دار ہو
فوارے کی زباں سے کہو کچھ تو اپنا حال	کیوں موتے زار زار تم اے ایشوار ہو
اور تم بتاؤ پانی کی لہر و کس لئے	مضطرب ہو بیج و تاب میں ہو بہار ہو
کبے جلا رہا ہے یہ سوزِ دروں نہیں	دل دادہ کس کی یاد میں تم اے چنار ہو

ہاں اے مسافر، ایسے سوالوں سے فائدہ

زخموں پہ کیوں چھڑکتے نمک بار بار ہو

میرزا سعد الدین سعد کشمیر کے علم دوست رئیسوں میں سے تھے وہ اپنے زمانے
میں کشمیر کے اچھے عالم اور فاسی کے شاعر تھے۔ لیکن کبھی کبھی اردو میں بھی کہہ لیا
کرتے تھے۔ سعد کے اجداد ترکستان کے رہنے والے تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ میرزا
قاسم بیگ شاہ جہاں کے عہد میں ترکستان سے ہندوستان آئے اور شاہ جہاں
کے دربار میں رسائی حاصل کی، عہدہ اور منصب سے بھی سرفراز ہوئے ان کے فرزند
اوزنگ زیب کے دربار میں اعزاز و اکرام رکھتے تھے۔ ۱۰۷۵ھ میں جب اوزنگ زیب

کشمیر کی میسر کو آئے تو میرزا عنایت اللہ بیگ بھی ان کے ساتھ تھے۔ انہیں کشمیر کی آب و ہوا ایسی پسند آئی کہ یہیں بود و باش اختیار کر لی۔

میرزا عنایت اللہ بیگ کے پوتے، میرزا احمد نے سکھ اقتدار کے آخری زمانے میں اپنے علم و فضل کی بدولت ترقی کی اور انگریزوں کی جانب سے کشمیر میں وقایع نگار کے عہدہ پر فائز رہے۔ یہ حکمت ان کی اولاد میں کئی پشت تک قائم رہی۔ میرزا احمد کے پانچ فرزند تھے۔ میرزا سیف الدین، میرزا غلام محی الدین، میرزا عزیز الدین، میرزا قمر الدین اور میرزا محمد الدین۔ ان میں سے تین یعنی میرزا سیف الدین، میرزا غلام محی الدین اور میرزا قمر الدین یکے بعد دیگرے اسی خدمت پر مامور رہے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے زمانے میں میرزا سیف الدین اس خدمت پر مامور تھے۔ ان کا رسوخ اور اثر انگریزوں کے یہاں بہت تھا۔ جس سے کام لے کر انہوں نے گلاب سنگھ کے تعلقات انگریزی حکومت سے بہتر بنانے کی کوشش کی۔ انگریز عہدیداروں

اور یورپی سیاحوں سے ان کے تعلقات اچھے رہے۔ چنانچہ ہیرن ہیلنگل اور بعض اور سیاحوں نے جو کشمیر آئے تھے۔ میرزا کے علم و فضل کو سراہا ہے۔ ان کے مرتب کئے ہوئے وقایع یا اخبار ۱۸۴۶ء تا ۱۸۴۸ء جو فارسی میں کئی جلدوں میں ہیں ریاست کی ریسرچ لائبریری، سری نگر میں محفوظ ہیں۔ میجر جان ہچر کی فرمائش پر میرزا سیف الدین نے کشمیر کی ایک مختصر فارسی تاریخ "خلاصۃ التواریخ" کے نام سے ۱۸۵۹ء میں لکھی تھی۔

میرزا سیف الدین کے بعد میرزا غلام محی الدین نے ۱۸۵۱ء کی رودادیں مرتب کیں اور ۱۸۵۸ء کی اخبار ان کے جانشین میرزا قمر الدین نے لکھے ہیں میرزا بدر الدین کے فرزند میرزا جلال الدین فارسی کے شاعر تھے اور کچھ غزلیں اور ایک مثنوی "حسن دگوہر" اپنی یادگار چھوڑی ہے۔

میرزا سعد الدین سعد، میرزا غلام محی الدین کے فرزند تھے اور ریاست میں

ایک عہدہ پر فائز تھے۔ فارسی علم و ادب کا ذوق انہیں خاندانی درشہ میں ملا تھا۔ فارسی شعر و سخن سے دلچسپی کی بدولت شبلی نعمانی سے ان کے گہرے مراسم ہو گئے تھے۔ چنانچہ ۱۸۹۹ء میں شبلی جب کشمیر آئے تھے تو انہیں کے یہاں مہمان ٹھہرے تھے۔ قیام کشمیر کے زمانے میں شبلی کی طبیعت نامساں ہو گئی اور جلد کشمیر سے روانہ ہو گئے۔ وطن پہنچنے کے بعد جب طبیعت ٹھیک ہوئی تو ایک "قصیدہ کشمیریہ" لکھ کر سعد کے یہاں بھیجا۔ جس کا مطلع یہ ہے:

دوستانِ ایکہ رہ و رسم وفا کیش شماس

ایچ دانید کہ شبلی بچہ حال است و کجاست

اپنے کشمیر جانے کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا ہے:

سوی کشمیر دال گشت ببال گرم روی

کرمی خواست درال رہ نفسی کوردن راست

آگے کشمیر کی خوبصورتی کی تعریف کی ہے اور اپنی علالت کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

اس قصیدہ کے جواب میں میرزا سعد الدین سعد نے ایک قصیدہ فارسی میں

"قصیدہ سعدیہ در شکر یہ قصیدہ کشمیریہ مصنفہ شمس العلماء مولانا شبلی صاحب

نعمانی در ۱۸۹۹ء" لکھ کر بھیجا تھا۔ جس میں ان کی صحت یابی پر مسرت کا اظہار

کیا ہے۔ اور ان کے علم و فضل کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ قصیدے کے کچھ شعر

حسب ذیل ہیں:

گلِ بباغ آمد و گلبنانگ نشاطی بر خاست

شاہد آرائشِ دنانئی و نانی و ساقیِ نخواست

شکر اجاب کر آ میختہ با شکوہ تب

شکری بہر گواہ شدن تلخ و راست

۱۸۴
 اور درآمد چو دریں گلکدہ گل زخت بہ لبست
 گلہ از گل بودش شکوہ نہ از آب ہواست

شبلی کے راسم کی وجہ سے، شبلی کی اصلاحی تحریکوں کا اثر سعد پر بھی پڑا تھا چنانچہ انہوں نے کچھ نظمیں فارسی میں اصلاحی انداز کی لکھی تھیں جو "نوحہ پُرنا شیر کشمیر" کے نام سے موسوم ہیں۔ اور ان کی دوسری نظموں اور اردو نظم "کشمیر کا دلچسپ" فوٹو کے ساتھ ۱۳۳۰ھ میں تحفہ سعد کے نام سے شائع ہوئی ہیں۔ "تحفہ" میں شامل نظموں میں "کشمیر کا دلچسپ فوٹو" بہت اچھی نظم ہے۔ اس میں نوحہ کشمیر کی سی المناکی اور مایوسی کے جذبات نہیں ہیں، کہیں کہیں کشمیر کے حسن و رعنائی کے پس منظر میں آثارِ سلف کی یاد ضرور آجاتی ہے لیکن دھچکارا تو بہا کر وہ آگے بڑھ جاتے اور فضا کے اتھرازی میں محو ہو جاتے ہیں۔

نظم میں کشمیر کے تقریباً سارے ہی دلچسپ گوشوں کی طرف اشارے کئے ہیں۔ اس کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے :

خاک پاک گلشن کشمیر اے غنچہ دیار
 رحمتیں ہوں فضل حق سے دسم تجھ پر نثار
 تجھ میں یہ گلزار یہ گلشن، یہ جھیلیں یہ یلاق
 ایک دفتر میں نہو جن کے بیاں کا اختصار
 مثل دل پہلو میں ترے جھیل ٹول ہے موجزن
 ہنچو روے حور عین تاباں ہیں تجھ میں چشمہ سار

آگے دوسرے قابل دید مقامات مثلاً مابیل، چترہ شاہی، باغ نسیم، شالمار، سونہ مرغ، گل مرغ، پہل گام، اولہ، سندھ ویلی، ویری ناگ، اچھ بل وغیرہ کی خوبصورتی کا حال رکھتے ہیں۔ جب عہدِ ماضی کی طرف خیال جاتا ہے تو آثار کی موجودہ ویرانی پر افسوس کرتے ہیں۔

تجھ میں شاہی یادگاریں ایسی ایسی بے بدل
جن کی دیرانی ہے اب چرخِ ظالم شرمسار
تجھ میں ہیں موجود اب تک ایسے آثارِ سلف
رو رہے ہیں بانیوں کو جو بہ چشمِ اشکبار
یہ مساجد، یہ منادر یہ عماراتِ رفیع
ہر جگہ باقی ہیں اب تک بانیوں کی یادگار

بانیوں کی یاد آتے ہی، ان کے شاندار عہد کا نقشہ ان کے ذہن میں آ جاتا ہے
لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی آ جاتا ہے کہ اسلافِ فخر کرنے سے کوئی فائدہ نہیں جب
تک اخلاق میں، علم دھنر موجود نہ ہوں۔ نظم کے آخری شعر میں وہ غالب کی طرح اپنی
فارسی پر اس طرح فخر کرتے ہیں:

آج اُردو میں لکھا ہے حال کچھ کثیر کا

گو زبانِ فارسی پر سعد کا ہے افتخار

اس زمانے کے ایک اور پاکیزہ ادبی ذوق رکھنے والے عہدہ دار لالہ کنور سین تھے،
جو کثیر میں عدالتِ الحالیہ کے چیف جج تھے۔ اُردو شعر و ادب کا وہ نفیس ذوق
رکھتے تھے اور اس زمانے کی علمی اور ادبی محفلوں کی رونق تھے۔ اکثر محفلوں میں وہ
ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے۔ لالہ اُردو میں تصنیف و تالیف کا بھی شوق
رکھتے تھے، چنانچہ انہوں نے کچھ ناٹک لکھے تھے۔

منشی امیر الدین امیر، جن کا کثیر کے نوجوانوں میں شعر و سخن کا ذوق پھیلانے
اور مذاق کو سونارنے میں بڑا ہاتھ رہا ہے۔ متو خاندان سے تھے۔ یہ خاندان تجارت
پیشہ تھا۔ اور امرتسر میں ان کے دادا کی دکان تھی جہاں کثیر سے پشتینہ منگواتے
اور ہندوستان بھیجتے۔ اور ہندوستان سے کپڑا آتا اور فروخت ہوتا تھا۔ اس تعلق

سے ان کے خاندان کو "کپرہ" بھی کہنے لگے تھے۔ ان بزرگ کے بڑے صاحب زادے کی شادی ایک کشمیری لڑکی سے ہوئی تھی، جس کے بطن سے امیر الدین پیدا ہوئے۔ امیر نے میر کرامت اللہ امیرسری سے تعلیم حاصل کی اور کشمیر کے مشہور شاعر اور انشاء پرداز خواجہ حسن شعری سے جو اس زمانے میں امیرسری میں مقیم تھے، فن شاعری سیکھا امیر تخلص اختیار کیا تھا۔ اور ابتدائے عمر ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔ امیر نے معانی، عروض اور بیان کے علاوہ، حکمت یا طب، منطق اور فلسفہ میں بھی دستگاہ پیدا کر لی تھی۔ کہتے ہیں انہیں کیمیا بنانے کا بھی شوق تھا جسے بعد کو دوستوں کے سمجھانے سے ترک کر دیا۔

امیر نے تعلیم سے فارغ ہو کر تجارت شروع کی، لیکن اس کام میں جی نہ لگا، پھر دو ڈھائی سال ایک اخبار میں کام کیا۔ آخر یہ کام بھی ترک کر کے کشمیر چلے گئے اور وہاں دکالت کا امتحان پاس کر کے دکالت شروع کی۔ لیکن امیر اپنی ذہنی اور تخلیقی افتاد کے ساتھ، اس طرح کے کام کے لئے نہیں موزوں تھے۔ ان کا قیام کشمیر کے مشہور دینی پیشوا، میر داعظ حافظ غلام رسول شاہ کے مکان کے قریب تھا اور وہ امیر کے علم و فضل اور صلاحیتوں سے واقف تھے۔ انہیں نصرت الاسلام کے زیر اہتمام میر داعظ ایک مدرسہ کھولنے کی تجویز بنا رہے تھے۔ انہوں نے امیر کو اپنے اسکول میں جو اسلامیہ ہائی اسکول کے نام سے موسوم ہوا، فارسی اور اردو پڑھانے کے لئے مقرر کر لیا۔ یہاں امیر کی طبیعت کے اصلی جوہر نمایاں ہوئے۔ وہ آخر تک اسکول میں اردو و فارسی کے معلم اہل رہے، لیکن تعلیم کے ساتھ ساتھ بہت سے نوجوان طالب علموں کے شعری مذاق کی تربیت بھی کی، جن میں محمد امین درالو داراب اور امیرزا کمال الدین شیدا نمایاں ہیں۔

مدرسہ کی ملازمت کے دوران ایک موقع پر امیر کی ہیڈ ماسٹر سے کسی بات پر جھگڑ

گئی تھی۔ وہ سیدھے گھر گئے اور فغانی کی مشہور غزل — 'فغانی گردے دلی
تو باش ایں جا کہ من رفت' کی محسوس میں تھیں۔ یہ استغنا لکھی اور میر داغ
کی خدمت میں روانہ کر دی۔ یہ تھیں جب ذیل ہے:

بحال اضطراب اندر بہاراں از چمن رفتم!
چو گلبرگ از خزاں در خاک بے گور کھن رفتم
زلطفِ سرِ مدرس آہ از ایں انجمن رفتم
چو برتنِ خاتم دامن گرفت از غلشن رفتم

بخط لغزش پای دریں رہ ماندن رفتم

مکن ای بجز از بادِ غمِ درِ جہدِ را پر چین
مگر ای خارِ صحرایِ دامنم بگذار دشت کیس
ترجمِ برگِ زخمِ جگر اے پنچہ گلچیں
تو اے گل! بعد ازین باہر کہ نخواہد رفتن

کہ چوں لاالہِ دلیغِ جگر از ایں چمن رفتم

نمودہ ناکسی انوس ضایع روزگارم را
غلط تاثیر طالع ریخت در شورہ شرارم را
شکتہ رنگ ظالم خاطر آئینہ دارم را
کہ مرہم میتواند لبست زخمِ دلفگارم را

برنگِ شمع در ہر نرم بہرِ سوختن رفتم

خدایِ داند ہم مدرس ہم انجمن کارش!
پس از عمری بسک کردیم مادرش خود از بدش
مرا تابی امیر کنوں نہانہ بہرِ ایذایش

دلی می باید دھری کہ آرد تاب آزارش

نغانی گردلی داری تو با ش اینجا کس رفت

مختس کو پڑھ کر میر داعظ نے امیر کو سمجھا سمجھا کر استعفا واپس لینے پر آمادہ کیا۔

امیر انجن نصرت الاسلام کے بھی بڑے سرگرم رکن تھے۔ انجن کے سالانہ جلسوں میں ان کی نظمیں جو حاکی اور شبلی کی قومی نظموں کا انداز رکھتی تھیں، پڑھی اور بہت پسند کی جاتی تھیں۔ ان کی نظم کے بغیر انجن کے جلسے پھیلے رہ جاتے تھے۔ ایک جلسے میں اپنی نظم کا آغاز انہوں نے اس انداز سے کیا تھا :

نوا سنجی میں میرا کوئی ہمتا ہو نہیں سکتا

میں چپ بیٹھا رہوں جلسے میں ایسا ہو نہیں سکتا

حالی کی ایک غزل پر مختس لکھا تھا، جس کا ایک بند ہے :

بات ایسی نہیں کرتے ہیں کبھی دانشمند

پہنچتے جس سے کہ کسی دل کو ذرہ بھر بھی گزند

کس کا ہم شک کریں کس کا کریں شک وہ پسند

آنکھ سب ایک کھلی رکھتے ہیں اور ایک کو بند

اس میں مسلم بھی ہیں ہندو بھی کیالی بھی

امیر اکثر مزاحیہ کہتے تھے۔ اور ان نے مزاحیہ ابتدائی سرید دو کے اردو شعرا کا سا

انداز ہوتا تھا۔ مزاح کا انداز پیدا کرنے کے لئے وہ فارسی، انگریزی، کشمیری سب

زبانوں کے الفاظ سے کام لیتے ہیں۔ ان کی ایک نظم کے چند شعر ہیں :

جب بھی دلبر سے کھٹ پٹ ہو گئی صلح کی تدبیر جھٹ پٹ می کنم

جس کو کیٹنے سے آتا ہے جواب جو کہ ہے مشہور اب غصت تاب

آٹھ ہے آنے کو وہ مست شباب اس لئے گھر کی سجادٹ می کنم

بادہ خوری میں بھی ہوں یکتائے فن
سینکڑوں گیلین پیوں لے جانِ من
چینی و سکی برانڈی سیمپٹن
منہ لگاتے ہی صفا چٹ می کنم

اس زمین کے مشکل ہونے کا اسیر کو اعتراف ہے اور اس کے ساتھ اپنی قادر طبیعت
پر بھی گھمنڈ۔ چنانچہ کہتے ہیں:

کیسی ہی مشکل سے مشکل ہوزیں طبع موزوں میری رگڑ ہی نہیں
موز میدانِ سخن اے ہم نشیں فکر کے ٹٹو کو سرپٹ می کنم
ایک نظم میں اپنی کماحقہ قدر نہ ہونے کا شکوہ کرتے ہیں:
گھر کی جو ہے مرغی تو وہ ہے دال برابر
کیا نظیں لکھیں صاجو ہر سال برابر
دیتا ہی نہیں داد کوئی بال برابر
فرماتے ہیں آیا نہیں یہ سب قال برابر
بکھلتے ہیں یہ کیا دُچھ اُٹھس اُڈڑٹس کن

ایک اور محسن کا بند ہے جو قومی اصلاح کا انداز رکھتا ہے:

تعلیم سے نفرت ہے مسلمان کو ہجرات
اصرار ہے واعظ کو پڑھو علم ہی دن رات
رکھلاتے ہیں انوائِ وطن ادب ہی کچھ بات
منعم کنم از خواہش دل پیر خرابات
زائے روکہ غذا کا ہش جاں است نبس پیچ

میر واعظ کے انتقال کے بعد انجن کا جو سالانہ جلسہ منعقد ہوا تھا۔ اس میں اسیر نے جو

نظم پڑھی تھی وہ مرثیہ کا سوز رکھتی ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

آج اس بزم میں احباب ہیں سائے آئے

قوم کے جتنے ہیں ہمدرد ہمارے آئے

سو جتنا مجھ کو نہیں یا کہ حقیقت میں امیر

باقی مدرسہ اب کے نہ ہمارے آئے

امیر کے ایک بھائی میاں حوام الدین بھی اترے تجارت چھوڑ کر کثیر لکھتے تھے۔
اور ریاست میں مدارس کے مددگار انسپکٹر رہے۔

منشی امیر الدین کے ایک رفیق کار منشی صادق علی خاں صادق بھی اچھی ادبی
صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ بھی اسلامیہ ہائی اسکول 'سری نگر' میں مدرس تھے پہلے وہ
سرکاری ملازمت میں تھے، لیکن قومی خدمت کے جذبے نے انہیں سرکاری ملازمت چھوڑ
کر، اسلامیہ ہائی اسکول کی مدرسے اختیار کرنے پر مایل کیا۔ منشی امیر الدین کے دوست
بدش صادق بھی، انجمن نصرت الاسلام کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے۔ ان میں ادب منشی
صاحب میں چشمک ہو گئی تھی۔ چنانچہ کبھی کبھی ایک دوسرے پر تعریفیں بھی کر بیٹھتے تھے۔
انجمن کے سالانہ جلسوں میں صادق کی نظمیں بہت پسند کی جاتی تھیں ان کی ایک نظم کے
شعر ہیں:

ہو گیا سرسبز نخل آرزوے ملک و قوم

دامن کشتِ تمنا گلِ بداماں ہو گیا

تھا دلوں میں دردِ اخواں، سوزِ مخفی کی طرح

آتشکار آج پھر یہ راز پنہاں ہو گیا

ہو رہی ہے نصرتِ اسلام کے جلسے کی دھوم

ہر زبانِ دل میں، دردِ دردِ اخواں ہو گیا

۱۹۰۷ء
صادق کی ایک اچھی نظم جو اقبال کے انداز میں لکھی گئی ہے، ادبی اعتبار سے عمدہ نظم ہے
اس کے چند شعر ہیں:

کتاب لالہ و سبل پہ ہے مراقبہ زبانِ نرگس سوسن ہے تری جان میری
ہے شمعِ آتش سوزِ جگر کا پر کالہ دہانِ قمری و بلبلیں ہیں ہے فضاں میری
اسی سے میرے سخن کی ہے گڑبازار اسی متاع سے ہے رونقِ دکھان میری
بیروا عطا رسول شاہ کے انتقال پر صادق نے بھی ایک مؤثر نوہ لکھا تھا۔ جو انجمن کی
سالانہ روداد میں شائع ہوئی ہے۔ اس کے دو شعر حسبِ ذیل ہیں:

صاف کہتا ہے زبانِ حال سے احوالِ دل
اک کتابِ داشدہ اس کا دردِ دیوار ہے
چشمِ بینا ہے تو دیکھ اور گوشِ بینا ہے تو سُن
تو ہی تو اے قوم، اس تعمیر کی معمار ہے

رسالہ "نخن" لاہور کے شمارہ اگست ۱۹۰۶ء میں صادق کی ایک نفیس نظم
"سفرِ زندگی" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی، جس میں زندگی کی کٹھن منزلوں کا ذکر
کیا ہے۔ نظم ذیل میں درج ہے:

کیا کہوں کیا کٹھن ہے زندگی کا سفر
ہر قدم پر جان کا نقصان تو ایماں کا ضرر
آفتوں سی آفتیں اور مشکلوں سی مشکلیں
الحذر اس زندگی سے، اے عزیزِ ہند الحذر
اک طرف خندق کھلی تو دوسری جانب کنواں
اور ان میں راہ ہے اک بال سے باریک تر
ہے یہی منزل وہ شاید جس کو کہتے ہیں مراط

۱۹۵
 دھار پر تلوار کے ہے نوعِ انساں کا گذر
 پہنچے جاناں ملک یا جان سے ہاتھ دھوئے
 رہتی ہے ہر کام پر یہ چیتاں مدِ نظر
 اس قدر دشوار گھاٹی ہے کہ کچھ پوچھو نہیں
 بیٹھ جاتے ہیں سبھی اس راہ میں جی جھوڑ کر
 عقل کہتی ہے نہ رگھو وادیِ وحشت میں قدم
 شرق کہتا ہے کہ عقلِ نکتہ رس کو کیا خبر
 آکے صادق پھنس گئے اس جال میں انجام کار
 جال اپنے ہاتھ سے بنتے رہے جو عمر بھر

صادق کے کچھ مضامین بھی "محرر" کے مختلف شماروں میں شائع ہوئے ہیں۔
 ایک مضمون "پیداوار اور دولت" کے عنوان سے ۱۹۱۰ء کے ایک شمارہ میں شائع
 ہوا تھا جس میں یورپی مصنفین کے خیالات کی روشنی میں دولت اور اس کی
 پیداوار کے معاشی مائیل پر بحث کی گئی ہے۔

صادق ۱۹۱۳ء میں پونچھ چلے گئے تھے۔ جہاں اسلامیہ ہائی اسکول پونچھ کی
 صدارت ان کے تفویض ہوئی تھی۔ ان کا انتقال پونچھ ہی میں ہوا۔
 منشی محمد صادق ایک اور خوش نکر شاعر ہیں جو انجمن ہی کے ایک سکول میں
 مدرس تھے۔ ان کا کلام معاصر اخباروں اور رسالوں میں چھپتا رہا۔ انجمن کے سالانہ
 جلسوں میں بھی ان کی نظمیں پڑھی جاتیں اور پسند کی جاتی تھیں۔ ایک نظم جو ۱۹۱۰ء
 کے سالانہ جلسہ میں پڑھی گئی تھی اس کے دُشعر ذیل میں درج ہیں:

جانتے ہیں آپ میں کیا گفتگو کہنے کو ہوں نیکے بد جو کچھ ہے وہ سب روبرو کہنے کو ہوں
 مثلِ شانہ سو بگو کہتا نہیں ہوں پشت پر آئینہ کی طرح سب کچھ روبرو کہنے کو ہوں

انجمن کے اصلاحی کام کی نوعیت کے لحاظ سے، اکثر اساتذہ میں ایک جذبہ عمل
 ابھر آیا تھا۔ انجمن کے سالانہ جلسوں کے لئے خاص طور پر جو نظمیں لکھی جاتی تھیں۔
 ان کا انجمن حمایت اسلام، لاہور کے سالانہ جلسوں میں پڑھی جانے والی نظموں، خاص
 طور پر مالی کی اخلاقی، اصلاحی اور قومی نظموں کا سائب لہجہ اور اپیل ہوتی تھی۔
 منشی صادق کی ایک طویل نظم کا آغاز، اس طرح ہوتا ہے :

سلمانو، ذرا سوچو جو ہے فہم و ذکا باقی !

سو آپس کے جھگڑوں کے رملے تم میں کیا باقی

آگے وہ انہیں عمل پر اُکاتے اور ابھارتے ہیں :

منشی غلام محمد خادم، منشی محمد الدین فوق کے چچا ہوتے تھے۔ ان کو شعر و
 شاعری کا بڑا شوق تھا۔ گو ان کا ادبی پایہ بہت بلند نہیں تھا۔ اپنے زمانے کے
 اکثر اہم واقعات پر انہوں نے تاریخی قطعے لکھے ہیں۔ خادم کا خاندان زینہ گیر کے
 زمینداروں میں سے تھا۔ اور ان کا قیام زیادہ تر تحصیل سوپور کے موضع سیمپور میں ہی
 لیکن یہ اکثر سری نگر میں رہتے تھے۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی وہ شعر کہہ لیتے تھے۔
 اپنے ایک بیٹے کے بے وقت انتقال پر انہوں نے ایک مرثیہ کہا تھا جس میں اپنے
 رنج و غم کے جذبات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں :

جس کی پیدائش کی خوشیوں میں لٹا یا مال دھن

جس کے بچپن اور جوانی پہ تھا میں سایہ نگن

جس کو بنا تھا عصاے پیر پری میں مرا

آج اس نے زندگی میری بنا دی ہے کھٹن

خادم کی نظموں کی اہمیت ادبی سے زیادہ تاریخی ہے۔ اپنے زمانے کی اکثر قابل ذکر
 شخصیتوں کے انتقال پر نظمیں اور تاریخی کہیں تھیں۔ سوپور کے ایک شہر قومی

خدمت گزار، حُسنِ دارِ خادم کے دوست اور ایک غیر انسان تھے۔ ان کے انتقال پر
خادم نے ایک مرثیہ کہا تھا جس کے کچھ شعر حسبِ ذیل ہیں :

وہ عزیز قوم دہ سردار قوم ! خادم قوم اور دہ غنچوار قوم !

ہو گیا ہم سے بھدا و احسرتا ! اے وہ زرنخش اور زردار قوم !

زینتِ محفل جو تھا دہ چل بسا آج بے رونق ہوا دربار قوم !

اے خدا جنت میں ہوا نکاح مقام ہے دعا گو ان کا خدمت گزار قوم !

سرپرہی کے ایک اور رئیس عبدالغنی دکیل، جو قومی خدمت میں پیش پیش رہتے
تھے۔ ان کے انتقال پر بھی خادم نے مرثیہ کہا تھا، جس میں ان کی قومی خدمات کی
طرف اشارے کئے ہیں۔ مرثیہ کے کچھ شعر ہیں :

تیرے دم سے قصبہ سوپور کی تنظیم تھی !

اب وہ بے سر کہ تو ہی چل بسا عبدالغنی

جب کبھی سوپور میں آیا کوئی قومی سفیر

تیرے دم سے اس کو چندہ مل گیا عبدالغنی

پندت شیبام لال ریونیو افسر مقرر ہوئے تو خادم نے ایک نظم کہی تھی، جس کے دو شعر
ہیں :

ہو گئے جب نہال سرگوپال بن گئے شیبام لال افسر مال

دوستوں کو ہوا ہے عیشِ طرب دشمنوں کو ہوا ہے رنج و ملال

فارسی میں بھی ان کی کچھ نظمیں ہیں۔ صوفی محمد اکبر کے مجلسِ قانون ساز کے رکن منتخب
ہونے کے موقع پر انہوں نے فارسی اور اردو ملی جلی ایک نظم کہی تھی جس کے چند شعر
یہاں درج ہیں :

تو مسخِ کردہ با خلق خود دلہای قوم قوم بی نازد تو، تو دلبری یا ساحری

۱۔ سرگوپال سوانی آئیگر۔ وزیراعظم کشمیر (۱۹۳۶ء — ۱۹۴۱ء)

گوہر انسانی تری جلوں میں ہم نے کیچلی دیکھیں گے پر جا سمجھائیں اب گہر زری حری
 آج دورِ ادیس کا پھر سماں آیا نظر پھر غلامانِ محمدؐ کو ملی ہے سروری
 کشمیر کے ایک بزرگ جنہوں نے کشمیری میں کافی کلام چھوڑا ہے، مولانا عبدالقدیر بدری
 تھے۔ بدری کی نسبت مولانا کے اسلاف میں ان صحابی سے ہے جنہوں نے جنگِ بدر
 میں حصہ لیا تھا۔ مولانا کے جدِ امجد حضرت مراد اللہ نقشبندی، خواجہ ہلال نقشبندی
 کے ہمراہ ۹۷۱ھ میں بلخ سے کشمیر آئے تھے۔ حضرت مراد اللہ کا قیام سیدپور، پیر، رملہ۔
 لیکن مولانا عبدالقدیر کے پردادا عبدالرزاق بدری، سری نگر آگئے تھے۔ مولانا عبدالقدیر
 کی ولادت سری نگر ہی میں ۱۲۸۶ھ (م ۶۳-۱۸۶۲ء) میں ہوئی۔ سری نگر ہی میں اپنی
 تعلیم کی تکمیل کی۔ مولانا عبدالسلام درابو سے انہوں نے ظاہر علوم کے علاوہ علومِ روحانی
 میں بھی استفادہ کیا اور اپنے زمانے کے نامور صوفیوں میں شمار ہونے لگے۔ ان کی
 زندگی گوشہ نشینی اور علومِ دینی کے اکتساب اور استغراق میں بسر ہوئی۔

فارسی میں مولانا کو بڑی دستگاہ حاصل تھی اور شعر بھی کہتے تھے۔ کشمیری میں
 انہوں نے کئی مثنویاں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان مثنویوں کا مطالعہ ڈاکٹر سید
 اسد اللہ کامل استاد شعبہ اُردو کشمیر یونیورسٹی نے کیا تھا اور ایک مضمون بھی
 شعبہ کے ترجمان "ادبیات" (شمارہ ۱۹۶۶) میں شائع کیا ہے، جس میں ان کی تین
 کشمیری مثنویوں، "مُشکلِ کُشا"، "تحفہ عشق"، "شکر ریز" اور فارسی مثنویوں "خیر بختا"
 اور "روحِ القدیر" اور ایک قصیدہ "روفتہ الجنات" کی تفصیلات لکھی ہیں۔ قصیدہ
 حضرت نقشبند کی لغت بھی ہے۔

مولانا کی ایک اور مثنوی "دُرِ یتیم" میں جو تین ہزار اشعار پر مشتمل ہے
 حضرت پیغمبر اسلامؐ کے کچھ معجزات اور ایک صحابی حضرت ہبابؓ کا قصہ بیان
 کیا ہے۔ اسی مثنوی کے کچھ حصے اُردو میں بھی نظم کئے ہیں۔ اس حصہ کا آغاز اس
 لہ۔ منقبت کی جگہ غلط استعمال ہوا ہے۔

طرح ہوتا ہے :

کرد میں بیاں قصہ بہاب کا مدح خواں ہوا جوں میں اصحاب کا
 صوابی تھے بہاب بہت نامور محبت تھی حضرت کی انہیں تیر تر^{۱۷}
 گوارا نہ کرتے تھے فرقت کبھی نہ خدمت سے ملتی تھی فرصت کبھی
 دل ان کا محبت سے بھر پور تھا اور عشق محمد سے معمور تھا
 حکیم فیروز الدین طغرانی فیروز، اپنے عہد کے اچھے علماء میں شمار ہوتے تھے اور شاعری میں
 انہیں استاد کی کامرتبہ حاصل تھا۔ ان کا خاندان کشمیر سے تھا، لیکن ان کی نشوونما
 پنجاب میں ہوئی تھی اور دہلی میں بھی کافی گذارہ تھا۔ ایک شعر میں اپنے کشمیری نژاد ہونے
 کا تذکرہ کرتے ہیں :

شک نہیں اس میں کہ ہے فیروز کشمیری نژاد
 لگ گئی مٹی مگر اس کو جہاں آباد کی

کچھ زمانہ تک وہ امرتسر میں بھی رہے تھے، اس کے بعد جوں آئے جہاں وہ اکبر لائی
 اسکول میں عربی اور فارسی کے مدرس مقرر ہوئے تھے۔ جوں وہ ۱۹۱۸ء میں آئے
 تھے اور اپنے ساتھ نکھرے ہوئے شعری مذاق کا سرمایہ لائے تھے۔ اس لئے وہ جلد ہی
 شعر و سخن سے ذوق رکھنے والے نوجوانوں کا مرجع بن گئے۔ فیروز طغرانی کل ہند
 شہرت کے استاد تھے چنانچہ ہندوستان کے مختلف حصوں سے شعر و سخن کا ذوق
 رکھنے والے، ان کے پاس کلام کی اصلاح لینے آتے تھے۔ مدراس کے مشہور استاد
 سخن شیخ عبدالقادر شاہ مدراس، ان سے استفادہ کے لئے اکثر جوں آیا کرتے تھے۔
 اسی زمانے میں وہ کافی عمر رسیدہ تھے۔ شاعری میں طغرانی کی دستگاہ کی بدولت ہندوستان
 بھر کے چوٹی کے شعراء سے ان کے مراسم قائم ہو گئے تھے۔ ان کا مکان شعر و سخن کی دلچسپی
 کا مرکز بنا جاتا تھا۔ انہیں کی سرپرستی میں ہر سال جوں میں ایک مشاعرہ وسیع پیمانہ پر

منقہ ہوتا تھا۔ اس شاعرہ میں کلام سننے کے لئے ملک بھر سے سربساز دروہ شاعر مدعو کئے جاتے تھے۔ ان مترکہ الارام شاعروں کا اثر نوز عمر شعراء کے ذوق کی آبیاری میں بہت معادن ثابت ہوا۔

طغرائی غزل کے استاد تھے اور غزل میں ان کا اپنا مخصوص انداز تھا۔ طغرائی کی زندگی میں رنج و غم کی بہت سی کھٹن منزلیں آچکی تھیں جس کا پرتوان کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔ ان کی غزل کے کچھ شعر درج کئے جاتے ہیں۔

اس چین میں ہم رہیں گریہ پیہم رہے
سر سے پاتک آبدیدہ صورتِ شبنم ہے
شمع ساں اک دم نہ رونے سے ہمیں فرصت ملی
عمر بھر گویا رہیں حلقہ ماتم رہے
کوئی حالت ہونہ چھوڑے ہاتھ سے دلمان صبر
پاٹے استغلال ہر منزل پہ مستحکم ہے

کھالے میلِ حوادث کے تھپڑے فرزد
آرمیدہ ہفتِ ساحل دریا ہو کر

نہ ہوئی پرنہ ہوئی صبحِ شبِ غمِ فرزد
در نہ ہر شام کی ہوتی ہے سحر کہتے ہیں

طغرائی کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ لیکن ان میں صوفی غلام مصطفیٰ اقبالی، ملک محی الدین قمر قمر ازی، حسن محمد منہ اس، ہرکشن حبیب، کشن سمیل پوری، پنڈت اقبال کشن اور نرسنگھ سہائے شوق، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پنڈت داسہ کول اور گربھ بلیں فارسی کے شاعر تھے۔ وہ ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔

اور سہی ہجری میں خانقاہ معلیٰ کے قریب اپنے آبائی مکان میں رہا کرتے تھے۔ فارسی میں بلبل پنڈت ست رام مجرم کے شاگرد تھے، پنڈت ست رام اپنے زمانے کے مستند فارسی علماء میں شمار ہوتے تھے۔ اور شعر و شاعری کا بھی اچھا مذاق رکھتے تھے۔ بلبل فارسی میں صاحب دیوان ہیں۔ اس کے علاوہ کئی شذوئیں بھی لکھی ہیں۔ جن میں سے بعض بہت ضخیم ہیں۔ "گلشنِ عندلیب" "گلزارِ بلبل" اور "چهار درویش" ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ انہوں نے ایک ناولک بھی ہریش چندر کے نام سے فارسی میں لکھا تھا۔ جس میں ان کی کچھ اردو غزلیں بھی شامل ہیں۔ یہ ناولک اب کیاب ہے۔

پنڈت مسہج رام کو مجرم اردو میں شعر کہتے تھے۔ ان کا ذکر وہ بہار گلشن کشمیر کے مولفین نے کیا ہے لیکن حالات نہیں لکھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کے انتقال پر ایک مثنوی کہا تھا جس کے چند شعر مذکورہ میں درج کئے ہیں۔ شعر یہ ہیں :

چل بسا وہ سب کو تنہا چھوڑ کر	مجھ سے فرزند کی کارشتہ توڑ کر
میری آنکھوں سے وہ نہال ہو گیا	یوسف مصر کی تنہا آنکھوں میں گیا
کیا کرتے اس درد کا غم بیان	سخت درد انگریز ہے یہ داستان
یہ وہ غم ہے جس کے لکھنے میں قلم	خوں بہا دیتا ہے اپنا دم بدم

دیوان پرشاد کول، فارسی کے شاعر تھے اور ایک دیوان فارسی کا چھوڑا ہے۔ وہ اردو میں فیکر سخن کرتے تھے۔ لیکن کلام اب دستیاب نہیں ہوتا۔

پنڈت شیونرائن بھان، عاجز تنکس کرتے تھے۔ ان کے والد پنڈت سردپ نرائن بھان عاصی فارسی کے اچھے سخن سنج تھے۔ عاجز محکمہ تعلیم سے وابستہ رہے اور عرصہ تک جوں کے موٹی اسکول میں ماسٹری کی خدمت انجام دی۔ بہار گلشن کشمیر میں ان کے کلام سے صرف ایک قطعہ تاریخ نقل کیا گیا ہے جو انہوں نے ہمد ام اکبر آبادی کے

ناول "عبرت" پر لکھا تھا۔ اس قطعہ کے چند شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔ جن سے عاجز کی شعری دسترس پر روشنی پڑتی ہے۔ شعر ہیں :

کیا شرم تمہاری دلکش ہے اور نظم تمہاری بے بہا ہے
کیا کہنا تمہارا واہ ہمدَم ہر بات میں اک نیا مزا ہے
مضمون رنگین عجیب بندش ہر فقرہ تمہارا چلبلا ہے
حاصل کمرے ہیں لوگ عبرت ہر قول نصائح سے بھرا ہے
پڑھ کر حیرت کو سب میں چلن ہر لب پہ تمہاری واہ دلہے

قطعہ میں اچھا یہ گلشن فضا ہے " سے ۱۳۲۱ کی تاریخ برآمد کی ہے۔

پینڈت جانی ناتھ کول ضیاء کا خاندان دہلی چلا گیا تھا۔ لیکن وہ خود سری نگر آگئے تھے۔ اور خزانہ صدر سری نگر میں کلرکی کے عہدہ پر مامور تھے۔ شعر و سخن کا اچھا مذاق رکھتے تھے اور ایک مثنوی گُزارِ عرفان کے نام سے لکھی تھی۔ اس کا موضوع بھگوت گیتا کا مشہور قصہ کرشن سداساتھ ہے۔ زبان صاف ستھری اور اساتذہ قدیم کے انداز کی ہے۔ دیباچہ میں مصنف نے مثنوی کی تصنیف اور خود اپنے بارے میں مختصر سے حالات لکھے ہیں۔ دیباچہ کا اقتباس ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

"یہ عاجز خاکسار، عقیدت آیات بندہ جانی ناتھ کول مہرلال دہلوی المتخلص بہ عبا مشتاقانِ ابدی اور عاشقانِ بارگاہِ ایزدی سے ہو کر مزہ دیتا ہے کہ ایک روز میں ترجمہ سری بھگوت گیتا کر رہا تھا کہ اس میں ذکر سدالیاں ہرمن اور کرشن اوتارِ یکت درلپس معلوم ہوا۔ چنانچہ اسی وقت خیال پیدا ہوا کہ اس تذکرہ کو پیرایہ نظم میں لے آؤں...."

مثنوی کی ابتداء، سری کرشن جی کی توصیف سے ہوتی ہے، پھر آغازِ داستان ہے اور داستان کئی عنوانوں پر منقسم ہے۔ اختتام مناجات پر ہوتا ہے۔ آغازِ داستان کے حصے

سے ایک اقتباس یہاں منقول ہے۔

ہے مشہور جہاں جوشہر منظر برہمن نیک تھا اک اس میں رہتا
مسلمان نام تھا اس برہمن کا عجب یہ گل تھا منقہ اک چین کا
تھی ایشور کی جو اس پر مہربانی ہوا وہ واقف ستر نہانی
بجز یاد خدا کرتا نہ کچھ کام ہمیشہ جیتا وہ نام سیرام
مناجات میں اپنے انجام بہ خیر کی دعا کرتے ہیں:

بخیر انجام ہو یا کرشن میرا صبار ہے بندہ بے دام تیرا
مثنوی کی تاریخ پنڈت جے رام گھڑیالی عیاش نے کہی تھی اور گنگنادر عارفاں شدہ نازہ را
زادہ رحمت سے ۱۹۵۵ء بمقام ۱۶۱۸۹۹ برآمد ہوتا ہے۔
پنڈت شیر پرشاد گنور، محبت غلص کرتے تھے۔ ان کے حالات دستیاب نہیں
ہوتے۔ ان کی غزل کا صرف ایک شعر حسب ذیل ملتا ہے:

عجب کیا وہ آئیں اگر ہنستے ہنستے مثل ہے کہ جلتے ہیں گھر ہنستے ہنستے

اہل کشمیر میں خاص طور پر مسلمان کشمیری باہر جانا بہت کم پسند کرتے ہیں، لیکن جب
کثیر سے نکلنے ہیں تو ان میں آفاقیت ابھر آتی ہے۔ اس کی ایک اچھی مثال عبدالسلام رفیقی
تھے جو سری نگر کے باشندے تھے۔ ادب تجارت کی غرض سے اطراف کے ملکوں کا سفر اختیار کرتے
تھے۔ اسی سلسلہ میں وہ جادا اور انڈونیشیا بھی گئے تھے۔ ان کا انتقال بھی وہیں ہوا اور
وہیں دفن ہوئے۔ وہ محض تاجر ہی نہیں تھے بلکہ بعض باشعور قوموں کے افراد کی طرح اپنی
دوسری مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ، کچھ علمی دلچسپیوں کو بھی جاری رکھتے تھے۔ ان کی
انہی دلچسپیوں کا نتیجہ، کشتواڑ کا کچھ حال تاریخی حصے میں نقل کیا جا چکا ہے مغللوں
کے اس علاقے پر تسلط کے بعد یہاں سے فارسی کے کئی اچھے شاعر اُٹھے۔ راجہ
لہان سنگھ اور راجہ عنایت اللہ سنگھ کا کلام بھی پچھلے باب میں نقل کیا گیا ہے

کشتوار میں علم و ادب کا ذوق یہاں کے مذہبی پیشواؤں کی دلچسپیوں کا نتیجہ تھا۔ مغلوں کے آخری زمانے میں جب فارسی کا اثر گھٹنے لگا اور دو علم ادب کے میدان میں آگے بڑھنے لگی تو جموں اور کشمیر کی طرح، کشتوار میں بھی اچھے شاعر ابھرنے لگے۔ انہیں میں ضیاء الدین ضیاء ایک بزرگ تھے، جو علوم ظاہری کے علاوہ علوم باطنی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ انہوں نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں کلام چھوڑا ہے۔ فارسی میں ان کی ایک تصنیف ”روضۃ العارفین“ بھی قابل ذکر ہے۔ ضیاء کا انتقال ۱۳۱۱ھ میں ہوا۔ تاریخ انتقال سری نگر کے ایک مشہور بزرگ شاہ احمد علی، ساکن محلہ ملک یار، فتح گدل نے بھی تھی:

رضوانِ خلد گفتہ آمد ضیاء بہ جنت

اس خاندان میں تین پشت تک شعر و سخن کا مذاق رہا۔ چنانچہ ضیاء کے فرزند غلام فی الدین جو محی تخلص کرتے تھے اور ان کے پوتے بہاء الدین بہائی، فارسی اور اردو کے اچھے شاعر ہوئے ہیں۔ محی کو تصوف سے لگاؤ تھا۔ ان کے کلام میں تصوف کا رنگ نمایاں ہے۔ ان کی ایک نعت کے چند شعر ہیں:

چشم الفت میں روشنائی ہے پر تو نور والضحائی ہے

خود تماشا ہے اور تماشا شائی رستہ حق نور مصطفائی ہے

پادشاہوں سے بڑھ کے عزت ہو اس گلی کی اگر گدائی ہے

مرحبا، مرحبا ہو بخت رسا کوئے جاناں میں اب سائی ہے

کشتوار کی انجمن اسلامیہ کے سالانہ جلسوں کے لئے محی عمومی نظائیں لکھا کرتے تھے۔

۱۹۱۸ء کے جلسے میں انہوں نے جو نظم پڑھی تھی۔ اس کے چند شعر ہیں:

آج دایرہ عمرتِ ملکے دینا چاہیے گوہر یک منادِ اَلَقَت پوینا چاہیے

عشق اگر اسلام کا ہو تو ہے عشقِ ناما بلبلِ ہرگز نہ نامِ عشق لینا چاہیے

بندہ اسلام تھا میں جب کہ تھا عالم فلام
اب مری حلقہ بگوشی پر تو رہنا چاہیے
المدد اے بہت پروازِ بال و پر مدد
اب قفس کی قید سے تجھ کو چھڑانا چاہیے
نئی کا ایک مستزاد بھی دستیاب ہوتا ہے جس میں ان کا مقصود فانی طرز خیال نمایاں ہے۔
کہتے ہیں:

دل پر سوزِ خم، بدن پر کوئی آثار نہیں
اس کو کیا کیجئے دوا
اس عجب زخم سے خالی کوئی میاں نہیں
یہ تمہارے عین شفا
ترکِ خون ریز، کماندار، تملک، سفارگ
دوزن چشمانِ سیاہ
قتلِ عاشق کے سودا یا رتھے کار نہیں
ہے رنگِ تیر قضا
نئی کنگال کا تکیہ ہے کہ شاہِ اسرار
منہ سے تیر بل کچھ
سب میں اغیار تجھے غیر خدا یا نہیں
حق کرے تیر اہلا
کشتواڑ کے مرغزار، چوگاں کی تشریف میں بہت سے اُردو اور فارسی شعرا نے لکھا
ہے۔ نئی کے ایک شخص کے دو بند ہیں:

دل کو بھاتی ہے چاروں کی ہوا ساون کی
آج شب کاٹ لیں چوگاں میں ہوا ساون کی
میری جاں، مہرِ تمہارا بھیں گے نضا ساون کی
جو دم جھوم آتی ہے گفتگو رگٹا ساون کی
ٹنڈی ٹنڈی چلی آتی ہے ہوا ساون کی
عالم بھر کر منے مگر بگ کہ آج اے ساقی
مجھے پلوا ہے رہی دل کو علاج اے ساقی
لیکے تاتیں کہیں اس بیت کو کج اے ساقی
صورت ابر ہوا پر ہے مہراج اے ساقی

لے اُڑی مجھ کو مئے ہوش رُبا لے ساقی

نعمی کا انتقال ۱۳۳۷ھ میں ہوا۔ ان کے فرزند بہاء الدین بہائی باب کے علم و فضل کے ساتھ ان ذوقِ شریعت کے بھی وارث بنے، لیکن عینِ غفلت و شباب میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے افکار سے کچھ غزلیں اور چہ نظیں باقی رہ گئی ہیں جن میں لطیف سخن سے زیادہ تصوف کی چاشنی نمایاں ہے۔ فارسی میں انہوں نے ایک نظم بھی تھی، جس کے عنوان پر تحریر ہے: نقلِ عریفہ الیت کہ برادر صاحبِ سید نجم الدین حسن مظلہ ۱۱۔ رجب ۱۳۳۵ھ نوشتہ شدہ یوم جمعہ۔ اس نظم سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہائی نے ان سے کسبِ فیض کیا تھا۔ اس کے کچھ شعر ہیں:

ہوشیار از دمِ کلامِ توام! مست صہبائے جامِ توام
تربیت یافتہ از حضرت تو بشدہ کمتر دغلامِ توام
شد بہائی عزیز و تلمیذت برگزیدہ از خاص و عامِ توام
بہائی کی ایک اُردو نظم جو "دعوتِ دار" کے عنوان کے تحت لکھی گئی ہے اس کے دو شعر حسبِ ذیل ہیں:

مضطرب تو ساز پر گاہ نغمہٴ مجازی عشاق کو سکھائے اُمیرِ عشقِ باری
فرصت ہے بس غنیمت ہے داغِ عشقِ جانا بے رنگِ مبادا کھلا دے خفا باری
یہ ۱۹۱۶ء کی لکھی ہوئی ہے۔ اس زمانے کی ایک اور نظم "دعوتِ صلح" کے عنوان سے ملتی ہے۔ اس کے کچھ شعر یہ ہیں:

ہندوستان میں ہر اک بھائی ہے اور بہن ہے
بیگانگی ہے کیسی اک مادرِ وطن ہے
مسلم ہیں اور ہندو آپس میں بھائی بھائی
اک جان ہے یہ گویا ظاہر بد و بدن ہے

ہے اختلاف مذہب عالم میں کیا ہوا تو

گل تو ہیں رنگِ برنگی پر ایک ہی چین ہے

محمد الدین فوق کا نام کشمیر کی تاریخ اور ادبی اور صحافتی سرگرمیوں کے ساتھ گہری وابستگی رکھتا ہے۔ اُن کا خاندان کشمیر سے تھا۔ لیکن پنجاب سے ان کے تعلقات قائم تھے۔ چنانچہ ان کی تعلیم لاہور میں ہوئی۔ ان کے والد پونچھ کے ایک قصبہ میں بٹواری تھے۔ فوق کی ولادت ۱۸۷۷ء میں ہوئی۔ تعلیم داہمی حاصل کی تھی کہ ان کا تقرر جوں کے گورنر دیوان امرناتھ نے ۱۸۹۴ء میں سکریٹری میں کر دیا تھا۔ لیکن اپنی صحافتی دلچسپیوں کی بدولت وہ ملازمت ترک کر کے لاہور گئے اور "پیشہ اخبار" کے دفتر میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس طرح انہیں تربیت حاصل کرنے کے موقع مل گئے۔ اخبار "کوہ نور" کی ادارت بھی ان کے تفویض رہی۔ پھر ۱۹۰۱ء میں انہوں نے اپنا اخبار "پنجرہ فولاد" جاری کیا۔ ۱۹۰۲ء میں میاں جان محمد گنائی نے کشمیری گزٹ نکالنا شروع کیا تو اس کی ادارت کے لئے فوق کی خدمات حاصل کیں۔ ۱۹۰۶ء میں جب یہ اخبار بند ہو گیا تو فوق نے کشمیر میں پریس قائم کرنے اور اخبار جاری کرنے کے لئے ۱۹۱۳ء میں راجہ امر سنگھ مدار المہام کے پاس درخواست دی، جو نامنظور کر دی گئی۔ اس کے بعد لاہور سے انہوں نے اپنا مشہور ماہنامہ "کشمیری میگزین" جاری کیا۔ جس میں کشمیر اور اہل کشمیر کی دلچسپی اور مفاد کے مضامین اور خبریں شائع ہوتی تھیں۔ بعد میں اسے ہفت روزہ کر دیا تھا، اور اس کا نام "اخبار کشمیر" رکھا تھا۔ ان کا تعلق ماہنامہ "طریقت" اور "کشمیری اخبار" سے بھی رہا۔ کشمیری پنڈتوں کی طرح، جو ریاست میں اخبار جاری کرنے کی اجازت نہ ملنے کے سبب، لاہور یا پنجاب کے کسی اور شہر سے اخبار اور رسائل نکالتے رہے۔ فوق نے بھی ساری مساعی لاہور سے جاری رکھیں۔ کچھ ادارے بھی انہوں نے کشمیر کے مسلمانوں کے اغراض و مفاد کو اگے

بڑھانے کے مقصد سے قائم کئے تھے۔ چنانچہ لاہور میں ایک انجمن جو کشمیری انجمن کے نام سے قائم تھی، وہ ۱۹۰۹ء میں انہیں کی کوششوں سے مسلم کشمیری کانفرنس میں تبدیل ہو گئی۔

فوق اچھے شاعر بھی تھے۔ لیکن کشمیر کے اُردو ادب میں ان کے بڑے کارنامے ان کی تاریخی اور سوانحی تصانیف ہیں۔ ان کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ بعض وقت گنتی مشکل ہو جاتی ہے۔ خود انہوں نے اپنی تصانیف کی تعداد ستر بتائی ہے۔ ذیل کی تصانیف خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں:

تاریخ اقوام مشرق، جو تین جلدوں میں ہے، مکمل تاریخ کشمیر، تاریخ
بڈشاہی۔ راجہ سکھ جیون مل، کشمیر کا نادر شاہ (رجنٹ سنگھ)
کشمیر کی زبانیاں۔ تذکرہ مصنفین و مولفین کشمیر، تذکرہ مفتیان
کشمیر، خواتین کشمیر، سیاست کشمیر، غنی کا کشمیری، اللہ عارفہ،
تاریخ حریت اسلام، تاریخ کاروشن پہلو، مزار الشہداء،
شالامار، شباب کشمیر، سفر نامہ کشمیر، سرگذشت فوق ارہماے
کشمیر۔

ان تصانیف کے ہزاروں اوراق ہیں فوق نے اپنی ان تھک سعی سے، کشمیر کی لازوال خدمت انجام دی اور انے والے عہد کے مورخین اور تذکرہ نگاروں کے لئے اتنا ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں کہ ان کے مطالعہ کے لئے بھی فرصت چاہیئے۔

کشمیر کے اکثر ریٹوں، عہدہ داروں اور پہاڑی سرداروں سے فوق کے مراسم تھے۔ اور بعضوں سے ان کی تصانیف کی اشاعت میں مالی مدد ملی۔ ان سرداروں سے تعلقات اور محبتوں نے ان میں سے بعض کو شعر گوئی یا افانہ نگاری کی طرف بھی مایل کیا۔ ان کے دورے مختلف علاقوں میں ہوتے رہتے تھے۔ ۱۹۲۰ء میں سلطان

محمد متولی خان رئیس کٹھانی کے یہاں گئے تھے۔ جن کا محل دریائے بھہامہ کے کنارہ پر تھا۔ اس موقع پر انہوں نے ایک نظم کہی تھی، جس کے دو شعر ہیں :

بہارِ جنت و کوثر کے نظارے نظر آئے

کنارِ آبِ بھہامہ میں گلگشتِ کٹھانی میں

جہاں نیرنگی حُسنِ اندل ہے بے نقاب اُتل

مجھے لے چل اسی خطے کے دامنِ ہوائی میں

غزل گوئی میں بھی انہیں مہارت تھی۔ ان کی ایک غزل کے شعر ہیں :

کس ہستی موزم پر غافل یہ تنکبر اتنا تو سمجھ کوئی ہے گانہ ناہے

میں وہ کہ ترے نظم و ستم پر بھی دُعا گو تو وہ کہ مرے عجز و وفا پر بھی خفا ہے

آہ اور مری چشمِ تصور میں سما جا آئینہ ترا دیر سے بے عکس پڑا ہے

کشیر جسے کہتے ہیں سب غیرتِ فردوس جب تو ہی نہیں پاس تو دردِ رخسے سوا ہے

کشیر میں ایک یونیورسٹی قائم کرنے کے سلسلے میں بھی فوق کی مساعی یادگار ہیں۔

انہوں نے اس عنوان سے ایک نظم ہی لکھی تھی، جس میں کشیر میں یونیورسٹی

قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ اس نظم کے کچھ شعر درج ذیل ہیں :

میرا کشیر بھی ہندستان بھر میں غنیمت ہے

جہاں علم و دہن کے دیر تک چشمے بہے جاری

اسی کشیر میں بڈشاہ وہ شاہِ معظم تھا

کہ جس کے دور میں تھی علم و فن کی گرم بازار

یہیں رئیسِ سنگھ سا علم پر در تھا ہزار

جلو میں جس کے چلتی تھی حکومت اور سپہ داری

بنے کشیر سے باہر تو ہیں دارالعلوم اکثر

ابھی آئے گی کثیر کی بھی کیا کبھی باری
مگر کثیر کی یونیورسٹی ہو تو ایسی ہو
کہ جس کے دم قدم سے قومیت کی لہر ہو جاوے
نہ حسرت شایقین علم کے دل میں رہے کوئی
اگر یونیورسٹی کا ہوئے جاری حکم سرکاری

فوق کے کلام کا مجموعہ بھی "کلام فوق" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔

صحافت کے شوق کی طرح، جوں اور کثیر میں ذوقِ ادب اور شعر کو فروغ دینے
میں فوق کی مساعی کو دخل رہا۔ اس سلسلے میں ان کے جوں کے ایک شاعر اور رفیق کار
عاقل سے بڑی مدد ملتی تھی۔ ادب اور شعر کے ذوق پھیلانے اور ترقی دینے کے لئے
وہ ادبی محفلیں بھی منعقد کرتے تھے۔ ادبی اور شعری اور شہری انجمنوں اور اداروں
کے قائم کرنے کا طریقہ ابھی ریاست میں عام نہیں ہوا تھا۔ اپنے اور اپنے ساتھیوں
کا کلام سنانے کے لئے وہ اجتماع کا انتظام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ محرم میں مرثی
سنانے کے لئے جو اجتماع ہوتے ان میں بھی اپنا کلام سنانے بہتے تھے۔

راجہ بشیر علی خاں بسمل کثیر کے رئیسوں میں سے تھے۔ ان کے اور فوق کے
گہرے مراسم تھے۔ اسی تعلق نے غالباً ان میں بھی شعر و سخن کا مذاق پیدا کر دیا تھا۔ بھل
کے والد راجہ اکبر علی خاں تحصیل اتر غنچہ پرہ کے جاگیردار تھے۔ بسمل ۱۸۸۰ء میں
پیدا ہوئے اور فارسی اور اردو میں اپنے عہد کے اقتضا کے مطابق تعلیم حاصل کی۔
انہیں شعر و سخن کا ذوق فطری تھا۔ اور شعر کہتے تھے۔ وہ شاعروں اور عالموں کے قدردان
بھی تھے۔ اور نوعمر شاعروں اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی میں کسر اٹھانے رکھتے
تھے۔ محمد الدین فوق سے ان کے گہرے مراسم تھے اور فوق اکثر ان کے یہاں مقیم رہتے
تھے۔ اپنی تاریخ اقوام کثیر میں انہوں نے بسمل اور ان کے خاندان کے حالات

کہتے ہیں۔

بسمِ عملاً غزل کہتے تھے اور کبھی کبھی کوئی نظم بھی کہہ لیتے تھے۔ شاعری میں وہ آداب اظہار اور فن کا لحاظ رکھتے تھے۔ ان کے ایک محسن کے دو بند ذیل میں درج کئے جا رہے ہیں جن سے ان کی فکر اور اسلوب کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

نہ نیلوغز ہوں ناخویشید خادر جلوه افگن ہو

نہ مانند کتاں ہوں ماہِ انور جس پہ روشن ہو

نہ ہوں شمشادِ تاقمری مرے سر پر نوازن ہو

نہ پردانہ ہوں محفل میں کہ میرا نام روشن ہو

ٹھہر دانہ بنایا کس لئے دنیا کے خرمن میں

نہ بوئے زلفِ عنبر ہوں کہ کام آؤں صبا کو میں

نہ سُرہ ہوں کہ روں روشن کسی چشمِ دفا کو میں

نمکدال بھی نہیں تازہ کردں رسمِ جفا کو میں

نہ ہوں بادِ صبا چھڑوں جو پردے میں جیا کو میں

نہ شاعر ہوں کہ لکھوں شعر ہی کشمیری سخن میں

یہ نظم ”کشمیری میگزین“ میں چھپی تھی۔ بسمِ نے راجہ امر سنگھ کی وفات پر ایک

مختصر سا مثنوی بھی لکھا تھا جسے ایک نوٹ کے ساتھ محمد الدین فوق نے کشمیری

میگزین شماره مئی ۱۹۰۸ میں بسمِ کے ذیل کے نوٹ کے ساتھ شائع کیا تھا۔

”جنرل سر مہاراجہ امر سنگھ بہادر آنجنہانی کے بے وقت انتقال سے

جو صدرہ رعایا سے جموں و کشمیر کو ہوا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ اسی

صدرہ سے میری زباں سے بھی چند شعر نکل گئے جو بشرضِ اندراج

ارساں خدمت کمر نما ہوں۔“

نظم کے چند شعر ہیں :

ہے کسی غم میں مگر نالہ بلبلی امروز ہے کسی غم میں مگر چاک گریباں گل کا
گل و گلزار پہ چھائی ہے اُدا سی کسی کیوں پریشان ہوا بال ہر اک سنبل کا
چشمِ نرگس ہے اشکوں کی طانی ہر دم داغ ہے لالہ کو دل خستہ جگر ہے گل کا
بائے افسوس ہے گھر گھر میں یہ ماتم کیا آخری وقت ہے شاید کسی پیار گل کا

فوق کے دوستوں میں ایک اور رئیس راجہ بلند اقبال خاں بھی تھے جو پونچھ کے
کھمکھ قبیلے سے تھے اور ادبی ذوق رکھتے تھے۔ وہ فوق کے "اخبارِ کثیر" کی اعانت
کرتے تھے۔ ان کی فرزند راجہ محمد افضل خاں بھی افسانے اور مضامین لکھتے تھے۔

اس زمانے کے فوجی شعرا میں میرزا مبارک کا بھی تذکرہ ملتا ہے، لیکن
ان کا کلام دستیاب نہیں ہوتا۔ رائے بہادر انت رام بی۔ اے ڈائریکٹر لینڈ ریکارڈ
تھے۔ اس کے علاوہ وہ کمشنر مردم شماری بھی رہے۔ انہیں بھی شعر و سخن سے لگاؤ
تھا۔ ایک اور صاحبِ ذوق بہیرا نند رینہ بھی تھے، جو شعر کہتے تھے۔ کاؤش اسوری
بھی اس زمانے کے صاحبِ ذوق اہل قلم میں سے تھے۔

کاؤش کے ہم عصر دل میں شیخ غلام حیدر خاں چستی نے ایک نمایاں مقام
پیدا کر لیا تھا۔ وہ جموں کے رہنے والے تھے، شعر و سخن کے پاکیزہ ذوق کے علاوہ تصنیف
تالیف اور صحافت سے بھی ان کو دلچسپی تھی۔ اُردو میں غلط الفاظ اور ان کے استعمال
کے بارے میں انہوں نے ایک کتاب "اصلاحِ ادب" کے نام سے لکھی تھی۔ جموں سے
وہ ایک ماہوار رسالہ "پاباں" نکالا کرتے تھے۔ انہیں ڈراما سے بھی دلچسپی
تھی اور ایک ڈراما بھی لکھا تھا۔

پیرزادہ غلام احمد مہجور، جو جدید دور میں کشمیری کے سربراہانِ شعر اور میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری کی ابتداء اُردو اور فارسی سے ہوئی تھی۔ ان کا تعلق رشتہ ہدایت کے ایک خاندان سے تھا۔ اور ان کے اسلاف میں کئی عالم اور فاضل گذرے۔ محمد الدین فوق کا بیان ہے کہ ان کے اخبار کشمیر کی ترغیب سے کشمیر کے بعض ایسے خاندان جن کا دار و مدار پیری مریدی پر تھا، اپنے دست و بازو کی سعی سے رزری کمانے پر مائل ہوئے ان میں مہجور کا خاندان بھی تھا۔ مہجور کے والد پیرزادہ عبداللہ شاہ فارسی اور عربی کے عالم تھے اور قصبہ ناکام ان کا وطن تھا۔ لیکن شادی کے بعد وہ مہرگام منتقل ہو گئے تھے۔ یہیں مہجور ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے۔ ابتداء میں گھر پر والد کے پاس تعلیم پائی، پھر نرال میں حضرت علی گنائی عاشق کے مکتب میں شریک ہوئے۔ کچھ عرصہ اسلامیہ ہائی اسکول سری نگر میں بھی زیر تعلیم رہے۔ عاشق فارسی کے شاعر تھے، ان کے اثر سے مہجور کو بھی فارسی میں شعر کہنے کا شوق ہوا۔ اور سری نگر میں اسلامیہ ہائی اسکول کے استاد حسین شاہ زیرنگ کو کلام دیکھاتے رہے۔

۱۹۰۵ء میں مہجور نے پنجاب کا سفر کیا اور امرتسر اور قادیان میں کچھ عرصہ گزارا جہاں ان کی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ امرتسر میں وہ مولانا بٹسلی کی صحبتوں میں شریک ہوتے رہے۔ انہیں صحبتوں میں مہجور کی ملاقات علامہ شبلی سے بھی ہوئی تھی۔ قادیان میں قیام کے زمانے میں مہجور نے "البدر" کی مجلسِ اداوت میں بھی شامل رہے۔ اور اخبار کی کتابت بھی وہی کرتے تھے۔ کشمیر لوٹنے کے بعد، محکمہ بندوبست میں وہ پٹوارگری کی خدمت پر مامور ہوئے۔ ۱۹۴۵ء تک ملازمت میں رہے۔ اس کے بعد وظیفہ حاصل کیا۔ ۱۰۔ اپنے آبائی گاؤں جاکر شعر و ادب کی خدمت میں مشغول ہو گئے۔ ۱۹۵۲ء میں ان کا انتقال بعارضہ فالج ہو گیا۔

مہجور اُردو میں قدیم انداز پر غزل کہتے تھے۔ کچھ نظمیں اور ایک آدھ قصیدہ
 بھی ان کی یادگار ہے۔ ۱۹۱۱ء میں قصبہ ترال کے قریب ایک جنگل میں انہوں نے ایک
 غزل کہی تھی :

آج مجھ پر پھر ستم ہونے لگا دور جب سے وہ منم ہونے لگا
 گلِ رغو کی بے وفائی دیکھ کر بارِ غم سے سردِ غم ہونے لگا
 جب سے وہ دلبرِ جُدا مجھ سے ہوا ہم نشینِ رنج و الم ہونے لگا
 دیر سے رنج پھیر کر مجھ کو آج داخلِ بیتِ الحسم ہونے لگا
 اسی زمانے میں وہ لدھیانہ گئے تھے، جہاں ایک مشاعرہ میں غزل پڑھی تھی۔ غزل کے
 کچھ شعر ہیں :

تشنہ غم کے لئے وصل کا جام اچھا ہے !
 عندلیبوں کے لئے گل کا پیام اچھا ہے
 دل سے بہتر ہے کہ آنکھوں پر بٹھائیں ان کو
 ادج پر ہوئے اگر ماہِ تمام اچھا ہے
 زلف اور خال کو مہجور یہ سمجھا میں نے
 طائرِ دل کے پھنسانے کو یہ دام اچھا ہے

مہجور کی یہ شعری دلچسپیاں بیس پچیس برس تک جاری رہیں۔ اس درمیان
 بیس دہائی میں بھی شعر کہنے لگے تھے۔ کثیر میں اور کثیر سے باہر وہ اُردو مشاعروں میں
 غزل سناتے اور دار پاتے رہے۔ کچھ غزلوں کے منتخب شعر ذیل میں درج ہیں :

دلبر طناز کی اس خاک پر منزل نہیں شاہِ خوباں کے لئے اک کاغذِ دایوان اور ہے
 باغِ شالار کا سودا مرے سر میں نہیں جس چمن میں ہے مرا گلِ دہ گلتاں اور ہے
 مثلِ سکندر نہیں ظلمات کا سودا اٹھے جس کاہوں میں تشنہ لبِ آبِ عیاں اور ہے

دل درد آشنا میرا کسی سے ہم زباں کہ زل ہو
 عیاں انجام ہو جس کا وہ میری دانتاں کیوں ہو
 بدل دی رُخ کی زردی غارِ مغرب کی سُرخ نے
 قدیمی وضع کا پابند اب ہندوستان کیوں ہو
 رہ کوٹے صنم گوشہ نشین زناہد بتائے کیا
 جو منزل سے ہونا واقف وہ میر کا رول کیوں ہو

مہجور نے کچھ تفسیلات بھی کی تھیں۔ سودا کی غزل "نئے ببل چین نہ گل نورِ میدہ ہوں"
 کی جو تفسیلات انہوں نے کی تھی، اچھی تفسیلاتوں میں سے ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ غزل میں
 وہ نمایاں مقام حاصل نہ کر سکے۔ مہجور کا فطری رجحان قومی اور اخلاقی شاعری کی طرف
 تھا۔ چنانچہ ان موضوعات پر انہوں نے جو شاعری کی ہے اس میں جذبات کا خلوص اور زلفی
 قابلِ توجہ ہے۔ ان کی ایک نظم "خطابِ مُسلم" کے عنوان سے "اخبارِ کشمیر" اترتھر
 (جون ۱۹۲۴ء) میں شائع ہوئی تھی۔ اس نظم کا اقتباس درج ذیل ہے :

بتا اے مُسلم کشمیر سوچا بھی کبھی تو نے

تو ہے کس گلشنِ رنگیں کا برگِ شاخِ عربیانی

ترے اسلاف وہ تھے جن کے علم و فضل کے آگے

ادب سے ٹھکتے تھے دانشورانِ ہندو ایرانی

شہنشاہِ معظمِ زمینِ العابدینِ بدشاہ

کیا اکبر نے جس سے کسبِ آئینِ جہانِ بانی

بخوبی یاد ہے اب تک سخنِ سنجانِ عالم کو

تمہنی کی نکتہ سنجی، شیخِ صرفی کی سخنِ دانی

غرض بے مثل تھے اسلاف تیرے جن خوبی میں
مگر اب قابلِ ماتم ہے تیری خانہ دیرانی
شکستہ حالے لبِ دُلاں پر تھے، نوہ خوانِ سعدی
پئے اسپین ہے اقبالِ مومرشیہ خوانی
مگر کشیر میں دیراں ہوا اسلام کا گلشن
کوئی کرتا نہیں ہے مثلِ شبنمِ اشکِ انسانی
نہیں باقی رہا اسلاف کا کوئی نشانِ تجھ میں

وہ تھے محنت کے عادی اور تو موعظِ آسانی
عید کی سرت کے موقع پر انہوں نے ایک نظم کہی تھی، جو ہفتہ وار ہلالِ مئی ۱۹۳۷ء میں
شائع ہوئی تھی۔ اس نظم کے چند شعر ہیں:

بامِ گردوں پر نظر آتے ہیں آثارِ ہلال !
عید کا پیغام لانا ہے سدا کارِ ہلال
ہے دلیلِ کامیابی جہدِ وسعی روزِ شب
ہم کو یہ زریں سبق دیتی ہے رفتارِ ہلال
بدرِ کابل بن کے چمکے گا ستارہ قوم کا
مومنوں کو آسمان دیتا ہے اخبارِ ہلال

ایک اور نظم عید اور ہولی کی تقریبوں کے موقع پر کہی ہوئی، اخبارِ مارتنڈ (سرینگر ۱۹۳۵ء)
میں شائع ہوئی تھی۔ اس نظم میں وہ اخوت اور اتحادِ قومی کی تبلیغ کی ہے۔ کچھ شعر
ہیں:

اب کے آیا موسمِ گل کے پیغامِ نشاط
عید ہے، نوروز ہے، ہولی ہے، انعامِ نشاط
سبزہ نوخیز پر رقصِ عروسِ نو بہار
جھومتا پھر تلے گویا بادہ آشامِ نشاط

ساکنانِ گلشنِ کشمیر کو ہجو آج پیش کرتا ہے مبارکبادِ ایاں نشاط

اے خوشامرز کی خوشدل ساکنان کا شمر
عید اور ہولی منائیں مل کے باہم بے خطر
ہجو نے کچھ قصائد بھی کہے ہیں۔ ان کا ایک قصیدہ جو مہاراجہ ہری سنگھ کے راج ملک
کے موقع پر قصیدہ کے صوری لازم کی پابندی کرتا ہے۔ قصیدہ بہار یہ تشبیب سے
شروع ہوتا ہے :

بلبل شیریں بیاں لائی پیامِ نو بہار
صد مبارک آگئی فصلِ بہارِ خوشگوار
قصیدہ میں مہاراجہ کے اسلاف کا بھی تذکرہ ہے۔ اس تقریب کی شان و شوکت اور
اس میں شریک ہونے والے راجوں مہاراجوں کی طرف اشارے، قصیدہ کے اہم حصے
ہیں۔ کہتے ہیں :

دیکھنا کس ٹھاٹ سے نکلی سواری شاہ کی
ساتھ ہے فوجِ گراں با نیزہ لٹے آبدار
پُشت پر پیر و جواں کے ہو درجِ نڈکار میں
خسر و خاوری ہے ددشیں ابر پر گویا سوار
ہند کے اعلیٰ مہاراجے بشانِ سروری
مشرق و مغرب کے شاہنشاہ کے سب رازدار
قصیدہ دعائیہ پر ختم ہوتا ہے :

یا الہی جب تلک دورِ مہم انجام رہے
جب تلک باقی رہے یہ گردشِ لیلِ نہار

سرہارا جہاد تا ابد پایتہ باد
 زندہ باد، پایتہ باد، تابندہ تاروز شمار
 ختم کر مہجور مدح خسرو فیروز بخت
 کر دغا، پھولے پھیلے یہ فونہاں سایدار

مہجور نے ۱۹۳۵ء میں سودا کی غزل کی تفصیل کی تھی جس کا عنوان تھا "میں کون ہوں"
 اس شخص میں رموز استعارہ کے انداز میں اپنے بارے میں کہتے ہیں:

گلزارِ کاشمیر کا سرو خمیدہ ہوں صحنِ چین کا سبزۂ دامن کشیدہ ہوں
 خاموش مثلِ غنچہِ خاطر، کبیدہ ہوں نے بلبیلِ چین نہ گلِ نودمیدہ ہوں
 میں موسمِ بہار میں شاخِ بریدہ ہوں

ناواقفِ حیاتِ ثمرات اور گرمِ سرد ناآشنائے، فرقِ سفیدِ سیاہ دزد
 مہجورُ سنی یہ نکتہ احوالِ نیک مرد میں کیا ہوں اور کون ہوں سودا بقول

جو کچھ بھی ہوں سو ہوں غرض آفت رسید ہوں

مہجور علامہ اقبال سے بہت متاثر رہے۔ اور یہ اثر ان کی اُردو اور کشمیری شاعری
 میں نمایاں رہا۔ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے، کشمیری میں شعر کہتے ہوئے بھی اُردو
 شاعری کی محبت ان کے دل سے نہ جاسکی تھی، چنانچہ پروفیسر پی۔ این۔ پشپ، بہنوں
 نے ان پر ایک تعارفی کتابچہ مرتب کیا ہے، لکھتے ہیں:

"کشمیری غزل کی طرف رجوع کرنے کے باوجود مہجور کے لئے فارسی
 اور اُردو کی کشش ابھی باقی تھی۔"

مقبول احمد مید نے مہجور کی ایک کشمیری نظم کا نفیس منظوم ترجمہ کیا ہے، جو ہفت روزہ
 "آئینہ" (سری نگر) کے سالانہ ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔ یہ ترجمہ ذیل میں مستوفی ہے۔ اس
 کشمیری ترجمہ میں مہجور کے اندازِ فکر پر روشنی پڑ سکتی ہے:

سیاہی شب ہجران کا زور دھڑکیا
 اُنق سے جھانک ہی ہے نگارِ صبحِ جاں
 قدم قدم پہ ہیں لالہ کی مشعلیں روشن
 نظر نظر سے عیاں ہے کنونِ مصبر قرار
 جن کا دامنِ مد رنگ ہے بہارِ نظر
 روشِ روش پہ کھیلے ہیں کنولِ محبت کے
 سناہے سیر گلِ دلالہ کے بہانے سے
 ہماری دید کو آئے گا وہ بہارِ خیال !
 مہک چکی ہے جو بٹے حنا سے دادی دل
 ہٹا چکے ہیں دنوں سے غبارِ جوہرِ نزاں
 فنا نہ شب ہجران بھی لوگ بھول گئے
 کچھ اس طرح سے ہوئی ہے طلوعِ صبحِ بہار
 ہجور اُردو میں ایک نثری تصنیف کے بھی مُصنّف تھے۔ یہ حضرت سلطان الفقراء
 عبدالرحیم شاہ صاحبِ تندرِ صفا پوری کے حالات اور کشفِ دکرّات کی تفصیلات
 پر مشتمل ہے اور حیاتِ رحیم کے نام سے ۱۳۳۸ھ میں مرتب اور ۱۳۴۰ھ میں راوی
 پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپی ہے۔ اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہجور سلیم
 اُردو نثر پر پورا قابو رکھتے تھے۔ کتاب ایک دیباچہ، تمہید اور حالات پر مشتمل ہے تمہید
 میں ہجور نے کشمیر میں علماء اور اولیاء اللہ کی کثرت کا تذکرہ کیا ہے اور اپنی ترتیب
 کتاب کی خواہش کے بارے میں لکھا ہے :

”میرے دل میں عرصہ سے یہ تمنا چلی آتی ہے کہ منفرد متقدمینِ کشمیر کے
 حالاتِ زندگی کو فرداً فرداً کتابی صورت میں مُروجہ زبان اُردو کا لباس

پہنا کر اہل دنیا کے آگے پیش کر دوں۔“

لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی اس لئے کہتے ہیں:

”سب سے پہلے قدرت نے مجھے معاشرت کی طرف سے ایسا مجبور کر رکھا

ہے کہ مجھے ایسی تنادوں کی تکمیل کا موقع ہی نہ ملا۔“

حضرت عبدالرحیم کے حالات لکھنے کی طرف زیادہ تر توجہ اس لئے بھی ہوئی کہ یہ ان کے سلسلے کے بزرگ تھے۔ حالات مختلف عذرات کے ماتحت اکٹھے کئے ہیں اور آپ کے کشف کرامات کی تفصیلات بھی جمع کر دی ہیں۔ کتاب کا آغاز، مہجور نے اپنی فارسی نظم ”نائدہ مہجور“ سے کیا ہے جس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

اے صبا زلف پیک خوش خرام اے امین لعل درمئے کلام
نظم ایک مناجات کا انداز رکھتی ہے اور مہجور پر شنیعی معنوی کے رد عمل کا نتیجہ ہے۔

درسل سلطانِ خوبانِ جہاں موردِ الطافِ ہائے بیکراں

اے کرا طاق کہ بنو لیسد جواب برپیامت سوی آں عالی جناب

دُرکش دغواں دریایِ علوم عاشقِ سربازِ سولانایِ روم

خواستِ چوں دادن جواب یک پیام ہفت دفتر گفت ماندش ناتمام

مہجور نے کتاب کے دیباچہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ انہیں شعراے کشمیر کے بارے میں بھی لکھنے کا خیال تھا اور اس مقصد سے انہوں نے تلاش اور جستجو سے بعض شعراء کے غیر مطبوعہ کارنامے بھی فراہم کئے ہیں۔ لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔

پنڈت تیج ناتھ تکتوناز تخلص کرتے تھے اور انگریزی اور اردو میں شعر کہتے

تھے۔ ان کی ولادت اہل کشمیر کی نوآبادی امرتسر میں ہوئی تھی۔ بی۔ اے پاس کرنے کے

بعد وہ ریاست منڈی میں ملازم ہو گئے تھے۔ کچھ عرصہ مہاراجہ منڈی کے ایڈی کاٹنگ بھی

رہے۔ بعد میں وہ ریاست جموں و کشمیر میں افسر حیات ہو گئے تھے۔ ناز کے والد پنڈت

برج مومن لال تلو کو بھی شعر و سخن سے لگاؤ تھا۔ اور وہ زریبا تخلص کرتے تھے۔ وہ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ایک دفعہ باپ اور بیٹے دونوں میں غالب کی شاعری زیر بحث تھی۔ غالب کے مصرعے — ”دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔“ دونوں کے لئے جانی تو چھٹا، اور دونوں اس زمیں شعر موزوں کرنے کی کوشش میں تھے۔ اتفاق سے ناز کو ایک اچھا شعر فوراً سوچ گیا:

تم اگر بام پہ آجاؤ تو جھگڑا مٹ جائے
دیکھیں تم اچھے ہو یا ماہِ کمال اچھا ہے
ناز غزل اچھی کہتے تھے۔ ان کے چند شعر ہیں:

ہم وفا پیشہ تو دن رات انہیں یاد کریں
اور وہ لطف سے اغیار کا دل شاد کریں
دین مسجد میں ہے دنیا ہے بنوں کے بس میں
وائے مشکل انہیں پوچھیں کہ انہیں شاد کریں
ناز وہ ناز کہاں، اس کو یہ ملتا ہے جواب
جائیں اور آپ بھی افسد کی یاد کریں

اُردو شعر و سخن کا شہسہ مذاق رکھنے والی کشمیری خواتین میں شریعتی سوشلیڈ تلو بلین شعر کہتی تھیں۔ وہ برج کشوری کے نام سے شہور تھیں اور سوشلیڈ تخلص کرتی تھیں۔ ان کے والد پنڈت کدرا ناتھ اوگرہ لاہور چلے گئے تھے۔ اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر فائز تھے۔ سوشلیڈا خود الہ آباد میں ۱۸۹۸ میں پیدا ہوئی تھیں اور پنڈت اذکار کش تلو سے بیاہی گئی تھیں۔ ان کا کلام رسالہ ”بہار کشمیر“ میں شائع ہوتا تھا۔ ان کی ایک نظم کے ذیل کے شعر ان کے معیار کو ظاہر کرتے ہیں جو کسی شاعر کے جواب میں کہے گئے تھے۔ سوشلیڈا نے خواتین کی عظمت پر ایک نظم کہی تھی جس پر شاعر نے چھتر

ایرا دیکھئے تھے سوشیلا بواب دیتی ہیں!

بحث تھی یہ تو اصولی مشفق شیریں زباں
اشتعال طبع کا باعث ہوا کیا حیریاں
یہ سنا تھا آپ کا طرزِ بیاں، دلچسپ ہے
شاعری کا آپ کی ہے معتقد سارا جہاں
ساری کوشش کی ہے صرف داستانِ جنِ موش
ہستکدہ کا آپ نے چوم ہے رنگِ آستان
مرجبانِ سلاست جہذا ذوقِ سلیم
خوب زری دادِ فصاحت آپ نے لے لے ہر بیاں
یہ فصاحت، یہ بلاغت یہ سلاست آپ کی
اس پر سونے پر سہاگہا اکبر آبادی زباں
چشم بد میں دور، مطلع، مطلع انوار ہے
جو ہر پاکیزگی ہے، دونوں مصرعوں سے عیاں
ٹھنڈے دل سے آپ نے سوچی کبھی یہ بات بھی
کیا ہیں وصفِ اردو ہنگنی، کیا ہیں اسمیں خیریاں

اے سوشیلا جس بلندی پر نشین ہے تیرا
طبع موزوں کی دہاں پہنچیں گی کیا طنیناں

پنڈت بشبر ناتھ رہنے سب بچ کی صاحبِ زادی، پران کٹھوری کچلو بھی شعر کا اچھا
مذاق رکھتی تھیں۔ ان کی شاعری کا مرنج زیادہ مذہب اور اخلاق کی طرف تھا۔ ان کے

۱۔ سنکرت لفظ اردو ہنگنی = یعنی نصف بہتر

غور سے دیکھا تو میں نے ہر جگہ پایا بھٹے
پھر نہ کیوں اُمید رکھوں تو ہی تار مار ہے
پرآن ہے چرنوں کی راسی غزل کی ہے
مجھ کو بھکتی اور مکتی دے تو بیڑا یاد ہے

مکرتے ہیں جو سب سے بھلائی وہ ہی بھلا پھل پاٹیں گے
کرپا اگر ہوگی تیری وہ پھر نہیں بھٹے کھاٹیں گے

پرآن کا انتقال ۱۹۱۳ میں ہوا۔

پندت آنند لال رتن، ملازمت کے سلسلے میں بھدر واد میں ہے۔ اُردو میں
اچھے شعر کہتے تھے۔ ایک موقع پر جب انہیں کشمیر کی یاد ستاتی ہے۔ تو جذبات ایک
غزل کی صورت میں اس طرح ظاہر ہوتے ہیں :

کشمیر ہے پیارا جنتِ نشاں ہمارا ہر اک کی جانِ جان، روحِ رواں ہے
اپنے وطن کی لکھیں تعریف ہم نہ کیوں گے پھر لے پھلے ہیں اسیں اُسے مکتاں ہمارا
اگے کشمیر کے حکمران راجگان کی مدح سرائی کی ہے۔

خواجہ سعد الدین جتئی کشمیر کے مشہور "نانت" علماء کے خاندان سے تھے خواجہ
یعقوب نانت، خواجہ علی نانت، اور خاص طور پر ملا جوہر نانت اپنے عہد کے سربراہ اور وہ
علماء ہوئے ہیں۔ خواجہ یعقوب نانت سلطان قطب الدین کے قائم کئے ہوئے مدرسہ
قطب الدین پورہ کے صدر تھے۔ ملا جوہر نانت اسی مدرسہ کے فارغ التحصیل تھے۔ ان کی
علوم باطنی کی تربیت، شیخ داؤد خاکی کی خدمت میں ہوئی تھی، جو مخدوم شیخ حمزہ کے
خلفاء میں تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ فریضہ راج اور گرنے کے لئے گئے اور قیام
مکہ کے زمانے میں ملا علی قاری اور ابن حجر کی سے استفادہ کیا۔ اس خاندان میں علم و فضل
اور درس و تدریس کی روایات حال تک بانی رہیں۔ چنانچہ سکھوں کے دورِ حکومت میں

خواجہ سعد الدین کے دادا خواجہ محمد یوسف نامت، اپنے زمانے کے سربراہ اور وہ علماء میں شمار ہوتے تھے اور اس زمانے کے کشمیر کے گورنر شیخ امام الدین کے استاد تھے خواجہ سعد الدین چستی، فارسی کے عالم تھے اور فارسی اردو اور کشمیری میں بھی شعر کہتے تھے۔ ان کی ولادت سری نگر میں ۱۸۸۹ء کے لگ بھگ ہوئی تھی اور ۷۷ برس کی طویل عمر پائی اور ۱۹۶۶ء میں انتقال کیا۔

سعد الدین چستی کی زندگی درس و تدریس میں بسر ہوئی۔ میر واعظ مولوی رسول شاہ نے ان کی صلاحیتوں کو دیکھ کر انجمن نفع الاسلام کے مدرسہ واقع نوشہرہ میں ان کا تقرر ۱۹۰۹ء میں کیا تھا۔ اسی سال یہ مدرسہ بھی قائم ہوا تھا۔ اس کے جیسی ضرورت پڑی ریزہ داری اور صفا کدل کے اسکولوں میں بھی ان سے فارسی درس تدریس کا کام لیا جاتا رہا۔ انجمن کے مرکزی ہائی اسکول میں اوپر کی جماعتوں کو فارسی کا درس دیتے رہے۔ کچھ عرصہ میر واعظ کے دفتر میں منشی کی خدمت بھی انجام دی۔ ۱۹۶۲ء میں کئی اور اساتذہ کے ساتھ انہیں بھی خدمت سے سبکدوش کر دیا گیا۔ اپنی یادداشت میں وہ لکھتے ہیں کہ دوسرے اساتذہ نے منت سماجت کر کے اپنے آپ کو پھر سے بحال کرالیا، لیکن خود اپنے بارہ میں لکھا ہے کہ

”بندہ نے وقار سے کام لیا اور نہ پیر صاحب کے پاس گیا اور نہ منت سماجت کی۔“

خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ پیر کی عمر میں فریضہ حج ادا کرنے کے لئے گئے اور کشمیر واپس لوٹنے کے بعد سے مطالعہ اور عبادت میں زندگی گذاری اپنی یادداشتوں میں انہوں نے اپنے زمانے کے کئی اہم واقعات درج کئے ہیں جن میں عبدالکبیر پنجابی کے مقدمہ ۱۹۳۱ء کے واقعات بڑی تفصیل سے درج کئے ہیں۔

”آج بتاریخ ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء، ۲۶ صفر ۱۳۵۰ھ سوموار عبدالقہیر

پنجابی کا مقدمہ اہتمام بغاوت کی تاریخ تھی۔ میجر ٹریٹ عدالت نے
 باستصواب اعلیٰ اختیارات، ظاہراً اس اندیشے کو مبداً واجب
 معمول تاریخ لمبے گزشتہ پھر، جو مسلمانون سہری نگر ہو، بجائے عدالت
 کے مقام پیش سنٹرل جیل مقرر کر لیا تھا۔ اور کل ۱۲ جولائی کو ہی
 عبدالقدیر مذکورہ سواری لاری پولیس دہاں بھیجا گیا تھا۔ مسلمانان
 سہری نگر کو مقام ہذا کا پتہ چلا تھا۔ اور وہ دس بجے صبح سنٹرل جیل
 کی سیر دنی گزرا گاہوں پر جمع ہونا شروع ہوئے۔ میجر ٹریٹ عدالت پر ۱۲ بجے
 پہنچا۔ دہاں محمد عبداللہ وکیل موجود تھے۔ لوگوں نے زبردستی خاں
 جیل کے صحن میں بمقام پیشی گھسنا چاہا۔ پولیس نے جس کی کافی تعداد
 آگے ہی سے دہاں موجود تھی۔ ان کو روکنا چاہا۔ لوگوں نے نہ مانا اور
 وہ بدستور ضد کرنے لگے۔

یہ تفصیل بڑی طویل ہے، جیل میں مسلمانوں پر بددق چلانے اور اس
 کے بعد سترہ اٹھاوا مسلمان شہداء کی لاشوں کو جامع مسجد میں لا کر رکھنے اور بالبعد
 واقعات اور آخر میں مسلمانوں کی شکایتوں کو سننے کے لئے شیر گدھی میں دھاراجہ
 کے دربار کی تفصیلات سب درج ہیں۔ ۱۳ جولائی کا دن آج بھی کشمیر میں آزادی کی
 جدوجہد میں یادگار دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔

سعد الدین نے فارسی میں کافی کلام چھوڑا ہے جس میں زیادہ تر اپنے عزیزوں
 احباب، اور کچھ ملنے جلنے والوں کی فرمائش پر لکھے ہوئے قطعات تاریخ، ایک فارسی
 شہر آشوب، ملاؤں کے خلاف ایک شامل ہیں۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور
 جو جوں کشمیر یونیورسٹی میں اُردو اور فارسی شعبوں کے صدر اور ڈین رہے تھے ان کے
 انتقال پر ایک مرثیہ لکھا تھا۔ جس کا آخری شعر ہے :

۱۔ یہ مقام اصل مسودے میں خالی ہے۔

چستی از فرط غفیت جذبہ دل برنگاشت
گرچہ اندر شعر گوئی نیتش اصلا شعور

حج اور زیارت مدینہ منورہ کے موقع پر انہوں نے ایک مناجات بھی کشمیری میں لکھی تھی۔
میرد اعظم رسول شاہ بانی انجمن نصرت الاسلام کے یادگار دن کے موقع پر انہوں نے
ایک نظم لکھی تھی، جس کے چند شعر ہیں:

ابراہیم کے تھے وہ سایہ ہمارے سر پر	افسادہ قوم مسلم کے تھے وہ پیرِ مہر
کشمیر کے مسلمانوں کی دیکھی جو حالتِ زار	کڑھتے رہے کہ کیونکر
الہامِ انبوی سے یہ مدرسہ بنایا	نخلِ مراد کیا ہی کشمیر میں لگایا
چستی ہے جانِ دل سے مدتِ سرائیں	یارِ طفیل ان کے دے اس کو تیرِ عقیلی

اسد میر، کشمیری کے مشہور شاعر تھے اور فارسی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ وہ کبھی
کبھی اُردو میں بھی طبع آزمائی کر لیا کرتے تھے۔ وہ اننت ناگ کی ایک تحصیل کے رہتے
والے تھے۔ اسد میر نے کشمیری میں کلام کا کافی ذخیرہ چھوڑا ہے۔ ایک غزل کا مطلع
یہ ہے:

لگارا بادل پر نگوں کہاں جاؤں کدھر جاؤں
پینیسِ فکرِ کن گئیسِ مفتوں کہاں جاؤں کدھر جاؤں

نیا ز کشمیری، تحصیل کو لگام موضع کامپرن کے متوطن، غلام محی الدین راتھور زمیندار
کے فرزند ہیں۔ ان کی تعلیم شوپیان میں ہوئی۔ اس کے بعد لاہور جا کر تعلیم کی تکمیل کی۔
اور نمشی فاضل کا امتحان کامیاب کیا۔ اس کے بعد سٹیٹ پرائمری کے دفتر میں ملازمت
اختیار کر لی تھی۔ شاعری سے لگاؤ تھا اور اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔

ان کے کچھ شعر فوق نے نقل کئے ہیں: شعر حسب ذیل ہیں:

متاع بے بہا تھی اک جوانی سولٹادی ہے
 نہ جانے اہلِ اُلفت اب کیسے کہتے ہیں قربانی
 گھٹائیں کالی کالی میکے پر جھوم کر آئیں
 چلو اے ہم نشینو، پھر کریں، اک بار نادانی

مشیر حسین قدوائی کا ذہنی تعلق کشمیر سے گہرا رہا تھا۔ وہ کشمیر کی دفعہ آئے، اور ہر بار یہاں سے تو صیغی جذبات لے کر گئے۔ ستمبر ۱۹۱۳ء میں انہوں نے ایک نظم بھی تھی۔ جو ان کے اس نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی:

”کشمیر کا حال، دہاں کی آب و ہوا کا اثر جو میرے دل و دماغ پر ہوتا تھا۔
 یہ سب اس خط میں مفصل بیان ہوئی ہے۔ ایک نظم غزل
 ہی کی طرح ردیف و قافیہ کے التزام سے تین سوا اشعار سے زیادہ فلسفہ
 محبت کے عنوان سے ہوئی تھی۔ بعد میں اور کئی غزلیں اور نظمیں لکھیں۔“
 یہ ساری نظمیں ان کے مرتب کردہ مجموعے میں شامل ہیں۔ ایک نظم کے چند شعر ہیں:

دہی ننگرگ ہوتا، دہی دلفریب وادی
 جہاں شاعری کا سودا مجھے بار بار ہوتا
 دہی رنگ رنگ کے گل، وہ حبیب گلبد بھی
 وہ نشاط باغ ہوتا، دہی شالام ہوتا
 دہی زعفران کے ننھے، دہی یاقین کی خوشبو
 دہی گل کنول کے ڈل پر دہی لالہ زار ہوتا
 وہ سفیدے استادہ وہ ادھر ادھر ٹرک کے

پہنچ تواریخ

اس دور میں کئی اچھی تواریخ بھی لکھی گئیں، جن میں مولوی حشمت اللہ کی تواریخ جو مختصر تاریخ جہول و ریاست مفتوحہ کے نام سے موسوم ہے، ہم سے قریب تر زمانے کی اہم تواریخ میں سے ہے۔ اس تاریخ میں جیسا کہ اس زمانے میں رواج ہو گیا تھا۔ بہاراجہ گلاب سنگھ کی تفصیلی سوانح حیات اور ان کی فتوحات کی تفصیل بھی شامل کی گئی ہے۔ مولوی حشمت اللہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے، لیکن ملازمت کے سلسلے میں وہ عرصہ تک جہول اور کشمیر میں رہے۔ برطانوی سرکار کی جانب سے وہ گلگت کے ایجنٹ مقرر ہوئے تھے۔ اس طرح انہیں ریاست اور خاص طور پر ریاست کے علاقوں گلگت، چترال، کافر، کرغز (قرغز)، یارقند، بدخشاں اور دوسرے ملحقہ مقامات میں دورہ کرنے اور وہاں کے حالات کا مطالعہ کرنے کے کافی مواقع ملے تھے۔ وہ عالم اور صاحبِ قلم بھی تھے۔ اس لئے ان علاقوں میں گھومنے کے دوران وہ ان کی تاریخ اور دوسری تفصیلات کے بارے میں معلومات بھی فراہم کرتے رہے جنہیں بعد میں انہوں نے ایک کتاب کی صورت میں مرتب کیا۔

مولوی حشمت اللہ ۱۸۹۸ء میں ریاست کی ملازمت میں داخل ہو گئے تھے اور اس وقت بھی وہ عرصہ تک گلگت میں رہے اور گلگت کے علاوہ مظفر آباد، راجوری، کراچی، لداخ میں بھی متعین رہے۔ لداخ میں وہ وزیر وزارت یا گورنر کی حیثیت سے متعین ہوئے تھے۔ جب وہ ولیفِ حسنِ خدمت بر ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو

تو انہیں اپنی فراہم کی ہوئی معلومات کو ترتیب دینے کے زیادہ مواقع نصیب ہوئے اور اپنی تاریخ مرتب کی۔ یہ تاریخ ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی۔ پروفیسر محمد نجیب دالیں چانسلر، جامعہ ملیہ نے اس پر تقریظ لکھی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:

”یہ کتاب تاریخ جنوں ہماری زبان کی چند واقعی علمی تصانیف میں سے ایک تصنیف ہے۔“

مصنف نے اس تاریخ کو ڈوگر خانہ دان کی مفصل تاریخ کے علاوہ سکھوں کے عہد اور کشٹوار کے راجاؤں کی تاریخ، ان کی علمی سرگرمیوں کے حالات، تہت اصلی اور تہت خورد یعنی لداخ کے حکمرانوں کے سلسلے میں، غرض اس حصہ ملک سے متعلق بڑی مفید تفصیلات فراہم کر دی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس وسیع مواد کے تجزیہ اور ترتیب کا طریقہ ان کا اپنا ہے، تاہم ان علاقوں سے تعارف اور یہاں کے حالات جاننے میں اس تاریخ سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔

ٹھاکر کاہن سنگھ بلادریہ جنوں کے قصبہ بلادور کے رہنے والے تھے۔ بلادر قدیم زمانے میں چھوٹے راجاؤں کی راجدھانی رہی تھی۔ جسے بعد میں گلاب سنگھ نے خون کشی کر کے اپنی ریاست میں شامل کر لیا تھا۔ ٹھاکر کاہن سنگھ کی تعلیم تربیت جنوں ہی میں ہوئی تھی۔ اور انہیں تصنیف و تالیف کا بھی شوق رہا تھا۔ چنانچہ انہوں نے دو تصانیف چھوڑی ہیں۔ ایک مہاراجہ رنبیر سنگھ کی سوانح عمری ہے جس میں ان کے خاندان کے حالات، گلاب سنگھ کی فتوحات اور رنبیر سنگھ کے عہد کے واقعات تفصیل سے لکھے ہیں۔ ان کی ایک اور تصنیف ”تاریخ راجپوتانہ پنجاب“ بھی ہے۔ رنبیر سنگھ کی سوانح عمری ”سوانح عمری مہاراجہ رنبیر سنگھ بہادر“ کے نام سے ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی۔

اپنی کشمیر کو، کشمیر اس قدر پسند ہے کہ دو عام طور پر باہر جانے کو کم ترجیح

دیتے ہیں۔ لیکن جب ضرورت ان کو کثیر سے لکھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ تو ایسا سلوم ہو جاتا ہے کہ گویا ان میں ایک آفاقی احساس ابھر آیا ہے۔ اس کی ایک عمدہ مثال عبدالسلام رفیقی کی ہے، جو سری نگر کے باشندے تھے۔ اور تجارت کی غرض سے وہ ہندوستان اور اطراف کے ملکوں کا دورہ کرتے تھے۔ تجارت ہی کے سلسلے میں وہ انڈونیشیا بھی گئے تھے۔ جہاں وہ عرصہ تک رہے اور وہیں ان کا انتقال بھی ہوا۔

عبدالسلام رفیقی محض تاجر ہی نہیں تھے بلکہ علم و ادب سے بھی دلچسپی تھی۔ اور یورپ کے بعض باشعور اقوام کے افراد کی طرح اپنے پیشے کی مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ وہ علمی مشاغل کو بھی جاری رکھتے تھے۔ انہیں مشاغل میں، جادا کے حالات کی فراہمی بھی تھی۔ انہیں جادا کی تاریخ لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ جس کے لئے انہوں نے اپنے قیام جادا اور انڈونیشیا میں مولد اکٹھا کیا اور کتاب مرتب کر لی تھی۔ یہ تاریخ "تاریخ جادا و ملحقات و اندونیشیا" کے نام سے موسوم ہے۔ اس تاریخ کا ایک مخطوط جو غالباً خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، ریسرچ لائبریری، سرینگر میں محفوظ ہے۔ (۱۹۵۹ء)۔

ابتداء میں جادا کے نام سے بحث کی ہے اور اسے سنسکرت لفظ "جادا" دوبا سے ماخوذ بتایا ہے۔ ان جزائر پر پرتگیزیوں کے تسلط کا حال لکھے ہوئے ریمارکس ہیں:

"۱۵۱۸ء سے پرتگیزیوں نے اس طرف اپنا رسوخ جمانا شروع کیا لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ پھر ۱۵۲۰ء یا ۱۵۲۱ء میں اس کا دوسرا مشن اس طرف آیا۔ جسے صرف اتنی کامیابی ہوئی کہ ان جزائر میں اپنے تجارتی تعلقات قائم کئے۔ وہ بھی اس طرح پر کہ چونکہ مسلمانوں کا زور تھا۔ ایک نامسلمان راجہ نے مصلحت اس میں دیکھی کہ پرتگیزیوں

۲۳۱
 کے ساتھ دوستی کے تعلقات قائم کرے اور اس طرح مسلمانوں کی
 تقدی سے امن میں رہے۔ چنانچہ برتگیزی تاجروں نے اس کی خواہش
 کے مطابق اس کے لئے ایک قلعہ بھی تعمیر کیا جس کے معاوضہ میں
 راجہ نے ان کو سالیانہ ایک ہزار روپیہ سپاہیہ مرحوں کی دینی ہفتہ کی
 یہ تاریخ ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ لکھی گئی۔ تاریخی حالات کے علاوہ اس سے
 انڈونیشیا اور جاداکے طرز معاشرت، رسم و رواج، عقاید وغیرہ پر بھی روشنی پڑتی
 ہے۔

پیر نجم الدین عشرت، کشمیر کے دیوانی خاندان کے بزرگوں میں اپنی علمی اور
 قومی خدمات کی بدولت ممتاز رہے۔ وہ کئی قومی اور ملی اداروں سے منسلک رہے
 انجمن خدام الخلق کے اور انجمن فلاح المسلمین کے وہ جنرل سیکرٹری رہے۔ ان کے
 ایک رفیق کاؤ پیر حسام الدین، قومی کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ وہ بھی دیوانی
 خاندان کے عاملوں میں سے تھے عشرت کو شعر و سخن سے گہرا لگاؤ تھا اور کچھ کلام ان
 کی یادگار ہے۔ اپنے ایک دوست کو انہوں نے منظوم خط لکھا تھا جس میں خود اپنے
 بارے میں اٹھائے گئے ہیں۔ خط کا اقتباس حسب ذیل ہے :

بجا ہے گر کہوں نازک ہے قسمت نارسا میری
 کہ میرا بے خطا ہونا ہی ٹھہرے جب خطا میری
 غبت مصروف ہوئے چارہ ساز و فکر دران میں
 بڑھے گا درد جب کہ بنے گا خود دوا میری
 مرا نخل تمنا پھر زمانے میں پھلے پھولے
 خبر پہنچائے اس گل نگ اگر باد صبا میری
 اس زمانے کے موزین کشمیر میں مفتی محمد شاہ سعادت کو ایک خصوصی مقام حاصل ہے۔

وہ فارسی کے سربراہ درہ عالم تھے اور کثیر کی تاریخ سے انہیں گہرا لگاؤ تھا۔ چنانچہ انہوں نے کثیر کی تاریخ پر کئی کتا میں لکھیں اس لئے عام طور پر وہ مورخ کثیر کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ مفتی سعادت کی ولادت سری نگر میں ۱۸۸۱ء میں ہوئی۔ ان کے والد مفتی غلام محی الدین بھی پانڈانی خاندان سے تھے اور عربی اور فارسی کے عالم تھے۔ مفتی سعادت کی ابتدائی تعلیم انہیں کے یہاں ہوئی تھی۔ بعد میں وہ میر واعظ رسول شاہ سے مستفید ہوئے۔ سعادت کے معاصر علماء میں مفتی عزیز، خواجہ اسد اللہ، مولوی غلام مصطفیٰ الزسری، مفتی شریف الدین، مولوی صدر الدین، اور مولوی دفائی، سربراہ درہ مانے جاتے تھے۔ مفتی سعادت نے ان سے بھی استفادہ کیا تھا۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد ۱۹۱۷ء میں انجمن نصرت الاسلام کے مدرسہ عربیہ میں معلم مقرر ہوئے تھے۔ میر واعظ یوسف شاہ سے ان کی شریعت داری بھی تھی۔ کثیر کی تاریخ اور آثار قدیمہ سے سعادت کی دلچسپی کے مد نظر، کثیر کے محکمہ آثار قدیمہ نے ان کی خدمات حاصل کر لیں۔ اس زمانے میں محکمہ کے ناظم ڈاکٹر ہیراند شاستری تھے۔ جن کی ہدایت پر سعادت نے کثیر کے آثار قدیمہ کے بارے میں ایک کتابچہ تیار کیا تھا۔ اس کے علاوہ کثیر کی تاریخ اور شاہیر کی سوانح حیات پر ان کی کئی تصانیف اردو میں ہیں۔ ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی نے ان کی جملہ تصانیف کی تعداد پچیس بتائی ہے اور اپنی تاریخ کثیر میں ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف کی فہرست بھی دی ہے۔

سعادت صاف ستھری زبان لکھتے تھے۔ بابا داد خان، جو کثیر کے صاحب باطن بزرگ اور فارسی کے شاعر ہوئے ہیں۔ ان کی حیات سعادت نے "مقدس زندگی" کے عنوان سے لکھی ہے۔ اس کتاب کے دیباچہ میں کتاب کی تصنیف کے بارے میں لکھتے ہیں:

”نیاز مند ماتم محمد سعادت گذارشس پرداز ہے کہ میں نے امت سے
 ارادہ کیا تھا کہ اللہ میرے ارادہ کو پورا کرنے والا ہے اور ہم کو
 خطاؤں اور گناہوں کی گرفت سے نجات دینے والا ہے کہ دفعہ
 سلطان العارفین محبوب العالم شیخ حمزہ اور ان کے نام خاص
 خلفاء خصوصاً جناب شیخ المشایخ بابا داد خان کی ”کے بہترین تہذیبی امور
 حالات ایک کتاب کی صورت میں تالیف کر کے شائع کروں۔۔۔۔۔
 آخر الامر خدا کے فضل و کرم سے سال موال ۱۳۶۲ھ میں میرا ارادہ
 ”میں وجود میں آیا اور یہ کتاب تحریر میں آئی جو کہ موثق و الہامات
 سے نقل کر کے میرے حالات کا مجموعہ پیش کرتی ہے۔ کتاب کا نام تقدس
 زندگی ”رکھا گیا ہے متعدد کتابوں کے علاوہ اس مجموعہ خاص مافذ
 وہ باتیں ہیں جو ”ورد الہدین“ ”دستور الکلیں“ اور ”تقصیر“
 میں موجود ہیں۔“

- ”مقدس زندگی“ چھپ چکی ہے سعادت کی دوسری تصانیف حسب ذیل ہیں:
- ۱۔ بیان واقعی جس میں سری نگر کی جامع مسجد کی تعمیر کے بارے میں تفصیلات
 شامل ہیں۔ یہ کتاب ۱۳۵۵ھ میں بی بی بی بی بی بی بی بی بی بی بی بی بی بی
 ۲۔ حالات سلطان سکندر اور خانقاہ علی۔ شہمیری خاندان کے حکمران سلطان
 سکندر کے حالات پر مشتمل یہ کتب ۱۳۵۵ھ میں صابر الکتب پریس لاہور
 میں شائع ہوئی۔
 - ۳۔ اطباء شہر حضرت امیر کبیرؒ کے عہد کے حالات، مطبوعہ برکات
 پریس سری نگر ۱۳۵۰ھ (۱۹۳۶ء)
 - ۴۔ تذکرۃ الصوفیاء۔ کثیر کے بہت سی رسالوں کے حالات پر مشتمل ہے۔ یہ صابر

الکٹرک پریس سے ۱۳۵۶ھ میں چھپی۔

۵۔ مناقب السادات۔ کثیر کے امدادی سیدوں کے حالات میں

جو مذکورہ بالا مطبع میں ۱۳۵۷ھ میں چھپی۔

۶۔ یادگار عجایب سید مدین صاحب کے حالات پر مشتمل یہ رسالہ

مارٹنڈ پریس، سری نگر سے شائع ہوا۔

۷۔ فتوحات ربانی۔ کثیر کے علما کے حالات پر یہ رسالہ ۱۳۵۲ھ میں مسلم پرنٹنگ

پریس سری نگر میں چھپا تھا۔

۸۔ حیات یوز آسف۔ نیشنل پرنٹنگ پریس، سری نگر میں چھپی تھی۔

۹۔ حیات صرفی۔ حضرت شیخ یعقوب صرفی کے حالات اور شاعری پر یہ کتاب

صابر الکٹرک پریس میں ۱۳۵۶ھ میں چھپی۔

۱۰۔ بیل شاہ صاحب۔ حضرت شرف الدین سید عبدالرحمن بیل شاہ کے حالات

پر رسالہ مقبول عام پریس لاہور میں ۱۳۶۰ھ میں چھپا۔

۱۱۔ مسجد عالی اور عید گاہ سری نگر کے بارے میں ایک رسالہ جو نشاط الکٹرک

پریس، سری نگر ۱۳۶۰ھ میں "کلام عالی" کے عنوان سے چھپا گیا تھا۔

سعادت کی کئی اور تصانیف، جن کا ذکر صوفی نے اپنی تاریخ میں

کیا ہے، شائع نہیں ہو سکیں۔ اپنی تصانیف کے لحاظ سے مفتی سعادت

کثیر کے کثیر التعداد معتدّف ہوئے۔

"تاریخ جنوں" کے نام سے ایک مختصر ریسرچ لائبریری سری نگر میں محفوظ

ہے۔ دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی ایسی تاریخ کا اردو حروف میں

ترجمہ ہے جو بھاشا میں لکھی گئی تھی، لیکن اس کی زبان ٹھیکہ اردو ہے۔ اس کے مصنف

سے شروع ہوتی ہے اور مہاراجہ ہری سنگھ کی دل عہدی کے زمانے کے کچھ حالات بھی اس میں شامل ہیں۔ اس طرح یہ مہاراجہ پر تپ سنگھ کے عہد سے تعلق رکھتی ہے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے راج تلک اور ان کے عہد کے واقعات تفصیل سے درج ہیں۔ مولوی حشمت اللہ کی تاریخ جموں کے مقابلے میں اس کی زیادہ اہمیت نہیں لیکن اس میں کچھ تفصیلات لکھی ہیں۔ جو حشمت اللہ کی تاریخ میں نہیں ملتیں۔ ترجمہ کرنے والے نے بعد کے واقعات غالباً خود اضافہ کئے ہیں۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے راج تلک اور ان کے عہد کے واقعات تفصیل سے درج ہیں۔ جن کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے :

”مہاراجہ بہادر نے پنڈتوں اور جوتشیوں کو بلا کر راج تلک کا مہورت کیا تو ماہ پھاگن بسنت ریتوں سے ۱۹۱۷ء کا مہورت قرار پایا تو مہاراجہ گلاب سنگھ جی بڑی دھوم دھام سے جشن راج تلک کی تیاری کرنے لگے۔ اس موقع پر دیگر ریاستوں سے راجہ مہاراجہ بلائے گئے۔۔۔۔۔۔ دیگر سکوں سے راج تلک کی غمر سن کو کے طرح طرح کے تماشا کرنے والے لوگ بھی جموں آئے اور جشن راج تلک کی رسوم خوب دھوم دھام سے ہونے لگیں۔ منڈپ کو اچھی طرح سجایا گیا۔ جب راج تلک دینے کا مہورت عنقریب پہنچا تو مہاراجہ گلاب سنگھ نے منڈی مبارک میں دربار کیا۔ اور اپنے ہاتھ سے سری رنبیر سنگھ جی کو راج تلک دیا۔ اور پھر منڈی مبارک سے سواری سجائی گئی تاہم کو خوب سجایا گیا اعدہ فوج لدل میں تھی توپ خانہ اور رسالہ وغیرہ بھی لدل میں تھے۔ بہت سے بابے اور بندوٹی جو بھلا وغیرہ بھی لدل میں تھے۔ جب بلکوں راجہ بالندو جی کی منڈی یعنی کپڑا منڈی

پہنچا تو رہیں ادا کی گئی "

زبان پر سق می اثرات معقوں اور جلیوں کی ساخت میں بھی نظر آتے ہیں :

حکومتی کونسل کی کاروائیوں کی ایک مسلسل

ہمارا بد پر تپ سنگھ کے زمانے میں حکومتی کونسل کی کاروائیوں کی کچھ اور اور
ہم کو ملتی ہیں۔ بعض اوجہ دہانوں کی کاروائی کی نقل جو سلسلے سے دستیاب ہو سکی
ہے وہی ہیں وہی کی جاتی ہے۔ اس سے دھڑی زبان کی مرقی پر روشنی پڑتی ہے۔
عزیزیں جیسے

سری سہ کار دلہا جی سی ایس۔ آئی

راجہ سرور سنگھ کے سی ایس۔ آئی

رائے صاحب راجہ ترن داس ام۔ پی

خان بہادر غلام احمد خان صاحب، ملٹری ڈپارٹمنٹ

مسٹر قواعد جمہوری راجہ صاحب ملٹری، اڈوائزر

بمیراد اجرائی کسودر ریاست بعد نظروں بانسابطہ کرسل کی پیش ہوا۔

قواعد جمہادی بنس مان ہیں جو نو فصلوں اور (۷۵) دفعات پر مشتمل

ہیں :-

قائد اولیٰ - قاعدوں کو اس طرح پررب میں کہا جاسکتا ہے :

"جنرل کا ٹنگ سرنی کر گئی شمس کو بوسہ اور چھانڈنی میں کسی بڈار یا

سرکاری جگہ میں کسی جرائیم ذیل کام ترکیب معلوم ہوا، سزا آئے۔

جرمانہ جو فٹہ روپیہ سے زیادہ نہ ہو یا قید محض جو بہت سے زیادہ

نہ ہو یا ہر دو دے سکتا ہے

جوڈیس جبر کی رائے پر کبھی انسر نہ جسکو ^{۳۴} یکم ستمبر ۱۹۱۱ء کو سنایا گیا۔

جوڈیس جبر کے خط مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۱۱ء کو سنایا گیا کہ وہ ان کو سنایا گیا۔ یہ تجویز کی گئی۔ درگتیا سبدرم جہلم دہلی روڈوں سکھا
ان کے چار تیس تیسریں کے ہائیں جو کہ ان کی حفاظت پر درگتیا
پائے اور بڑھنے کا ذمہ دار ہوگا۔

جوڈیس انسر کے فیصلہ پر کسی بابا بھائی جبریز ۱۱ جولائی کو پولیس میں

ہوئی :-

اسی روز مارش ایک نقشہ ابدی و قیامت بخش سوار پولیس کا درج

چڑھے کی اعتلاج استعمال کی گئی ہے

کونسل کی ایک اور کارروائی جو ۲۶ - اگست - ۱۹۱۱ء سے متعلق ہے یہ ہوا جا
یہاں کے مقدمات کی تفصیل درج کی گئی ہے :

۱۔ شہر دیوی سنگھ قوم پارک سکائی نہ اٹھ تحصیل سری نہ سنگھ

پورہ مدعا عظیم سیلان بنام مسماہ منور تہر الحروف گوگل میں

بیل قوم چارک سکساں بھٹا مدعیہ سنوں درخواست نظر ثانی

روز پوریش نمبر ۱۱ مورخہ ۱۲ - اگست ۱۹۱۱ء بجری جس کی رو سے ڈپٹی

ٹیک اگر مہن سوے اور اسی بادی اس صورت رد یہ بھن منڈ

بساں وہی ہوان سولی اوس کی سرکوٹھ بون پورہ سرس کرار

دلا میں مسئلہ داشت مورخہ ۲ بیساکھ ۱۹۵۸ء (۱۹۵۸ء) مشورہ

ش میں طرہ تان ماتے میں مسماہ سکول زورہ بیل چارک متقی

مورعہ کیا تو فہم کی و عروا بہ نسبت سیلان ہونی اور پہلے یہ

مقدمہ صاحب زادہ سلامت اللہ خان کے اجلاس میں رہا اور اس نے

۲۳۸
 ڈگری مسماۃ منور تہو بابت معرعہ لکھانو حق بسوئے دند گلوبے
 و صادر کی۔ (یہ تفصیل طرل ہے)۔

سرکار دلائے جہاں تگ دیکھا ہے اور سرکار بکنسٹ پاشی جی سے
 سنا ہے۔ یہ اقوام پارک وکوال لنگہ سلساریہ اندوہ ترجیح اعد دیگر
 اقوام جو کہ ۱۳ یا ۱۴ نمبر کے قریب ہیں، ان کی عورتیں خاندانی
 تہیں کر سکتی ہیں۔ کیونکہ یہ اقوام ساریہ کہلاتی ہیں اور شاہی
 خاندان و اقوام راجپوت کو لڑکیاں دیتی ہیں۔ اگر کوئی عورت اقوام
 مذکور میں گھر سے نکل جاوے یا دوسرا خاندان کرے تو اس کو
 کوئی استحقاق جائیداد شوہری پر نہیں ہوتا۔

اگے لکھا ہے کہ عدالتوں نے اپنے فیصلے میں اس امر کو ملحوظ نہیں رکھا اور اگر سرکار
 دلا میں اس مسئلے کو پیش کیا جاتا تو سرکار ضرور نوٹس لیتے۔

مشیر مال خان بہادر غلام احمد خان صاحب نے اصلاح یہ محکمہ کا بھرتی
 افشا غلبہ، مبلغ چار ہزار روپیہ، ۹ ستمبر کو مرتب کر کے ۱۴ ستمبر ۱۹۰۱ء کو کنسل
 میں پیش کیا تھا۔ جس کی تفصیل دی ہے:

”محصول کا بھرتی کی مختصر تاریخ“

محصول کا بھرتی سرکار مہاراجہ گلاب سنگھ صاحب سورگپشی
 کے عہد سے قلمرو جوں کشمیر میں نافذ ہے۔ اس محصول کا لگایا جانا اس
 خیال پر مبنی معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف زمین کی سلطنت بلکہ بالعموم اس
 کی ملکیت بھی قلمرو جوں کشمیر کے فرماں روا کا حق ہے۔ علاوہ برہی
 قلمرو و وزیر بخت قار تاپہڑی و میدانی علاقہ جات پر شامل ہیں

۲۳۹

جہاں نہ صرف رعایا ریاست ہے بلکہ وہ لوگ بھی جو حدود ریاست
سے باہر رود و باش رکھتے تھے جہاں اپنے مولشی چرایا کرتے
لہذا ریاست بلا شک مستحق تھی کہ چرنے والے جو چراگاہ کے استعمال
سے بے انتہا فائدہ اٹھا رہے ہیں اس میں سے کم از کم کچھ حصہ
لے۔۔۔

اس تمہید کے بعد دیہاتوں کی تفصیل سے گاہ چرائی کی شرح دی ہے اور نقشہ
اور جدول بھی دیئے گئے ہیں۔ ساری کارروائیاں ایک ضمیمہ مثل کی صورت میں کچھ
دیس کی کشمیری اور سپاکوٹی کاغذ پر اور کچھ جدید مشینی کاغذ پر نیلی روشنائی سے لکھی
ہوئی ہیں۔ ہر کارروائی کے نیچے کونسل کے سیکرٹری کے دستخط ثبت ہیں۔ مثل کی ضخامت
کوئی ڈیڑھ ہزار صفحات کے قریب ہے۔ ہر صفحے کے پہلے نصف صفحے پر کارروائیاں
درج ہیں اور باقی نصف کونسل کی تجویز کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے۔ کونسل کی تجویزیں
اور فیصلے اسی دوسرے نصف حصے میں درج ہیں۔

ایک رو بکاری کی نقل

یہ رو بکاری راجہ امر سنگھ کی جانب سے ۱۰ جولائی ۱۸۹۹ء کو راجہ
رام سنگھ کے انتقال کے بعد ان کے منصب کا مایزہ اپنے تفویض کردہ
جانے کے بارے میں جماعت کی گئی تھی۔ یہ منشی حسن ابن علی کی ڈائری
سے ماخوذ ہے۔

از پیش گاہ حضور راجہ امر سنگھ صاحب بہادر کے بیس۔ ایس آئی کمانڈر ان چیف
افواج جموں و کشمیر۔ جنرل آرڈر نمبر ۵۔

حضور لفٹنٹ کرنل راجہ سر رام سنگھ صاحب بہادر کے بیس۔ بی، کمانڈر

ایجنٹ افراج تھوں وکشیہ کے سرگباش ہونے سے وہ رنج و الم شاہی خاندان د
 الیائی ریاست د ملا مان جنگی و ملکی اور رعایا کو ہوا کہ جس کا بیان کرنا ناممکن ہے
 خصوصاً فوج کو جس قسمہ صدر حضور سرگباشی کی ناگہانی وفات سے ہوا۔ اس
 کو علاج طاقت بشری سے باہر ہے لیکن بغرض انتظام و بہبودی فوج پیشگاہ
 حضور سری سرکار والا سے بتوسل ارشاد مصدرہ ۸ ماہ ساون ۱۲۵۶ھ بحوالہ رزلوٹن
 اسٹیٹ کونسل مورخہ ۵ ماہ ساون ۱۲۵۶ھ مطابق ۱۶ ماہ جولائی ۱۸۹۹ء اس عہدہ
 عظیم کے مراتب کا انجام دینا سپرد اینجناب ہوا۔ اس میں ذرہ بھی شک نہیں کہ
 حضور مابدولت اس کمی کو جو حضور راہ صاحب کے اس جہان فانی سے ولت
 کر جانے کی وجہ سے ہوئی پورا کرنا ناممکن خیال فرماتے ہیں۔ الا اس موقع پر اتنا
 کہہ سکتے ہیں کہ ان تمام اصول اور قواعد کو جو فوج ریاست میں لایکج ہیں یا بعد
 ازال وقتاً فوقتاً صاحب یزطر پر نفاذ پذیر ہوں گے، مد نظر رکھ کر مفاید اور حقوق
 ہر کہ دہر ملازم فوج کا حفاظت کرنا یا قائم رکھنا ہم سب سے اعلیٰ فرض سمجھیں
 گے۔ ہم کو فوج کے ساتھ قدرتی طور پر بوجہ پیدائش در قوم راجپوت محبت اس
 کی بہتری میں دلچسپی اور اس کی حالت کی ترقی اور بہبودی کی ازلی خواہش
 ہے اور اُمید کی جاتی ہے کہ وہ محبت، اعتبار، بھروسہ جو فوج کو حضور
 کمانڈر ایجنٹ سرگباشی کے ساتھ تھا۔ وہی ہم پر بھی رکھیں گے اور آج حضور
 مدوح نے چارج لے لیا۔ نقطہ۔

ایک خیر مقدمی تقریر

غش حسن ابن علی نے مہاراجہ پرتاپ سنگھ اور راجا اس سنگھ کے
 ملکہ سکول میں تشریف لانے کے موقع پر جو خیر مقدمی تقریر کی

منشی اور جس کی طرف ان کے حالات میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ذیل میں
درج ہے : منشی صاحب نے لکھا ہے کہ یہ تقریر سادہ انداز میں
اس لئے لکھی ہے کہ انگریز بھی اسے سمجھ لیں۔
اعلیٰ حضرت، خوش آمدید و منفا آوردید۔

امروز شاہ شاہاں مہمان شہادت مارا

اقبال دعوزد دولت وہاں شہادت مارا

ہم تمام استاد اور طلباء، مشن اسکول کے اس مبارک موقع پر، جس کی نصیب
ہونا غایت دیر کی خوش قسمتی سے ہے، حضور انور کی تشریف آوری کے شکر گزار
ہیں۔ یہ چند شکستہ الفاظ نہایت خاکساری اور حق شناسی کی دلی جوش سے
پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ ہم شکستہ زبانوں کے پاس وہ الفاظ موجود نہیں جن سے
اس نعمت عظمیٰ کا شکریہ تمار واقعہ ادا کیا جاتا، مگر سبب جوش سرد کچھ کہنے
کے بغیر ہمارے دلوں کو تسلی نہیں ہوگی۔ اس لئے الطاف شانہ سے یہ توقع ہے
کہ ہمارے اس ناقص شکریہ کو درجہ اجابت عنایت کریں۔ اعلیٰ حضرت کی تشریف
آوری سے جو مسرت اور خوش وقتی ہم کو نصیب ہوئی وہ حد بیان سے باہر ہے اور
اس خوش نصیبی اور خوش وقتی سے اس قدر ہمارے حوصلے بڑھ گئے جس کا اندازہ
کرنہ صرف روشن دماغ اور دقیق النظر اشخاص کا کام ہے اور اس اسکول کو
جو دس بارہ سال سے اس سرزمین میں کام کر رہے حضور انور کے قدیم مبارک
سے اعلیٰ درج کی رونق اور ترقی ہوگی اور ہمارے خیالات وسیع اور ہمارے حوصلے
فراخ اور ہمارے ارادے بلند ہوں گے۔ فی الواقع یہ امر ایک چھوٹا امر نہیں بلکہ اگر
ہم آبِ زند سے صفحہ تواریخ پر اور اپنے کارناموں میں لکھ لیں۔ زیبا ہے کہ قرناً
بعد قرناً اہل نسل بعد نسل ایک عالی شان یادگار ہوگی اور ہمارے اس اسکول کی

وقت بھی اس وقت سے اہل نظر کے سامنے چند در چند ہو جائے گی۔ اس کام کا پودا اگرچہ ابتدا میں مسٹر ڈاکے نے اس گلزمین میں لگایا تھا مگر اس نے زیادہ تر مسٹر فوس اور ان کے لائق و فائق رفیق کی عرق ریزی اور جانفشانی سے سرسبزی اور غایت درجے کی نشوونما پائی اور اس قدر شاخ و برگ نکالے کہ جس کے نظارہ کے لئے اعلیٰ حضرت نے بھی شوق ظاہر فرمایا۔ ادویل وقت میں جب مسٹر ڈاکے نے اس اسکول کو جاری کیا، صرف چار لڑکے موجود تھے۔ مگر اوس وقت سے پایہ بہ پایہ یہاں تک ترقی کرتا گیا کہ اب اوسکی کئی شاخیں اس ملک میں واقع ہیں۔ اور طلباء جو ہمارے ان اسکولوں میں تعلیم پا رہے ہیں، قریب تین سو شمار ہیں۔ الحق اتنی مدت میں جو کچھ عجیب و غریب کاروائی اس اسکول کے لائق و فائق منتظموں سے حضور انور کی قلمرو میں ظاہر ہوئی وہ مثل آفتاب روشن ہے۔ عیال راجہ بیاں۔ جس کی صداقت پر اس محفل عالیہ کا انعقاد ایک مہینہ قاطع ہے جو کچھ مدعا اور علت نھائی اس اسکول کے سرگرم اور جاں فشاں منتظموں کی کاروائی سے ہے، وہ یہ ہے کہ وہ اطفال اور افراد جو ہماری تعلیم و تربیت کے ماتحت ہیں۔ ان کے دل دیانتداری و نیکوکاری وغیرہ صفات حسنہ کے نور سے مثل آئینہ روشن ہو کر خدا کے نیکو کار بندے اور ریاست کی خیر خواہ رعایا ہو جائیں۔ اور اپنے ہمشہریوں کے حق میں برکات دہن بودی کا باعث ٹھہریں۔ کیونکہ جس عنوان پر ان کو دینی تعلیم دی جاتی ہے اسی عنوان پر ان کی شایستگی اور درستی اخلاق پر بھی حتی الامکان توجہ مصروف ہوتی ہے۔ ہم اس اسکول کی ترقی میں جہاں تک ہماری معلومات میں گنجائش ہے بڑی سرگرمی اور غایت دلچسپی کی توجہ سے کوشش کرتے ہیں اور لڑکوں کو یونیورسٹی کے امتحان کے لئے تیار کر رہے ہیں۔ جس میں ان کے فوائد ذاتیہ اور صفات علیہ شامل ہیں۔ بالخصوص ہم بڑی

خوشی سے اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ چھ لڑکے ملل اور پانچویں کے لئے
طاقتوری اور ہنرمندی سے اون کو جمانی

محاطے اُراستہ کرتے جاتے ہیں۔ مثلاً فطبال، بگرٹ

فنِ کشتی رانی، مشقت دلی، رتنِ مصارعت،

پلائے کافن وغیرہ امور میں ہماری کوشش سے مہارت پیدا کرتے جلتے ہیں۔
جس سے اون کے دلوں میں بہت کامادہ جو انسانی طبیعت کا خاصہ ہے، پھیل کر
اون کے طبائع اور حواسِ دقوای انانیت میں اعلیٰ قسم کے خواص بروز کر رہی۔

جن کے باعث سواد انگلستان اس وقت رونے زمین پر چمک رہا ہے اور اس

تمام کاروائی کا باعث اور محرک وہی ہمدردی ہے، جس کا بہت سا مادہ اس

اسکول کے مہتمموں اور منتظموں کے دلوں میں رکھا ہوا ہے اور اُمید قوی ہے کہ

اوس کے نتائج اور فوائدِ حضور انور کی قلم و دہیں دور تک پھیلتے جائیں گے۔

اور آئندہ یہ ملک بھی جس کو جنتِ نظیر کہا جاتا ہے۔ اسمِ بانی ہر جلتے۔ اخیر

میں ہماری یہ التماس ہے کہ جس طرح یہ اسکول اعلیٰ حضرت کے سایہ حکومت

میں اب تک رہا ہے اور رہے گا۔ اسی عنوان پر اپنے الطافِ شامانہ کے خاص

نظرِ توجہ اس پر ڈال کر وقتاً فوقتاً مشمولِ عنایات و مشکور یاد آوری فرمادیں۔

اہم اس موقع پر حضورِ راجہ رام سنگ صاحب بہادر بالقابہ اور حضور

راجہ اکر سنگ صاحب بہادر بالقابہ کا بھی شکریہ بھی تہ دل سے ادا کرتے ہیں۔

جنہوں نے وقتاً فوقتاً اس اسکول کی امداد پر اپنی توجہ مبذول فرمائی ہے۔

انتہی —

۱۔ بکسنگ کا یہ ترجمہ شاید قبولِ خاطر نہ ہو۔

ادارے

ریاست کے مختلف حصوں میں علمی اور ادبی ذوق جیسا جیسا پھیلتا گیا، صاحب شعور اور صاحب ذوق اصحاب کو جن میں کئی شعر اور ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے، آپس میں مل بیٹھنے اور علمی اور ادبی موضوعات پر تبادلہ خیال کے مواقع فراہم کرنے کی خواہش فطرتاً اُبھرتی گئی۔ ڈوگرہ مطلق العنان حکمرانوں کو ایسے اجتماع پسند نہیں تھے۔ اس لیے خواہش دل کی دل ہی میں رہ جاتی تھی۔ آخر اس کی ایک صورت اس طرح شکل آئی کہ ریاست کے رزیڈنٹ کے دفتر میں کچھ صاحب ذوق منشی جو اکٹھے ہو گئے تھے۔ انہوں نے پہل کی۔ کیونکہ رزیڈنسی کے علاقہ میں مہاراجہ کا محکم نہیں چل سکتا تھا۔ غالب صاحب منشی سراج الدین احمد خان میر منشی رزیڈنسی نے اس خواہش کو عملی جامہ پہنایا۔

انجمن مفرح القلوب

منشی صاحب کے حالات کے سلسلے میں انجمن مفرح القلوب کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ یہ انجمن ہم مذاق ہم نشینوں کے ایک آزاد ادارہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ ابتداء میں اس کا دائرہ تفریحی مشاغل تک محدود رہا اور یہ اس زمانے کی سیاسی فضا کے مد نظر مناسب بھی تھا۔ لیکن اس کے ارکان میں ادبی ہونگاہیں نمایاں تھیں۔ اس میں جلد ہی اس کے اہتمام سے شعری محفلیں منعقد ہونے لگیں۔

انجمن مفرح القلوب کے اجتماع دلچسپ متنوع انداز کے ہوتے تھے ابتداء میں رزیدنسی کا احاطہ ان کے لئے منتخب ہوا تھا لیکن بعد میں منشی سراج الدین احمد ناں کے مکان پر بھی اس کی محفلیں منعقد ہونے لگی تھیں لیکن اس کی وہ محفلیں دلچسپ ہوتی تھیں جو موسم بہار میں شالامار اور نشاۃ اور کبھی کبھی روالہ ڈنگوں اور شکاروں میں منعقد ہوتی تھیں۔ حبیب کیفوی اپنے مضمون "جولہ کشمیری شعری محفلیں" (صحیفہ لاہور شمارہ ۱۹۶۶ء) میں ان محفلوں کا بیان بڑی خوبی سے کیا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

"معمول یہ تھا کہ ہفتے کو اس کے اراکین ڈنگوں میں سامان خوردہ نوش لے کر ڈول کی طرف نکل جاتے۔ رات ڈنگوں میں ڈول کے کنارے بسر کرتے اور صبح کو نشاۃ، شالامار، انیم باغ یا چشمہ شاہی میں ڈیر لگالیتے اور تمام دن ہنسی مذاق اور شہر خوانی میں گذار دیتے۔"

انجمن مفرح القلوب رفتہ رفتہ ریاست کے اور باہر سے آنے والے ادب دوستوں کا مرکز بن گئی تھی۔ چنانچہ باہر سے جو صاحب ذوق ادیب اور شاعر کشمیر کی سیاحت کو آتے، وہ بھی انجمن کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے ان میں سر محمد اقبال، سر عبدالقادر، سر محمد شفیع، جسٹس شاہدین ہمایوں اور دوسرے بہت سے شہسیر قابل ذکر ہیں۔ مشہور صحافی ملک انصاف اللہ عزیز ۱۹۶۲ء میں جب کشمیر گئے تھے، انجمن کی ایک محفل میں شریک ہوئے تھے چنانچہ "ایشیا" شمارہ ۲۱-۲۲ مارچ ۱۹۶۰ء میں انہوں نے اس انجمن کا تذکرہ یادِ ماضی کے طور پر اس طرح کیا ہے:

"میں جانتے ہی اس انجمن کا ماضی میر بن گیا۔ مجھے غالب حسرت

اور اقبال کی غزلیں ترنم کے ساتھ پڑھنے کا شوق تھا اور اس انجمن کے ارکان ان کے دلدادہ تھے۔

اس انجمن کے ایک غیر معمولی اجتماع کے بارے میں ملک عزیز نے جو لکھا ہے اس سے بھی اس کی متنوع دلچسپیوں پر روشنی پڑتی ہے :

”عید کی نماز ہم نے اس عید گاہ میں پڑھی، جو بعد میں تحریک آزادی کشمیر کی جلسہ گاہ بن گئی، اور نماز کے بعد، انجمن مفرح القلوب کا اجلاس منشی سراج الدین احمد خاں کے مکان پر منعقد ہوا۔
تفریح و مسرت کا ہنگامہ برپا تھا۔ غم عشق تھا نہ غم روزگار، لطافت نظلیں اور فتنے جاری تھے۔“

انجمن کے دوسرے سرگرم ارکان میں چودھری خوشی محمد ناظم، پیرزادہ محمد حسین عارف اور سعد الدین سعد بھی شامل تھے۔ اس انجمن نے جوانوں میں شعر و ادب کے مذاق کو پھیلانے اور اسے نکھارنے کے ساتھ ساتھ، ایک اور بڑی خدمت یہ انجام دی کہ اس کے اجتماعوں کی بدولت، دوسرے سیاسی، سماجی، تعلیمی اور ادبی اداروں کے قیام کے لئے راہ ہموار ہو گئی۔
منشی سراج الدین احمد خان نے خود ایک نوٹ میں، جو ”مخزن“ میں شائع ہوا تھا، اس انجمن کا تذکرہ انجمن مفرح الماراج کے نام سے کیا ہے اور ایسے آپ کو اس کا بے تردید بتایا ہے۔

انجمن نصرت الاسلام

مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت اور ان کی سماجی اصلاح کے مقصد کے کشمیر کے مشہور دینی پیشوا امیر واعظ مولوی غلام رسول شاہ کی کوششوں

سے یہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے نمونے پر ۱۹۰۵ء میں قائم ہوئی تھی۔ میر واعظ نے
 نئی تعلیم کو کشمیر کے مسلمانوں میں رائج کرنے کے لئے وہی کام کیا تھا۔ جو سر سید نے ہندو
 کے مسلمانوں کے لئے انجام دیا تھا۔ وہ کشمیر کے میر واعظوں کے برگزیدہ خاندان میں ۱۲۷۱ھ
 میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد میر واعظ محمد علی سربراہ درود عالم تھے۔ حافظ غلام رسول
 شاہ بھی اپنے زمانے کے علماء میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ انجمن کے تعلیمی کارناموں میں
 مدرسوں اور سکولوں کا قیام خاص اہمیت رکھتا ہے، جن کی بدولت، وادی کشمیر
 میں جدید تعلیم کی اشاعت عمل میں آسکی۔ ان اسکولوں کے مدرسین میں کئی صاحب
 ذوق ادیب اور شاخہ علمی تھے ان میں سے منشی امیر الدین، امیر اور صادق علی خاں
 صادق کا تذکرہ گذر چکا ہے۔ انجمن نصرت الاسلام کا قیام جس زمانے میں عمل میں
 آیا۔ لاہور میں انجمن حمایت اسلام مسلمانوں کے تعلیمی اور سماجی مسائل کے حل کے لئے
 ایک باوقار انجمن کے طور پر کام کر رہی تھی۔ انجمن نصرت الاسلام کے بانیوں کے پیش نظر
 انجمن حمایت اسلام ہی کا کام تھا۔ انجمن نصرت الاسلام کے سالانہ جلسے بھی انجمن حمایت
 اسلام کے سالانہ جلسوں کی طرح جن میں عالی اور اقبال بھی اپنی نظمیں سناتے رہے،
 بڑے تفرک و احتشام سے منعقد کئے جاتے تھے اور ان جلسوں میں سربراہ درود مسلمانوں
 کے علاوہ پرنسٹ علماء اور کبھی کبھی انگریز عہدہ دار بھی شرکت کرتے تھے۔ کشمیر کے اساتذہ
 شعراء میں منشی امیر الدین، امیر اور منشی صادق علی خاں صادق ان جلسوں میں اپنی
 قوی نظمیں سننا اور داد حاصل کرتے تھے۔ منشی محمد الدین فوق بھی بعض سالانہ جلسوں
 میں شرکت کی تھی۔ انجمن کی سالانہ رودادیں، ان ساری نظموں اور نصابین اور
 تقریروں کے ساتھ اجوان جلسوں میں پیش ہوتی تھیں ہر سال کی باقی تھیں۔
 انجمن کے اغراض و مقاصد حسب ذیل تھے۔

۱۔ مسلمان بچوں خصوصاً یتیموں کی (جو تعلیم میں بالکل پیچھے ہیں) دینی

اور دینی تعلیم کا اختتام کرنا اور حق کی وسیع تعلیم میں مدد دینا۔

۲۔ ابن اسلام کو اصلاح طرز و معاشرت اور تہذیب اور باہمی اتحاد اور اتفاق و خیر خواہی ریاست کا شوق دلانا۔

انجمن کے تعلیمی اور سماجی مقاصد کی وجہ سے ملک کے رئیس اور راجے، مہاراج بھی اس کی ترقی امداد کرتے تھے۔ چنانچہ چھٹے سالانہ جلسے کی جو روداد ۱۹۱۱ء میں شائع ہوئی تھی اس میں، مہاراجہ گایکڑا، برودہ کی جانب سے "چندہ خیر" کے عطا ہونے کا اعلان کیا گیا ہے۔ انجمن کے سرپرستوں میں سوپر کے رحمن ڈار، خواجہ عبدالغنی وکیل کے علاوہ بن کے انتقال پر کبھی ہوئی منشی غلام محمد خادم کی نظم کے کچھ شعر گزشتہ صفحات میں نقل کئے جا چکے ہیں، بارہ مولہ کے رئیس خواجہ عبدالحمید مگر دے کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس سال کی روداد میں اس بات پر اظہارِ طرانت کیا گیا ہے کہ انجمن کی سرپرستی میں جو سکول قائم کیا گیا تھا۔ وہ نذر کے فضل سے ترقی کر رہا ہے۔ روداد کا اقتباس ذیل میں درج ہے:

"ہم کیا ہماری بضاعت کیا کہ خداوند کریم کے فضل و احسان کا شمار کر سکیں یا تو وہ دن تھا کہ بڑے زور شور سے ہمارے اپنے ہی بہرہ بان ہم وطن یہ پرسن اگلاتے تھے کہ کشمیری مسلمانوں کا سکول چلنے کا نہیں، کیونکہ یہاں برادرانِ اسلام میں نہ شوقِ تعلیم ہے نہ ایسے کاموں میں دلچسپی، پھر پلے تو کیونکر، مگر خدا کی ہر بانیوں کے قربان کجس نے بانیانِ مدرسہ کے ہاتھوں سے اس نامکمل کو ممکن کر دیا۔"

۱۹۱۰ء کی سالانہ روداد میں اس بات پر بھی حرج نہ تھا کہ اظہار کیا گیا

ہے کہ رام سنگھ انجمن کے کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ

کہ لوگ سالانہ روداد کے چھیننے کے منتظر رہتے ہیں۔ اس جلسے میں، خواجہ ابید الدین نے ایک سندس سنایا تھا۔ ان کے علاوہ منشی صادق علی خان صادق، سکند ماسٹر مدرسہ نصرت الاسلام، منشی غلام محمد صادق، منشی غلام محمد خادم نے بھی نظمیں سنائی تھیں۔ ان شعراء کا حال لکھا جا چکا ہے۔ سالانہ جلسے کی تقریروں میں، اختتامی تقریر خواجہ عبدالصمد لکھنوی کی ہے، جس کا آغاز وہ اس طرح کرتے ہیں:

”جناب صدر مجلس و معزز حاضرین۔ آپ جانتے ہیں کہ میری عادت ہمیشہ سے ہر ایک تقریر کو بسم اللہ اور حمد و ثناء سے شروع کرنے کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک نو حدیث میں آیا ہے:

”كُلُّ امْرِئٍ بِالْاِيمَانِ بِسْمِ اللّٰهِ فَهُوَ مِنْهَا“

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ عبدالصمد مشتاق مقرر تھے۔ ایک اور تقریر مولوی احمد شاہ صحائف مدرس براہنج سکول، سیٹھ ہانی سکول اور یکہ ٹری گریڈ سکول سری نگر کہتے ہیں انہوں نے مولوی رسول شاہ میر داغ کا نظم لکھی اور قوی کاہ کو سراہا ہے:

”ہر کہ دہ پر روشن ہے کہ جناب مولوی رسول شاہ صاحب میر داغ مرحوم، خدا اُن کو جوار رحمت میں جگہ دے، اتباع سنت نبوی علیہ السلام پر ایسے ثابت قدم تھے کہ انہوں نے اپنے وجود مبارک کو بکثرت افعال و اعمال سنت نبوی علیہ افضل الصلوٰۃ والتحمید مہذب و ندیب بنایا تھا۔“

۱۹۱۱ء کی سالانہ روداد میں پہلی تقریر خواجہ عبدالصمد لکھنوی کی درج ہے، جس میں انہوں نے پنجاب، ہندوستان اور کشمیر میں کی ہوئی اپنی تقریروں کا ذکر کیا ہے۔ اقتباس ہے:

”مجھے جب کبھی پنجاب و ہندوستان اور کشمیر میں بولنے کا اتفاق ہوا تو میں اسے حمد کبریا، اور نعت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع کیا۔۔۔ گویا میں نے وسیلہ نجات نعت سرور کائنات جان کر، ایک مضمون اپنے لئے قاصد کر رکھا ہے۔۔۔۔۔“

اس روداد میں ایک تقریر مولوی احمد شاہ کی بھی شامل ہے اور ایک اور تقریر نذیر احمد بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی، جج عدالت مطالبہ خفیفہ، کشمیر کی ہے، جنہوں نے آیات طیبات قرآنی سے تقریر کا آغاز کیا تھا لیکن چونکہ ان کی فصیح قطع مغربی تھی۔ اس لئے معذرت کے طور پر کہتے ہیں:

”صاحبان، آپ مجھ جیسے شخص کی زبان سے آیات طیبات قرآن مجید سن کر تعجب کرتے ہوں گے مگر آپ میری صورت و شکل شبہاً نظر انداز کر کے میری تقریر کی طرز متوجہ ہوں۔۔۔ (انظر و مقال۔۔“

اس روداد میں سب سے اہم رزیڈنٹ فریئر کی تقریر ہے۔ اس سلسلے میں روداد میں لکھا ہے کہ فریئر ۱۸ ماہ اپریل ۱۹۱۲ء کو مدرٹہ لقرت الاسلام کے معائنے کو گئے تھے۔ اس موقع پر ایک ایڈریس انہیں پیش کیا گیا تھا۔ روداد میں لکھا ہے کہ ایڈریس کے اختتام پر حضور مختتم الیہ سرور وراثہ ہوئے اور ایک مختصر سی تقریر اردو میں فرمائی۔ امیر الدین صاحب آمیر نے شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد گورنر صاحب نے بھی صاحب موصوف (رزیڈنٹ) کی تقریر کو مدہر فرمایا:

رزیڈنٹ کی تقریر حسب ذیل ہے:

”صاحبان، میں سیر دعا عطا اور عمران انجمن کی ملاقات سے نہایت محفوظ ہوا ہوں مجھے یہ معلوم ہونے پر کہ یہاں عرصہ یا پنج سال سے باہمی ناراضگی ہے، سخت افسوس ہوا، مگر خدا کا شکر ہے

کہ دو سال سے ان میں صلح ہو گئی ہے۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ ایک ہی پیغمبر کے پیروؤں میں باہمی نفاق ہے۔ میں یہ معلوم کر کے سخت متحیر ہوں کہ اسلامیہ سکول کو جو مدت سے جاری ہے، تمام قوم سے بوجہ نفاق مدد نہیں ملتی۔ زمانہ حال میں تمام ہندوستان تعلیم کے واسطے بیدار ہو رہا ہے۔ مگر یہاں بوجہ نفاق ہنوز خواب غفلت طاری ہے۔ تمہارے لئے یہ سخت ضرورت ہے کہ آپس میں اتفاق رکھو اور پرانی رنجشوں کو بالکل بھول جاؤ اور اپنے بچوں کو عمدہ تعلیم دینے میں آپس میں مل جاؤ۔ اس نصیحت میں میرے ساتھ مہراں انجن اور میرد اعظ شامل ہیں۔

فریڈرک حیدر آباد میں پہلے مددگار رزیڈنٹ اور کچھ عرصہ رزیڈنٹ بھی رہے۔ حیدر آباد بھی کثیر کی طرح اُردو کا بٹرام کرتھا۔ اور کثیر ہی کی طرح دہاں کی سرکاری اور عام طور پر برلی اور سمجھی جانے والی زبان اُردو تھی۔ اس اعتبار سے فریڈرک اُردو سے واقف ہونا، برطانوی مصالح کے مناسب تھا۔

منشی ہر گوبال خستہ پنڈت لڑکوں کی تعلیم اور پنڈتوں میں سماجی اصطلاح کے کام کے لئے اس زمانے میں نمایاں تھے۔ ان کا ذکر گذر چکا ہے۔ وہ بھی ۱۹۱۰ء کے سالانہ جلسہ میں شریک ہوئے تھے۔ اور تقریر کی تھی:

”میرزا گوشت دوست تمام مسلمانوں کے روپیہ سے پردوش یافتہ ہے، کیونکہ میرے کل نوکل مسلمان ہیں۔ اس لئے مجھے سخت افسوس ہے کہ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں نے کچھ بھی تعلیم نہیں پائی۔ سطح سکول کے سالانہ جلسہ انجانی میں مسلمان طلباء پانچ فیصد سے زیادہ نہیں تھے۔ ایک ان کی آبادی ۹۴ فیصد ہے“

اراکین میں میرزا مبارک بیگ، شیخ غلام حیدر خان جتئی اور عبدالحکیم پیش پیش تھے۔ بزم سخن کی محفلیں ہفتہ وار منعقد ہوتی تھیں، اور عموماً مصرعہ طرح پر غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ اس بزم کا مرکز ابتداء میں چراغ شاہ کی حویلی تھی، لیکن بعد میں یہ محفلیں غلام حیدر خان جتئی کے مکان پر بھی منعقد ہوتی تھیں۔ یہ بزم ۱۹۲۷ء تک قائم رہی اور اس کی سرگرمیوں کی بدولت جنوں اور کشمیر کے نوجوانوں میں شعردُمن کا ذوق پھیل گیا۔ ان نوجوانوں میں سلمان ڈوگرے اور دوسرے لوگ بھی شامل تھے۔

بزم دمن نے اردو شعرد ادب کے ذوق کے پھیلانے میں ایک اور طرح سے بھی مدد دی۔ اس کی ہفتہ وار محفلوں کے علاوہ سالانہ مشاعرے بھی منعقد ہوتے تھے۔ یہ مشاعرے بڑے اہم سے منعقد کئے جاتے تھے۔ اور ان سے لوگوں کو اتنی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ لوگ سال بھر اس کے انتظار میں رہتے کہ اپنے پسندیدہ اور محبوب شعوروں کا تازہ کلام سننے کا انہیں ملے گا۔ اس کے پہلے ہی مشاعرے میں اردو شاعری کے سرآمد اردہ ستائے، حبیب حفیظ جالندھری، سیماب اکبر آبادی، تاجور نجیب آبادی، ہری چند اختر، سوہن لال ساحر، اثر صہبائی، عابد علی عابد نے شرکت کی۔ یہ مشاعرہ مندر دیوان جوالا سہائے میں ۱۹۲۷ء میں منعقد ہوا تھا۔ اور صدارت رتھپال سنگھ شیدائے کی تھی۔ جو شعر کا اچھا مذاق رکھتے تھے۔

ان مشاعروں کے موقعوں پر بڑی ادبی چہل پہل پیدا ہو جاتی تھی، مشاعرے کے زمانے ہی میں دوسری تعلیمی، ثقافتی اور ادبی محفلوں کے انعقاد کا بھی انتظام کیا جاتا تھا۔ چنانچہ مذکورہ بالا مشاعرہ کے دوسرے دن انجمن اسلامیہ کا سالانہ جلسہ مسلم ہال میں منعقد ہوا۔ اور رات میں مشاعرہ بھی ہوا۔ بزم کے دوسرے سالانہ مشاعرے میں چودھری خوشی محمد رانظر، پینڈت برجہ رن، ناتاریہ کیفی، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

یاس یگانہ چنگیزی، جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی، جگر مراد آبادی، احسان دانش،
عبدالحمد عدم، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، نواب جعفر علی خاں اثر اور فیض احمد فیض
بھی شریک ہوتے رہے۔

اسی طرح ایک اجتماع میں مولانا علیم الدین ساکب موجود تھے۔ انہیں اس کا
احساس ہوا کہ بزم کے مفید کام کو جنوں تک ہی محدود نہیں رہنا چاہیئے۔ چنانچہ ان کی تحریک
پر بزم کی رکنیت اور ضوابط میں وسعت دے کر اس میں کشمیر کو شامل کر لیا گیا۔
اور جنوں کی طرح کشمیر میں بھی بزم کا ایک عرصہ کام کرنے لگا۔ جس سے اہل کشمیر کے
ذوق کی ترقی کے اسباب مہیا ہو سکے۔ لیکن بزم کا نام بدل کر بزم اُردو جنوں و
کشمیر رکھا گیا۔ نام کی تبدیلی، سری نگر میں منعقدہ اس جلسے میں کی گئی جس میں
مشہور کشمیری قائد اور صحافی پنڈت پریم ناتھ بزار، یوسف خان، عبداللہ قریشی
اور شعراء میں پنڈت دینا ناتھ چکن مست اور قلیس شیرانی موجود تھے۔ بزم اُردو
کے پہلے صدر پنڈت دینا ناتھ مست منتخب ہوئے اور ایک شاندار مشاعرہ شریں الکول
سری نگر کے وسیع احاطے میں منعقد ہوا۔

بزم اُردو عرصہ تک مفید خدمات انجام دیتی رہی۔ اس کے مشاعرے موسم
بہار میں کشمیر میں منعقد ہوتے تھے اور سردیوں میں جنوں میں۔ سری نگر میں کچھ شاعرے
ریاست کی صنعتی نمائش کے موقع پر بھی منعقد ہوتے تھے۔ ایک یادگار مشاعرہ ۱۹۳۹ء
میں منعقد ہوا تھا، جب کل ہند ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بھی سری نگر میں منعقد
کیا گیا تھا۔ کانفرنس کے اجلاس سری پرتاپ کالج میں ہو رہے تھے اور اس میں
شرکت کے لئے شاہیر تعلیم اور علم دادب جیسے ڈاکٹر ذاکر حسین بابائے اُردو مولوی
عبدالمومن، سر تیج بہادر سپرد، ڈاکٹر امر ناتھ جھا، میاں بشیر الدین احمد اور علامہ کیفی
سری نگر آئے ہوئے تھے۔ اس موقع پر جو مشاعرہ منعقد ہوا، اس کی صدارت سر تیج بہادر

انجمن معین الاسلام

۱۹۱۵ء کے لگ بھگ سوپور میں قیام ہوئی تھی۔ اس انجمن کا مقصد زیادہ تر مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کو دینی امور اور علوم کی تعلیم دینا تھا۔ اس کے بانیوں اور سرگرم کارکنوں میں مولوی میرک شاہ اندرابی، خواجہ محمد جوہیہ، قاضی محمد احسن، خواجہ غلام محمد دتو، خواجہ حبیب اللہ قتلوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان اصحاب کی مساعی سے سوپور میں کئی مدارس قائم ہوئے تھے، جن میں قرآن، دینی احکام اور مسائل کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ سکولوں کا مروجہ نصاب بھی پڑھایا جاتا تھا۔ انجمن کا قیام کیا ہوا مرکزی سکول اب ہائی سکول تک ترقی کر گیا ہے اور سوپور کے اکثر نوجوان اسی سکول سے فیض پا کر نکلتے ہیں۔ اور ان میں سے کئی انجینئرز، ڈاکٹر ہیں اور کچھ حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز ہیں۔

انجمن نے سوپور شہر کے علاوہ اطراف و اکناف کے قصبوں اور گاؤں میں بھی سکول قائم کئے ہیں۔

سری نگر کی انجمن ہمدانیہ نے بھی نوجوان بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے سکول اور کتب قائم کئے ہیں جن میں حکومت کے مروجہ نصاب کے علاوہ دینی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔

بزم سخن

جوں میں اس صدی کے اوائل میں ۱۹۰۹ء کے قریب شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والے کئی نوجوانوں نے مل کر ایک بزم سخن کی طرح ڈالی تھی جس کے سرگرم

پسرو، صدر انجمن ترقی اردو نے کی تھی۔ سر سپرد نے اپنی صدارتی تقریر میں اردو کی ہم گیری اور افادی اہمیت کے بارے میں جو تقریر کی تھی، وہ اب تاریخی اہمیت حاصل کر چکی ہے۔ دوسرے دن آبِ ڈل پر ایک "سیلانی مشاعرہ" ترتیب دیا گیا اور پندرہ سولہ سچے سچے شکاروں میں یہ تقریب بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام کو پہنچی۔ اس کی کچھ دلچسپ تفصیل حبیب کیفوی نے دی ہے۔ لکھتے ہیں:-

"رات چاندنی تھی، فضا میں خوشگوار ہنسی سی تھی۔ ڈل کے سینے پر آرام دہ اور نظر نواز شکاروں کا بیڑا رواں تھا۔ ہانچوں (ملاحوں) نے شکاروں کو کچھ اس طرح ترتیب دیا کہ ایک حلقہ سا بن کر رنگ و نور کا تیرتا ہوا حلقہ نظر آنے لگا۔ جس شاعر کے پڑھنے کی باری آتی وہ دریائے کے شکارے میں آجاتا، اپنا کلام سناتا اور پھر اپنی جگہ پر چلا جاتا۔ کسی کو محسوس ہی نہ ہوا کہ یہ بزم سطح آب پر تیسر رہی ہے۔"

بزمِ اردو کے دوسرے صدر، پنڈت وشنو ناتھ ماہ منتخب ہوئے تھے۔ جو اردو کے خوش فکر شاعر تھے۔

بزمِ مشاعرہ

جموں کے اہل ذوق اصحاب کی کوششوں سے ۱۵-۱۹۱۷ء میں قائم ہوئی تھی، جس کے آغاز اور تنظیم میں صاحب زادہ محمد عمر شیخ غلام نقشبند سردار وزیر محمد خاں اور شیخ غلام قادر کی مساعی کو بڑا دخل تھا۔ شیخ غلام نقشبند اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے تھے اور اراکین میں میر فرید احمد، جو گلگت میں مددگار رزیدنٹ رہ چکے تھے۔ سردار عالم خان، ملک محی الدین قمر قزازی، غلام علی حسرت، غلام حیدر خاں غوری رموز، پنڈت امر ناتھ شہید اور منشی غلام نبی کپتن

قابل ذکر ہیں۔ اس بزم کے زیر اہتمام چند روزہ مشاعرے منعقد ہوئے تھے اور جنوں کا عجیب گھر مشاعروں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ مشاعروں میں جو غزلیں پڑھی جاتی تھیں، ان کو جگہ ستہ کی صورت میں شائع کرنے کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ ہمارا یہ کی ممانعت اور مخالفت کے باوجود اس بزم نے ایسا وقار قائم کر لیا تھا کہ سرکاری عہدہ دار بھی اس کے مشاعروں اور مجلس انتظامی میں شریک ہوتے تھے۔ بزم کے سرپرستوں میں پنڈت اودے چند گورنر جنوں، پنڈت اقبال کشن داس، انسر خزانہ اور پنڈت بھاری لال بھاکری، سیشن جج شامل تھے ان سب کو اردو زبان اور شاعری سے لگاؤ تھا۔ لیکن یہ بزم بدلتی برس سے زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی اور اس کا سبب حبیب کیفوی نے یہ بتایا ہے کہ اس کے ادائیکوں میں زیادہ تر سرکاری عہدہ دار شامل تھے۔ جن کا تبادلہ ایک مقام سے دوسرے مقام پر ہوتا رہتا تھا۔ چنانچہ صاحب زادہ محمد عمر، سردار وزیر محمد خان جو بزم کے درجہ دوں تھے، خود سرکاری عہدوں پر فائز تھے۔ تاہم ان تین چار برسوں کے اندر بزم کے زیر اہتمام ایسے معرکۃ الکلام مشاعرے منعقد کئے، جن کی یاد دہوں کے دلوں میں باقی رہ گئی۔ ایک یادگار شاعر کا مقولہ اس حال حبیب کیفوی کے مضمون سے اخذ کر کے یہاں درج ہے :

اس میں مشہور شاعر سہا کی جوں میں آمد اور مشاعرہ میں شرکت کا حال بیان کیلئے :

”سہا جنوں کے ایک مشاعرے میں اتفاقاً آ پہنچے۔ یہ مشاعرہ بڑے اہتمام سے عجائب گھر میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں حفیظ جالندھری بھی شریک ہوئے تھے۔ مشاعرے کے دوران جب سامعین کو یہ معلوم ہوا کہ سہا بھی مشاعرے میں موجود ہیں تو ان کی خوشی کی کوئی

انتہا نہ رہی۔ جب ان کے پڑھنے کی باری آئی تو ان کے لئے سیٹج
پر ایک میز رکھا گیا، جس پر کھڑے ہو کر انہوں نے اپنا کلام سنایا۔
اس مشاعرے میں ان کے بعد پھر کسی کا رنگ نہ جما۔۔۔۔۔۔

یہ بزم مشاعرہ اور بزم سخن کے ارائین اور مؤیدین کی آپس میں چشمک پیا ہو گئی
تھی۔ ایک بزم سے متوسل شعراء، دوسری بزم کے سخن دروں کے کلام پر سنا نہ
تنقیدیں لکھتے اور انہیں چھاپ کر گوگوں میں تقسیم کرتے تھے۔ اس طرح کی چشمک
اور اعتبار سے یقیناً نامناسب ہے، لیکن جموں میں اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ
شعراء کو زبان کی درستی، محاورہ اور روزمرہ کی پابندی کا زیادہ خیال رہنے لگا۔
اس طرح محافضوں نے بھی ریاست میں ذوق ادب اور شعراء اور اردو زبان کے
درست استعمال کی سعی میں بڑی مدد دی۔

جموں میں شعر و ادب کے ذوق کی نشوونما کے سلسلے میں اللہ رکھا ساغر کی
کوششوں کو بھی دخل تھا۔ وہ خود خوش فکر شاعر تھے۔ اس کے علاوہ پرجوش
انشاء پرداز بھی تھے۔ اپنی ساعی کو وسیع تر کرنے کے لئے، انہوں نے ایک اخبار
”جمہور“ بھی جاری کیا تھا۔ جو اس زمانے کے قابل اعتنا اخباروں میں شمار ہوتا
تھا۔ اس طرح ساغر خود ایک ادارہ بن گئے تھے۔ اپنے اخبار کے ذریعے سے
وہ نہ صرف اپنے خیالات کو عوام تک پہنچانے کی کوشش کرتے تھے، بلکہ بہت
سے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی ہمت افزائی بھی کرتے رہے لیکن انہیں
جلد ہی گرفتار کر لیا گیا اور اخبار بند کر دیا گیا۔ بعد میں انہوں نے ”جاوید“
بھی نکالنا شروع کیا تھا جو ۱۹۴۷ء تک جاری رہا۔

محرم کی مجالس

ریاست جموں و کشمیر میں اردو کے ذوق کو پھیلانے اور سنوارنے میں، کئی

اور عناصر کا بھی ہاتھ رہا۔ ان میں اداروں کے علاوہ، محرم کی مجلسیں بھی خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ مجلسیں جموں اور کشمیر میں بڑے اہتمام اور سلیقہ سے منعقد کی جاتی تھیں، اور ان میں مرثیہ پڑھنے اور سوز خوانی کے لئے خاص طور پر لکھنؤ سے شاعر اور ذاکر مدعو کئے جاتے تھے۔ یہ مجلسیں خالقانہ پیر بیٹھا میں منعقد ہوتی تھیں اور شہر کے سارے پڑھے لکھے لوگ اور شعردادب کا ذوق رکھنے والے ہندو مسلم اور سکھ حضرات ان میں شرکت کرتے اور نہایت خوشگوار تاثر ساتھ لے جاتے تھے۔ محرم میں پہلے دس دن تک یہ مجلسیں جاری رہتیں۔ ان مجلسوں کا جو اثر لوگوں پر پڑتا ہے۔ وہ مذہب سے زیادہ شعری اور ادبی ہوتا۔ چنانچہ مرثیوں کے بند، اشعار اور مصرع زبان زمر ہو جاتے تھے۔ یہ تاثر، صلاحیت رکھنے والے اصحاب کو خود شعر کہنے پر ابھارتا تھا۔

ناٹک کمپنیاں

ناٹک کمپنیاں تجارتی ادارے رہے ہیں۔ لیکن ان کے کام کا ایک تہذیبی اور ادبی پہلو بھی ہے۔ اہل جموں کے ذوق و شوق کی بدولت، اکثر پارسی ناٹک کمپنیوں کو بار بار واپس آنے اور اپنے تماشے پیش کرنے کی خواہش رہتی تھی ان تماشوں میں غوام اور خواہس بڑے شوق سے شریک ہوتے اور اس وسیلے سے بھی ان کے ذوق شعردادب کی آبیاری ہوتی اور وہ پروان چڑھتا۔ یہ ایک معنی خیز بات ہے کہ اردو میں ناٹک، ڈراما اور ایسٹج کے موضوع پر سب سے پہلی یادگار تصنیف ”ناٹک ساگر“ جموں کے ہی کے دو صاحب ذوق اہل قلم، محمد عمر اور نور الہی کی کاوشوں کا نتیجہ تھی۔

صحافت

گزشتہ باب میں 'ریاست کے پڑیے' لکے عوام کے اخبار جاری کرنے کی خواہش اور مطالبے کو نظر انداز کر کے، مہاراجہ رنبیر سنگھ کی حکومت کی بنیاد پر ایک سرکاری اخبار "پدیا بلاس" ہفتہ وار کے اجراء کا تذکرہ کیا جا چکا ہے اور ان اخباروں کا بھی ذکر کیا جا چکا ہے جو عوامی مطالبے اور ان کی ضرورتوں کی تکمیل کے مقصد سے ریاست کے باشندے باہر جا کر لاہور یا امرتسر سے جاری کرتے تھے۔ اور مہاراجہ کے نظم و نسق پر تنقید کرنے کے مواقع فراہم کر لیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ اس دور میں بھی جاری رہا۔ چنانچہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے ابتدائی دور میں لاہور سے بابو غلام محمد نے "آئینہ ہند" کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار ۱۸۷۵ء میں جاری کیا تھا۔ اور اس میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ اور ان کے نظم و نسق پر تنقید کی جاتی تھی۔ ایک اور اخبار "ہمدرد" ۱۸۹۳ء میں جاری ہوا تھا۔ اور اس کا مقصد مہاراجہ کے خلاف تنقیدوں کا جواب دینا تھا لیکن اس میں زیادہ تر اشخاص کو چین کران کے خلاف لکھا جاتا تھا۔ یہ طریقہ ریاست کے اکثر صحیفہ نگاروں کا رہا۔ چنانچہ پنڈت ہرگوپال کول خستہ اور پنڈت ساگر رام سنگھ کا بھی یہی طریقہ رہا۔ "کیشور پرکاش" ماہنامہ تھا جسے ۱۸۹۸ء سے پنڈت منکایشور سنگھ لاہور سے لکھتے تھے۔ "کشمیر دین" سرتیج بہادر پردی کی ادارت میں الہ آباد سے ۱۸۹۸ء سے لکھنے لگا تھا اور ۱۹۰۴ء تک جاری رہا۔ یہ ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ سرتیج بہادر کے علم و فن اور سیاسی صداقت شعاری نے اس کے لب و لہجہ کو بہت بلند کر دیا تھا۔ اسی سنہ میں پنڈت ہرگوپال خستہ نے "اخبار شمالی" کے نام سے راولپنڈی سے ایک ہفتہ وار جاری کیا جو دو سال بعد بند ہو گیا۔

پنڈت گوپی ناتھ گھڑوٹے جو پہلے "بدیا بلاس" کے ادیٹر تھے اس کے مندر ہونے کے بعد انہوں نے "اخبار عام" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا تھا جسے ان کے فرزند پنڈت بال کرشن گھڑوٹے ترتیب دیتے تھے۔ یہ اخبار ۱۹۲۸ء تک جاری رہا۔

بیسویں صدی کے اوائل کے اخباروں میں "راجپوت گزٹ" "گلشن کشمیر" پنجہ فولاد" "کشمیری گزٹ" "کشمیری مخزن" اور "کشمیری میگزین" قابل ذکر ہیں۔ یہ سب ہفتہ وار اخبار تھے۔ "راجپوت گزٹ" لاہور سے ۱۹۰۰ء میں شٹا کر سکھ رام چیلان

نکلانے لگے تھے اور کشمیر کے معاملات پر لکھتے تھے۔ کچھ عرصہ اس کے مدیر پنڈت راج نرائن ارمان بھی رہے۔ یہ اخبار ۱۹۲۷ء تک جاری رہا۔ "گلشن کشمیر" ۱۹۰۱ء میں مولانا تاج الدین احمد تاج لاہور سے نکالنے لگے تھے۔ کچھ عرصہ جاری رہنے کے بعد

یہ کبھی مسدود ہو گیا۔ اسی زمانے میں محمد الدین فرقہ بحیثیت صحیفہ نگار منظر عام پر آئے اور سب سے پہلے اپنا ہفتہ وار "پنجہ فولاد" لاہور سے ۱۹۰۱ء میں جاری کیا۔ اور اس کو کشمیر کے ساری تک محدود کر دیا۔ یہ اخبار ۱۹۰۶ء میں بند ہو گیا۔ ۱۹۰۷ء سے ایک سال پہلے خواجہ کمال الدین مسلم مبلغ انگلستان کے ساتھ مل کر انہوں نے ماہنامہ "کشمیری مخزن" جاری کیا تھا۔ بعد میں جب خود اس کو نکالنے کے تو اس کا نام "کشمیری میگزین" رکھا تھا۔

پنڈت دیا کرشن گھڑوٹے جن کے ایک مضمون کا حوالہ گذر چکا ہے، سری پرتاپ سنگھ کے عہد میں، اُردو کی ترقی کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

مہاراجہ شری پرتاپ سنگھ جی کے عہد حکومت میں دفتری زبان اُردو قرار دی گئی، ڈوگری زبان کا ٹائپ اور فونڈری فروخت کر دی گئی اور اس زمانے میں اُردو کتابیں طبع ہونا شروع ہوئیں اور اس طرح ڈوگری استعرت اور فارسی کا دور اختتام پذیر ہوا۔ مہاراجہ

پرتاب سنگھ جی کے عہد حکومت میں چچا پخانہ کا نام بھی تبدیل ہو گیا، نیا نام زمبیر پرکاٹا، برقی پریس رکھنا تجویز ہوا۔ انیس تبدیل قدرت کا ایک۔ اٹل قانون ہے۔ ہمارا جہ پرتاب سنگھ جی کے عہد حکومت میں ان تینوں زبانوں کی ترقی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

اہل کشمیر کی صحافتی جدوجہد کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سب سے پہلے کشمیری پینڈتوں کو اپنے مفاد کی حفاظت یا عوامی رائے کو منظم کرنے کے مقصد سے اخبار جاری کرنے کی خواہش پیدا ہوئی ہے اور اس کا سبب ان میں مغربی تعلیم کا پہلے رواج تھا۔ ڈوگم راجا بھی بعض وقت ان سے کام لیتے رہے۔ چنانچہ ہمارا جہ پرتاب سنگھ کی معزولیت کے زمانہ میں پینڈت ہرگوپال خستہ اور پینڈت ساگر رام سالک کی صحافتی سرگرمیاں راجہ کے مفاد کے لئے رہی۔ سالک رام جب پرتاب سنگھ سے کسی بات پر ناراض ہو گئے یا ان کی وہ توقعات پوری نہ ہو گئے، جو انہوں نے اس خدمت کے مفاد کے طور پر قائم کر رکھے تھے تو پھر وہ ہمارا جہ کی مخالفت پر اتر آئے تھے اور اس کی طرف اپنا ایک نظم میں اشارہ بھی کیا ہے کہ ہمارا جہ کے کہنے سے انہوں نے یہ غدرات انجام دیں۔

ان حالات نے مسلمانوں کو بھی چوکنا اور بیدار کیا اور اس میں محمد الیزہ فوق کا بڑا حصہ رہا۔ چنانچہ اس صدی کے درمیان کے دوران مسلمانوں نے بھی کئی ہفتہ جاری کئے۔ اخبار ہفتہ وار اس لئے نکالے جاتے تھے کہ وہ ہر چھتے تھے۔ گوان کی ترتیب جموں یا کشمیر میں عمل میں آتی تھی۔ ان کے ریاست میں پہنچنے تک خبریں پرانی ہوجاتیں۔ اس کے علاوہ اخبار فریقے کے مفاد کے لئے

یا اپنے ذاتی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے نکالے جاتے تھے۔ اس لئے ہفتہ وار ہی اس کے لئے موزوں تھے۔ پھر بھی یہ ہوتا تھا کہ وہ پابندی سے نہیں نکلتے تھے اور اکثر مقصد حاصل ہو جاتے یا اس کے لئے سعی کا موقع گزر جانے کے بعد، بند ہو جاتے یا طویل وقفوں کے بعد پھپھتے تھے۔

مذکورہ بالا اخباروں میں "کثیر"، "انقلاب"، "کثیر مسلمان"، "مظلوم کثیر"، "مکتوب کثیر" قابل ذکر ہیں۔ "کثیر" ہفتہ وار اترسے ۱۹۲۲ء میں جاری ہوا تھا۔ اس کے مدیر خواجہ غلام محی الدین تھے۔ یہ ۱۹۲۷ء تک جاری رہا۔ "کثیر مسلمان"، "مظلوم کثیر" اور "مکتوب کثیر" لاہور سے جاری ہوئے تھے۔ "انقلاب" ۱۹۲۹ء میں جاری ہوا۔ یہ کثیر میں ذمہ دار حکومت قائم کرنے کے لئے مسائل جماعت احرار کا ترجمان تھا۔ یہ ۱۹۳۱ء میں بند کر دیا گیا۔ اصل میں مذکورہ بالا سب اخباروں کا ایک سلسلہ ہے اور ان کو حکومت جب بند کر دیتی، تو ان کی جگہ دوسرا اخبار جاری ہوتا۔ لیکن انتظام پرانا ہی برقرار رہتا۔ یہ جدوجہد زیادہ تر مہاراجہ ہری سنگھ کے زمانے میں جاری رہی۔ اس لئے ان اخباروں کی مزید تفصیل آئندہ باب میں دی جا رہی ہے۔

محمد الدین فوق نے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے اس صدی کے اوائل سے جو جدوجہد شروع کی تھی، اس کی طرف مجمل اشارہ اوپر کیا گیا ہے۔ "پنجہ نرلاہ مسلمانوں کے، سیاسی، سماجی اور معاشی مفاد کا علمبردار تھا اور ان موضوعات پر فوق کے علاوہ ان کے چچا منشی غلام محمد خادم اور بھائی رحیم بخش لکھا کرتے تھے۔ ماہنامہ "کثیر میگزین" جو ۱۹۰۶ء میں فوق اور خواجہ کمال الدین مبلغ اسلام، انگلستان کی مشترکہ ادارت میں لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ اخبار میں نوگرا راج کے تحت مسلمانوں کی زبوں حالی کو پیش منظر میں لایا جاتا تھا۔ اس کے

۲۶۳

اغراض و مقاصد میں حسب ذیل شامل تھے :

- ۱۔ برادران قوم میں اتفاق، یکسو جہتی اور ہمدردی پیدا کرنا۔
- ۲۔ شادی اور غمی کے رسمیات میں اصلاح کرنا۔
- ۳۔ باہمی خصوصیات کا آپس میں بذریعہ ثالثی فیصلہ کرنا۔
- ۴۔ صنعت و حرفت اور تجارت کی طرف مائل کرنا۔
- ۵۔ بزرگان قوم کے حالات شایع کرنا۔
- ۶۔ قوم کے ہونہار لڑکوں کی تعلیم و تربیت پر زور دینا۔
- ۷۔ قومی خبریں اور دلچسپ اخلاقی و تواریخی اور علمی مضامین بذریعہ نظم و نشر پیش کرنا۔

”کشمیری میگزین“ کو ۱۹۱۲ء میں ہفتہ وار ”کشمیر“ اخبار ”کشمیر“ نام مجوز ہوا۔ اس کے اغراض و مقاصد بھی وہی تھے۔ جو ”کشمیری میگزین“ کے تھے، لیکن اس میں مضامین کی بجائے خبروں اور خبروں پر تبصرہ پر زور دیا جاتا تھا۔ یہ اخبار ۱۹۰۵ء تک جاری رہا۔

پنڈت اہل قلم نے ایک ماہ نامہ ۱۹۱۴ء میں ”سفیر کشمیر“ کے نام سے جاری کیا تھا، جس کے مدیر پنڈت تلچھی نرائن کول تھے اور اس میں پنڈتوں کے مفاد اور ان کی دلچسپی کے مضامین شایع ہوتے تھے۔ ۱۹۱۶ء میں یہ رسالہ بند ہو گیا اور پنڈت تلچھی نرائن کول اور پنڈت دینا ناتھ چکن مست کی مشترکہ ادارت میں ایک اور ماہ نامہ ”صحیح کشمیر“ کے نام سے جاری کیا گیا۔ یہ رسالہ بھی کچھ عرصہ جاری رہنے کے بعد بند ہو گیا۔

پنڈتوں کے اخباروں اور رسالوں کے مقابلے میں جنوں کے ڈوگروں کی جانب سے بھی کئی رسالے اور اخبار نکالے گئے۔ ان میں سب سے پہلا رسالہ ”مہا جن پتھر پکا“

۲۶۳

۱۹۱۱-۱۲ء میں جاری کیا گیا تھا۔ یہ رسالہ اور "ڈوگرہ گزٹ" دونوں لالہ ہنسراج
مہاجن کی ادارت میں نکلتے تھے۔ "ڈوگرہ گزٹ" ۱۹۱۱ء میں جاری ہوا تھا اور اس
کے پہلے ایڈیٹر پنڈت لکھی چند سنگوتہ تھے۔ اور اسے مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی
سرپرستی حاصل تھی۔ چنانچہ اس کے نمبر ۱۹۱۱ء کے شمارہ کے سرورق پر یہ عبارت
درج ہے جو عموماً ہر رسالے میں شائع ہوتی تھی۔

"یہ رسالہ ماہراری زیر سایہ سرکاری مدار دائم اقبالہ
دھرم مورت مہاراجہ صاحب بہادر سر پرتاپ سنگھ جی ہی۔ میں
آئی۔ والی جوں کو شیردہت شائع ہوتا ہے۔"

اس تعلق سے ظاہر ہے کہ اس میں عام طور پر ڈوگرہ اور خاص طور پر مہاراجہ کے
مفاد کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ رسالہ سرکاری پریس میں چھپتا تھا اور اس
میں مام علی اور ادبی مضامین کے علاوہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ اور ان کے عہدیداروں
کی توصیف کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ کچھ قیصدے بھی اس میں شائع
ہوتے ہیں۔ مہاراجہ کے دربار سے اس رسالے کی مالی اعانت کبھی کی جاتی تھی۔ اس
کے مضامین اور زبان کی نوعیت کا اندازہ مذکورہ بالا شمارے کے حسب ذیل
عنوانات سے ہو سکے گا :

"عورت کمزور ہے یا مرد (ایڈیٹریل)۔ فنان سیٹاجی
(نظم) طالب علم کے خرافے۔ "مید عشر"۔ کبیر شراب
میلہ چٹری، اشتہاری ٹیکوں کا کچا چٹھا۔

کشمیر سے باہر

گزشتہ صفحات میں سیالکوٹ اور اپنی کشمیر کے تعلق پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ ہماری صدی کے عظیم ترین شاعر اقبالؒ اسی سرزمین سے اُٹھے تھے۔ لیکن اقبالؒ کشمیر کے تعلق سے جتنے عظیم شاعر اور عالم ہیں، عام تاریخ ادب اردو کا بھی وہ ایک اہم باب ہیں۔ تاریخ ادب سے جڑ کر ان کی فکر و فکر کی عظمت اور گونا گونی اور اس کے علمی پہلوؤں کی وجہ سے ان کے بارے میں نہ صرف اردو بلکہ فارسی، انگریزی، عربی اور یورپ کی کئی زبانوں میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اقبالؒ اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ان کا سلسلہ کشمیری پندتوں کے خاندان تک پہنچتا ہے۔ یہ خاندان بہت عرصہ پہلے اسلام قبول کر چکا تھا۔ ان کی ولادت سیالکوٹ ہی میں ۱۸۷۵ء میں ہوئی تھی۔ والد شیخ نور محمد، ایک مدرسیہ بزرگ تھے جن کے دادا کشمیر کے سپرد خاندان سے تھے۔ ابتدائی تعلیم سیالکوٹ ہی کے ایک مکتبہ میں حاصل کی۔ اسکالرشپ کا لالچ بھی ان کی تعلیم ہوئی۔ تعلیم کے لئے وہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں داخل ہوئے، جہاں انہیں پروفیسر آرنالڈ کرسٹ گری کے مواقع نصیب ہوئے۔ پروفیسر آرنالڈ فلسفہ کے استاد تھے اور ام۔ اے۔ اد کالج میں قیام کے زمانے میں شبلی سے ان کے اچھے مراسم ہو گئے تھے۔ اردان سے نرئی بھی پڑھی تھی۔ آرنالڈ نے اقبالؒ پر جو گہرے اثرات پھیرے تھے، ان کا کچھ اندازہ ان کی نظم "نالہ فراق" سے ہوتا ہے جو آرنالڈ کی انگلستان سے اقبالؒ کے بین ولادت کے سلسلے میں ۱۸۷۹ء اور ۱۸۸۰ء کا ذکر ہوتا ہے لیکن ۱۸۷۵ء سے ۱۸۷۹ء کا اضافہ ہے۔

کو رونا لگی کے موقع پر لکھی گئی تھی۔

اقبال نے بھی اپنے عہد کی روایت کے مطابق شاعری غزل سے شروع کی تھی اور سب سے پہلے وہ شمس العلماء سید میر حسن اور مرزا ارشد گورگانی سے مشورہ کرتے رہے۔ اسی زمانے میں غزل کے استاد الاساتذہ «آرغے» بھی انہوں نے رجوع کیا جو حیدر آباد میں تھے۔ لیکن یہ اقبال کی ابتدائی محنت کا زمانہ تھا۔ شعر کے فن پر دسترس حاصل ہو جانے کے بعد ان کی حوصلہ مندی کے لئے ان اساتذہ کی شاعری میں کوئی بات ایسی نہیں تھی، جو اس طرز شاعری سے ان کی دوامی وابستگی کا باعث ثابت ہوئی۔ اقبال کی شاعری میں نیا موڑ اس وقت آیا، جب وہ غالب کی شاعری سے روشناس ہوئے۔ یہی آئندہ ان کی عظیم شاعری کی بنیاد ثابت ہوئی۔

اقبال بنیادی طور پر قوم پرست اور وطن پرست شاعر تھے۔ چنانچہ ابتدا میں بہت سی نفیس قومی اور وطنی نظمیں لکھیں۔ لیکن ان کے ارتقاء کے ساتھ، ان کے حب وطن اور ان کی قوم پرستی، فلسفیانہ تعقل پسندی کی بنیاد پر تلاش کرنے لگی۔ اصل میں ان کا ابتدائی قومی اور وطنی تصور، یورپ کی مخصوص فکر کا نتیجہ تھا۔ یورپ میں قیام کے زمانے میں اس تنگ نظرانہ تصور کی خامیاں انہیں شدت کے ساتھ محسوس ہونے لگیں اور وہ انسانی برادری کی تنظیم اور خوش حالی کے لئے بہتر اور روحانی بنیادوں کی ٹوہ میں لگ گئے۔ یہ بنیادیں انہیں اسلامی عالمی برادری میں نظر آئیں جس کی توضیح اور تشریح کے لئے انہوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو وقف کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے جو کچھ لکھا اس میں ایک عالمی اپیل مضمر ہے۔ اسی لئے ان کی فکر کے گوشوں کی چھان بین یورپی مفکرین کو دعوتِ عمل دینے لگی۔ اس پہلو سے اقبال کا شمار

دنیل کے عظیم مغکشاؤں میں ہوتا ہے۔

اقبال کو کشمیر کے ساتھ نسلی ربط کے علاوہ گہرا ذہنی ربط بھی رہا جہاں وہ کشمیر کے فطری مناظر کے حسن اور ان کی رعنائی کے تحت گتے ہیں، اپنی کشمیر کی مظلومی اور بے بسی پر بھی آنسو بہاتے ہیں۔ کشمیر کے حسن کو دیکھنے میں ان کی ژرف بین نظریں، عام شاعروں کے روایتی انداز سے متاثر نہیں ہوئیں چنانچہ کشمیر کے حسن کے روایتی موضوعات، گارگ، پہل گام، ڈل یا ڈلر پر انہوں نے کوئی نظم نہیں لکھی بلکہ کشمیر کی حقیقی زندگی اور اہل کشمیر کے بعض بنیادی مسائل، ان کی توجہ کا مرکز رہے جیسے ان کے حسنِ فطرت اور ان کی ذہانت کے باوجود، ان کی سیاسی بے چارگی اور سماجی داناہنگی پر اقبال کا دل کڑھتا ہے۔ چنانچہ ان کی مشہور فارسی نظم کا یہ مصرعہ "قوسِ فردختند و چہ ارزاں فردختند" زبانِ زہدِ دیگیا ہے جس سے انگریزوں کے گلابِ سنگھ کے ہاتھ کشمیر کے بیع و شرعائے کے قابلِ نفیر، معائنے کے بارے میں ان کی گہری دلسوزی ظاہر ہوتی ہے۔ حسنِ مناظر کی تلاش کے لئے ان کی نظریں لولاب جیسے حسین گوشوں اور ان کے حسنِ ددشیزہ کی طرف جاتی ہیں اور ایسے رصع شعر نکلتے ہیں:

پانی ترے چشموں کا ٹپتا ہوا سیما ہے اے وادیِ لولاب

اس عہد کے سربراہِ آردو ادیبوں میں جن کا کشمیر سے تعلق تھا لیکن وہ کشمیر سے باہر رہ کر لکھتے تھے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کا درجہ بہت بلند ہے انہوں نے آردو داستان کو ایک نیا موڑ عطا کیا اور نادل کے موجد بنے۔ سرشار لکھنؤ ہی رہے اور حیدر آباد میں ان کی زندگی کے آخری ایام بسر ہوئے، لیکن کشمیر کے اور بہت سے مشاہیر کی طرح، کشمیر سے ان کی وابستگی برقرار رہی، بلکہ ذہنی طور پر وہ کشمیر

کی زندگی اور سیاسی اور ادبی تحریکوں کے ساتھ رہے۔ لکھنویا اور مقامات میں کشمیر سے متعلق جو تحریک اٹھتی، وہ اس میں حصہ لیتے۔ رشی پیر، کشمیر کے ایک بزرگ گزے ہیں، جن کا آستان، مسلمانوں اور ہندوؤں، دونوں کا مرکز بنا رہا۔ اور اب انتقال کے بعد بھی ان کا مزار زیارت گاہ انا ہے۔ سرشار کو ان سے جس قدر عقیدت تھی اس کا اندازہ ذیل کی رباعی سے ہو سکے گا۔

مداح جناب رشی پیر آیا ہے وصف شد عرش سر بر آیا ہے
خوشید کی آنکھ کیوں نہ بھیکے سرشار ہاں ذرہ خاک کا شیر آیا ہے
رشی پیر، اہل کشمیر کی بول چال میں محض "رشی پیر" ہو جاتا ہے۔

ایک کشمیری کا نفرنس کے لئے انہوں نے جو قصیدہ لکھا تھا۔ اس کے دو شعر ہیں :-

نہ آب و تاب وہ اگلی سہی ہے نہ وہ رنگ و روپ

نہ ہیں وہ شاہد مضمون کے پھول سے رخسار

کمال کے لئے لازم جو ہے زوال ضرور

اب قطرہ ہے، پہلے تھا، قلزم ذخار

ان اشعار میں اپنے آخری زمانے تصویر پیش کی ہے۔ "فسانہ آزاد" کے ایک کردار کی زبانی انہوں نے کشمیری کے شعر بھی کہلوئے ہیں۔

سرشار پنڈت بیج ناتھ در کے فرزند تھے، لکھنویں پیدا ہوئے اور

مشہور استاد سخن منشی مظفر علی اسیر سے مشورہ سخن کیا۔ داستان کا انہیں شوق تھا۔

اور با محاورہ اردو زبان سے انہیں عشق۔ اسی عشق نے انہیں لکھنؤ کے شرفاء

کے گھرانوں میں بیٹھ کر، زبان اور اس کے حسن، اظہار پر قابو حاصل کرنے پر

مایل کیا تھا۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد، اودھ اخبار سے منسلک ہو گئے تھے۔ جس میں

لکھنے کی ذمہ داری نے ان سے "فائدہ آزاد" جیسا شاہکار تصنیف کر دیا۔ "اودھ پنچ" اودھ اخبار کا مقابل تھا، جس کے شاہسیر لکھنے والوں میں اکبر الہ آبادی، ترہوڑ ناتھ مرزا لکھو بیگ ستم ظریف اور خود اس کے اڈیٹر جیسی سجاد حسین اپنے عہد کے سربراہ اودھ مزاج نگار تھے۔ سرشار اپنی ذہنی صلاحیتوں کی بدولت ان سب کے مقابل ثابت ہوئے۔

آغا حشر کاشمیری جنہوں نے خاص طور پر پارسی ناولنگ کمپنیوں کے لئے ڈرامے لکھ کر بڑی شہرت حاصل کی اور اپنے زمانے کے عوام کے مذاق کے مطابق ڈرامے عطا کر کے، ان کمپنیوں کو مقبول بنانے میں حصہ لیا، اپنے اعلان اور اصل دونوں اعتبار سے کاشمیری تھے۔ ان کے والد سید غنی شاہ شال کا کاروبار کرتے تھے اور سری نگر سے ۱۸۶۸ء میں ہندوستان چلے گئے تھے۔ آغا حشر، جن کا اصلی نام آغا محمد شاہ تھا، غالباً غنی شاہ کے بنارس میں قیام کے زمانے میں ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔ شعرو سخن کا مذاق ابتداء سے تھا۔ لیکن ڈراما سے بھی انہیں ابتداء سے لگاؤ رہا تھا۔ اسی کی پیش رفت میں ڈرامے لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ لیکن جب وہ ناولنگ کمپنیوں کی خاطر لکھنے لگے تو ان کے ڈراموں کا وہ خاص انداز متعین ہوا جو ان سے پہلے کے کچھ لکھنے والوں نے اختیار کیا تھا۔ ان میں طالب بنارسی، احسن لکھنوی راج بنارسی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سرتیج بہادر سپرد کا مذکورہ برجستہ ادیب یا مصنف کے نہیں بلکہ اس لئے فردری ہے کہ کشمیر کے ایک عظیم فرزند ہونے کے ناطے، جسے اردو سے بحیثیت زبان کے، اس کی وسیع صلاحیتوں اور اس کے ہمہ گیر مزاج کے امکانات سے جیسی واقفیت تھی۔ بانی فورٹ ولیم کالج، ڈاکٹر جان گلکرسٹ کو چھوڑ کر

شاید ہی کسی اور کو ہوگی۔ اُردو کے حق کو منوانے میں انہوں نے جو سعی کی وہ ان
 کے کسی اور مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں بلکہ خود مقصد تھی۔ اسی لئے انجن ترقی
 اُردو غیر منقسمہ ہند کے وہ سالہا سال تک صدر رہے۔ سر سپرو اُردو کے عالم اور
 بڑے اچھے مقرر بھی تھے۔ ان کی مشہور تقریر جس میں انہوں نے یہ تاریخی اعلان
 کیا تھا کہ اُردو ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ اور ناقابل تقسیم میراث ہے کشمیر ہی
 میں اور سری پرنپ کا لچ کے پلاٹ فارم پر ہوئی تھی۔ یہ اعلان الہامی ثابت ہوا چنانچہ
 ملک تقسیم ہو گیا، لیکن اُردو تقسیم نہ ہو سکی۔

کشمیر سے سر سپرو کے سرکاری ربط سے قطع نظر، اہل کشمیر اور اُردو
 سے ان کے گہرے ربط کی نشانی، ان کا رسالہ "کشمیر درپن" بھی تھا۔ جس میں کشمیر
 اور اہل کشمیر کی دلچسپی اور فلاح و بہبودی کے مضامین اور نظمیں شایع ہوتی
 رہیں۔

کشمیر کے اُردو دوستوں اور ہمدردوں میں مولانا علیم الدین ساکن بھی ایک
 ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ وہ بھی حب نسب کے کشمیری تھے۔ لیکن اقبال اور فوق کے
 مانند پنجاب میں رہتے تھے۔ انہیں اپنے کشمیری ہونے پر فخر تھا اور انہوں نے کشمیر کی
 ثقافت و تاریخ پر بڑے اہم مضامین لکھے۔ جن میں سر کے حیدر علی کے بار میں ان کا وہ
 مضمون مشہور ہوا جس میں انہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ بنیادی طور کشمیری تھے۔ علم الدین لکے
 ۱۹۳۰ء سے کشمیر آتے رہے اور یہاں کی بیداری کی تحریک سے منسلک رہے۔ وہ یہاں آکر مولود
 شریف کی مجلسوں میں دینی اور تاریخی موضوعات پر نہایت عالمانہ تقریریں کرتے اور
 لوگوں کا دل گولتے تھے۔ وہ کشمیر کے کو ایف کی لاہور کے اخباروں میں شہیر کراتے
 رہے۔ حبیب کیفوی کے بیان کے مطابق تحریک کشمیر کے سلسلے میں وہ لاہور کی دیوار

پر اپنے ہاتھوں سے پوسٹر چپان کرتے تھے۔ سری نگر کے قیام میں وہ انگریزوں کے
 علمی محفلوں کی مجال ہوتے۔ انہوں نے انارکلی کے زندہ دیوار میں پھولے بجانے کے
 مفروضے کو مسکت تواریخی دلائل سے باطل ثابت کر دیا۔ مولانا کا انتقال ۱۳۴۷ھ
 میں لاہور میں ہوا۔

نیا عہد، نئی تحریکیں

اس صدی کے اوائل میں 'ہندوستان کے اور بھوتوں میں نئے عہد کی جو شروعات ہو چکی تھیں، ان کا اثر اس دور افتادہ ریاست میں مطلق العنان شخصی اقتدار کے دباؤ اور بندشوں کی وجہ سے کوئی ربع صدی بعدِ خصوصاً ہونے لگا اور اس میں انگریز عہدہ داروں کی مداخلت کا بڑا حصہ تھا۔ ہمارا جہ ہری سنگھ جن کے عنانِ حکومت سنبھالنے کے زمانے سے یہ دور کم و بیش مطابقت رکھتا ہے، 'نئی تہذیب' — فی الجملہ مستفید تھے اور ہندوستان میں جو سیاسی شعور پروش پاتا تھا اور جو ثقافتی تحریکیں برپا تھیں، اس سے غافل نہیں تھے۔ تاہم کچھ تو ڈوگراراج کی جاگیردارانہ روایات ان کے ہاتھ پیر یا منہ سے ہوئے تھیں۔ اور کچھ یہ بھی تھا کہ رعایا کے بعض طبقے، کسی طرح کی جمہوری اصلاحات کو اپنے مفاد کے متافی دیکھتے اور ان کی راہ میں حائل آتے تھے۔ اس کے باوجود وہ زمانے کی رفتار کو نہ تو روک سکتے تھے اور نہ اس کو پیچھے کی طرف لوٹانے پر قدرت رکھتے تھے۔ انگریزی تعلیم کی اشاعت اور ریلوے کے باہر کے سوالات آگے اور مغربی طرز زندگی اور اس کے سیاسی، سماجی اور ادبی اداروں سے ملتی اور ذہنی مناسک کے نتیجے کے طور پر پڑے، رکھے فوجیوں میں نئی زندگی کی انگلیں کر دیں لے رہی تھیں، دایک عیاشی دور ہو رہا تھا۔ اس نئے شعور کو عام کرنے میں نئی تعلیم اور وسیع تر ذہنی ربط کے علاوہ رسالوں کا زور رہتا

اشاعت کو بھی دخل تھا۔ ریاست سے اخبار جاری کرنے کی کوششیں جو انیسویں صدی کے وسط سے ہو رہی تھیں، ان کے عملی صورت اختیار کرنے کا موقع اس صدی کے ربعِ اول میں نصیب ہوا، جیسا کہ اس باب کے آخری جیتے میں اخباروں کے اجراء اور صحافتی مساعی کی تفصیلات پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوگا۔ غرض ریاست کے اطراف کی متحرک اور ترقی پسند زندگی کے درمیان، یہ ریاست، 'قرونِ وسطیٰ' کی جاگیردارانہ روایات کو سینے سے چمٹائے اور ایک موجِ سمندر کے بچ میں ساکت و صامت ٹھہرے ہوئے رہ سکتی تھی۔

۱۹۲۴ء میں ہمارا برہنہری سنگھ نے عنوانِ حکومتِ پنجالی۔ پچھلے سو پلوں سو برس تک حکومت کی روایات اس خاندان میں جاری و ساری رہنے کی وجہ سے، برہنہری سنگھ جہانپانی کے اولیٰب سے اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ چنانچہ گدنی پر بیٹھنے سے کچھ پہلے انہوں نے بعض عوامی تحریکوں میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا تھا اور جو گونا گوں مسائل خاص طور پر ریاست کے سامنے تھے، انہیں سلجھانے کے لئے وسیع نظری سے بھی کام لینا چاہا۔ اس کے باوجود یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ وہ ایک ایسی ریاست کے سربراہ تھے، جس کی رعایا میں میٹرنسلی، مذہبی اور تہذیبی گروہ تھے۔ وہ اپنے فقیہوں لگاؤ کے تحت ان مسائل پر جو معمولی انداز میں سوچنے سے قاصر رہے۔ خاندان سے حکومت کے تسلسل کے سبب سے ان کی فطرتاً امداد پسندی کی ذہنیت موجود تھی، تاہم سبب وہ مناسب سمجھتے، حوصلہ مندی بھی دکھاتے۔ لیکن یہ محدود حوصلہ مندی ان کے آگے کے پیچ و پڑج مسائل سے نبڑنا نہیں ہو سکتی تھی ایسی لئے ان کا لئے بہتر سے آگے بڑھنے کا اقدام بہت زیادہ کامیاب نہیں رہا۔

ان حالات میں ان کی حکمتِ عملی ریاست کی اکثریت کے بعض اور ترقی پسند اندازِ نظر رکھنے والوں کے لئے تشفی کا باعث نہیں ہو سکی۔ چنانچہ ان کے عہد میں ذمہ دار حکومت کی تحریک زور پکڑنے لگی۔ ان تحریکوں کو مدد دیتے ہیں، ان کے بعض رجعت پسند وزیروں اور ناعاقبت اندیش مشیرین کا

یہی جھٹکا۔ جو بہار اور عوامی مطالبات کو قبول کرنے کے خلاف مشورہ دیتے تھے۔ اور جبراً استبداد سے ان تحریکوں کو کچل دینے پر انہیں ابھارتے تھے۔ نظم و نسق کو جمہوری بنیادوں پر قائم کرنے میں ناکامی کے سبب بغاوت کے جذبات بھی دلوں میں پرورش پانے لگے تھے۔ اسی ماحول نے مسیحیل کے قائدین شیخ محمد عبداللہ، مرزا محمد افضل بیگ، مولانا محمد سعید مسعودی، بخشی غلام محمد، چودھری غلام عباس، خواجہ غلام محمد صادق، بیرم ناٹھ بزاز اور کچھ اور سیاسی کارکنوں کو ابھارا، جو اپنی تعلیم و تربیت کی بدولت جہاں پانی کے لئے اہولوں سے روشناس تھے اور جب یہ میدان میں آئے تو انہیں انگریزوں کے شکنجے میں پھنسا گیا۔ اجڑا تحریک دراصل اسی استبداد کا نتیجہ تھی، جس نے ڈوگر اقبہ حکومت کے در و دیوار بٹا دیئے۔ ریاست کے اندر ان تحریکوں پر پابندی کے سبب، ان کو متحدہ طاقتوں میں منظم کیا جاتا، اور جب اس کے کارکن ریاست میں داخل ہوتے تو انہیں گرفتار کر کے جیلوں میں ٹھونس دیا جاتا۔ یہ ساری تفصیلات جناب خواجہ غلام محمد صادق نے اپنے کتابچے "کشمیر چھوڑو" میں بڑی وضاحت سے درج کی ہیں۔

بخشی غلام محمد اور خواجہ غلام محمد صادق اور تحریک آزادی کے کئی خلیفے کارکن، حکومت کی دار و گیر سے بچنے کے لئے لاہور چلے گئے تھے اور وہاں کے عوامی اخباروں سے ربط پیدا کر کے، یا خود اپنے اخبار جلدی کر کے تحریک کو چلانے میں کامیاب ہوئے۔ حکومت کی سخت گیریوں کے خلاف روزنامہ "انقلاب" میں کئی مضامین شائع ہوتے رہے جس کی وجہ سے ریاست میں اس کا داخلہ بند کر دیا گیا۔ اس اخبار کی بجائے ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۱ء تک کئی ہفت روزے جاری کئے گئے، جن میں "کشمیری مسلمان"، "مظلوم کشمیر"، "کتوب کشمیر" قابل ذکر ہیں۔ جب صورت حال قابو سے باہر ہونے لگی حکومت نے گلانی کمیشن قائم کیا۔ تاکہ شکایتوں کا جائزہ لے اور سفارشات تیار کرے۔ اس کمیشن کی سفارشات کی بنیاد پر کچھ اصلاحات نافذ کئے گئے، جو ریاست کے کشمیری طبقے کے لئے قابل قبول تھیں۔ اس کے متعلق مرتبہ کے دیباچہ کو دیکھیے۔

نہیں تھے۔

اخبارات کی اجرائی کو منوانا بھی اس عوامی جدوجہد کا ایک نتیجہ تھا، چنانچہ ہمارے
کو اخبار کی اجرائی کی اجازت دینے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس کے بعد ریاست کے عوام کو اپنی شکایات
اور مطالبات حکومت کے سامنے پیش کرتے گئے ریاست کے باہر کے مشہوروں سے اخبارات جاری
کرنے کا جو طریقہ تھا، وہ مسدود ہو گیا ہے اور ریاست کے مختلف حصوں جیسے جموں، سرری، ٹکڑ، پونچھ،
میرپور اور مظفر آباد سے اخبارات نہ ہونے لگے۔

ریاست میں ایک تنظیم سیاسی تنظیم مسلم کانفرنس کے نام سے قائم ہوئی تھی۔ لیکن اس زمانے
میں یہ خصوصاً ہوا کہ تنظیم ایک محدود اپیل رکھتی ہے۔ اس کے زیر۔ اہم اجلاس میں جو ۱۹۳۹ء میں
خواجہ غلام محمد صادق کی صدارت میں منعقد ہوا ہے، اسے وسیع ترین حدود پر قائم کرنے کی تجویز منظور
ہوئی اور اس کا نام بدل کر نیشنل کانفرنس رکھ دیا گیا۔ اس کے پہلے صدر بھی اس وقت صاحب ہی منتخب ہوئے
یہ صحیح ہے کہ انفرادی گروہوں کے لحاظ سے دلچسپیاں اب تک باقی رہیں، لیکن ریاست کی اس وسیع
سیاسی تنظیم کو صحت بخش راہوں پر ڈالنے میں اس نے تہفیف نے ملک کی شاہی سر رہنمائی کی اور ایک
حادی لائحہ عمل کے ساتھ مشترکہ پلیٹ فارم بنایا کر دیا۔ اس نئی تنظیم نے جو نوجوانوں کو تعمیری مقاصد کی
طرف رجوع کرنے میں پیش بہانہ مدت انجام دی۔ ریاست سے ہٹ کر سماجی اصلاح اور ادب اور
فن میں ترقی پر درجہ جانات کو جگہ دینے کے مقصد سے ایک وسیع لائحہ عمل تیار کیا گیا۔ لیکن ان ساری مسئلوں
کو یاد آور ہونے کے لئے مکمل آزادی کا انتظار تھا۔

۱۹۳۱ء میں جموں کشمیر میں نمائندہ ذمہ دار حکومت قائم کرنے کے مقصد سے 'احرار
تحریک' شروع کی گئی اور پنجاب سے ہزاروں 'احرار' ریاست میں داخل ہونے لگے لیکن جوں ہی وہ
ریاست کی سرحدوں میں داخل ہوئے، انہیں گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا جاتا۔ رفتہ رفتہ ان سیاسی

نظر بندوں کی تعداد اتنی نیاوہ ہو گئی کہ ریاست کی جلیں ان کے لئے ناکافی ثابت ہونے لگیں۔ اس لئے کوئی پانچ ہزار اندر بندوں کو حکومت پنجاب کے تفویض کر دیا گیا۔ اس تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست کی حکومت نظم و نسق میں تبدیلی برپا کرنے پر مائل ہو گئی۔

جوں میں ایک اور تحریک روٹی ایجیٹیشن کے نام سے ۱۹۳۳ء میں شروع ہوئی جس کا مقصد غذائی اجناس کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کی طرف حکومت کی توجہ متوجہ کرنا تھا۔ تحریک میں حصہ لینے والے گروہ جیسے منعقد کرتے اور جوس نکالے تھے۔ ان جلو سوں پر لاطھی چارج کیا گیا جس سے عوام میں حکومت کے خلاف بددلی پھیل گئی۔

ڈوگر حکمرانوں کے مذہبی معاملات میں غلو کی طرف اشارے گذر چکے ہیں جس کی تفصیل ہندو دھرم ارتھ کے قیام، سنسکرت تعلیم کی اشاعت اور اس کے فروغ، مذہبی اداروں اور پیشواؤں کی فراخ دلی کے ساتھ منہ پرستی میں پڑھی جاسکتی ہے۔ اسی رجحان کا ایک پہلو ۱۹۳۳ء میں گائے کے تحفظ کے قانون کا نفاذ تھا۔ اس اقدام کے معاشی مضمرات سے قطع نظر ریاست کا اکثریتی طبقہ اس سے متاثر ہوا تھا۔ اس لئے ریاست بھر میں سخت بے چینی پھیل گئی اور جوں کے مسلمانوں نے پورے پچیس دن تک مکمل بڑاں منائی۔ یہ اور اس طرح کے کئی واقعات حکومت کی مطلق العنان آمریت کے مظہر تھے اس لئے ریاست میں ذمہ دارانہ حکومت کی تحریک کو تقویت حاصل ہوتی گئی۔

ریاست میں نمائندہ مجلس کا قیام ۱۹۳۳ء میں عمل میں آیا تھا۔ لیکن اس کی ہیت ترکیبی ایسی تھی کہ ذمہ دار حکومت کی تحریک کے قائدین کی توقعات کو پورا نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے کل ۷۰، ۷۰ اراکین میں سے ۲۴ حکومت کے نامزد تھے اور صرف ۳۳ منتخب۔ اس کا ہر بھی سہ کارہ عہدہ دار تھا۔ اس لئے کمیشنس برابر جاری رہی تا آنکہ ۱۹۳۳ء میں مزید اصلاحات دینے کے مقصد سے ایک آئینی تحقیقاتی کمیشن قائم ہوا۔ مہاراجہ کے اعلان نے جس کی رو سے یہ کمیشن قائم ہوا تھا، شیخ محمد عبداللہ صاحب ل۔ اس کا نام پرجا سمجھا تھا۔

کے الفاظ میں یہ ذہنی نشین کر لیا کہ کمیشن مقرر کرنے میں ہر باقی تسنیں ہمارے ہمارے اور کی یہی حریت پروردانہ خواہشات کا قرض ہیں۔۔۔۔۔ اور ہمیں اس امر پر مائل کیا کہ ہم کمیشن کے اجلاس میں اپنے قہروں کو شامل ہونے کی اجازت دینے کا فیصلہ کریں۔ چنانچہ خواہہ غلام محمد صادق اور مرزا محمد افضل بیگ کو کمیشن کا فرنس نے کمیشن کے کام میں حصہ لینے کے لئے اپنا نام کردہ منتخب کیا۔ لیکن اس کمیشن کی طرزِ روش سے بھی نیشنل کانفرنس کے قائدین کو سخت مایوسی ہوئی جس کا اظہار شیخ محمد عبداللہ صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

” سب سے پہلی وقت یہ دکھائی دی کہ اتنی بڑی اہمیت کا کمیشن بغیر کسی قابل سیکرٹری اور دفتری انتظام کے چلایا جا رہا ہے۔ کاروائیوں کو قلبیت کرنے کا کوئی انتظام نہیں۔۔۔۔۔“

اس کے علاوہ کمیشن نے بعض اہم امور پر گفتگو کی اجازت نہ دے کر سارے حریت پسند عناصر کو مایوس کر دیا، اور نیشنل کانفرنس نے اپنے نمائندوں کو کمیشن سے واپس بلا لیا۔

اسی اثناء میں سربے۔ این۔ راؤ ریاست کے وزیرِ اعظم مقرر ہو کر آئے، اور اس دعوٰی کے ساتھ کہ وہ اس ریاست کو نوٹہ کی ریاست بنانے کی تمنا رکھتے ہیں، لیکن وہ اپنی یہ تمنا دل ہی میں لئے جلد ریاست سے رخصت ہو گئے۔ ہمارا یہ اداران کی حکومت کی طرف سے مایوس ہو کر آخر کار نیشنل کانفرنس نے یہ محسوس کیا کہ ریاست کے نظم و نسق کو آئندہ عہد میں جس ڈگریہ چلنا ہے، اس کا ایک خاکہ مرتب کیا جائے، چنانچہ ۱۹۳۳ء میں وہ اہم دستاویز تیار ہوئی، جو ”نیا کشمیر“ سماجی آئین اور اقتصادی منصوبہ کے نام سے موسوم ہے۔ اور کشمیر کے حریت پسند فہموں کے لئے اصول رہنما کا کام کرتی آئی ہے۔ یہ ایک نہایت حاوی دستاویز ہے، جس کے کچاس دفعات اور فیصلوں میں سیاست، نظم و نسق، سماجی اور اقتصادی مقصد و منہاج غرض زندگی کے سارے اہم

شعبوں کی تفصیلات شامل ہیں۔ اس کے اہم عنوانات حسب ذیل ہیں۔

قومی اعلان، وطنیت اور اس کے حقوق، قومی اسمبلی، ریاست کا حکمران، انتخابات،

عدلیہ، ریاست کی قومی زبانیں، اقتصادی زرعی، صنعتی منصوبے، مزدوروں

کے حقوق، تقسیم دولت و پیداوار، تعلیم، سکس و مالیات، عورتوں کے حقوق۔

کشمیر کے حکمران، زمین الودین بادشاہ کے بارے میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کے نظم و نسق نے بکر اعظم

کو راستہ دکھایا۔ اس دستاویز کو پڑھنے کے بعد ایسا دکھائی دیتا ہے کہ اس کے محقق آئین نے آئینہ کے غنیم

ہندوستانی آئین کی رہنمائی کی۔ ریاست کی قومی زبانوں کی تفصیل دفعہ ۴۸ میں اس طرح دی گئی ہے۔

”ریاست جموں و کشمیر کی قومی زبانیں، کشمیری، ڈوگری، داردی، پلستانی، پنجابی، ہندی اور

اردو مشہور ہوں گی۔ اردو زبان کو ریاست جموں و کشمیر کی بین الاقوامی زبان کی حیثیت حاصل ہوگی۔“

ان زبانوں اور ان کے ادب کو ترقی دینے کے بارے میں ہدایتیں آگے صریح کی گئی ہیں۔

اس عہد کا ادب انہیں تحریکوں کا رد عمل ہے۔ ترقی پروردار اندازِ حکمران نظر رکھنے والے عقائد پر

کی مناسی اور رہنمائی نے اردو کے واسطے سے ریاست کے اہل انگریز سیاستی اور سماجی کارکن اور علم و ادب کے

میدان میں کام کرنے والوں کو ملک کے دوسرے حصوں کے اردو اویسوں کے قریب لاکر ان کی فکر اور

اسالیب کو ملک کے اور حصوں سے ہم آہنگ بنانے کی کوشش کی، اور نئے عہد کے حالات نے نوعِ نسل میں

جس کی تشکیل کی، اس کا نمایاں اثر اس عہد کے لکھنے والوں کی تحقیقات میں نظر آتا ہے۔

علامہ اقبال نے اپنی ایک نظم میں وادیِ لولاب کے حسن کی طرف اشارے کرتے ہوئے نظم

کے ساتھ ایک خیمہ سُرخی ملائے لولاب کی بیامن کو دیکھ کر کی بھی قائم کی ہے۔ اس سے بعض

لوگوں کا خیال مولانا محمد انور شاہ کی طرف گیا۔ جن کا آبائی وطن یہ وادی تھی۔ اقبال کے معاصر علمائے

مولانا کا بڑا مرتبہ ہے۔ وہ دیوبند میں شیخ الحدیث رہے۔ اور خدمت کے بعد نے انہیں

لے ملازادہ شیخ لولابی کی سیاحی۔ اصل سُرخی ہے۔

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے شعبہ دینیات میں لکچراری کی خدمت قبول کرنے سے باز رکھا۔ مولانا شاہ کا وطن وادی ارباب کا قصبہ نور پور تھا، یہاں ان کی ولادت ۱۲۹۲ھ میں ہوئی تھی۔ ان کا خاندان کشمیر کے سربراہ اور وہ علماء کا ایک خاندان تھا۔ ان کے جدِ امجد شیخ مسعود بٹہ دار سے ملتان آئے تھے اور ملتان سے لاہور گئے اور پھر کشمیر آ گئے۔ ششمی سلطان سلطان حسن شاہ، سلطان محمد شاہ اور فتح شاہ کی خانہ جنگیوں کے زمانے میں وہ کشمیر میں موجود تھے، اور سلطان نازک شاہ کا عہد بھی انہوں نے دیکھا تھا۔ میر سید احمد کرمانی سے انہیں ارادت تھی اور علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ علوم باطنی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ شیخ کا سلسلہ امام ابوحنیفہ تک پہنچتا ہے۔

کشمیر میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولانا محمد انور شاہ نو عمری میں دیوبند گئے اور فلسفہ، ہیئت، تفسیر حدیث، صرف و نحو اور معانی و بیان کی تحصیل کی اور فارغ ہونے کے بعد دیوبند ہی میں شیخ الحدیث کے عہدہ پر مامور ہو گئے اور کوئی تیس برس تک سینکڑوں تلامذہ گانِ علم ان سے فیض حاصل پاتے رہے۔ مولانا محمد انور شاہ دیوبند میں مولانا محمود الحسن کے ہاشمیان تصور ہوتے تھے۔ ۱۳۲۲ھ میں مولانا درج بیت اللہ کے لئے گئے اور فریضہ حج سے فارغ ہونے کے بعد مہر، طرابلس، بصرہ اور دوسرے اسلامی ممالک کے علمی مرکزوں کا دورہ کیا اور وہاں کے علماء سے ملاقات کی۔ بعض علماء نے انہیں سند فضیلت بھی عطا کی تھی۔ تعلیم و تدریس میں انہیں ایسا انہماک تھا کہ کوئی چالیس سال کی عمر تک تلامذہ کا خیال ہی نہ آیا۔ آخر مولانا حبیب الرحمن دیوبندی کے اصرار پر گنگوہ کے خاندان کی ایک لڑکی سے شادی کی، بن سے انہیں غالباً تین لڑکے ہوئے تھے۔ منجھلے لڑکے کا نام عبدالرشید تھا۔ ان صاحبزادے کی ہدایت کے لئے انہوں نے حضرت سید شاہ یوسف حسینی شاہ راجو کی طرح جنہوں نے اپنے فرزند حضرت محمد حسینی گیسو دراز کے لئے دینی اور اخلاقی ہدایتوں کا ایک رسالہ تحفۃ النصایح کے نام سے لکھا تھا، ایک نظم فارسی میں رشید نامہ کے عنوان سے لکھی تھی۔ اس نظم میں وہ فرزند کو

ہدایت کرتے ہیں :

بہرکاری کہ دست انداز باشی طلب گار رُضای حق بَبَاشی
 روایات سلف از دست مگذار خلف با هر سلف مانام بردار
 تعالیٰ اللہ چہ خوش نیکو سبب گلِ انور بَبَاشی بو حنیفہ
 علوم دینی کے ساتھ مولانا کو شہر و سخن سے بھی دلچسپی تھی۔ اردو اور فارسی میں انہوں نے
 کچھ نقیصے اور نقیصے لکھے تھے۔ ایک فارسی نعت کے شعر ہیں۔

امی لقب و ماہ عرب مرکز ایمان ہر علم و عمل را تو مداری تو مدبری
 عالم ہر یک شخص کبیر است کہ اجمال تفسیر نمودند دریں دیر سدی
 آن عقیدہ تفسیر کہ از کس نہ شد مل ترقی تو کشیدہ کہ خبری و بیماری
 اردو میں کچھ نظمیں جو ان کی باقیات الصالحات سے ہیں، ان میں سے ایک نظم دنیا کا
 ناپائیداری کے بارے میں ہے۔ اس کے چند شعر ہیں۔

سفر کی منزل ہے دار دنیا ذرا تو اس کا خیال سا کر
 سدا نہیں ہے یہ دیس تیرا ضرور جانا ہے دن بٹھا کر
 وہ چل بے سارے پاری پاری یہ باقی خلقت بھی چل بے گ
 تو چشمِ عبرت سے دیکھ غافل، کبھی تو اپنی نظر اٹھا کر
 چلے ہی جاتے ہیں قافلے سب یہاں کا ٹھہرا ہوا ہے یہ ڈھپٹ
 کئی کا آنا، کبھی کا جانا، کبھی ہنسنا کر، کبھی رولا کر

مولانا کو عربی تقریر میں بھی بڑی مہارت تھی۔ جامعہ ازہر کے کچھ علماء دیوبند آئے تھے۔ اس
 موقع پر انہوں نے جو غیر مقدمی تقریر کی تھی، اس کو سن کر ازہر کے علماء کو بڑا اچھلتا ہوا تھا۔ مولانا کا

انتقال ۱۹۲۳ء میں ہوا۔

اس صہدی کے رہنے ثانی کے اواخر میں، جبوں کو کشمیر کے نوجوانوں میں نئے ادبی ذوق کو ترقی دینے میں، جس سرکردہ ادیبوں کا جھنڈا تھا، ان میں ڈاکٹر محمد دین تاثیر خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر کشمیری نثر اور شاعری میں، لیکن وہ سب سے اہم لوگ تھے، اور ملازمت کے سلسلے میں کشمیر میں رہ چکے تھے۔ کشمیر میں آنے سے پہلے وہ پنجاب اور لاہور میں بھی اپنے عہد کے نوجوان ادیبوں اور شاعروں سے سنے معیاروں کو روشناس کرانے میں کامیابی حاصل کر چکے تھے۔ ۱۹۱۵ء میں وہ بری مگر سسے بری پرنٹاپ کالج کے پرنسپل مقرر ہو کر آئے اور یہاں کے نوجوان ادیبوں اور شاعروں میں شعروں کا صحیح ذوق پیدا کرنے اور اس کو ترقی دینے میں امکان بھر کر کوشش کی۔ کالج کی بزم اوسب، ان کے زمانے میں بڑی کارکردگی بن گئی تھی، جس کی سرپرستی میں ادبی مجلسیں اور مشاعرے منعقد ہوتے اور ان میں اپنی تخلیقات پیش کرتے کیلئے نوجوان طلباء کو مدعو کیا جاتا اور ان کی ہمت افزائی کی جاتی۔ کالج کی ادبی انجمن اردو سبھا کے نام سے موسوم تھی۔ تاثیر کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی تھا کہ انہوں نے اردو کی تعلیم فارسی کے اس تہذیب کے تفویض کرنے کی حیرانی روایت کو ترک کر کے، اردو کی تربیت پائے ہوئے اس تہذیب کو مقرر کیا۔ کالج کے طلباء کا رسالہ پرنٹاپ، اس نوع کے اہم رسالوں میں شمار ہونے لگا تھا، جس میں اس تہذیب کے علاوہ تخلیقات طلباء کی شامل ہوتی تھیں۔

تاثیر کا وطن، اہل کشمیر کی یاد آبادی، امرتسر تھا۔ جہاں وہ ۱۹۱۵ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ابھی دو سال ہی کے تھے کہ ان کے والد اور والدہ دونوں کا انتقال ہو گیا، اور ان کے خالو میاں نظام الدین نے ان کی پرورش کی۔ میاں نظام الدین کا شمار لاہور کے رؤساء میں ہوتا تھا۔ انہوں نے تاثیر کی تعلیم پر خاص توجہ کی چنانچہ تاثیر نے پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم۔ اے کا امتحان کامیاب کیا اور ۱۹۲۳ء میں اسلام آباد کالج، لاہور میں انگریزی کے لکچرار مقرر ہو گئے۔ اسی اشارہ میں انہوں نے امرتسر میں ڈاکٹر ٹریٹ

بھی حاصل کی۔ کچھ عرصہ انہوں نے محکمہ اطلاعات میں بھی کام کیا۔ ۱۹۳۷ء میں ان کا تقرر ایم۔ اے۔ او۔ کالج امرتسر کی پرنسپل پر ہو گیا۔ جہاں وہ تین سال تک کام کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ ایس۔ پی۔ کالج کے پرنسپل مقرر ہو کر سبزی بھرتے آئے۔ ان کی پرنسپل کے دوران کالج کو بڑی ترقی ہوئی اور طلباء کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی کہ ایک نیا کالج امر سنگھ کالج کے نام سے قائم کیا گیا جس کے پرنسپل تاثیر خود مقرر ہوئے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد حکومت کی پالیسی سے اختلاف کے سبب وہ سبزی بھرتے چلے گئے اور حکومت ہند میں مختلف عہدوں پر مامور رہے۔ ۱۹۴۶ء میں ریاست کی حکومت نے انہیں ناظم تعلیمات کی حیثیت سے مدعو کیا، لیکن حکومت کی ریشہ دوانیوں اور پالیسی کے تکڑوں نے انہیں اس خدمت کو قبول کرنے پر مائل نہیں کیا۔ تقسیم ہند کے بعد تاثیر کچھ عرصہ آزاد کشمیر میں محکمہ اطلاعات کے ناظم بھی رہے۔ لیکن جلد ہی اس خدمت سے شکایت ہو کر اسلام آباد کالج لاہور کے پرنسپل ہو گئے جہاں ۱۹۵۰ء میں اپنے انتقال تک وہ کار گزار رہے۔

تاثیر ادب اور شعر کا سحر اذاق رکھتے تھے اس کے ساتھ ان کا تحقیقی اور تنقیدی شعور بھی رچا ہوا تھا۔ ادب کے مقصد اور صرف کے بارے میں وہ ترقی پرور خیالات کے حامل تھے۔ اپنے صحت بخش ذوق کی بدولت تاثیر نے پنجاب اور کشمیر دونوں مقامات کے نوجوان اہل علم اور شعروں کو نئی راہیں سچھائیں۔ خود ان کی شاعری کا آغاز اس میں شک نہیں کہ اپنے عہد کی عام روایت کے مطابق غزل گوئی سے ہوا، لیکن جلد ہی وہ ادب اور شعری نئی بنیاد میں تلاش کرنے کی طرف مائل ہو گئے۔ ادب میں ترقی پسند تحریک کو فروغ دینے میں تاثیر کا بھی بڑا ہاتھ رہا۔ اقبال کی صحبتوں میں اٹھنے بیٹھنے انہیں شاعری کا نیا عرفان بھی حاصل ہوا تھا۔ ان کے فنز کے امداد کو سمجھنے میں ذیل کا اقتباس مدد دے سکتا ہے۔

حضورِ یار میں آنسو نکل ہی آتے ہیں کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں

جتنے تاجن پا ہو کر ملو سر زلف چھپائیں ہی تو یہ جاوہر نکل ہی آتے ہیں
 بنابِ شمع کوٹھوکے لئے ہی ، لیکن کسی پہانے لپچ چوٹیں ہی آتے ہیں
 مٹاؤ مٹتی رہے آنسو جو دل میں ڈوب گئے ذہن کا فزول جو آنسو نکل ہی آتے ہیں

حسرت مولیٰ نے اپنی مخصوص افادی رومانی منسکر اور بھان کے نتیجے کے طور پر اردو غزل کو ایک میا موڑ عطا کیا تھا ، اور یہ ارتقا غزل میں سا مہا سال سے ہوتا رہا تھا ، لیکن جدید عہد میں حسرت نے اسے اپنے روایتی راستے سے ہٹا کر جس ڈگر پر ڈال دیا تھا ، اس سے وہ نئے افق سے روشناس ہونے لگی تھی۔ ہم سے قریب تر زمانے میں ڈاکٹر تاثیر اور ان کے رفقاء نے غزل کو ایک اور دنیا شعور حیات عطا کیا۔ خود ڈاکٹر تاثیر نے غزلیں بہت کم کہی ہیں۔ ابتدائی غزلوں سے ہٹ کر جو غزلیں انہوں نے کہیں ، ان میں اپنے عہد کے مخصوص رجحانات کو براہِ دے کر اسے رومانی نظم سے قریب تر لانے میں تاثیر کی کاوشیں اپنا ایک مقام رکھتی ہیں۔ اس کے باوجود تاثیر کا اصلی سٹریٹ انائی نظمیں ہیں۔ اور ان کی تعداد بھی زیادہ نہیں ہے ، پھر بھی ان کی منسکر کی مخصوص اقتاد کی بدولت اور ان نظموں کے تاریخی موقف کی وجہ سے انہیں ایک امتیاز حاصل ہے۔ بحر وں کے انتخاب میرٹھوں کی نئے انداز کی ترتیب اور موضوع کے لحاظ سے کچھ نئے عناصر کے شمول نے تاثیر کو نئی نظم کے پیش رو کا مقام عطا کر دیا ہے۔

تاثیر کی نظم 'ید بیضا' کو بعض حلقوں میں ان کی شہ کار نظم سے تعبیر کیا گیا ہے ، اور یہ صحیح ہے کہ نثر کی ندرت اور اظہار کے مخصوص سانچوں کی وجہ سے تاثیر کی اس نظم نے پنجاب کے نوعمر شاعر کو اور ہند اور کشمیر میں بھی نئی نظم کی راہ دکھانے کا حق ادا کیا ہے۔ نظم میں خیالات کا تسلسل انتخاب کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ نئے شعور کے طلوع ہونے کے ابتلائی آثار میں سے ہے ، اس لیے پوری نظم یہاں نقل کی جا رہی ہے۔

مجھے تلاش رہی ہے
 نہیں، تلاش نہیں
 تلاش میں تو طلب
 جستجو بھی ہوتی ہے
 دہی دہی سی سہی
 آرزو بھی ہوتی ہے

نہ آرزو، نہ طلب ہے، نہ جستجو نہ تلاش
 فرامی ایک جہالت فرامی ایک فرامی

میانِ قلب و نظر اک مقام ہے اس کا
 مقام بہ مرحلہ بہ مرحلہ بھی نام ہے اس کا

جہاں خیال کے پسیر پینائے جاتے ہیں
 نگاہِ گوشوں کو نغے دکھائے جاتے ہیں
 وہ طور جلوہ معنی

وہ کارگاہِ خیال
 تصورات کی آلائشوں سے پاک خیال
 تعینات سے بیباک وارداتِ جمال

جمال، تائیشِ رُو، گرمی خرام نہیں
 ہزار ایسی ادائیں ہیں، جن کا نام نہیں

بھلکیاں

یہ ادائیں

یہ پُرفشاں سائے

یہ بھلے لگاتے

اُجھرتے

دبے ہوئے سایے

موادِ توسِ فم و گم و دُش و نشور و سرور

یہ کائناتِ مری کائناتِ ہو، یہ نہیں

ہر ایک بات مگر میری بات ہو، یہ نہیں

میں دن کو رات بتاؤں، وہ رات ہو، یہ نہیں

نہیں مجھے غلش، یہ ہوس نہیں ہوتی

بقدرِ جامِ یہاں اذینِ عام ہے سب کو

یہ میکدہ ہے، یہاں پیش و پس نہیں ہوتی

مگر کبھی کوئی کم گشتہ، رہ نور و غنزل

مری کندِ نظر کا شکار ہو مہاسے

حریمِ ناز کا پردہ صبا اُلٹ ڈالے

کسی کا رازِ دروں آشکار ہو جائے

یہ مدعا طلبی، یہ نظر کی آلاچی

یہ حسنِ رہ گزری، یہ سودِ نشر گئی

یہ شمعِ طاقِ قرم، یہ شرارِ بو بلی

یہ مُنتہیٰ نظر، یہ مآلِ کار نہیں
 نہیں، نہیں کی یہ مکرار ہر جگہ نہیں
 کہ جیسے علم و عمل میں تضاد ہو جائے
 کہ جیسے قلب و فکر میں فساد ہو جائے
 کہ پیسے یہ نہیں، یہ تشہیں کیا ہیں کہوں
 یہ اعتقاد کے اثبات کی نفی سے نہیں
 و فور شوق کے جذبات کی کمی سے نہیں
 بساطِ کیف ہے ایک کارِ نازِ جوشِ نمود
 دوشِ دوش ہمہ راسخ، چمن چمن ہمہ رنگ
 نخلوطِ مرغ و تباہِ شیر و سنبل و ریحان
 نوائے برکت و طہور و دف و نای و چنگ
 نمودِ سرسبزِ افہام و کوہِ یک تن
 ہزار پیکرِ شہریں فردہ درگ سنگ
 مٹی نے مسدِ سنگِ بسیہ پہ لی کھوٹ
 یرنگ موجِ ابھرنے لگے نشیب و فراز
 کھلا ہے فریتِ تیشہ سے اک دریچہِ مُرخ
 قطارِ بستہ ہیولے کھڑے ہیں موحِ نیاہ
 نمودِ ہمت و قوسِ نیاہ و ٹوہرِ مدر
 بدن ڈھلے ہوئے انگڑائیوں میں بے سرو و مست

تے کئے ہوئے، سینے بلند، سر پدھست
شکارِ ماہ کہ تسخیرِ آفتاب کروں
میں کس کو ترک کروں، کس کا انتخاب کروں

تأثریِ حسّاعی فیہ کر شعر تک محدود نہیں تھی، بلکہ وہ اچھے عالم اور سر بلند نقاد بھی تھے۔
ان کے تنقیدی مضامین کا بھی اردو میں ایک پایہ ہے۔ کشمیر میں قیام کے دوران جاگیر نے کئی نظمیں لکھی
تھیں، جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتی تھیں، کثیر پر لکھی ہوئی نٹوں میں ان کو ایک امتیاز حاصل ہے۔

تأثیر کے معاصرین میں دو بھائی، امین حمزہ اور عبدالسمیع پال اثر بھی اردو شاعری
میں مقام پیدا کر چکے ہیں۔ امین حمزہ بیٹے بھائی تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں ہوئی۔
لیکن اعلیٰ تعلیم کے لئے وہ لاہور چلے گئے تھے۔ لاہور ہی کے ادبی حلقوں میں ان کے ذوق سخن کی پرورش
ہوئی۔ اور رفتہ رفتہ انہوں نے اپنے خاص انداز کو نشوونما دیا، جس میں روحانیت، فلسفہ اور نئے
شعری اسالیب طے چلے نظر آتے ہیں۔ اس صدی کے رطبِ اول کے بعد ان کی نظمیں اکثر ادبی تہذیبوں
میں شائع ہوتی رہیں۔ ان کی غزل میں بھی نئے انداز کی رعایت ملتی ہے۔ ان کی ایک نظم جو
"نفسیات" کے عنوان سے پہاڑوں کے شمارہ اکتوبر ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی تھی، دراصل عہدِ نو
کی غزل بھی ہے۔ اس کے کچھ شعر ہیں :-

نثارِ غزہ نثارِ اداے یار ہوئے	جب اہل دل میں کہیں جا کے ہم شمار ہوئے
تہوڑ رُخ گلگوں کا دیکھے عجب از	دہی جو داغ تھے سینے کے لالہ زار ہوئے
نگاہِ شوق کا پڑتا تھا روئے سادہ پر	ادائیں آپ سے آپ آگئیں سنگار ہوئے
کیا نہ ہمتِ عالی نے اعترافِ شکست	ہم اپنی ہمت سے زمانے میں کامگار ہوئے
تخیلاتِ امین ہیں غلافِ کعبہ رزل	تہادی خیر نہیں، نریہ داغدار ہوئے

ایتن کی ایک طویل نظم ”سخن ہائے گفتنی“ کے عنوان سے ”ہمایوں“ دلاہود کے شمارہ جون ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ قومی نظم کا انداز رکھتی ہے اور ایک تجویز کے ماتحت لکھی گئی ہے۔ اس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

امین سے ایک دن پوچھا کسی نے
ترقی کیوں نہیں کرتے مسلمان

اس بات میں کئی متبادل پہلو پیش کئے گئے ہیں کہ مسلمانوں میں کیا نقص باطنی ہے؟ ان کو بحیثیت مجموعی تنزل کیوں ہے؟ ان میں جمود ہے؟ کیا یہ قوم اب مغضوب فطرت تو نہیں بن گئی ہے؟ ان سوالات کے جواب میں شاعر نے مسلمانوں کی صلاحیتوں کو سراہا ہے، لیکن بدلے ہوئے حالات اور نئے عہد میں کئی عین راہ کے اختیار کرنے میں ان کے تذبذب پر تنقید کی ہے۔ جواب پتھر جیسوں پر مشتمل ہے۔ تذبذب، سہرا، ”مفہوم ترقی“، ”روح روحانیت“، ”روح دنیاۓ دلوں“، ”بشر۔ ان چھ عنوانوں کے تحت شاعر نے تنزل کے اسباب و علل کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ نظم اقبال کے اشرفی نشانہ بنی کرتی ہے۔ لیکن اس میں خیالات کی رفعت نہیں ہے، صرف کہیں کہیں کچھ اشارے ملتے ہیں۔

ایتن کے جوابات کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

نہیں فطرت میں اس کے کوئی بھی نقص
حریف برق ہے اس کی رگِ جانا

پھر کہتے ہیں:

تفانی کیش ہے بے حس نہیں ہے دلِ مسلم ابھی تک ہے مسلمان
اس میں اقبال کے خیال ”ذرا نام ہو تو یہ مٹی بہت درخیز ہے ساقی“ اور ”کلم کوش تہیں لیکن بے ذوق
نہیں راہی“ کی صداۓ بازگشت سنی جا سکتی ہے۔ آگے اپنی توجہ یہ پیش کرتے ہیں:-

سہارن پور کی ہے قوم کی قوم کہہ رہا جاتی، 'مذہب ہے مسلمان
ان تین راہوں کی شہرت کی ہے۔

رہ روضائیت دائیں طرف ہے مگر بائیں طرف جو راستہ ہے
دہی ہے جادہ دنیائے فانی فضا جس کی بظاہر دکشا ہے
مگر جو سامنے تیرے سڑک ہے اسی کا نام سیدھا راستہ ہے
اس سیدھے راستے، 'مراط مستقیم کی وضاحت کی ہے اور آخر میں یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ۔

بشر تنہا نہیں، یہ جسم خاکی
مشتن ایسے ہے آہو۔ سے نشین بھی
سمجھتا ہے مکان کو بے مکین تو
ارے تادان، 'اسی تن میں ہے من بھی

اور یہی من ہے، جس سے زندگی عبادت ہے۔ نظم: 'انجام میں کسی بلند مقام کو چھوے بغیر ختم ہو جاتی
ہے تاہم یہ اس عہد کی ان نظموں میں سے ہے جو ایک یقین تجویز کے تحت لکھی گئی ہے۔

عہد السیمع پال، 'اُدبی دنیا میں اثر صہبائی کے نام سے مشہور ہیں۔ اور ۱۹۳۲ء کے بعد
عرصہ تک وہ مقبول شاعروں میں شامل رہے۔ ان کی دلاوت بھی سیالکوٹ میں ۱۹۰۱ء میں
ہوئی تھی۔ پال کی نسبت ان کے ایک راجپوت قبیلے سے ہونے کی یادگار ہے۔ سیالکوٹ سے میٹرک کا
امتحان کامیاب کر کے 'اثر لاہور گئے' جو اس زمانے میں شمال مغربی علاقے میں علوم مشرقیہ کا مکرمانا جاتا
تھا۔ اسلامیہ کالج سے انہوں نے بی۔ اے کا امتحان کامیاب کیا، قانون کی تعلیم بھی حاصل کی اور
کچھ عرصہ وکالت کرتے رہے۔ اس کے بعد فلسفہ میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ شعر و سخن سے انہیں
ذہان ہی سے دلچسپی رہی، اور لاہور کی ادبی صحبتوں میں ان کے ذوق کی جلا ہوئی۔

اشتر کو اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی، اور یہ ان کی شاعری میں اشتر شیرانی کی سلمیٰ کے مقابلے میں اشتر راحت کماستخاری نام سے ظاہر ہوئی تھیں۔ اس بیوی کا جلد انتقال ہو گیا، جس کا اشتران کی زندگی سے گزر کر ان کی شاعری پر بھی گہرا ہٹا، اور ایک المیہ کے کی صورت میں ظاہر ہوتا رہا۔

اشتر ۱۹۳۷ء میں جوں آگئے تھے، یہاں ان کا لقرہ وکیل سرکار کے عہدہ پر ہوا تھا۔ کچھ عرصہ وہ ہائی کورٹ میں مددگار ایڈووکیٹ بھی رہے۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں اشتر سیالکوٹ چلے گئے اور مددگار کسٹوڈین کے عہدہ پر مامور رہتے، پھر وکیل سرکار ہو گئے۔

جوں میں قیام کے زمانے میں اشتر کیفی کی محبتوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ فن شعریں وہ اپنے بھائی امین اور تاجور نجیب آبادی کے شاگرد تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی اور ابوالکلام آزاد ان کی شاعرانہ صلاحیتوں سے متاثر تھے۔ اشتر کلاسیکی شاعروں میں میر اور غالب کا اثر تھا، لیکن وہ جدید عہد کے شاعر تھے، اور اپنے عہد کی تحریکوں سے وہ بیگانہ نہیں رہ سکتے تھے۔ غزل، رباعی، قطعے کے علاوہ انہوں نے نظمیں بھی کہی ہیں، بن میں ابتدائی دور کی اردو نظموں کی سہ سادگی اور سلاست ہے۔ ان کی ایک نظم پھول اور ستارہ سے ایک اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

میں لالہ بھرا ہوں تو غرش کا تارہ ہے

چاہوں کہ پہنچ جاؤں

اڑ کر تیری غمِ غسل میں

پھر میری تگ و دو کیا

کچھ دور ذرا اڑ کر

پھر خاک پہ گر جاؤں

گرتے ہی فنا ہو جاؤں

میں لاکھ بھرا ہوں تو عرش کا تارا ہے

اشرفی نقیص غلوۃ جلیات اور جام صہبائی کے عنوانوں کے تحت شائع ہوئی تھیں۔ ان کے کلام کے دو متن مجموعہ شائع ہو چکے ہیں۔ ایک مجموعہ "قستان" کے نام سے ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا تھا جس پر سید سیدمان ندوی اور پنڈت کیفی نے مقدمہ اور تاثرات لکھے ہیں۔ "جام طہور" ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ اور رباعیات کا ایک مجموعہ "راست گدہ" کے نام سے شائع کیا تھا۔ اشرفی رباعیاں فلسفیانہ انداز فکر سے ممتاز ہیں۔ ایک رباعی ہے :-

آزاد طلسم رنگ و بو ای سنہ ہوا

نیرنگ جہاں کا راز جو ہی نہ ہوا

دنیا سے عبث رہی شکایت تجھ کو

افسوس کہ اپنا دوست تو ہی نہ ہوا

اشرفی کے قطعات میں اتھری مودائیت کی جھلک ملتی ہے۔ ایک قطعہ کے شعر ہیں :-

ترا سُن بہار آرا گلستانوں پہ پھایا ہے

ترے جلووں نے دامانِ بیاباں کو بسایا ہے

رہناں رہتی ہے جیسے برگ گل میں بوسے جاں پرور

ترا سوزِ فحبت میری رگِ دگ میں سکایا ہے

مولانا غلام سرور نے اشرفی صہبائی کی نظموں پر ایک اجمالی نظر کے عنوان سے مضمون "ہمایوں" (شمارہ جون ۱۹۳۷ء) شائع کیا تھا۔ مضمون میں انجمن اربابِ علم ایک جلسے کا تذکرہ کیا ہے جس میں مولانا عبد الباقی صاحب، مولانا سہارا، پر مزید رونا تھا، ڈاکٹر گوگل چند نارنگ جیسے صاحبِ ذوق سخنِ سنخ

اور سخن فہم خسر کیسے تھے۔ شاعری پہلی نظم جس کے دو شعر یہاں درج ہیں، اسی جیسے میں پڑی گئی تھی :-
 - انجہام کی کیا کہئے، آغاز نہیں معلوم ہستی کے معنی کا کچھ راز نہیں معلوم
 کب ٹوٹ کے رہ جائے یہ سارا نہیں معلوم پی اور پلا ساقی، پی اور پلا ساقی
 اشق کی نظموں میں ذوقِ نظارہ، تری وحدت کے گیت گاتا ہوں۔ شہابِ کیفِ آفریں، تاروں بھری
 رات، نفیس نظمیں ہیں۔ ذوقِ نظارہ سے ایک اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے :

ماہ میں حسنِ سرا، مہر میں تنویرِ تری سنگ میں نورِ سرا، خاک میں اکیرِ تری
 کاکلِ سبیلِ بچیاں سزا ہے زنجیرِ تری اور ہر وقت ہے منتوش ہے تنویرِ تری
 اس قدر واوی نظارہ میں کھو جاتا ہوں

خود بھی اک چرخِ محسن کا بن جاتا ہوں
 اثر آہنگ اور مکرارِ صوت سے اظہار میں حسن پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ خصوصیت بھی بہرِ مدح
 دور کے نظم نگاروں میں زیادہ نمایاں ہے۔ مثلاً ان کی ایک نظم کا اقتباس ہے :-

بہار ہے، رنگار ہے کنارِ بحرِ مبار ہے
 فہمائے کوہِ سار ہے ربابِ آبِ شاد ہے
 نسیمِ خوشگوار ہے بہانِ روزگار ہے
 پلائے جا، پلائے جا

غمِ بہاںِ مٹاے جا

پینڈت برج موہن دتاتریہ کتنی کٹھیری پنڈتوں کے ایک خاندان سے تھے، بودا ہی منتقل
 ہو گیا تھا۔ کیفی نے عرصہ تک ریاست میں ملازمت کی اور مہاراجہ پر تاپ سنگھ کے معتد امورِ خدیوہ
 کے عہدہ پر فائز رہے۔ ان کے قیام ریاست سے، کئی نوجوان شاعروں کو ان کی صحبتوں سے فائدہ اٹھانے

کامیاب قرار دیا۔ کیفیؔ اپنی ذکاوت اور زبان کے مسائل اور کلاسیکی شعری معیاروں پر قدرت کے سبب اپنے عہد میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی ولادت ۱۸۷۷ء میں دہلی میں ہوئی تھی۔ ان کے نانا، قاری کے عالم تھے، جن کے پاس کیفیؔ نے فارسی کی تکمیل کی۔ ان کے بزرگوں میں پنڈت نرائن داس ضمیر، صاحب ذوق شاعر تھے، کیفیؔ نے فن شعر میں انہیں سے تربیت حاصل کی تھی۔ لیکن وہ اپنے عہد کی تحریکوں سے بھی متاثر تھے۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کیفیؔ کچھ عرصہ لاہور میں رہے، اور وہاں کی ادبی صحبتوں سے استفادہ بھی کیا۔ ۱۹۱۱ء میں وہ یورپ کے سفر کے لئے روانہ ہوئے اور وہاں کے کچھ علمائے بھی ملاقات کی۔ ہندوستان لوٹنے کے بعد وہ ریاست کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ ریاست چنئی میں بی بی ٹیٹر ریٹ اور کلکٹر کے عہدہ پر مامور رہ چکے تھے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد مولوی عبدالموتی کے دوش بدوش وہ اردو کی ترقی اور اس کے مسائل کو سلجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ انجمن ترقی اردو کے وہ شریک مفکر بھی ہے اردو زبان اور قواعد کے مسائل پر کیفیؔ نے لکھنؤ یونیورسٹی میں جو تالیفات تقریریں کی تھیں انہیں ابجد میں منثورات کیفیؔ اور کیفیت کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا۔ جید آباد میں قیام کے زمانے میں ریاست کے وزیر اعظم ہمارے سرکش پرشاد شاہ کی شہری غلوں میں شریک ہوتے رہے۔ رشاد نے اپنے ایک شعر میں ان کی سُخنوری کی داد دی ہے شعر ہے:-

ہم تابہ شہ و بھی ہی کیفیؔ سے باخلوص

مشہور خاص و عام ہے ان کی سُخنوری

کیفیؔ کی شاعری میں لطف سخن سے زیادہ، خیال اور شعری اظہاروں پر ان کا قابو نمایاں ہے۔ الفاظ کی تلاش میں وہ انشاء اور ہمارے زمانے کے استادہ میں مولانا ظفر علی خان کی راہوں پر چلے گئے۔

نغمہ اور نثر دونوں میں کیفیؔ نے کئی تصانیف چھوڑی ہیں۔ نثر میں "منثورات" اور "کیفیت" کے

علاوہ دو ڈرائے "راج ڈلاری" اور "مراری راجا" اور ایک نیم تاریخی ڈرامہ "نہتارانا" ان کی یادگار ہیں۔ شاعری کی طرح انشا میں بھی ان کا اپنا ایک انداز تھا۔ منظوم کارناموں میں "جگ جیتی" اور ایک مجموعہ چند نظمیں قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ کئی نظمیں جو رسالوں میں شائع ہوتی ہیں بہائی شکل میں مدون نہ ہو سکیں۔ کئی کے اسالیب کی طرح ان کے موضوعات میں بھی جدت اور تنوع نمایاں ہے۔ ایک نظم انہوں نے "روپ چالیسا حسن فطرت" کے عنوان سے لکھی تھی جس میں ورڈ سورتھ کی طرح حسن فطرت کی دلکشیوں سے نقاب اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ اس کا آغاز ہوتا ہے۔

ہرمن حسن فطرت کیا ہے خودی کی دنیابے

ذرہ ذرہ شاعر ہے، قطرہ قطرہ صہبا ہے

غور سے اگر دیکھو، کائنات کا عالم

حسن کا ہے اک طوفان جو ازل سے برپا ہے

"حسن کی دنیا میں بھی وہ کائنات میں حسن کی جلوہ گردی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ان کی دوسری .. "طلوعِ سحر" "کیفِ بہار" "برسات کی بہاریں" بھی فطرت کے حسن کی تفسیریں ہیں۔ کشمیر سے ان کے دوہرے تعلق نے اور شاعروں کی طرح اس کھن اور رعنائیوں پر طبع آزمائی پر مائل کیا جس کا نتیجہ ان کی وہ نظم ہے جس میں انہوں نے ایک ڈرامائی انداز میں کشمیر کے حسن کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک افکار زندہ انسان کو وہ مشورہ دیتے ہیں :

سرنگوں کب تک رہو گے رنج اور افکار میں آؤ تم کو لے چلیں اک چر فضا گلزار میں
یہ چر فضا گلزار ظاہر ہے، ان کے اسلاف کے وطن کے سوا کوئی اور نہیں۔ اپنے ساتھی کو وہ اس
گلزار میں پہنچاتے ہیں اور کہتے ہیں :-

ہے یہ دلکش ہے بیل جس کی ہر اہل نظر ہے ثنا جس کی برابر یار اور اغیار میں

پھر اس کے سر پر چشموں، سبرنگ کو ہساروں، بوش بہار کی رعنائیوں کو پیش کر دیکے بعد،
ان شاہزادوں پر تعریف کرتے ہیں، جو کشمیر کو جنت نظیر کہتے ہیں، کئی کہتے ہیں، جنت ایک افسانہ ہے۔
اور کشمیر ایک حقیقت بشر ہے:۔

ہے ہنس کشمیر کی کہنا اسے جنت نظیر سامنے آنکھوں کے یہ وہ بس دل انہر میں
اس اجمال پر اگر کسی کو اعتقاد نہ آئے تو وہ تفصیل سے اسے قایل کرتے ہیں:

تم نہ پاؤ گے کہیں جو ہے یہاں جوش بہار پھولتا کوئل ہے چوبیدر دستہ غبار میں
ہے آب ایک گلشن اور ہے اک زیر آب دل بھی لاشافی ہے دنیا کے دیار امصار میں
ماہ تاپے کیا سفیدہ آب و رکھو کرہاں رونڈے جاتے ہیں گہرا اس بزم گوہر بار میں
دست انشاں ہے چنار، اس درجہ ہے خوشیوں سے بھرنا خونِ خایا قوت دست افشاں میں
برف کی یہ چوٹیاں، الماس کے سرچھچھ میں ان بزرگوں کو طے قدرت کے ہر دربار میں
ایک سے اک بڑھ کے ملے ہیں عناصرِ دلفریب دیکھو وادی میں ہر جا و جہاں ہسار میں
پھول ہیں، چشے ہیں، میوؤں کے شجر، اور غزل چہ پیہ دب رہا ہے لطف حق کے بار میں
یہ ساری تفصیل سنانے کے بعد کئی کئی کو اس کا احساس ہوتا ہے، تو صیف کا حق ادا نہ ہو سکا،
اس لئے کہتے ہیں:۔

گلشن کشمیر کے اوصاف قابلِ وصف ہیں ہو سکیں کیونکر میاں کئی وہ چند اشعار میں
کئی نے غزل کا سراپا یہ بھی پھوڑا ہے، لیکن جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے، ان کی غزل لطف
اظہار سے زیادہ استادانہ استعمالِ الفاظ کی جادوگری کا سہارا لیتی ہے۔ غالب کی زمین میں ان
کی ایک غزل کے شعر ہیں:

حسنِ جلیبابِ عدم سے ہو درخشاں نکلا وچد میں کون و مکان میں خود ورقِ قصاں نکلا

برق کا ہے وہ تبسم کہ شکر خندہ ٹھل ٹھل
 حُسن کا ہے یہ وغیر اس کو نہ کہہ دو تشنگی
 حُسن ہر شکل میں ہر آن میں زینتوں نکلا
 رنگ بھی سینہ سے غنچے کے پُر انشوں نکلا
 "ادب اور شعر کی تجدید کیسے کی اہم نظموں میں سے ہے جس میں وہ حالی کی نظم شعر سے
 خطاب کی طرح شاعری کے مروجہ انداز میں اصلاح کی طرح توجہ دلاتے ہیں۔"

گذاری عاشقی میں غم پھر بھی یہ تہا ہے
 اہلی ترجمانِ دل نگاہ واپس ہوتی
 اسی جہول و عاملِ عشق پر دل سے لکھتا ہے
 نگاہِ اُٹھیں یا رب نگاہِ اولیں ہوتی
 ان استعاروں میں گفتگو کے بعد وہ حالی کی طرح مسائل سے نپٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔
 ستمِ سخی کی بس ہم یہ غرض نایت سمجھتے ہیں
 کہ ہزمِ شعر میں برپا صلاے آخر میں ہوتی
 اثرِ اخلاق پر جو اس ستمِ سخی کا پڑتا ہے
 نہ کیوں بے ربط اس سے اپنی تحریر چیں ہوتی
 مذاقِ شعر بگڑا اور طرزِ معاشرت بگڑی
 طبیعت کیوں نہ ہر داغیز باتوں سے حزین ہوتی
 حالی کی ہمنوائی اور مجددِ دین اور مصلحینِ ادب کی سنت کی پیروی کرتے ہوئے وہ اپنے
 شرعی آدرش کی وضاحت کرتے ہیں۔

ادب اور شعر سے جو کام دنیا میں نکلتے ہیں
 یہاں بھی ان کی وقعت کاش مانوس یقین ہوتی
 بھرے ہوتے یہاں خرمینِ حقایق اور معانی کے
 بجائے نکتہ چین گریہ طبع اپنی خوشہ چیں ہوتی
 حقیقی کھینچا جذبات و محسوسات کی شکلیں
 جو چھٹے میں قلم کے عنفیت روح الامیں ہوتی
 اردو ادب اور شاعری بلکہ خود اردو زبان کی اپیل محدود ہونے کا سبب کیسی ہمارے
 ادیبوں اور شاعروں کے اسی انجذاب گدایانہ کو سمجھتے ہیں جس کی وجہ سے عقل و حکمت کا ایسا
 بہت کم سرمایہ ہمارا ادب اکٹھا کر سکا جس تک رسائی حاصل کرنے کے لئے کسی کو اردو زبان
 سیکھنے کا شوق پیدا ہو سکتا۔

زبانوں میں اگر اُردو کو جا ملتی تو کیا ملتی یہ کیوں وقت جہاں میں اپنی کم سے کم تریں ہوتی
 تمنا ہے یہ کبھی کئی بھی اس کی دعا تھ سے ادب اور شعر کی تجدید رب العالمین ہوتی
 یہ معاندانہ تعریف نہیں بلکہ اُردو ادب اور زبان کو بلند سے بلند تر پایہ پر دیکھنے کی کبھی
 کی تمنا کا اظہار ہے۔ کبھی جو اردو حقیقی قومی اتحاد کے کردار کو سمجھتے تھے۔ اپنے ایک کشمیری نثر اد
 عالم، سر تیج بہادر سیرو کے ساتھ اردو کے صحیح موقف کو سمجھانے اور اس کے تحفظ میں ساری
 عمر گزار دی۔

کبھی نے "وگ دید" کے کچھ حصوں کے ترجمے بھی کئے تھے، جن میں تخلیق عالم والا حصہ اہم ہے۔
 اس کے علاوہ گیتا کے فلسفہ عمل کو بھی انہوں نے نظم کا جامہ پہنایا تھا۔
 کبھی کے قیام ریاست کے موقع سے کشمیری کئی نوعمر شاعروں نے فائدہ اٹھایا، اور
 ادیبوں نے بھی ان سے استفادہ کیا تھا۔ شعرا میں سب سے پیش پیش بہنڈت مند لال کول
 طالب ہیں، جن کا تذکرہ آگے آ رہا ہے۔ صاحب زادہ محمد عمر سے بھی ان کے درس نانہ مراحم
 تھے، چنانچہ ان کے "نائک ساگر" پر کبھی نے ایک بسیط مقدمہ تحریر کیا تھا۔

ماسٹر زندہ کول ثابت کشمیر کے بزرگ شعرا میں سے ہیں۔ وہ کشمیر میں عام طور پر "ماسٹر جی"
 کے لقب سے مشہور تھے، کیونکہ انہوں نے اسکول میں مُدرِ رسمی کی تھی۔ نہایت کی ولادت ۱۸۹۰ء
 میں قصبہ مٹن کے قریب میر گاؤں میں ہوئی تھی۔ آٹھویں جماعت تک تعلیم پائی تھی کہ گھر کے نامساعد
 حالات کی وجہ سے نوکری تلاش کرنی پڑی۔ پہلے ایک فوٹو گرافر کی دکان میں ملازم ہوئے۔
 لیکن دل میں پڑھنے کا شوق تھا، دکان میں بیٹھے پڑھا کرتے تھے، آخر ۱۹۰۱ء میں دسویں جماعت
 کا امتحان کامیاب کیا، اور آخر پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ کشمیر
 لوٹنے کے بعد ایک دفتر میں ملازمت اختیار کرنی پڑی۔ لیکن تعلیم و تدریس کا بہت شوق

تھا، لڑکوں کو پڑھایا کرتے تھے، اس لئے ماسٹری مشہور ہو گئے۔

ثابت کی زندگی اور شاعری کے بارے میں پنڈت ترلوکی ناتھ کندن نے ایک دلچسپ مضمون "کوہ نگہ پوش" (سرنگمر-جون ۱۹۵۴ء) میں شائع کیا تھا۔ ماسٹری کی شاعری کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں کہ سکول کے زمانے سے وہ شعر کہنے لگے تھے اور پہلے پہل فارسی میں کہتے تھے۔ شعر سن کر بعض اساتذہ نے ان کی ہمت افزائی کی، لیکن بعضوں نے شاعری ترک کر کے پڑھائی کی طرف توجہ کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن ثابت کا ذوق ترقی ہی کرتا گیا۔ وہ سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں انداز میں لکھتے تھے۔ فارسی کے ساتھ ساتھ کشمیری اور اردو میں وہ شعر کہتے تھے۔ جھگڑتی اور تصوف سے انہیں گہرا لگاؤ تھا، تاہم وہ اپنے عہد کے مسائل سے بیگانہ نہیں تھے۔ چنانچہ اپنے عہد کے ہاگیردارانہ سماج اور اس سے پیدا ہونے والی برائیوں کی مذمت کی اور ایک لکڑی کی زندگی کی نکاسی کرتے ہوئے اس کا اچھا مزاحیہ خاکہ اڑایا ہے۔ اس نظم کے کچھ شعر ہیں:-

ہے بچپن سے دودھ اور انڈے سے نفرت

ہے گھی اور مکھن کی ہرگز نہ عادت

جھگڑے اسی کو ہیں اعلیٰ حقیقت

کھوٹری جو مل جائے آلو مٹر کی

اور ہو لکڑی، لکڑی، لکڑی

پنڈت کندن نے لکھا ہے کہ پنڈت ثابت، 'بھوڑ' کی شاعری سے خاص طور پر متاثر تھے۔ ۱۹۳۱ء میں آزادی کی تحریک برپا ہوئی تھی، پنڈت جی اس کے مؤید اور ہمنوا ہو گئے تھے، اور اپنے عہد کے اور شاعروں کی طرح مطلق العنانی کی پیروی، دستوں اور ظلم و استبداد کے خلاف احتجاج کرتے تھے۔ اسی زمانے میں جب کشمیری میں شعر کہنے کی تحریک چلی تو ماسٹری نے

خسری میں بھی کہنا شروع کیا اور کافی کلام چھوڑا۔ اُردو اور فارسی میں شادی بیاہ، خوشی اور غم کے موقع پر بھی ہوئی ان کی بہت سی نظمیں موجود ہیں۔ پنڈت گندن پنجا سترجی کا بڑا اچھا مصلیٰ بھی لکھا ہے :-

کشمیر کے کہنے مشقِ شاعر، ماسٹر زندہ کول کی صحت اگر اس وقت اچھی ہوتی اور بوڑھا پالا جی بھر پوری طرح غالب نہ آتا، تو وہ آپ کو کہیں نہ کہیں شیروانی پہنے، پگڑی باندھے، لکڑی کے سہا سر پہلتے ہوئے نظر آتے۔ اور آپ بوڑھا پے میں بھی الٹ کی بچوں جیسی معصوم صورت سے متاثر ہو کر غم نہیں بہتے۔ مگر میں ماسٹر کی اکثر انکھیں بند کئے بیٹھے بہتے ہیں اور دل کے تاروں پر سردی نچے چھڑ کر اپنے آپ ہی جھومتے رہتے ہیں۔۔۔ عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں پر آپ کو کافی عبور حاصل ہے۔“

ماسٹر ثابت کی ایک مشہور نظم چھپو رتھنا کے نام سے موسوم ہے، ذیل وہ رچ کی جاتی ہے :-

ہر ذرہ امکان میں ہے جلوہ ترا اسے لامکاں	ظاہر ہے تو باطن ہے تو دونوں جہاں کے ہم جہاں
تجہ سے ازل کی ابتدا، تجھ سے ابد کو انتہا	موجود تجھ سے ہے عیاں، معدوم ہے تجھ میں نہاں
اجسام کی ترکیب میں، ذات کی ترتیب میں	حکمت ہے تیری ہر جگہ قانون قدرت میں عیاں
گزار ہستی میں جو ہر دیکھ کوئی صاحب نظر	میں صاف ہر گل برگ و براس کلک صغٹ کچن
اک ذرہ ہر حسن کا بنجر میں ہے چمکا ہوا	گل میں وہ رنگ و بو بنا، بلبل میں وہ شیریں نیاں
تیرا ارادہ ارتقا تکمیل کو ہے راہنما	ناسوت سے لاہوت تک تدریج کی ہے نریاں
عالم میں ہیں گزربیش و کم عیش و خوشی یا رنج و غم	ہمدردی و ہمت میں ہے مطلب، فلول کا امتحان
تعریف ذاتِ پاک کی، دیدوں نے بھی جرات کی	اول صغٹ میں رہ گئی، میراں یہ عقل نکلتے داں
تو گیانوں کا گیان ہے، تو جوگیوں کا دھیان	تو برہم و ہندو داں ہے، معبود و مقصود جہاں
توفیق دے یا رب ہیں سب راہِ معنی پر چلیں	مند تیری پوجا کا ہو پیلہ وطن ہندوستان

باطل کی ظلمت سے بچا، نورِ حقیقت کر عطا اور مرگ روحانی سے لا، سوے بقلے جادواں
 ماسٹر زندہ کول کو ترتیب، تدوین اور تنقید سے بھی دلچسپی تھی، چنانچہ 'سنہ ۱۸۹۰ء میں پرمانند
 کے انتقال کے بعد انہوں نے ان کی تصانیف کو جمع کر کے اپنے بسیط انگریزی مقدمہ کے تحت
 جلدوں میں شائع کیا۔

پنڈت دوشوانا تھ در جو ماہ تخلص کرتے تھے اور در کا شمیری اور ماہ جموی دونوں ناموں
 سے لکھتے تھے، وادی کے اچھے صاحبِ ذوق ادیبوں میں سے تھے۔ اُردو شاعری سے انہیں بھلا
 گہرا لگاؤ تھا، اس کا اندازہ ہم کو پروفیسر ارجن ناتھ رینہ کے ایک مضمون سے ہوتا ہے، وہ انہوں
 نے ایس۔ پی۔ کالج کے ادبی رسالہ "پرتاپ" (اگست ۱۹۵۷ء) میں ماہ کے بارے میں لکھا
 تھا۔ مضمون کی ذیلی سرخی دی ہے۔ "ایک شاعر جسے اُردو شاعری سے بہت لگاؤ تھا۔"
 ماہ کشمیر کے ایک مضمون گھرنے سے تھے۔ ان کے والد پنڈت در گا پرشاد وزیر لداخ ہیں۔
 ماہ کو اچھی تعلیم حاصل کرنے کے موقع نصیب ہوئے بی۔ اے کی تعلیم ایف۔ ایس۔ سی۔ کالج لاہور
 میں پائی۔ اس کے بعد وہ دہلی چلے گئے اور یونیورسٹی میں ایم۔ اے کی تعلیم فلسفہ میں پائی دہلی
 میں قیام کے زمانے میں، ان کا تعارف مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت کیفی تہ ہوا۔ کشمیر میں ڈاکٹر
 خلیفہ عبدالحکیم کے کشمیر آنے کے بعد، ماہ ان سے بھی متعارف ہوئے۔ پنڈت کیفی کو کلام بھی دکھاتے
 تھے۔ لاہور میں قیام کے زمانے میں، اقبال کی خدمت میں بھی وہ حاضر ہوتے تھے۔ اپنے زمانے
 کے کئی اہم شعرا سے ان کے مراسم گہرے تھے۔

ماہ کی ملازمت محکمہ تعلیم میں رہی، شعروغنی کا ذوق ان کو فطری تھا۔ چنانچہ پروفیسر رینہ
 ان کے ذوقِ ادب کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ماہ کمسنی ہی سے شعرو شاعری کا شوق رکھتا تھا۔ کہتے ہیں کہ سکول میں وہ چھوٹی چھوٹی

تولیوں میں 'بڑی میٹھی آواز سے شعر پڑھتا تھا۔"

ماہ کی طبیعت غزل اور نظم دونوں میں رواں تھی۔ ان کی نظموں میں حب وطن کا جذبہ اور
ہندو مسلم اتحاد کا درد نمایاں ہیں۔ کچھ نظمیں مناظرِ فطرت پر اور کئی نظمیں مذہبی موضوعات پر بھی
لکھی تھیں۔ ان کی ایک نظم "نوشہ روز اور عروسِ بہار" کشمیر میں آمید بہار کے موقع پر لکھی گئی تھی۔
اس کے دو بند ہیں :-

گلشنِ ہستی کا عارض کس لئے ہے لالہ فام آج کیوں ہکا ہوا ہے باغِ جنت کا مہتمام
ہم کو فطرت دے رہی ہے آج کیوں بھر بھر کجام دیکھ ہمدم چشمِ باطن سے تو عالم کا نظام
ہے عروسِ دہر کے رخِ پیر بہار آئی ہوئی
مردنی زالِ خزاں کے چہرہ پر پھانی ہوئی

رفعت سے باز دستاںِ رفعت سے باز خزاں اب کہ ہے باہر بہاری سبز خزاں پر رواں
کانپتی ہے بید کے اشجار پر فصلِ خزاں نوشہ روز بالا بہاراں کی ہے رشاں
دی ندیا ہاتھ نے شاید آگیا نوروز ہے
یا خزاں کے سینے پر اک برقِ خرمین سوز ہے

ماہ کی مذہبی موضوعات پر لکھی ہوئی نظموں میں "کرشن جنم" پر لکھی ہوئی نظمیں اس
موضوع پر لکھی ہوئی اردو نظموں میں جذباتِ عقیدہ تمندی سے ملبو ہیں۔ ایک نظم کا اقتباس ہے:
زمین سے آسمان تک شورشِ حسنِ تاباں کا شجرِ حسن نے اکھاڑا بیجِ ذہن سے ظلم و عصیان کا
مشامِ جانِ عطیہ کر دیا قفا، اس گلی تڑنے جھکایا اس کی گیتا کے مقابل سر جہاں بھرنے
نیا لکھے کہاں یہ حوصلہ ہے حدِ امکان کا ہے نامکمل کوئی پردہ الٹ دے رے جہاں کا
اسی عنوان کی ایک اور نظم کے چند شعر بھی پڑھنے کے قابل ہیں :-

چمک اٹھا ہوا ندھیرے میں نور یزدانی
 کہ یسا دیو کی گود میں خود نظر سبجانی
 ادا اک اک برج کی تار یوں کی آج بانگی تھی
 زمین کیا آسمان بھی موہنی صورت سے جھانکی تھی
 آفتی سے ملہ انور نے بھی ڈر کر سر لگا لٹھا
 کہ آدمی رات کو سورج زمین پہ آنے والا تھا
 ماہ کی مذمتی موضوعات پر لکھی ہوئی نظموں میں ایک اور اچھی نظم "شیر و شکر" ہے جو ۱۹۳۸ء میں
 شائع ہوئی تھی۔ اس نظم میں کشمیر کی برف پوش پہاڑیوں کے پس منظر میں شاعر کے جذبات عقیدت کا
 پھلکا و ایک مخصوص کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ اس نظم کے کچھ شعر ہیں:

زمین پر برف اپنا فرش چاندنی کا بچھاتی ہے
 گہن میں چاند لیکن چاندنی سی چھائی جاتی ہے

بچھی ہے برف کے تودوں میں استی ایک زندانی
 فرشتوں سے کہیں بڑھ کر رخ پر نور نورانی
 جلال ایسا کہ مانگے مہر تاباں جس سے تابانی
 جمال ایسا کہ حسن اپسرا ہو شرم سے پانی
 نہ ہے صورت فقیرانی نہ ہے تیری جہان بینی
 یہی در ہے غنا کر رہے میں جس کی وربانی
 مقبول شیر وانی کشمیر کے قوم پرست فرد تھے، جو ۱۹۴۷ء کے قبائلی ہنگاموں میں بے دردی
 سے مارے گئے تھے۔ ماہ نے ایک نظم میں ان کو سراہا ہے:-

مٹا بیس زار اپنے چسمن پر
 خدا ہو گیا شیر وانی و طہ پر
 اقبال کی نظم "زوال سن" کے جواب میں ماہ نے ایک نظم لکھی تھی: "جس میں حسن کو لازوال
 قلب ہر کیا تھا۔"

علامہ صدیقی سامبوی کا تذکرہ ان صفحات میں آیا ہے۔ وہ مائٹنڈ کے ادبی شماروں کے
 لئے کبھی کبھی ادیبوں اور شاعروں کے خاکے لکھا کرتے تھے۔ ماہ کا خاکہ بھی انہوں نے لکھا تھا۔ اس کا اقتباس
 درج ذیل ہے:-

”نام وشوانا تھ، تخلص کبھی دراکبھی ماہ۔ جب جموں چلے جاتے ہیں۔۔۔۔۔ تو ماہ جموی کہلاتے ہیں، جن دنوں کشمیر میں قیام رہتا ہے۔۔۔۔۔ تو اپنے آپ کو دراکشیری سے موسوم کرتے ہیں۔ غرض دراکشیری اور ماہ جموی مترادف ہیں۔“

”خاصے جوان ہیں، قد کسی قدر پست، خوبصورت، بانگے بانگے، چست بدن، عینک پہننے کے عادی، انگریزی وضع پر فریفتہ، سگریٹ اور پان کے دلدادہ، راگ و رنگ کے مشتاق، خوش گویا، خوش تمیز، صاحبِ بہمت اور بلند۔“

”آپ شاعر بھی ہیں، ناشر بھی ہیں، ڈراما نویس بھی، مزاح نگار بھی۔“
 ”آپ کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ انکشاف حقیقت، تلاش حقیقت، اب سننے میں طبیعت، ڈراما نگاری کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ تھی۔“

ماہ نے کچھ ڈرامے بھی لکھے تھے۔ اور کچھ مضامین اور انشائیے بھی ان کی یادگاریں۔ انشائیے ادبِ اذیت کا انداز رکھتے ہیں۔ ان کا ڈراما ”شہزادی نوشہ“ جو ”ماہِ بند“ کے ۲۷ ستمبر ۱۹۷۱ء کے ادبی شمارہ میں شائع ہوا تھا، اچھا مختصر ڈراما ہے، سکندر انغم کی نوعمری کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے اور اس سے سکندر کی توجہ مندی ظاہر ہوتی ہے۔ اس کا ایک کردار ارسلو بھی ہے، سکندر کا باپ فلپ، یونانی فتوحات کے بعد مقدونیہ لوٹ رہا ہے، بشہر میں چراغاں ہو رہے ہیں۔ سکندر کی ماں، خوش خوش رنگا میں مصروف ہے۔ شہزادہ سکندر اپنے کمرہ میں غموم بیٹھا ہے۔ ملکہ سکندر کو بلانے کے لئے خادمہ کو بھیجتی ہے۔

”نوکرانی۔ حضور ملکہ بلاری ہے (جواب نہیں ملتا)۔ رعب سکندر سے نوکرانی واپس جاتی ہے۔ (ملکہ سے) شہزادہ، معاصرت چپ چاپ بیٹھے ہیں، میں بولی جواب نہ دیا۔ ملکہ۔ کیا وہ ہے؟ (سوچ کر) اچھا، ان کے استاد، ارسلو کو فوراً بلا بھیجو میں بھی چلتی ہوں۔“

(شہزادہ کا کمرہ۔ ایک طرف ارسلو ذرا غافل پر بیٹھا ہے، دوسری طرف ملکہ سکندر کے بہت

نزدیک بیٹھی ہے۔ تین چار نوکر لائیاں پاس کھڑی ہیں (

ملکہ — آج یہ ادا کیسی بیٹا! قاری گھر آ رہے ہیں، شہر دہلن بن رہا ہے۔ شہری خوشیاں من رہے ہیں، میرا تخت جگمگائیں ہے، یہ کیوں؟

سکندر — خوب، امی جان، خوب

ملکہ — مطلب نہیں سمجھی بیٹا..... میری جان، دشمنوں کو کیا تکلیف ہے؟

ارسطو — ایسی غلگین صورت ہیں بھی بھلی نہیں معلوم ہوتی، بیٹا تمام یونان آج ہمارا اوجھڑکا ہے۔

سکندر — یہی تو رونہ ہے۔ (ملکہ سمجھی نہیں، لیکن ارسطو سمجھ گیا ہے۔ مسکراتا ہے)

ارسطو — بتاتے کیوں نہیں بیٹا۔

سکندر — یہ سلسلہ جاری رہا تو میرے نتیجے کرنے کو کیا رہ جائیگا!

ماہ کے انشاءوں کے موضوع زیادہ تر مذہبی ہیں۔ "پریم کی آہوتی" "بھکشا" اچھے پیارے ہیں۔

ماہ کے بھائی جیون نے فلمی دنیا میں بڑی شہرت حاصل کی۔

ماہ کی اہلیہ بھی پاکیزہ ادبی ذوق رکھتی تھیں۔ ان کی ہندی امیر مذہبی موضوعات پر لکھی

ہوئی کچھ نظمیں "مارٹنڈ" میں شائع ہوئی تھیں۔ ان نظموں میں بھکتی کی بھلاکت ہے۔ ایک نظم "بھکتی

کے چند پھول" — بھگوان شیو کے چرنوں میں اچھی نظم ہے۔ اس کا اقتباس درج ذیل ہے

پیارے، پیارے میں بلہاری مستی کے شکر پیارے

گنگا بنتی، سیس میں رہتی سندی پیٹھ چڑھائے

اس جیون سے خاک ہی بنتی شکر کنٹھ لگائے

لکڑی بن میں راکھ ہو جاتی شکر بمسم رماے

ورشا ہوتی، چرن میں دھوتی وایو چرن دھلاے

یہ تن تیاگ سنگھ بن جاوے بھولا جسے بجائے
 رو رو کر سب رین گزار دوں بھٹک بھٹک دن سارا
 بھٹکتی دان کرداب شکر درشن پاؤں تمہارے

ان کی دوسری نظمیں جیسے "پریم بھکشا" وغیرہ بھی اسی طرح کے نرم جذبات اور سلیس زبان میں لکھی گئی ہیں۔

دشونا تھماہ کے معاصرین میں قیس شیروانی، شاعری اور افشا میں خاصی شہرت رکھتے تھے۔ جموں ان کا وطن تھا، اور وہیں تعلیم بھی حاصل کی۔ ابتداء پر دہادی کے علاوہ شاعری کا بھی ان کو ذوق تھا، اور کچھ کلام ان کی یادگار ہے۔ قیس ایک سکول میں معلم تھے، لیکن ان کو ہنسا پروازی اور شاعری کی بدولت کافی شہرت حاصل تھی۔ اس زمانے کے کچھ نوجوان شاعر قیس سے مشورہ سخن بھی کرتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں فانی و چارناگی کا ذکر آگے آ رہا ہے، جو اچھے شاعر اور انشا پرداز تھے۔ قیس اور غلام حیدر خاں مہشتی دونوں کی مشترکہ ادارت میں 'پاسپا' شایع ہوتا تھا۔

قیس کی ایک نظم جو یو راج کرن سنگھ کی ولیعہدی کے زمانے میں سالگرہ کے موقع پر لکھی گئی تھی، اس کے کچھ شعر حسب ذیل ہیں۔ یہ گویا اہل مونیوں کی تشبیہ ہے، جس سے ان کی منفرد نگاری کی صلاحیت پر روشنی پڑتی ہے۔

دیدنی ہیں دہر کی زریا بشیں ہر طرف ہے حسنِ فطرت کا نکھار
 ہر قدم پر حسن، ہر منظر حسین کیوں نہ ہو چشمِ تمنا کا مکار
 گل ہیں ہر جا کارواں درکارواں صحنِ گلشن ہو کہ ادراج کو ہسار
 باغ میں اتر کے چلتی ہے نسیم دامنِ موجِ صبا ہے مشکبار

ہن گیا ہے خلغدار رنگ و بو ہرچین ہر گلستان ہر لالہ زار
ہیں جلو میں مستیوں کے قافلے آراہی ہے فصل گل مفتاحہ وار

قیس کی ایک غزل کے دو شعر حسب ذیل ہیں :-

ترے پردہ کا سایہ پڑ گیا شاد و متبیر یہ سلی اب نکلنے کی نہیں اس محل دل سے
بھائی ! پھر تمہارے عشق کی فہم بھی مرے لب پر یہ مے چھلکی نہ پھلکے گی کبھی پیمانہ دل سے

صاحب زادہ عبدالرحمن زکی، صاحب زادہ محمد عمر کے چھوٹے بھائی، شعر و ادب کے ذوق
میں اپنے بھائی سے پیچھے نہیں تھے ان کا انتقال کم عمری ہی میں ہو گیا۔ انتقال کے وقت وہ بیات
کی قانون ساز مجلس کے انڈر سیکریٹری تھے۔ ان کی سنجیدہ فکر اور پاکیزہ مذاق نے انہیں اپنے عہد کے
ادبی حلقے میں ایک نمایاں مقام عطا کیا تھا۔ میرزا کمال الدین شیدائے کربلا کا ذکر آگے آ رہا ہے
وہ گہرے دوست تھے اور دونوں میں دلچسپ شعری صحبتیں رہا کرتی تھیں۔ ان کا زیادہ کلام رشتیاب
نہیں ہوتا، لیکن ان کی ایک کسی قدر طویل نظم ہے، جو انہوں نے میرزا شیدائے کربلا کی نظم "احساس منظر"
کے جواب میں لکھی تھی، ان کی سلاست طبع اور شاعرانہ بالغ نظری پر روشنی پڑتی ہے۔ ذکی کی نظم کا
عنوان ہے۔ "سوز منظر"۔ "سوز منظر" کا ایک جواب پھر شیدائے کربلا نے "ماہصل منظر" کے عنوان سے لکھا تھا۔ یہ
تینوں نظمیں ایک رسالے کی صورت میں ذکی کے مقدم کے ساتھ مرتب کی ہوئی، مجھے شیدائے کربلا کی تھی،
جسے میں نے مجلس تحقیقات اردو برہنہ نگر کشمیر، ۱۹۶۷ء میں شائع کیا۔

"سوز منظر" میں ذکی نے صبح کی جان کنش نفہات کچھ معنوی تاثرات تلاش کرنے کی کوشش
کی ہے۔ یہ کوئی پختہ شعر کی نظم ہے، اور اسی بحر میں لکھی گئی ہے، جس میں شیدائے کربلا نے "احساس منظر"
لکھی تھی۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :

صبح کا منظر یہاں ہر سو اداس جذبہ قلب و نظر و فہم و فہم یا اس

اس میں گریہ کا ہے اک طوفان نہاں تم سمجھتے ہو جسے آبِ رواں
 یاس کے یہ جذبات شاعر کے دل میں انجام کار گل کے خیال سے پیدا ہوتے ہیں اور شاعر کو سوزِ غم
 عطا کرتے ہیں، کہتے ہیں :-

دل کے تاروں پہ ہے غمِ مفرابِ زن سوزِ نغمہ میں ہے دوزخ کی جلن
 آنسوؤں کے تارِ نغمہ سازِ دل سوزِ جن کا ترجمانِ رازِ دل
 ان کی ہم آہنگ جانِ کائنات کامگار ان سے نہاں دردِ حیات
 سیں اشکِ زندگی ہے آبِ بحر یا ضمیرِ آرزو کا ہے لہو
 سوزِ دل کی کمی کا شاعر کو قلوب ہے۔ حالانکہ یہ نقشِ بند کائنات ہے اور :-

اس سے ہے ناموسِ دل تابندہ تر اس سے سعیِ عرش میں سوز و اثر
 اس کے ہی دو قطرہ ہر و ماہ میں روز و شب اس سے تجلی خواہ ہیں
 حُسنِ شاعر کو ہر جگہ پیدائی دکھائی دیتا ہے، لیکن عشق کی نایابی کا اسے افسوس ہے۔
 کہتا ہے :-

صن وافرِ عشق اب نایاب ہے اب جوئے ذوقِ دل پایاب ہے
 کامگاریِ عشق کی اب ختم ہے نام داریِ عشق کی اب ختم ہے
 زندگی میں سوزِ پنہائی نہیں روح درد و ذوق و جدائی نہیں
 آرزو سے دردِ فریادی نہیں دل میں ذوقِ غم کی آبادی نہیں
 جو غلش کی زندگی تھی جستجو مٹ چکی عالم میں اس کی آرزو
 قصہ پارینہ جو ہے شیر ہے رومے عشقِ یار بے تنویر ہے

آگے رشید اکو دعوت دیتے ہیں :-

آؤ شیدا، عشق کا ماتم کریں یہ جہاں کانہ لوں برہم
نظم غزل پر ختم ہوتی ہے۔

عشق پھرتا خانماں برباد ہے سرد سٹی تیشہ و سر ہاد ہے
عشق کی ہوتی عزاداری ہے آج حسنِ مجونالہ و فسریاد ہے
عشق عفا باغِ عالم میں ہوا دامِ بار بازو و صیاد ہے
میں بھی تو دیکھوں ذرا شیدا جہاں کس کا سید عشق سے آباد ہے
عشقِ رخصت ہو چکا محرومِ حال سوزِ دل، فریاد ہے، فریاد ہے
ذکیٰ کی یہ نظم اپنے عہد کے چوکھٹے میں، غیر کئی تصورات اور اظہار کی اُپرچ کی وجہ سے کچھ اجنبی تصویر
سی لگتی ہے۔

ذکیٰ اچھے انشاء پر واز بھی تھے۔ ان کی انشا کا حرف ایک نمونہ اس مقدمہ کی صورت
میں باقی رہ گیا ہے جو انہوں نے ان تینوں نظموں کے مجموعے کے لئے لکھا تھا، اور جس کی طرف ادیب
بشارہ کیا جا چکا ہے۔ اس مقدمہ میں ادبیت ہے اور اس کا ایک تاریخی اہمیت بھی ہے۔ اس میں
انہوں نے کثیر میں اردو ادب کی تحریک کے ارتقاء کی طرف بھی کچھ اشارے کئے ہیں۔ مقدمہ سے
ایک اقتباس ذیل میں درج ہے :

”کثیر میں اردو ادب کا دور اولین عملی طور پر جو دھری خوشی محمدناظر، مولانا عبد الحمید
مفتی محمد حسین، کثیر میں مفتی الدین قمر قزازی اور غاں صاحب منشی سراج الدین کی ادبی کاوشوں کا
مرہونِ منت ہے۔ ان ایام میں مشاعرے اور ادبی محفلیں عام طور پر غاں صاحب منشی سراج الدین کے
دوات کہہ دیاں طباغ اور شاہلار میں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ ان محدود ادبی اجتماعوں نے کثیر
کی اس نئی پودیر بھلور اثر کیا، جو حصولِ تعلیم میں مصروف تھی۔“

بھرنے والی نئی پود کے شاخوں میں دیکھی گئی تھی۔ شیخ غلام حیدر خان چشتی، میرزا مبارک بیگ مبارک اور پنڈت اقبال کشن در کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ دکنی اس زمانے کے ادبی ذوق پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں :-

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اس وقت نہ صرف کافی ادبی شعور بیدار ہو چکا تھا، بلکہ معیارِ کلام بھی بلند اور دلکش تھا۔

تیسرے دور میں کالج میں پڑھنے والے ان ہونہار طلباء کو شامل کرتے ہیں جو جلد ہی منظرِ عام پر آگئے۔ انہیں میں میرزا کمال الدین شیدا کو بھی شامل کیا ہے۔ دکنی نے میرزا شیدا کی شاعرانہ صلاحیتوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ پنڈت مند لال بے غرض بھی اُس زمانے کے نمایاں لکھنے والوں میں سے تھے۔ ذوقِ شعر انہیں اپنے والد پنڈت ٹیکالال در قانع سے ورثاً ملا تھا۔ ان کے دادا پنڈت داسر کا بھی شاعر تھے اور باسکر تخلص کرتے تھے۔ اس طرح اس خاندان میں تین پشت تک ادبی اور علمی ذوق چلا آیا۔ بغیر غرضی سر پر تاپ کو لیں مدرسی تھے۔ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے، اور ایک تاریخ بھی فارسی متر میں لکھی تھی، جو غالباً ان کے فرزند لالہ نسیم کنھ کے قبضے میں ہے۔ لیکن بغیر غرض کا زیادہ کلام اردو میں ہے۔ وہ اچھے مضمون نگار بھی تھے اور زیادہ تر مذہبی موضوعات پر اور مذہبی تہواروں کے موقع پر لکھا کرتے تھے۔ اردو شاعری میں بغیر غرض نام اچھا معیار حاصل کر لیا تھا اور کافی کلام سر انجام کیا، چنانچہ ان کا اردو اور فارسی کلام دو مجموعوں کی صورت میں بدو، ہوا ہے، جو 'جام و عدت' اور 'ترانہ بغیر غرض' کے نام سے موسوم ہیں۔ ان کے فارسی کلام کا نمونہ درج ذیل ہے :

گفتم جو ہم خاک پا، گفتا بکوی من در آ	گفتم ندانم راہ او، گفتا برو دیوانہ باش
گفتم کہ بنیم رو برو، گفتا دوی را ترک کن	گفتم کہ قربانت شوم، گفتا کہ چون پڑا زبانش

سُدم بخود چو مجنوں در پہ دیدار آن سیلا بشوقِ سنگِ طفقانِ اُطرف دیواندی رقصم
 اردو میں بیغرض نے غزلیں اور قومی اور اخلاقی نقیصں کہی ہیں۔ ان کی غزل میں کہیں کہیں قصوف کا
 مارنگ جھلکتا ہے۔ ان کی غزل کے کچھ شعر ہیں:۔

شبِ فرقت بلاے بدھے، ٹائے سے نہیں ٹپتی نہ پوچھو دل لگانے کی سزائیں نے یہ پائی ہے
 نہیں سنا وہ ظالم، بیغرض شکوہ ہے لا حاصل میں تنہا اس طرف اور اس طرف ساری خدائی ہے
 ان کی قومی اور اخلاقی شاعری کے کچھ نمونے ذیل میں درج ہیں:۔

ما فی تمہارا کیا ہوا، کیوں حال سے بد حال ہو ہمت اگر کچھ تم میں ہو، ہر خار رہ گلِ قلم ہے
 بس غافل ہو، شیار ہو، غفلت کی نیندیں سوچکے سر پر تمہارے کھیلی، شمشیرِ نولِ آشام ہے

حسنِ باطن اور بے شکل دشمن پر نہ جبا بے خبر کھاتا ہے دھوکا ظاہری تصویر سے
 بیغرض اکثر "مارٹنڈ" کے ادبی شماروں کے لئے لکھتے تھے۔ شیورائری سال نو (نورہ) اور پنڈتوں
 کے دوسرے تیوہاروں کے موقع پر ان کے مضامین اکثر شائع ہوتے تھے۔ "مبارک سال نو" "جو مارٹنڈ"
 کے 9 اپریل ۱۹۳۸ء کے شمارہ میں اور "شیورائری اور کشمیری پنڈت" (مارٹنڈ ۲۸ فروری ۱۹۳۸ء)
 اور "دیہ سال نو" جو اسی اخبار کے اپریل ۱۹۴۲ء کے شمارے میں شائع ہوئے ہیں۔ شیورائری پر ان کے
 ایک مضمون کا اقتباس ذیل میں درج ہے:۔

"مقتدرِ ناظرین، راقم آپ کے طاثر خیال کو اب سے ڈیڑھ سو سال گزشتہ کی طرف
 سبک پرواز ہونے کی تحریک کرتا ہوں، اس وقت کے حالات پر ایک چھپکتی ہوئی
 نگاہ ڈالنے کی دعوت دیتا ہوں، جبکہ یہاں کے ہندو (کشمیری پنڈت) حکمران وقت
 کے ہاتھوں گونا گوں مظالم اور مصائب کے تہمتہ مشتبہ بنائے جاتے تھے۔ تاہم اس کے

”انہیں تیماروں کے منانے اور کھلے بندن یا دالہی عبادت یومیہ ادا کرنے کی اجازت نہ تھی۔“
 بے غرض کے کلام کا مجموعہ ”تازیانہ عبرت“ کے نام سے مرتب ہوا تھا لیکن شائع نہیں ہو سکا۔

بلدیہ کوشن بنگو قومی اور اخلاقی شاخری میں شہرت رکھتے تھے۔ ان کے والد ریاست کے محکمہ پولیس کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ بلدیہ کوشن ملازمت کے سلسلے میں کچھ عرصہ لاہور میں بھی رہے، جہاں وہ محکمگی میں کام کرتے تھے۔ ریٹری میں وہ زیادہ تر قومی اور اخلاقی انداز کو پسند کرتے تھے۔ عشقِ غزل انہوں نے شاید ہی کبھی ہو۔ ان کا اردو دیوان مرتب ہوا تھا، لیکن غالباً شائع نہیں ہو سکا۔ ان کے کچھ شعر ہیں:-

نہ وہ اوصاف ہیں ہم میں نہ وہ الفت ہیں لی میں ہماری غفلتوں سے دیکھئے سارا وطن بگڑا
 ذرا دیکھو تو بگڑی کس قدر حالت ہماری ہے روش بگڑی، چلن بگڑا ہمارا پیرا بن بگڑا
 آذر عسکری اسی زمانے کے اچھے شاعروں میں شمار ہوتے تھے۔ انہیں گھڑی سازی میں مہارت تھی اور لال چوک میں بگنی اینڈ کو میں گھڑیاں درست کیا کرتے تھے۔ مزاحیہ انداز میں وہ خوب کہتے تھے اور جب مشاعروں میں اپنا کلام سناتے تو سارے مشاعرے پر چھا جاتے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔

پہنڈت دینا ناتھ مٹو دکنگیر اس مہدی کی تیسری دھانی کے کٹھیری ادبوں میں پیش پیش تھے۔ ان کے خاندان میں فارسی کا چرچا تھا۔ دادا پہنڈت کرشن داس مٹو، کشمیر کے گورنر کے دفتر میں میمنٹھی تھے۔ دکنگیر ۱۸۴۲ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی تعلیم بھی خاندانی روایت کے مطابق فارسی میں ہوتی تھی اور پنجاب یونیورسٹی سے منشی عالم کا امتحان پاس کیا تھا۔ بعد میں ایف۔ اے بھی اسی یونیورسٹی سے کامیاب کیا۔ اور پنجاب میں منشی اسکول میں فارسی کے مدرس ہو گئے تھے۔ گورنمنٹ ہائی اسکول مظفر آباد میں بھی فارسی کے استاد کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ ابتدا سے ان کی طبیعت شعر و سخن کی طرف مائل تھی اور اردو کے علاوہ

کشمیری میں بھی شعر کہتے تھے۔ قوی اور ہندو مذہبی تحریکات کا دیگر پر بہت اثر تھا، اور اکثر نظمیں ایسی شریعت تحت لکھی تھیں۔ ان کی ایک نظم جو "تحریک انجمن امداد قرضہ" کے عنوان سے لکھی گئی ہے، اس کے دو شعر یہ ہیں:

جان لو کسی فراغت بخش ہے تحریک یہ خود ہب را بہد جہاد جس نے ہوں روح رواں
اس سے حاصل فیض اہل ملک کو ہو دے سدا ہاں یہی دیگر کی تجھ سے دعا ہے 'اے خدا'
دیگر نثر ل بھی کہتے تھے اور انھی کہتے تھے۔ ان کی مختلف غزلوں سے اقتباسات ذیل میں، درج ہیں۔
گرہ جب اس نے دی ناز و اداسے اپنی زلفوں میں بہم سب جڑ گئے یہ عشق کی زنجیر کے ٹکڑے
گرمیاں زاہدوں کے جب نہیں محفوظ وحشت سے نہ کیوں ناصح کے ہوں پھر دامن تنزدیر کے ٹکڑے
بھلا لکب چھوڑے وہ اپنے وطن کی پاک مٹی کو جسے گھر بیٹھے ہی مل جاتے ہوں تقدیر کے ٹکڑے

دل جو پامال خیال دید جاناں ہو گیا گویا عکس شمع پر پردانہ شریباں ہو گیا
لوگ کہتے ہیں سنبھل جاؤں گا لیکن ہے اب فرط سودا یا غث چاک گرمیاں ہو گیا
دیگر خواہ فسانہ نگاری کا بھی شوق تھا، گو ان کے افسانوں میں جدید عہد کے فنی محاسن کم ملتے ہیں۔ پھر بھی اپنے زمانے کے وہ مقبول افسانہ نگار مانے جاتے تھے۔ ان کے افسانے اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ ایک افسانہ مندر "جوسماجی زندگی کے ایک مخصوص پہلو پر لکھا گیا ہے" اچھا افسانہ ہے۔ سماج اور سماجی اصلاح کے موضوعات پر ان کے کئی مضامین شائع ہوتے رہے۔ پندتوں میں کمسن بیوہ کی حالت زار ہمیشہ منظر میں لانے کی تحریک اس زمانے میں عام تھی اور احساس رکھنے والے پندتوں نے مضامین، افسانوں اور نظموں کے ذریعہ اس طرف توجہ منحطف کرانے کی کوشش کی تھی۔ اس سلسلے میں دیگر نے ایک بال و دھوا کا دکھڑا اپنی ماں سے بیان کرنے کا اندوہناک منظر پیش کیا ہے۔ اس میں تھوڑا سا افسانہ پن بھی پیدا ہو گیا ہے۔

دیگر مارنڈ کے ادبی شماروں اپنے معاصر ادیبوں اور شاعرانہ کے چہرے "علامہ صدیقی سانہوی" کے فرضی نام سے لکھا کرتے تھے۔ یہ چہرے یا خاکے "ارکین محفل ادب" کے کالموں میں شائع ہوتے رہے۔ ایک خاکہ انہوں نے پردیسی کا لکھا تھا جس کا اقتباس آگے دیا جا رہا ہے۔ ایک شمارہ میں انہوں نے خود اپنا خاکہ پیش کیا تھا۔ جس کا آغاز اس طرح کیا ہے :

"حضرت دیگر ڈرا سنبھل کر بیٹھ جائے، ہلے جھلے نہیں تصویر کھینچتی ہے۔ آپ کی طرح شعر نہیں کہتا ہے۔ کیا کر دیا ہے چھپو دیا ہے خبردار، ایک، دو، تین، لیجئے جناب یہ رہی آپ کی تصویر پر پیش کر دی۔ مہور کے خلاف ہمیں سازش نہ کیجئے گا....."

آگے حلیہ لکھا ہے اور اپنے عادات بیان کئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنی تحریر کی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ ان کی عبارتیں چست اور انداز دلکش ہوتا ہے اور زبان میں محاورے اور کبھی کبھی ممتنع نگاری کے چٹارے بھی ہوتے ہیں۔ پریم ناتھ پردیسی بھی مولانا غلامی کے نام سے ارکین محفل ادب کے لئے خاکے لکھتے تھے۔ ایک دفعہ ادبی حلقوں میں یہ بحث چھڑی تھی کہ مولانا غلامی اور علامہ صدیقی سانہوی کے خاکوں میں سے کس کے خاکے بہتر ہوتے ہیں۔ دونوں کے خاکوں کی اضافی اہمیت پر غور کرنے کے لئے "مارنڈ" کے دفتر میں ۱۵ مارچ ۱۹۳۸ء میں ایک محفل کا انتظام کیا گیا جس کی صدارت نند لال طالب نے کی تھی اور دیتا ناتھ دارکو شاہ کشمیری، شام لال ولی تیرتھ کشمیری، شام لال ایمہ اور خود دیگر پردیسی بھی محفل میں شریک تھے۔ دیگر نے آخری زمانے میں اسماعیل میٹھی کے انداز کی آزاد نظم لکھنے کی بھی کوشش کی۔ ان کی ایک نظم اسماعیل کی "تاروں بھری رات کے انداز پر لکھی ہوئی" مارنڈ کے ایک شمارہ میں شائع ہوئی تھی۔ اس نظم کا اقتباس یوں ہے:-

اے جگ جگ جگ کرتے ننھے ننھے تارو

تم لیلائے شب کے رہنے ہو ، اے جھل جھل جھل کرتے ہوئے شبیم کے پیارو

تم ذریعہ آبیاری گلزار می بنے ، اے جھل جھل جھل کرتے تارو.....

دیگر کے فرزند ویر ویشورا اس عہد کے آخری برسوں میں بہت نمایاں رہے اور کشمیری ادبی چہل پہل میں حصہ لیتے رہے۔ ان کا حال آگے آ رہا ہے۔

ملک محی الدین قمر قمری تحصیل کوکام کے رہنے والے تھے۔ یہ علاقہ کابل میں واقع ہے۔ اس تعلق سے انہوں نے قمری و قمری کا راج نسبت اختیار کی تھی۔ ان کا خاندان پشیمین کی تجارت میں شہرت رکھتا تھا اور ہندوستان سے باہر بھی وہ پشیمین کی برآمد کرتے تھے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں جیسے دہلی لکھنؤ، شملہ اور امرتسر میں بھی ان کی تجارتی کوٹھیاں تھیں۔ قمری ولادت ۱۸۹۶ء کو کنگ جگ ہوئی تھی، یہ کنگ کا بیاب کرنے کے بعد وہ انٹر ملے گئے جہاں انہوں نے حکیم فیروز الدین طغرانی سے تلمذ اختیار کیا اور فارسی کے درس کی تکمیل کے علاوہ فنی شعریں بھی مہارت حاصل کی۔ حبیب کیفی نے طغرانی کے ارشد تلامذہ میں شمار کیا ہے قمر کو فارسی میں شعر کہنے کی دلیسی ہی مہارت تھی جیسے اردو میں کہنے کی۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ سلسلہ ملازمت میں داخل ہو گئے اور کچھ عرصہ اورٹی میں تحصیلدار کے عہدہ پر فائز رہے۔ پھر ترقی کرتے کرتے وہ افسر مال ہو گئے تھے، لیکن ملازمت کی مصروفیتوں کے باوجود ادبی اور شعری مشاغل جاری رہے۔ ۱۹۵۹ء تک کہا ہوا کلام، ایک مجموعے کی صورت میں مرتب اور "ارمغان کشمیر" حصہ اول کے نام سے شایع ہوا ہے۔ اس وقت وہ پاکستان میں مقیم ہیں قمر غزل اور نظم دونوں اصناف میں کہتے ہیں۔ ان کے مجموعہ کلام پر مقدمہ لکھتے ہوئے محمد حسین عرش، اڈیر ماہ نامہ فیض الاسلام، راولپنڈی نے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

"قمر صاحب کی ہمہ گیر طبیعت نے ہمہ گیر شاعری کی ہے اور ہر صنف میں اپنے جوہر کو کھائے ہیں اور مجموعہ کلام کی اہمیت کے بارے میں لکھا ہے:

ادب کے ساتھ ساتھ اس گلستان فکر و تخیل کی ایک تاریخی اہمیت بھی ہے۔

ایک محقق ادب کو اس میں نصف صدی تک کے ادبی ادوار و ارتقار کے نمونے

میں گئے، جو کسی اور مجموعے میں شاید ہی مل سکیں۔"

شاعری کے آغاز میں قمر کے فکر و تخیل پر اور نوعمر شعراء کی طرح، حسن و رومان کی پرچھائیں

تھیں، لیکن زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ ان کی فکر میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوتی گئی۔ غزل سے ہرطہ کر

آثار ذیل کے اشعار میں نظر آتے ہیں :

عشق زینہ گلگون کا مسرخ ہو گیا مجھ کو
لکھ دیں مرے قہقہے میں اطبا عرق گل

وہ تیکس ہوں کہ ہنستا ہے زمانہ دیکھ کر مجھ کو
اثر لائی ہے اپنی زرد روئی زعفران ہو کر

بت بہرستی گرنہ ہوتی حق پرستی کا اہول
کعبہ کہلاتا ہے جواب کیوں وہ کبھی بیت خانہ تھا

میں نے یہی فکر و اسلوب کے لحاظ سے قہر کے لئے انداز فکر کے آثار نظر آئیں گے :

پھرتا ہوں تجس میں تیری صحر اصرار ۱۲۱	لا تا ہوں جدائی میں تیری دجلہ و جلیقوں کیوں
زلفیں وہ تیری مشکیں مشکیں آنکھیں وہ تری میگوں میگوں	جس دہشت غم یاد آتی ہیں ہستی کا رنگ جماتی ہیں
زرجوں جوں ہاتھ میں آتا ہے ہوتی ہے ہوس افزوں افزوں	یہ سنو تھر نہیں دہوا دنیا میں کسی سے مل نہ ہوا
یہ دل میں سگتی راتی ہے ہنسی ہنسی، مکتوں مکتوں	یہ ہنسی وہ آگ ہے بجھتی ہی نہیں ہے بجھانے سے
ہر مصرعہ ہے جب جلاو جلاو ہر شعر ہے جب افسوں افسوں	یہ تیرا سرشار سخن، تسیم نہ ہو کیوں ناز سخن

قرآن و ریاست کے عہدہ دار اور شاعر ہونے کے لحاظ، حکمرانوں کی مدح سراہی بھی کرنی پڑتی تھی۔
اس نے ہندو بہرہری سنگھ کی سالگرہ کے موقع پر ایک قصیدہ لکھ کر ہمالہ کی خدمت میں پیش کیا۔
نہ خیر الما ترن فرما کے یکم اکتوبر ۱۹۳۳ء کے شمارہ میں شائع ہوا۔

باقی ہیں نجوم و قمر اطلاق پہ جب تک
جب تک کہ ان اجرام پر مشورہ نہ ہو فیروزانہ
جب تک کہ تبسم رہے غنچوں کے لبوں پر
جب تک کہ دم نامیہ نے دلوں میں
یہ گلبن اقبال ہمارا ہر ہری سنگھ
شاداب و تروتازہ دسر سراسر رداں
یارِ بیا سحر و شام بھی دردِ زباں ہے
درگاہ میں مقبولِ قمر کی یہ دھماہوزں
قمر کو بھی اپنے دوسرے ہمنواؤں کی طرح اس کا شعور تھا کہ وہ ایسی سرزمین کا رہنے والا...

جنتِ ارضی سے موسوم کی جاتی ہے اور اس زمانے سے 'مادرِ وطن کی توصیف ان کا فرض تھا، لیکن اسی
فرض کو انہوں نے اپنے انداز سے پورا کیا ہے۔ کشمیر کے بارے میں لکھی ہوئی ان کی نظم ہے:

جہاں پر مسرت ہے رنج و الم میں جہاں شادمانی ہے پوشیدہ غم میں
جہاں رنگِ الفت ہے طرزِ تبسم میں جہاں نوشدارو کی لذت ہے غم میں
بہت طول تمہید طول سخن ہے

بتادوں کہ وہ سرزمینِ وطن ہے

وطن بھی کہ جو انتخابِ جہاں ہو جہاں کا ہر ایک ذرہ اکسیرِ جاں ہو
ہر اک کوہ جس کا جو اہرِ نشان ہو بیاباں ہر اک غیرتِ بوستان ہو

فلک سے سحاب ایک لحظہ جو برسے

زمین گنجِ بن جائے گل ہا سے زرسے

قمر نے کشمیر کے حسن اور اُس کے منظری محاسن پر کئی نظمیں لکھی ہیں۔ ذیل کی نظم 'بحرِ کی روانی
اور نرمی کے سبب قابلِ مطالعہ ہے۔ یہ نظم مستزاد کی شکل میں ہے اور کشمیر سے باہر لکھی گئی ہے۔ اس کا
انتباس ذیل میں درج ہے:

پھرتی ہے مری آنکھوں میں ہر دم تری تصویر
اسے وادیِ کشمیر

فلسفی اور باغ انظرش عرفی۔ آپ کی ملاقات مجھے ۱۹۴۶ء
 میں فیض پور میں..... ڈاکٹر صاحب کی شخصیت آسانی سے بھلائی جائے والی نہیں تھی۔
 بڑے قد تھے، بظاہر کم گو تھے مگر شعر لہریز۔ اجنبی کی صحبت سے بھاگتے تھے، شعر و ادب کی
 جان بولتے، کھینچ کر چلے آتے تھے۔ ایک وٹرنیری ڈاکٹر کا ملکوئی تخیل دیکھ کر عقل حیران
 رہ جاتی تھی۔ شام کی صحبت میں اکثر وجدانی کیفیت رہتی تھی۔ اُن کا سرور مستعار تھا کہ مے
 سینے ان کا شعار تھا۔ یہ وٹون سے نہیں کہا جاسکتا کہ انہیں بادہ حق کا جام نصیب ہوا
 تھا۔ یہیں مگر ان کے کلام میں تصوف کی گہرائیاں ملتی ہیں :-

ڈاکٹر سوز کا کلام عام طور پر دستیاب نہیں ہوتا۔ میرزا کمال الدین شیدا نے سوز کی ایک غزل کے تین شعر سنائے تھے، جو سوز نے ایک مشاعرہ میں پڑھے تھے۔ یہ مشاعرہ میرزا کمال الدین شیدا کے مکان پر منعقد ہوا تھا۔ عارف نے یہ شعر گریز میں نقل کر دیئے ہیں۔ مشاعرہ کی طرح تھی: ع۔

ہر گِ گل مجھے شمشیرِ نظر آتی ہے

سوز کی غزل کے شعر ہیں: س۔

بارغِ جنت مجھے کشمیرِ نظر آتی ہے موجِ صہبا مجھے اکسیرِ نظر آتی ہے

ان اشعار کے تیور قابلِ غور ہیں: —

میں بھی پابند تو آئینِ وفا بھی پابند یہ تو زنجیرِ زنجیرِ نظر آتی ہے

زندگی خط ہے، غم عنوان، مگر مطلب فوت یہ کسی شوخ کی تحسیرِ نظر آتی ہے

سوز کے دو شعر اور ہیں: —

دل اگر مضطر لا قسمت میں ہوتا کچھ سکوں آسمان گردش میں کیوں ہے گرز میں ساکن نہیں

بہتر تھا ٹوٹا کسی گلیں کے ہاتھ سے وہ پھول ہوں کر شاخ پہ مڑھار ہا ہوں میں

علامہ عارف درویش عامل، لکھنؤ کے متوطن، سری نگر میں عرصہ سے مقیم ہیں، اور ان کی محبت میں کشمیر کے بہت سے نوجوان نئیں سنجوں کی تربیت ہوتی ہے۔ سری نگر میں بارغِ نشاط کے قریب گیت گنگا کے پاس، انہوں نے "عامل کشیا" بنالی تھی، جہاں شعر و سخن کی مجلسیں منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ کشمیری کے مشہور شاعر سیدت دینا ناتھ ناتھ سے جو اردو میں بھی شعر کہتے ہیں، ان کے گہرے مراسم ہیں۔

س صدی کے تیسرے دہے میں، ان کا کلام ریسالوں اور اخباروں میں اکثر شائع ہوتا تھا۔ مارشل کے ادبی اڈیشن کے لئے وہ اکثر لکھا کرتے تھے اور ان کے نام کے ساتھ "ماہر نفسیات" "انثار العصر" لے۔ عامل بابا کا انتقال کئی سال پہلے ہو چکا ہے۔

اور بانی انجمن تنقید ادب لکھنؤ کے القاب لکھے جاتے تھے۔ اب "عابل کٹیا" کی صحبتیں درہم برہم ہو گئی ہیں، اور دنیا ناگہ نادم نے بتایا کہ اس وقت عابل جوں میں مقیم ہیں، جہاں نادم نے کی ان سے طلاق حال ہی میں ہوئی تھی۔ عابل بڑے طنطنہ کے شاعر ہیں۔ اور ایک موقع پہ انہوں نے جگر مراد آبادی کو اپنا فرزند معنوی لکھا ہے۔

ان کی سرپرستی میں ایک محفل شعر "ہزم ساغر" کے نام سے قائم ہوئی تھی، جس کے مشاعرے انہیں کی قیام گاہ پر منعقد ہوتے تھے۔ نادم، جو ساغر کے نام سے بھی لکھا کرتے تھے، ان مشاعروں میں اکثر شریک رہا کرتے تھے۔ عابل غزل کے استاد ہیں، لیکن نظمیں بھی کہتے ہیں، اور ان کی نظم پر بھی غزل کا انداز غالب رہتا ہے۔ "مصورہ ہستی" کے کچھ شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں :

کیا بتائیں گے اُسے اپنے گناہوں کا حساب	کوئی آیا بھی اگر روزِ جزا لینے کو
فُششِ فرطِ محبت سے جب آیا وہ صدم	پئے تعظیم وہیں درد اٹھٹا لینے کو
جنسِ دل ان سے طلب کی تو کہا اسے عال	ذرا اٹھہرو اسے کوئی ہے گیا لینے کو
علامہ عابل کی غزل کے کچھ شعر ہیں :	

ہوئی فصلِ نمودِ زہمت نہ پیرا وہ گلےزار آیا	خزاں کا دورِ گلشن میں یہ ہنگام بہار آیا
رموزِ داستانِ عشق کو سمجھا نہ وہ کس	میں کہتا مر گیا، لیکن نہ اس کو اعتبار آیا
حبابِ آسا وجودِ ظاہری تھا، مٹ گیا آخر	عدم سے جو بسوئے عالم ناپا سیدار آیا
تجربہ ہے کہ عال بھی اُگر روتا ہوا نکلے	کہ ہر کس بزمِ جاناں سے بہ چشمِ اشکبار آیا

عابل کی ایک نظم "نیرنگ عشق" کے عنوان سے مارٹنڈ کے شمارہ ۲۸ جولائی ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی تھی، جس کے ساتھ ذیل توہینِ سرشتی — "حیاتِ خطابیہ یہ پس منہوی جگر مراد آبادی" شامل ہے۔

اس نظم کے چند شعر ہیں :

بے خودی اختیار کیا جاتے عاشقی اعتبار کیا جاتے
مشغلہ ہے یہ یچختہ کاروں کا عشق کو خام کار کیا جاتے

ان کے چند خطوط سوالوں کے جواب کے طور پر شائع ہوئے تھے۔ ان سے ایک اقتباس ذیل میں درج ہے
پرشن — نتیجہ زندگی کیا ہے ؟

جواب — نتیجہ زندگی کا آخرش ہے موت اسے غائب

خدا جانے کہ اپنے آپ کو میں کیا سمجھتا ہوں

عالم اپنی ادبی امارت پسندی کے باعث بعض وقت نوجوان لکھنے والوں کے خلاف سخت تنقیدی لب و
لہجہ اختیار کرتے تھے۔ بعض شعراء ان کے اس رویے سے ناراض ہو گئے تھے۔ اور ایک مضمون ان کے خلاف
شائع کیا تھا، جس میں انہیں اپنے درویش محل میں چینی سے رہنے کی صلاح دی تھی اور نو عمر لکھنے والوں
پر غریبی کرنے سے احتراز کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس سلسلے میں ان کی ایک نظم کے اشعار درج کئے
تھے، جو یہاں درج ہیں :

جو صبح ایک بد نہ جانیں وہ بتے جا دو نگار شاعری کے نام پر بیٹھے ہیں وہ کھائے اُدھار
کچھ غفلت رکھ لیا، جلدی سے بن بیٹھے سوار ڈٹ لئے میدان میں اکوہم بھی ہیں اک شہسوار
سنہ ۱۹۰۲ء میں پھٹت جواہر لال نہرو کی کٹھن میں آمد کے موقع پر عامل نے ایک مقررہ قصیدہ لکھ کر
تاریخہ میں شائع کیا تھا۔ ان کے چند خطوط اپنے پسر منوئی سنگر مراد آبادی کے نام اسی اخبار میں شائع
ہوئے تھے۔ ایک خط کا اقتباس ہے :-

” میں اپنی فکروں کی پوشاک کی پوشاک کا اتنی ریتے ہوئے ہوں

شہانہ خیالی کا اظہار کرتے ہوئے رائے دی

پنڈت تارا چند ترس ساہگ ابں عہد کے لکھنے والوں میں اپنی خاندانی وجاہت اور ادب دوستی کے باعث ایک امتیاز رکھتے تھے۔ ان کا خاندان کشمیر کے رئیسوں میں شمار ہوتا تھا۔ اور اس خاندان میں علم و ادب کی روایات قدیم زمانے سے چلی آتی تھیں۔ ساہگ کے دادا پنڈت سہج رام ترسں ڈوگرہوں کے ابتدائی دور میں فارسی کے اچھے شعرا میں شمار ہوتے تھے۔ ساہگ کے والد پنڈت ڈوگرہ بھی شعر و ادب کا شوق رکھتے تھے۔ اپنی خاندانی روایات اور عہد کے اقتضا کے مطابق ساہگ نے فارسی کی تعلیم اچھی پائی تھی اور عربی میں بھی دست گاہ رکھتے تھے۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ سگری ملازمت میں داخل ہوئے اور تحصیلداری کے عہدہ تک ترقی پائی۔ کچھ عرصہ وہ بلدیہ سرئی نگر کے کمشنر بھی رہے۔ ملازمت سے سکونش کے بعد انہوں نے وکالت شروع کی، لیکن ان کا زیادہ وقت ادبی مشاغل میں صرف ہوتا تھا۔

ساہگ کے مراسم اپنے زمانے کے کئی برابر آوردہ ادبوں سے گہرے تھے۔ محمد الدین فوقت بھی بن کا نام کشمیر کی تاریخ، شذیب اور صفات کے ساتھ گہری وابستگی رکھتا ہے، ساہگ کے مرثیہ اپنی ایک نظم میں جو انیسویں ہدی کے قوی اور وطن احساس سے پڑے، ساہگ، فوق کی طرف اس طرح اشارہ کرتے ہیں:۔

ہیں فوق بھی ساہگ بھی ہستار و وطن کے
بھوں اپنا وطن چھوڑ کے جائیں وہ کہیں اور
اس نظم کے اشعار قوی ایک جہتی اور اتحاد کے جذبے سے مملو ہیں:۔

برہاد کی ہم کو فقط بغض و حسد نے
اقبال و چشم ہم سے گئے دور کہیں اور
جب چھوٹ نہ ہو ہم میں تو پھر اپنے مکان کے
ہرگز نہیں ممکن کہ بنیں آ کے کہیں اور
اے کاش نکالے کوئی محنت سے ذرا کھوج
اس ملک کی کانوں میں ہیں درنہیں اور

منہ نکالت اور کشمیر کی بہار ساہگ کی فکر کے لئے اکثر محرک کا کام کرتے ہیں چنانچہ ان کی

کئی نظمیں ان موضوعات پر لکھی گئی ہیں۔ گل نرگس کے عنوان سے انہوں نے ایک نفیس نظم بھی لکھی، جس کے کچھ شعر ہیں :-

نرگس، تجھے کس کی جستجو ہے
 بیمارِ صفت جو زردِ رو ہے
 ہے کس کے فراق میں یہ حالت
 ہے کون ہو تجھ سے خوبرو ہے
 تجھ سے ہی ہے باغ یہ ہسکتا
 گلشن میں تجھ سے رنگ و بو ہے
 سالکِ دل سے ہوا ہے مفتوں
 جب سے کہ تو اس کے رُو درو ہے

اپریل ۱۹۵۷ء میں موسم بہار کی آمد اور نوادہ کی مسرت کے موقع پہ انہوں نے ایک نظم بھی لکھی جس کے دو شعر ہیں :

ہو مہارک تجھ کو کشمیر، پھر بہار آنے کو ہے
 بہرِ ششِ رحمت پروردگار آنے کو ہے
 مست ہوں گے شیشِ بہتِ غمورے برناویر
 بے بسادک کی آنکھوں میں خمار آنے کو ہے
 اسی زمانے میں انہیں خبر ملی تھی کہ چودھری خوش خانان کے ساتھ جو اس زمانے میں کشمیر
 میں برطرہ خدمت تھے۔ علامہ اقبال، حقیقہ جالوزہری اور منشی محمد الہیہ قوٹ کشمیر کی میر کے لئے آنے
 والے ہیں۔ نظم میں وہ اس خبر کا مقدم کرتے ہیں

ہے مسرت۔ یہ کہ نادانِ فوقِ اقبال

نظمیں لکھی گئی ہیں۔

یہ موضوع اور بھی بحرِ سالک کو اتنے پسند تھے کہ انہوں نے کئی نظمیں اور قطعے کشمیر کی بہار پر اس بحر میں لکھے ہیں۔ ادھر کی نظم میں دو تین شعر اور خوب ہیں۔ شعر ہیں :

خلعت شام زمستان زمست سسر مائی
دلکش بیع نسیم پھر ہزار آنے کو ہے
برف باری اور یخ بندی کا دورہ ختم ہے
موسم رنگیں ادا اور سحر کار آنے کو ہے
ہل محروں کی خوشنوائی آبشاروں کی صدا
بارغ میں دُرّاج و قمری و ہزار آنے کو ہے

سالک کو تصوف سے بھی تھوڑا بہت لگاؤ تھا، اور اس میں یا تو ان کے تخلص کی رعایت تھی، یا تخلص اسی برجان کے، بد نظر اختیار کیا تھا۔ ایک نظم انہوں نے "ترانہ وحدت" کے عنوان سے لکھی تھی جس میں سارے مسلکوں کا مقصود ایک ہونے کا اثبات کیا ہے بلکہ ساری کائنات کو ایک ہی ذات کا پرتو ظاہر کیا ہے۔ نظم کے کچھ شعر ہیں،

سارے جہاں کو خالق تیری ہی جستو ہے راہیں جدا جدا ہیں، مقصود سب کا تو ہے
جلوس سے تیرے روشن نور شید و ماہ تاباں سب میں ہے تو ہی جو ہر اور سب کی آبرو ہے
ہر شے میں تیرے جلوہ ہر جاتا تھا تماشا تیری میں تو ہے نغمہ اگل میں تیری ہی بو ہے
جو لوگ ہیں شراب وحدت میں مست سالک کیا ان کو انتیاج پیمانہ و سبو ہے
سالک اپنے مضمون نگار بھی تھے اور ان کا برجان زیادہ تر رب لطیف کی طرف تھا۔ نوروز

کے موقع پر انہوں نے "نوروز مبارک اور میرا پیغام" کے عنوان سے ایک انشائیہ لکھا تھا جس میں انہوں نے تکوین کائنات اور اس بارے میں مذاہب اور فلاسفہ کے خیالات سے بحث کی ہے۔ اور مذاہب کی بنیادی

اتحاد پر زور دیا ہے۔ لکھتے ہیں :

”میرے خیال کے مطابق دنیا میں یا تو دو ہی مذہب ہیں یا جتنی سرشتی ہے اتنے ہی مذہب ہیں۔ قسم اول میں وہ مذہب داخل ہیں جن کا اعتقاد خدا پر ہے۔ قسم دوم میں وہ تمام خلقت ہے جن کا اعتقاد خود اپنا جدا جدا عقیدہ ہے خواہ وہ مقرر کنندہ ہوں یا مقرر نہ۔“

ہندوستان کی قدیم تاریخ پر ان کا ایک مقالہ ”قدیم آریوں میں جذبہ حب الوطنی“ کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس میں آریوں کے ہندوستان میں بس چلنے کے بعد اپنے نئے ملک سے ان کی محبت پر بحث کی ہے۔ مذہبی تہواروں کے موقعوں پر بھی وہ اکثر لکھا کرتے تھے۔ ”شیورا تری“ کشمیری پٹنوں کا بڑا تہوار ہے کیونکہ وہ شیو مذہب کے پیرو ہیں، سالک نے اس موضوع پر مضامین لکھے ہیں۔ ان کا ایک اچھا انشائیہ — ”جاگورا کھے سائیاں وا کو ماہسکے نہ کوئی۔“ کے عنوان سے شائع ہوا تھا، جس میں تائید ایتردی کے مقابلے میں مخالف قوتوں کی ناکامی پر زور دیا ہے۔ ان کے ادب لطیف کے طرز کے انشائیوں میں ”میری پرارتھنا“ دلچسپ ہے۔

فارسی سے ان کے اسلاف کو لگا ورہا تھا، وہ کبھی کبھی سالک کو بھی فارسی میں شعر کہنے پر مجبور تھا۔ لیکن ہندوستان کی طرح کشمیر سے بھی، جو کبھی ایرانی متغیر کہلاتا تھا، فارسی کا ذوق اب ختم ہو چکا تھا، اس لئے وہ مزاحیہ انداز میں ”فتہ پارسی“ کے عنوان سے کبھی کبھی لکھ لیتے تھے۔

امرچند ولی، سری نگر کی شعروادب کی غفلوں کی نمایاں شخصیت ہیں۔ ان کی ولادت ۱۹۰۸ء میں ہوئی۔ اور مروجہ تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ سکول کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ جوں و کشمیر کے علاوہ انہوں نے سرحد اور پنجاب میں بھی خدمت انجام دی اور سکولوں میں فڈ اسٹنگ اور آرٹ کی تعلیم دیتے رہے۔ ان کے شعری مذاق کی تربیت اچھے سخن سنجوں کی صحبتوں میں ہوئی، موسیقی سے بھی انہیں شغف ہے، شاعری کے ذوق نے انہیں اساتذہ کے دوا کی مٹا کھوتے پر مائل کیا۔ چنانچہ غزل اور رباعی میں وہ اساتذہ قدیم کے لئے۔ ولی کا بھی تین سال پہلے انتقال ہو چکا ہے۔

مسیاروں کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہیں۔ طبیعت کچھ قلندرانہ پائی ہے، اور کچھ تہتوف سے بھی لگا وہ ہے۔ ایک رُباعی میں اپنی دلچسپیوں کے بارے میں کہتے ہیں :

سُتلیتِ مہجوری و سیتِ گرمی کی رندی اور زلہدی قلندری کی

ملتی ہیں جہاں یہ سرحدیں ہوتی ہے تمہید وہاں دلی کی شاعری کی

دلی کی زندگی ناکامیوں اور مایوسیوں سے دوچار رہی۔ غم زندگی کی تلخیوں کو وہ ہنس کر چھیلنے کی

کوشش کرتے رہے۔ ایک قطعے میں اپنی نامرادیوں کی طرف اسی طرح اشارہ کیا ہے :

ابتداء میں مفلسی تھی 'انتہا میں بے کسی

درمیان مفلسی و بے کسی تھی ' بے بسی

غم غلط کرنے کو ہم نے بھنی لیا الفت کا غم

جذبہ الفت نے آخر ہم کو بخشش بے رسی

دلی کی غزل میں بیان کا لطیف اور اسلوب کی خوبی خاص طور پر نمایاں ہے اور غزل کی روایت

کی پابندی کے ساتھ 'جدید عصر کے رجحانات کی جھلک بھی اس میں ملتی ہے۔ دلی کی طبیعت میں ایک

دبا دبا سا مزاج بھی تھے 'جوان کی غزل کو دلچسپ بنا دیتا ہے۔ ایک غزل کے شعر ہیں :

کیا بات تھی بگڑ کے یہ کیا بات ہو گئی دن دھل کا تھا 'ہجری پھر رات ہو گئی

جمہور کی سحر سے تئی صوفشاں کمرن پھوٹی تو نذر گردش حالات ہو گئی

اے میر کا رواں سفر 'خیر اب کہاں رہنق سے لے تیری ملاقات ہو گئی

ساقی سے آئے کرنے لگا دندے پرست تقریب کچھ تو بہر ملاقات ہو گئی

دلی نے غالب کی ایک مشہور غزل کی تفسیر محسن کی صورت میں کی تھی 'اس کے دو بند

ذیل میں درج ہیں :-

سوزِ غم کی ترجمانی اور ہے اشکِ عہم کی روانی اور ہے
مُتغی غم کی کہانی اور ہے کوئی دہ گز زندگانی اور ہے

اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

پتھر پٹھڑا تے ہی رہے ہم تیر دام لڑی قسمت میں نہ تھی یہ دلازم
زہرگی کی اسے دلی اپ تو ہے شام ہو چکی غالبِ بلائیں سب تمام

ایک مرگ ناگہانی اور ہے

مشاہیرِ ہمدانِ نظمیں میں ٹیگور اور دلی اور نیام اور دلی دوا بھی نکلیں ہیں جن میں انہوں نے
ان صاحبانِ فکر و نظر پر حاشیہ لکھی کی ہے یہ بھی نظم میں ٹیگور کی مشہور نظم کو اردو کا جامہ پہنایا ہے:

جس جگر دلِ خوف سے عاری رہے 'اوپٹا' ہو سر

ہو جہاں آزادِ علم و عقل کا سوڑ و اثر

کشمیریوں نے ایک اچھی نظم لکھی ہے اور یہ اس سرورین کے فرزند ہونے کے ناتے، ان کا ایک
مقدس فرس بھی تھا۔ اس نظم کے چند شعر ہیں:

آسمان پر صبح کے تارے کا انجمِ حرام دے رہا ہے دہروں کو صبحِ خنداں کا پیام

نُہل رہی فطرتِ ہمد رنگ کیا آئینہ دار کھر رہی ہے گوہرِ بزم سے پھولوں کا شکار

آرسی میں پھول کے ہوتی ہے شبنمِ جلوہ گر نور سے معمور ہو جاتی ہے گل کی چشمِ تر

میری آنکھوں میں ابھی ہے خوابِ غفلتِ قفل ہو گئی کیا وہ سحر جس کا 'دلی' تھا انتظار

دلی کے چھوٹے بھائی 'دینا ناتھ المست' جو المستِ کشمیری کے نام سے لکھتے ہیں 'بڑے اچھے

فکرا رازِ مہتور ہیں۔ وہ کشمیری اور اردو میں شعر بھی کہتے ہیں۔ ان کے کشمیری کلام کا مجموعہ 'بالہ پیارہ' (پیارا

کے اس پار) کے عنوان سے شایع ہوا ہے۔

اُردو میں ان کی ایک نظم جو "پیام بیداری" کے عنوان سے کلچرل اکادمی کے

مجموعے "وطن کی پکار" میں شائع ہوئی ہے، اس کے دو شعر ہیں :

بٹا کر چھوڑ دو باطل کو اس دنیا کے پردے سے

جو انور، حق و باطل آدھاتے کا سما آیا

مبارک جان پر جو کھیل جاتے ہیں

ہے موقع ہم کو بھی جوہر دکھانے کا سما آیا

پنڈت مندل لال کوں طالب کشمیر کے اردو شعراء میں اساتذہ کا مقام رکھتے ہیں اور ہم سے

قریب تر عہد میں وہ شعروادب کی فقہا پر چھائے رہے، اور بہت سے نو عمر سخن سنجوں کو راہ دکھائی۔

تعلیم کے زمانے میں منشی امیر الدین نے ان کی رش عائدہ صلاحیتوں کو پاکر ان کی ہمت افزائی کی، چنانچہ کوئی

گیارہ برس کی عمر سے وہ شعر کہنے لگے تھے۔ بعد میں جب پنڈت کیفی کشمیر کی ملازمت میں منسلک ہوئے،

تو طالب نے ان سے رجوع کیا، اور اس فن کے رموز سے آشنائی حاصل کی۔

طالب کشمیری پنڈتوں کے ایک ذی اثر خاندان سے ہیں۔ ان کے جدا جدا پنڈت رگھوناتھ کوں

کشمیر کے وزیر اعظم رہ چکے تھے، دادا دیوہ کاکلہ قصبہ کے سربراہ اور وہ عالم، اچھے خوشنویس اور مہتمم بھی تھے۔

موسیقی میں بھی انہیں مہارت تھی۔ فارسی کے علاوہ عربی اور سنسکرت سے آگاہی رکھتے تھے۔ پنڈت طالب کے

والد پنڈت ٹٹھا کر پرشاد کوں بھی سنسکرت کے عالم اور خوشنویس تھے۔ بلم وادب اور شاعری کا

ذوق اس طرح طالب کو اپنے اسلاف سے ورثہ میں ملا تھا، اور اس کو انہوں نے اپنے عصر کے تقاضا کے

مطابق نئی راہوں پر ڈالا۔ دسمند پرشاد سکتیہ بدایونی نے طالب کے حالات اور ان کی شاعری کے

بارے میں ایک سیر حاصل مضمون "ہماری زبان" کے شمارہ ۳۲ جون ۱۹۵۸ء میں شائع کیا تھا۔

طالب نے پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں ایم۔ اے کیا، اور اردو کے امتحان تک بھی کامیاب رہے۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ سری برتاپ کالج میں اردو اور فارسی کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ پھر ترقی کرتے کرتے پروفیسر کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ کالج کی تعلیم سے اپنے طویل تعلق کے باعث وہ سینکڑوں نوجوانوں کے ذوق کی آبیاری کرتے رہے۔ خدمت سے وظیفہ پر سبکدوش ہونے کے بعد بھی ان کے مشاغل جاری ہیں چنانچہ وہ کئی ادبی اداروں کے رکن رہے اور اس وقت کلچرل اکادمی کی جانب سے زیر ترتیب کسٹیری لغت کے لئے ان کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔^۱

طالب کی شاعری کا آغاز ان کے زمانے کے رواج کے مطابق غزل گوئی سے ہوا، ابتدائی دور کی روایتی غزل سے ترقی کرتے ہوئے وہ عصری مذاق کے مطابق غزل کہتے رہے اور آخری دور میں نظمیں بھی لکھیں۔ ان کے کلام کا پہلا مجموعہ "رِشحات التعمیل" کوئی چالیس برس پہلے ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں غزلوں کے علاوہ مناظر قدرت پر کچھ نظمیں اور قومی اور مذہبی موضوعات پر نظمیں بھی شامل ہیں۔ اس کے ستائیس سال بعد دوسرا مجموعہ مرتب افکار ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ اور یہ تمام تر نظموں پر مشتمل ہے۔ اس سے طالب کی شاعری کی طویل عمر اور ان کی فکر کے ارتقائی منازل پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کی ابتدائی غزل کے کچھ نمونے ہیں :

گیا دل ہاتھ سے اور دل مستان کے ہاتھ کیا آیا

اڑا آنکھوں میں مطلب، مازداں کے ہاتھ کیا آیا

میری آنکھوں میں حسن یار کی تصویر بہنساں تھی

تو میرے روکنے سے پاسباں کے ہاتھ کیا آیا؟

اس غزل میں اکبر کے انداز کے کچھ اخلاقی شعور بھی آگئے ہیں۔ مثلاً

نہ غری بن سکا، نہ شرفیت اپنی گنوا بیٹھا

تشیع سے بھلا ہندوستان کے ہاتھ کیا آیا

۱۔ طالب صاحب کا ۱۹۷۱ء میں انتقال ہو چکا ہے۔

مرطالب کا اصلی میدان نہیں، حالانکہ ان کی تربیت پہلے غزل میں ہوئی تھی۔ وہ نئے عہد کے لئے کیا اور نیا عہد نظم کا عہد ہے، اس لئے طالب کو غزل سے زیادہ نظم سے لگاؤ ہے، اور ان کی نظم ان کے دوسرے فکر کی اچھی نمائندگی کرتی ہے۔ نظم کے لئے کشمیر کے اس سخن سنج کے لئے اطراف میں محرکات کی کمی تھیں تھیں۔ کشمیر کے حسن اور رعنائیوں پر کچھ لکھنا، گویا اس کا اولین فریضہ تھا۔ چنانچہ طالب نے کشمیر کے حسن کو شولہ کے بارے میں کئی نظمیں لکھی ہیں۔ بہار کشمیر، بہار ہل کی سیر، آیشار اور میں، کشمیر کے طالب کی قابل ذکر نظمیں ہیں۔ ان مناظر کا رد عمل طلب پر اپنے انداز سے ہوتا ہے۔ بہار کشمیر میں نے تالامار اور ہارون کے حسن اور دلکشی کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ نظم ترکیب بندی نظم کا آغاز شاعر کی دیرینہ آرزو کے اظہار سے ہوتا ہے :

شکست آرزو تھی لطف بہار دیکھوں کاش نہ چین کے نقش و نگار دیکھوں
بارغ نشاط میں ہو دل کو نشاط حاصل تازہ نسیم ڈل ہو اور شالامار دیکھوں

نظم میں عینیت پسندی کاش تب پیدا ہو جاتا ہے، جب شاعر کہتا ہے :
نصرت جائے مجھ پر راز نار و نیلہ الفت بلبل کے سامنے جب گل کا سنگھار دیکھوں
اسی لئے میں وہ منظر سرائی کرنے لگتا ہے :

چھائی ہوئی گھٹائیں گھنگور آسماں پر
برسا رہی تھیں موتی ابر بہار ہو کر
سرد سہی کی شاخیں تھیں جھومتی ہوا سے
یا کوئی لڑکھڑاتا تھا بادہ خوار ہو کر

منظر کا یہ کیف شاعر کو دودن بینی کی طرف مائل کر دیتا ہے اور وہ کہتا ہے :

جلوت میں نور کثرت کثرت میں عین وحشت آنکھوں میں آسمانے، اغمیاں یار ہو کر

نقشِ دولی مٹا دوں، کثرت سے دل مٹا دوں قدرتِ سارے مجھ میں، قدرت میں میں ساقوں
غافلِ خودی سے رہ کر اپنا سروپ دیکھوں وحدانیت کا نقشہ اس رنگ سے چھاؤں

طالب نے قومی اور مذہبی موضوعات پر بھی کچھ نظمیں کہی ہیں، جن میں چلبست کا انداز جھلکتا ہے۔ اور یہ
عموماً مسدس کی شکل میں ہیں۔ مذہبی موضوعات کی نظموں میں "سیری کرشن مہاراج کی یاد" موثر پیرایہ کہتی
ہے۔ راماین کے بعض واقعات کو بھی طالب نے منظوم کہا ہے، ان میں راوَن اور سیتا جی کا اس سلسلے
کی اُردو منظومات میں انوکھا ہے۔ "شیوراتری" پر بھی طالب نے ایک عمدہ نظم کہی تھی، جو "مارٹنڈ کے
شمارہ شیوراتری" (۲۹ فروری ۱۹۳۳ء) میں شائع ہوئی۔ اس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے،

کس قدر روشن ہے اپنی آج شامِ زندگی

لائی ہے شیوراتری تازہ پیغامِ زندگی

طالب نے کچھ مرثیے بھی کہے ہیں جو جدید انداز کے مرثیے ہیں اور ان میں انہوں نے اپنے بعض
دوستوں یا عزیزوں کے انتقال پر اظہارِ رنج و ملال کیا ہے۔

طالب کی تحویل شاعرانہ زندگی میں اُردو نظم پر جو انقلاب آئے، ان کا عکس ان کے افکار اور اسلوب

میں نمایاں ہے۔ "عالمِ مجاز"، "بہارِ جلوۂ دلدارِ دغیرہ" اس کی اچھی مثالیں ہیں، جن میں ضیقِ جالندھری
کی ابتدائی نظموں کا آہنگ ملتا ہے۔ "عالمِ مجاز" پہلا بند ہے:

بہار میں شباب ہے شبابِ انتخاب ہے

نظر کی آب و تاب ہے کوسنِ لا جواب ہے

غنا ہے، ثواب ہے سکونِ واضطراب ہے

= عالمِ مجاز ہے

کہ زندگی کا راز ہے

آگے اس عالم مجاز کے اوصاف گنائے ہیں :

کبھی خوشی ہے دمدم کبھی ہے حسرت و الم
کبھی ستم پہ ہے ستم کبھی ہے موثر کرم
یہ شان عظمت و حشم یہ محفلوں میں جسامِ جم

یہ عالم مجاز ہے

کہ زندگی کا راز ہے

"سورج کی کرن" اور "عورت" میں طالب نے مستزاد کی تکنیک آزمائی ہے۔ "مرزا غالب" اور "نور جہاں" پر ان کی نظمیں بہت موثر ہیں۔

طالب نے پروفیسر حیات لال کول کی معیت میں لہ دید پر جو کتابچہ کالج اکادمی کے لئے تیار کیا ہے۔ اس میں لہ دید کے کچھ داکھ کالان کا منظوم ترجمہ بھی شامل ہے۔ کشمیری شعر کے یادگار تذکرہ "بہار گلشن کشمیر" پر انہوں نے بسط مقدمہ لکھا ہے۔ اس کے علاوہ لالہ سربراہ کی "فحانہ جاوید"۔ انہوں نے ایک طویل منظوم تقریظ بھی لکھی ہے۔ اس تقریظ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اردو کے کم و بیش ایک سو مشاہیر کا ذکر آگیا ہے۔ یہ مشنوی کی شکل میں ہے اور اس کا آغاز ایک طرح کی تشہیب سے ہوتا ہے، پھر تذکرہ کا حال اس طرح لکھا ہے کہ گویا وہ ایک محفل ہے جس میں :

کہیں کرسی نشیں تھے میر و سودا

کہیں سوز اور جرات، درد و انشا

کہیں تھے قائم و تابان و ناسخ

کہیں مومن، اسیر و برق و راسخ

طالب کے تنقیدی مضامین بھی رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کا ایک مضمون "علامہ کفئی دہلوی

کی یاد میں "کے عنوان سے شیرازہ" (جنوری ۱۹۲۲ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں علامہ کیفی سے اپنے مراسم اور ان کی اصلاحوں کا تذکرہ کیا ہے۔ مضمون استاد کے ساتھ ان کی عقیدت مندی کا آئینہ دار ہے اور کیفی کے ادبی مزاج کو سمجھنے میں بہت معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ اس میں طالب کے نام کیفی کے لکھے ہوئے خطوط بھی شامل ہیں۔

رسا جاودانی جو کشمیر کے اردو شعرا میں اساتذہ کا مقام حاصل کر چکے ہیں۔ بھدر راہ کے متوطن ہیں، جو کشتواڑ کی طرح ایک چھوٹی سی خوبصورت دادی ہے۔ خواجہ عبدالقدوس ان کا اصلی نام ہے، لیکن اب ہم کم ہی لوگ جانتے ہیں۔ ان کے جد بزرگوار خواجہ احمد سکھوں کے عہد حکومت میں ترک وطن کر کے بھدر راہ چلے گئے تھے۔ رسا کے والد خواجہ نور تجارت کرتے تھے، لیکن فارسی علم و ادب کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ رسا کی تعلیم انہیں کے پاس ہوئی۔ بعد میں انہوں نے ذاتی مطالعے کی مدد سے پنجاب یونیورسٹی کا منشی فاضل ۱۹۲۶ء میں کامیاب کیا، اور والد کی تجارت میں پے در پے آتش زدگیوں کی وجہ سے نقصان آنے کے بعد انہیں سکول کی ملازمت اختیار کرنا پڑی۔ بھدر راہ کے ہائی اسکول میں عرصہ تک تعلیم دیتے رہے اہلاب ملازمت سے سبکدوش ہو کر، علم و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔

گھر کے علمی ماحول کی وجہ سے رسا کو شعر و سخن کا ذوق بچپن ہی سے پیدا ہو گیا تھا، بھدر راہ میں کوئی استاد فن میسر نہیں آ سکتا تھا، ذوق خدا داد کے سہارے انہوں نے اتنی مشق، بہم پہنچائی کہ اب کشمیر کے سربراہان شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ کلام کے مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں، جن میں سے پہلا مجموعہ "لالہ محرا" کے نام ۱۹۳۸ء میں چھپا تھا اور دوسرا مجموعہ "نظم ثریا" ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ اس پر مشہور استاد اور محقق، ڈاکٹر زور کا مقدمہ بھی شامل ہے، جو اس زمانے کی کشمیر لٹریچر میں صدر شعبہ اردو تھے۔

رسا نہایت سادہ طبیعت کے انسان ہیں، اور یہ سادگی ان کے کلام میں بھی نمایاں ہے۔ چنانچہ ان کی شاعری کے ایک نقاد، اللہ رکھا ساغر نے ان کی شاعری کے اس مخصوص پہلو کی طرف اس طرح

اشارہ کیا ہے :-

"لادہ صحرانے کے مصنف نے جس دنیا میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی اس میں کوئی تپ و خم

نہیں بناوٹ نہیں پرکاری نہیں اور یہی ماحول ان کی شاعری پر بھی چھایا ہوا ہے۔"

اٹل رکھا ساغر جو ہے آہ ساغر کے نام سے لکھتے تھے جنوں کے صاحبِ ذوق ادیب شاعر اور مسافر
محافت تھے۔ ان کا حال کچھ صفحہ پر قلمبند ہوا ہے۔

غزل سے رسا کو طبیعت ہے اور اسی صنف میں ان کی طبیعت کے جوہر نمایاں ہوئے ہیں۔
چھوٹی چھوٹی بحر میں انہیں مرغوب ہیں اور اپنے سادہ انداز اظہار میں وہ میر تقی میر جیسا اثر پیدا کر دیتے
ہیں۔ ان کی غزل کا ایک اور نمایاں وصف یہ ہے کہ اس میں رومانیت کم لیکن غور و فکر کی پرتھک پرتھک زیادہ نمایاں
ہیں۔ مثلاً ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو :-

بلے یقینی ہے استی ایماں	ضعف او ہام کا سہارا ہے
تیری فرقت میں تجھ سے ملنے تک	تیرے پیغام کا سہارا ہے
میکشوں کو فلک کی گردش میں	گردشِ جام کا سہارا ہے

ایک اور غزل کے چند شعر ہیں :-

جو اثر آگ پر ہے پانی کا	دہی دشمن پہ مہربانی کا
ایک جھونکا ہوا کا آگ ذرا	کیا یہی ہند تھا جوانی کا
ہے غنیمت اگر متعب ہو	ایک لمحہ بھی شادمانی کا
گنجِ فیضِ ریت کا ساگر	جس سے قطرہ ملے نہ پانی کا
وہ مکر بستہ ہیں رستم پر رست	جو صلہ خیر کو سخت جانی کا

رسا کے غزل میں بھی ایک مخصوص انفرادیت ہے۔ جب کہ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہو گا۔

جو عشق قرین زوشربا، وہ عشق کی دنیا کیا جانے
 جو قیس بھی معنوں نہ بنا، وہ الفت سیلی کیا جانے
 جو تنگ نظر کم ظرفی سے نظریہ کو سنا، کہتے ہو
 فکرِ ہم کی حقیقت کیا سمجھے وہ دُست دریا کیا جانے
 ان کی بعض غزلوں میں نظم کا سانس لے پایا جاتا ہے۔ لیکن انہوں نے کچھ نظمیں بھی لکھی ہیں، جو زیادہ تر
 منظرِ قدرت سے متعلق ہیں۔ ان میں بیٹے دنوں کی یاد اور ساون کا پائیزہ نمونے ہیں۔ ساون کے دُوبند
 ذیل میں درج ہیں۔ اپنے عہد کی نظم نگاری کی جھلک موجود ہے:-

کیا رنگ ہیں گلوں کے نغمے ہیں ببلوں کے

قری کی لہو

حق سہرہ ہو

بُت تو ہی تو

ہر سو ہے خوشنوائی ساون کی رُت ہے آئی

اے دل جلے پیچھے بے چین میرا جی ہے

کو کیں تیری

ہو کیں تیری

ہے تو ہی تو

ہر سو ہے خوشنوائی ساون کی رُت ہے آئی

کرشن سیمپلوری، مکتوب دہلیپیوں اور مصلحیتوں کے شاعر اور ادیب، جوؤں کے وضع

سے اٹھے۔ ان کی پیدائش کا سن ۱۹۰۱ء ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے موضع میں پائی۔ پھر جوں آگئے جہاں ان کے چچا پٹت آگیا رام پور پٹنٹ محکمہ تواضع کی کمرانی میں ان کی تعلیم اور تربیت ہوئی۔ بچپن سے انہیں شعر و موسیقی سے دلچسپی رہی۔ چنانچہ اپنے بچپن کی دکنشیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک مقام پر انہوں نے لکھا ہے۔
 ”چار پانچ سال کی عمر میں جس وقت گاؤں کے مراٹھوں کے گھر میں سارنگی کے نہرے فہما
 میں موسیقی کا رس گھولنے لگتے، طبلے کی تھاپ پر کسی کے پاؤں کے گھنگرہ کی جھنکار سنانی
 دیتی تو میں بھاگ کر ان کے گھر جا پہنچتا اور اس وقت تک وہاں سے نہ اٹھتا، جس
 وقت تک وہاں رقص و نغمہ کی وہ مشق جاری رہتی۔“

جب کشن سن شعور کو پہنچے، جنوں شعرو سخن کے ذوق اور علم و ادب کے چہرچوں کے سبب لاہور تائی بنا ہوا تھا، اس کی تھوڑی بہت تفصیل خود کشن نے اس طرح بیان کی ہے :-

”مباراجہ پرتاپ سنگھ کے زمانے میں جنوں میں بڑے دھوم دھام کے مشاعرے
 ہوا کرتے تھے۔ غلام اشرفی، عظیم مولوی فیروز الدین احمد فیروز طغرائی امرتسری پٹت
 نرنجن داس غبار میرزا مبارک بیگ مبارک لالہ تھراو اس وکیل قمر قمرازی، ڈاکٹر
 عمار الدین سوز، ڈاکٹر قیس پٹت، دشوناکھ دیوا، غلام حیدر شتی، لالہ منوہر لال
 دل، سیوک رام باہر اور ان کے علاوہ بیسیوں شعراء کلام مشاعروں میں شہرت
 فہماتے تھے۔“

اپنی شاعری کے آغاز کے بارے میں لکھتے ہیں :

”انہیں بلند پائے خواہ کے سامنے میں نے بھی ایک طرحی غول بڑھنے کی حماقت کر ڈالی۔
 میر ہر شعر پر سامعین ہنستے تھے، لیکن اس غزل میں ایک شعر صبح بھی تھا اور وہ
 شعر تھا :-

ذہم لکھ کر زندگی کا اور نفس کا تار توڑ

حشر میں مل لیں گے لکھا ہے اگر تقدیر میں

باشعری گوشت النورنی سنمکل کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے اس شعر کی خوب داد دی اور کہا "اڑے مٹاؤں میں پڑھنے سے پہلے ہی تم تو ہیں دکھایا کر دو۔"

اسے الفرائی سے کشن کے تلمذ کا آثار میں ملتا ہوا — استاد کی تربیت سے انہیں شعر کے فوائد اس نے محسوس کیے کہ مہوئی۔ جب حکیم طغرائی امرتسر چلے گئے تو کشن اپنا کلام پنڈت ہرشن لال جیپ کو دکھانے سے وقت و منتہ ان کی مشق اتنی پختہ ہو گئی کہ 'وہ شعر کے مشاعرہ میں اپنا کلام سنانے اور داد ملنے کرنے لگے۔ اس طرح کے ایک مشاعرے کا تذکرہ کشن نے کیلپت 'جولانہ سریرام مرتبہ خمنانہ جاوید کی کشمیری آمد پر سری پرناپ کلج سری گری میں منعقد ہوا تھا۔

ان کی آمد پر سری پرناپ کاٹ میں ایک طرحی مشاعرہ منعقد ہوا 'مشاعرہ میں جوں و کشمیر جے ہند پایہ۔ دبا شعرا اور اہل ذوق حضرات نے شرکت فرمائی۔ فلا آشیانی چوہدری خوشی محمد اور سرگرم علامہ دتا تریہ کھنٹی ایسے استادان فن کے علاوہ اس وقت کے منسٹر اور جہان مالیکورٹ بھی مشاعرہ میں رونق آفر دیتے۔ مشاعرہ چوہدری خوشی محمد اور کی شہرت میں شروع ہوا۔ میں نے بھی مشاعرہ کے دونوں معرعہ ہائے طرح پر غزلیں پڑھیں اور بہت پسند کی گئیں۔"

ایسے محرکات آثارِ شاعری میں داخلے سے کشن کی خود اعتمادی کا ہی گاساس ہونا متحمل ہونے لگا۔

دیکھا نا گیا تھا اگر وہ ریاست کے سربراہ اور وہ مشاعروں میں شمار ہونے لگے :-

تو جمیل لدی کو مصافحت سے بھی دلچسپی رہی۔ ۱۹۲۷ء میں انہوں نے - - - - -

ماہنامہ "جنت" کے بجائے جاری کیا تھا، لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے اسے بند کرنا پڑا۔ اور انہوں نے

دارنگ راجہ دانی کی شرکت میں جموں سے ایک ہفتہ وڑے شیر جاری کیا۔ اس میں بھی انہیں بہت زیادہ
 کامیابی نہیں ہوئی تو پھر خود اپنا انبار ویرہ ہفتہ دارنگا لے رہے۔ یہ اخبار بھی کچھ عرصہ کے بعد بند ہو گیا۔ اس کے
 بعد وہ بیڈلو کشمیر سے منسلک ہو گئے۔

کشتن کی ذہانت غول اور قظیم دونوں میں یکساں رواں ہے۔ فیکر شعریں وہ خود اپنے ذہن سے
 نئے نئے اسالیب اور موضوع پیدا کرتے ہیں۔ ان کی ایک غزل کے چند شعر ہیں :

تیری بزم میں ماہ و ش بھی چند لمے گزر گئے
 تو میرا نہیب چمک اٹھا میرے دن سدھر کے سنور گئے
 اُٹھیں دیر و کعبہ کے درمیان کوئی ایک حسین مقام تھا
 وہاں رقص تھا، وہاں جام تھا، وہیں جا کے ہم بھی ٹھہر گئے
 وہ نظر بجا کے نکل گئے، جنہیں جوش مستی پہ ناز تھا
 مری مے پرستی کو دیکھ کر جو نشہ چڑھے تھے، اُتر گئے
 مجھے بل گیا وہ نقش پا دیں اسے کشتن پرٹا ر ہا
 سر راہ سے بچڑوں کا رواں میرے سامنے سے گزر گئے

کچھ اور غزلوں کے اقتباسات ہیں :-

تاروں کو جو دیکھا تو ہوا مجھ کو یقیں اور
 اُن سا کوئی مہوش نہیں برص زمیں اور

تیرا وعدہ ستم ہی اگر استوار ہوتا
 میرا ہر ادا بس لمحہ طرب آشکار ہوتا

مرے مطلع یقین پر کبھی تیرگی نہ چھاتی

جو کبھی کبھار ہی تو اکہیں جلوہ یار ہوتا

کرشن کو جہاں اپنے وطن ڈگر دیں سے عشق ہے کشمیر کے حسن اور اس کی رعنائیوں سے بھی ان کی نیکر الہام حاصل کرتی ہے۔ ڈگر دیں پر انہوں نے کئی نظمیں لکھی ہیں۔ ایک سے محب وطن کی طرح ان کی نظر ڈگر دیں میں وہ سارے حسن دیکھتی ہے، ہوا دروں کو نظر نہیں آسکتے۔ ان کی نظم "میرا وطن ڈگر" اس موضوع پر لکھی ہوئی نظموں میں امتیاز رکھتی ہے۔ اس نظم کا اقتباس درج ذیل ہے :

توصیف سے بالا ہے، یہ خط خوش منقسم

رہتی ہے نخل اس سے رعنائی پر کشور

ہر موج ہوا، اس کی ہے موج مے کوثر

انداز فہما کے ہیں، کیف آور و جہاں پرور

ہر ناز و دل افزا ہے، ہر ایک ادا و لبہ

ہستی ہی نہیں اس سے، اٹھے جو نظر اس پر

فردوس سے بڑھ کر ہے

یہ میرا وطن ڈگر

ڈگر دیں کے ساتھ ڈوگر حکمرانوں کے حکمرانوں سے بھی انہیں بڑی محبت اور عقیدت رہی ہے چنانچہ

گلاب سنگھ، زبیر سنگھ، پرتاپ سنگھ اور ہری سنگھ پر انہوں نے نظمیں لکھی ہیں۔ اپنے گاؤں سمیل پور کو بھی

وہ نہیں بھول سکتے، جہاں ان کا بچپن گزرا اور جس سے ان کی بہت سی خوشگوار یادیں وابستہ تھیں۔

سمیل پور پر کرشن نے جو نظم لکھی ہے، اس کا ماحصل یہ مقرر ہے۔

سوجان سے عزیز ہے، مجھ کو سمیل پور

کشمیر کے بارے میں بھی کشن نے کئی دلکش نقیصے کہی ہیں۔ ان نظموں میں "اے وادی کشمیر"
 "نغمہ کشمیر" اور "مکتوب کشمیر" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ "مکتوب کشمیر" میں "وہ اہل نظر کو دعوت دیتے ہیں:

اگر تم نے کبھی فردوس کا نقشہ نہیں دیکھا
 لب تسنیم و کوثر، حور کا جلوہ نہیں دیکھا
 اگر جنت کے پھولوں کا، حین دستہ نہیں دیکھا
 برم کی وادیوں میں دودھ کا دریا نہیں دیکھا
 تو میرے دوست! کچھ دن کے لئے کشمیر آ جاؤ !

اگر تم شہکار دست قدرت دیکھنا چاہو
 اگر روئے زمیں پر بارغ جنت دیکھنا چاہو
 اگر کانٹوں میں بھی پھولوں کی نکبت دیکھنا چاہو
 اگر ذروں میں بھی نور حقیقت دیکھنا چاہو
 تو میرے دوست! کچھ دن کے لئے کشمیر آ جاؤ !

اگر دل میں دقار، ملک و ملت سے عقیدت ہے
 اگر سچ بچ تمہیں تعمیرِ نوست کچھ محبت ہے
 اگر جذبہ ترقی کا، تمہیں وہ مسرت ہے
 اگر یہ دیکھنا ہو، ہمتوں میں کتنی طاقت ہے

تو میرے دوست! کچھ دن کے لئے کشمیر آ جاؤ !

"وادی کشمیر میں کشن کی شاعری کی سادہ سادگی، ترتیب، تکمیل اور نرمی کے اعتبار سے اپنے عروج کو

پہنچ جاتی ہے۔ اس نظم کا ایک بند ہے :

بہتی ہوئی ندیوں کے فسوں کا دے نغمے مرثا سے نغمے
پُر کیف فضاؤں میں طرب بارسے نغمے بیدار سے نغمے
سنگیت کی دیوی کے ہر اک نغمے کی تفسیر اسے دادی کشمیر

تخلیقی شاعری کا طرح مرتب نگاری اور بیانیہ پردہ بھی انہیں یکساں قدرت ہے۔ نشاہ باغ میں ہمارا
پرتاپ سنگھ کی ایک بستانی پاری کا نقشہ وہ اس طرح کھینچتے ہیں :

آخری تختے پہ اک ٹی پائی کا انتظام
دید کے قابل تھا یہ شاہانہ حسنِ اہتمام
شامیانوں کی وہ رونق، گریسوں کی وہ قطار
پُر تکلف نعمتوں کا کھنڈ کوئی بھی شمار
دیدنی میزوں پہ گلدستوں کی جاں پر در بہار
صاف مثلِ آئینہ ہر ایک طشت زر نگار
ساغروں میں لے رہی تھی دختِ رزائے گرامیاں
راہ میں آنکھیں بچھائے، منتظر تھیں کُرسیاں

کرشن کی وطنی اور ملی نظموں کا مجموعہ فیروز دس وطنی کے عنوان سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا تھا
جس میں اڑتالیس نظمیں شامل ہیں۔ ان کی غزلوں کا بھی ایک مجموعہ مرتب ہوا ہے جو 'فیروز دس خیال'
کے نام سے موسوم ہے۔ ان کی فکر کے سوتے ابھی بند نہیں ہوئے ہیں۔ اور ان کی غزلیں اور نظمیں ہر سالوں
میں شائع ہوتی رکتی ہیں۔

پہنت دینا ناقہ پکن مست، کشمیر کے ایک کوٹہ مشن سوسائٹی میں جنکی ولادت ۱۹۰۰ء
میں اننت ناگ، اسلام آباد میں ہوئی۔ ان کے والد پربت آنند، امپکن، ہزار جبر پرتاپ سنگھ کے

پرائیویٹ سیکریٹری رہ چکے تھے مست نے سہی نگر میں تعلیم پائی اور انٹرنس کا امتحان کامیاب کیا۔ ان کا اردو اور فارسی کا مطالعہ وسیع ہے۔ شاعری انہیں فطری لگاوت ہے، اور نوعمری سے شعر کہنے لگے تھے۔ ۱۹۳۱ء میں ان کا تعارف پنڈت کیفی سے ہوا، اور اپنے کلام کی اصلاح کے لئے ان سے رجوع کیا۔ قومی جوش اور خدمت کا جذبہ ان میں گوٹ گوٹ کر بھر رہا۔ کچھ عرصہ تک وہ رسالہ "صبح کشمیر" لاہور کے مدیر بھی رہے۔ لاہور سے لوہنے کے بعد تھارتی کا رد بار میں لگ گئے۔ لیکن اس وقت وہ امریکن یکسیس میں ملازم ہیں۔

مست غزن اچھی کہتے ہیں۔ ان کی نظمیں بھی قابل مطالعہ ہیں۔ کشمیر کے مشہور مقامات پر مست نے بھی کئی نظمیں لکھی ہیں۔ جن میں ٹھیکہ جہوانی کے چہرہوں میں "ایک خصوصیت رختی ہے۔ ٹھیکہ جہوانی جن کا مندر پر نگر سے کچھ فیصلے پر تول مولہ میں ایک شہور یا ترابے مست کے عقیدت مندان جذبات سے نظم بھر پور ہے کہتے ہیں: یہ معبد حقیقت — یہ خاک نور سماں — یہ جلوہ گاہ فطرت — یہ ارض طور سماں

آیت ازل ہے تنویر بخش عالم	آب حیات ابدی امرت کا چشمہ تر
ہر قطرہ اس کا حوروں کی آنکھ کا ہے تارا	درنگوں سے بھی ہے تابندگی میں بڑھ کر
سیاں ہو کے شاید اُترا ہے ماہ کا رن	یا آگیا ز میں پر جنت سے حوض کوثر
مہر و سکوں رز کا اس کی فضا رکا رہا	جوش بہار جنت گہائے تر سے پیدا

اس نظم کے چار بند ہیں اور ان میں اشعار اور مصرعوں کی ترتیب مخصوص ہے۔ ان کی دوسری قابل ذکر نظموں میں "سنہری جہنا"، "جلوہ زار ڈنڈاک" اور "دل کا پجاری" بھی شامل ہیں۔ مست نے کئی قومی اور وطنی نظمیں بھی لکھی ہیں جن میں وطن کی ترقی اور خوش حالی کی خواہش نمایاں ہے۔ سماجی شعور، مست کی نظموں کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظم "فنان بیوہ یا ماتم شوہر" بہت موثر انداز رکھتی ہے۔

مست کی غزل رومانی ہے اور اس میں ایک شخص کی کا احساس ہوتا ہے۔ ایک غزل جو عقیدت کے موتی کے عنوان کے ساتھ لکھی گئی ہے، اس کے چند شعر ہیں :

بہت صدمے سہا کرتا ہوں میں تیری محبت میں
 رہیں گریہ ہم رہا کرتا ہوں خلوت میں
 چراغِ برق کی ہورت دمنہاں اٹھتا نہیں لیکن
 سراپا داغِ دل سے جل اٹھا میں سوزِ الفت میں
 تری مُرل کا نغمہ گونجتا رہتا ہے کانوں میں
 نظر آتا ہے تیرا روپ اب ہر ایک صورت میں

ایک اور مختصر رواں بحر میں لکھی ہوئی غزل کے چند شعر ہیں :

کیوں کس کے لئے تو روتا ہے ہار موتی کے کیوں پر روتا ہے
 یاس و حرماں جنوں و رسوائی عشق میں بس یہی تو ہوتا ہے
 مست سمجھتا ہے زندگی جس کو موت اس کا مال ہوتا ہے

پہلے چلبست پر مست نے ایک عمدہ نظم کہی تھی جس کا عنوان "آہ چلبست" ہے۔ نظم میں شاعر نے اپنے ہم وطن ہم نوا کو خراج عقیدت پیش کیا ہے :

آہ 'اے چلبست' اے روحِ رواں شاعری ہو گیا خاموش تو 'اے نغمہ خوان' شاعری
 تیری خاموشی سے اب اے عندلیبِ نغمہ زن ہو گئی نصبت بہارِ بوستانِ شاعری
 تیرے اک اک شعر میں پنہاں تھا پیغامِ عمل تیرا اک اک لفظ تھا گویا کہ جانِ شاعری
 تو گر جب وطن تھا، عاشقِ زار وطن تیرے شعر ترے تھا سرسبز گلزارِ وطن

مست کی اساتذہ قدیم کے انداز میں کہی ہوئی ایک نفیس غزل کے چند شعر ہیں :

مجھ کو کرے گی ان سے کیا گردشیں آسمان الگ
 درد نظر سے ہوں تو ہوں دل سے میں وہ کہاں الگ
 کتنی جنون عشق میں کی ہی قبول زحماتیں
 منت پاسباں الگ سجدہ آستان الگ
 تجھ کو کبھی سمجھ کے بھی کچھ نہ سمجھ سکے کوئی
 دونوں جہاں میں تو نیاں پھر بھی تیرا جہاں الگ
 کوئی سما سکے گا کیا دیر و حرم کی قید میں
 ٹھہرے جو لامکاں کوئی اس کا ہو کیوں مکاں الگ
 جھکائے سر کو کیا دیر و حرم کے سامنے
 بند لا مکاں ہے وہ دکھتا ہے آستان الگ

ان کی پاک کچھ نظم سچی خوشی کہاں ہے 'کے عنوان سے لکھی گئی ہے۔ شاعر خوشی کی تلاش کرتا ہوا
 پھرتا ہے ہر نئے کو آزماتا ہے، سوال کرتا ہے :

سب کیا شے ہے وہ جس میں ہے نہاں سچی خوشی

دستِ رازی دسما میں ہے کہاں سچی خوشی

سچی خوشی دل میں نظر آتی ہے اور نہ تنہا کر دل بکوب میں جب سارے راضی دسما

کو توں کر باہوس ہو جاتا ہے تو اس کے دل پر العیا ہوتا ہے :

عارف کا لب کے قلب پر سکوں میں ہے نہاں

فغفک مضموم کے شیریں تبسم میں عیاں

شیوہ رازی کے موقع پر اکثر چند شاعرانے شعوع و خفوع سے نفیس کہی ہیں۔ کچھ اقتباسات ان فنون

کی پچھلے صفوں میں نقل کی جا چکی ہیں۔ مست کی نظم ان میں اپنے اظہار کے مڈول پن کے سبب قابل
مطالعہ ہے۔ ان نظموں کی بڑی خصوصیت ان کا مثالی کشمیری پس منظر ہے۔ مست کا پہلا بند ہے:

صنّو نکلن ہے کوہ اک دُنیائے محشر سے پرے
آسمان سے دوز مہر و ماہ و اختر سے پرے
دامن کہسار رنگیں دور تک پھیلا ہوا
فرش پا انداز بن کر ہے فلک پھیلا ہوا
برفِ سیمیں سے سرا سر یہ تجلاتی زار ہے
دُورِ نور شہید درِ محشر انوار ہے

—
برف پر آس جہاں سے اک خدا کے نور ہے
جس کا پر تو دونوں عالم سے بھی پڑتا دور ہے
پیکرِ تنویر آگس سے ہیں جلوے آشکار
ہے سراپا نور نکلن 'نور گستر' نور بار
آہ اب بھلا میں یہ تو مست، بھولا ناتھ میں
سارے جگ سے دُور ہو کر سارے جگ کے ساتھ ہیں

"سنہری جنت بھی مست کا اچھی نظموں میں ہے۔ اس نظم کا پہلا بند ہے:

دہ شام و دُعا ہوئی خوشی ہر نوا ہوئی
چشمک سے تھپا ہوئی

شفق کا غازہ اُڑ گیا دہ شمس کی ضیا مٹی

وہ رنگ تازہ اڑ گیا وہ شوخی ادا مٹے

خوشاں ظہورِ حق ہوا طلوع نورِ حق ہوا

گُٹ کا ابرِ شق ہوا

کسی کی صنو سے نگرِ بےرِ خلا میں جھللا اٹھیں

جھک اٹھے ہیں بحرِ دہرِ فضا میں جگمگا اٹھیں

بھلک رہے ہیں خشک تر

چمن ہے ایک دورِ زر

ملا وہ اسکو اور ج ہے سنہری موج موج ہے

خوشی نے کی ترجمانی کسی کی

زباں بن گئی بے زبانی کسی کی

اس زمین میں شایق کا شمیری کی بھی ایک غزل ہے۔ یہ غزلیں دراصل اس حلقہ شعراء کے

اسی مشاعروں کے لئے لکھی گئی تھیں، جو ہر دم ساغر کے نام سے قائم تھی اور اس کے سرگرم ارکان میں مست

شائق کے علاوہ دنیا ناتھ تادم کا شمیری بھی تھے۔ پنڈت لہر کول شایق بارہ مولہ کے رہنے والے ہیں۔

وہ غزل، باہلی، نفیم، ہر صنف میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ مذکورہ بالا زمین میں ان کی غزل کے دو شعر ہیں:

دُکھا ہے تیری یاد کی خفاشی میں مر سے اشک رکھ لیں کہانی کسی کی

کرہیں کیوں نہ مُتہاں قدموں پہ دل کو جوانی بھی اور خوش بیانی کسی کی

ایک اور غزل کے شعر ہیں:

تیری غمخواری عجب ہے محتسب
 تجھ کو بھی ہونا تھا رسوا ہو گیا
 و کہیں شایق نہ ہو چکر قب
 لوٹ بھیجیں گے یہ چھپلا ہو گیا

شایق نے کئی رہا حیاں اور نہیں بھی لکھی ہیں۔ ان ایک نظم جو "حیات" کے عنوان سے ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی تھی اس کے دو شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں :-

دل اپنا دور رکھتے ہیں ہم بغض و عداوت سے
 کوئی آئے نہ آئے پیش آتے ہیں محبت سے
 غنیمت جانتے ملو جو ہم کو ہاتھ آتے ہیں
 یہ منزل زندگی کی طے بھی ہو جائے سلامت سے

میرزا اجمال الدین شہید، کشمیر کے عالموں اور اداہوں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔
 شہید کے اسلاف میں میرزا سعد الدین سعد کا ذکر گزر چکا ہے جو مولانا شبلی کے دوست اور اردو کے شاعر تھے۔ شہید کے والد میرزا جمال الدین میرزا فادسی کے اچھے شاگرد تھے جنکی کچھ غزلیں اور ایک 'منوئی' حسن و گوہر موجود ہے۔ یہ منوئی تنہا کی 'خسرو شیریں' کے اربع میں لکھی گئی ہے۔ میرزا جمال الدین شہید کے ادبی ذوق کی نشوونما میں میرزا سعد الدین اور ان کے رفقا، منشی سراج الدین احمد خان، جو دھری خوشی محمد ناظر، پنڈت تارا چند ترسل کی صحبتوں کے اثر اور مولوی امیر الدین امیر کی تربیت کو بہت دخل رہا۔

میرزا شہید کے مورث اعلیٰ 'میرزا قاسم بیگ' ترکستان کے عمائدین میں سے تھے جو ۱۸۵۵ء میں ترک وطن کر کے ہندوستان آئے تھے اور شاہجہاں کی ملازمت میں داخل ہو گئے تھے۔ ان کے فرزند

میرزا غیاث الدین بیگ ۱۸۷۹ء میں شاہجہاں کے ہمراہ کشمیر آئے اور یہاں کی آپ دہوا سے متاثر ہو کر یہیں اقامت گزین ہو گئے۔ میرزا غیاث الدین بیگ کے پوتے میرزا احمد فارسی کے اچھے عالم تھے، وہ کچھوں کے آخری زمانے میں وہ کشمیر کے وقایع نگار کی خدمت پر مامور ہو گئے تھے۔ کلاہ سنگھ کے زمانے میں بھی وہ اس خدمت پر بحال رہے۔ انگریزی حاکموں سے ان کے اچھے تعلقات تھے، میرزا احمد کے پانچ فرزندوں —
 میرزا سیف الدین، میرزا غلام محی الدین، میرزا عزیز الدین، میرزا قمر الدین، اور میرزا بدر الدین میں سے پہلے تین بچے بعد دیگرے وقایع نگار کی خدمت انجام دیتے رہے۔ میرزا سیف الدین فارسی کے اچھے ادیب تھے۔
 اور ۱۸۷۵ء میں کشمیر کی ایک تاریخ خلاصۃ التواریخ کے نام سے لکھی تھی۔ ان کا ایک ورکار مارڈوکر کھلون گلاب سنگھ اور زبیر سنگھ کا روزنامہ چھپتا ہے۔ جو گیارہ بارہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ میرزا محی الدین کے فرزند میرزا سعید الدین تھے۔ شیخ اکے والد میرزا جمال الدین، میرزا جبار الدین کے فرزند تھے۔

میرزا شہید کی ولادت ۱۸۷۸ء میں ہوئی۔ فارسی میں ان کی تربیت، اس عہد کے شہور عالم میرزا غلام مصطفیٰ کے یہاں ہوئی تھی۔ سکول کی تعلیم کے زمانے میں ان کے استاد لطیف داد خان اردو اور فارسی شاعری کا اچھا ذوق رکھتے تھے جس کا شہید ابیر بھی اثر پذیر ہوا۔ سرری پرتاپ کالج میں ان کے استاد پر دفسر اسحاق علی بھی شعر و سخن کا اچھا مذاق رکھتے تھے اور انہیں کی صحبتوں میں شہید کو شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ وہ غزل کہنے لگے اور اس زمانے میں کہیں ہوتی غزلیں کالج کے برائے پرتاپ میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ کالج کے استادہ من پر دفسر اسحاق علی کے علاوہ اور بھی کئی صاحب ذوق استادہ موجود تھے جن میں لطیف الرحمن نام، چونی لال تلوار، سردار محمد میر اور کالج کے پرنسپل ہنٹوٹ اقبال کشن شریہا شریہا قابل ذکر ہیں۔ کالج کے باہر کے فن سنجوں میں مولوی امیر الدین کی بہت شہرت تھی۔ شہید انہیں سے مشورہ کرنے لگے۔
 ۱۸۸۷ء میں بی۔ اے پاس کرنے کے بعد حکومت نے بلدی نظم و نسق کی تربیت کے لئے ان کا انتخاب کیا چنانچہ ہندوستان کے کئی شہروں میں رہ کر انہوں نے بلدیات کی تربیت حاصل کی اور کشمیر لوٹنے

کے بعد سری نگر میں وارڈ افسر مقرر ہوئے۔ اور ترقی کرتے کرتے ڈائریکٹر لوکل باڈیز ہو گئے۔ ۱۹۵۷ء میں حکومت نے ان کے عالی ادراہی ذوق کے یہ نظر پھیل اکادمی کا عقد منتخب کیا۔ اس قسم سے ملک علمی ادراہی حلقوں سے قریبی رابطہ پیدا کرنے اور ریاست کے ابھرتے ہوئے ادیبوں میں ذوق کو ابھارنے کے مواقع مل گئے۔ اس وقت وہ ادبی قومی خدمت میں مصروف ہیں ان کا خاندانی کتب خانہ بہت وسیع نہیں، لیکن قیمتی مخلوقات اور ضامانی کے نمونوں کی بدولت قابل قدر بن گیا ہے۔

شہید کو غزل سے زیادہ نگو در با۔ لیکن جب یہ نند کے تھامنے ان سے دیہی اچھلی نظمیں بھی کہلاتی ہیں۔ ان کی دو طویل نظموں کا ذکر صاحب زادہ عبدالرحمن ذکی کے بیان میں کیا جا چکا ہے۔ پہلی نظم جو انہوں نے احساس منظر کے عنوان سے لکھی تھی، اس میں کشمیر کے کوہسار کے پس منظر پر صبح کا سماں پیش کیا ہے۔ اس نظم کی ابتدا کے کچھ شعر یہ ہیں :-

صبح کا ردل کش سہاں یہ کوہسار
 اب جو 'صبحن چین' صورت ہزار
 بدلیاں چھائی ہوئی کہسار
 ابر رحمت خمیہ زن گلزار

نغمہ زار بیل ہے ادر گل محو خواب
 بک رہے ہیں ہر طرف ساز و دباب
 آج ساز درد پر گاتا ہے کون
 یوں چین والوں کو تر پاتا ہے کون

اس کی ہم آہنگ ہے اک آجی نازنین، سیس بدن، شیریں گلکو

آگے اس آجوں کی خوبیاں بیان کی ہیں :-

آئی ہے رقصاں فرارِ کوہ سے مضطربِ فرطِ غم و اندوہ سے

خفتہ سحرِ جگہ دستی ہے یہ آگ پانی میں لگا دیتی ہے یہ

عشق سے آباد اس کا سینہ ہے چشمِ بینا کے لئے آمینہ ہے

اس نظم کا آخری شعر ہے :-

اس کے پنہاں سوز میں سازِ حیات

اہلِ بندش کے لئے رازِ حیات

شیدائے انہیں خیالات نے ذکا دروں بینی پر مائل کیا تھا، اور ان کے تاثرات 'سوزِ منظر' میں

ظاہر ہوئے جن کے اقتباسات نقل کئے جا چکے ہیں۔ ذکی کی نظم کو پڑھ کر ان کے دل میں جو خیالات
انجریئے انہیں ماحصلِ منظر کے عنوان سے شیدائے نظم کیا ہے، اور ذکی کے مداوی کو بخشش کی ہے

ہوتے ہیں :-

ابرِ رحمت اب بھی ہے آفاق گیر

آدمِ فکری کی ہوس میں ہے اسیر

لیکن اس نظم میں شیدائے ابھی دروں بینی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور ذکی کو شمس تبریزی

جلال الدین رومی شیخ احمد سرہندی اور مخدوم شیخ حمزہ کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیتے ہیں کہتے ہیں:

تجھ کو شکوہ چرخِ ناہنجار سے

اے ذکی مجھ کو گلہ ہے یار سے

کیوں جہانِ کاف و نزلِ برہم کریں

عشق کو صورتِ گرِ عالم کریں

شیدہ کی غزل میں قنزل سے زیادہ اخلاقی پہلو نمایاں ہے۔ ان کی ایک غزل کے شعر ہیں :

تری فطرت سے نداؤں فتنہ سامانی نہیں جاتی

نہیں جاتی نگر کی تنگ دامانی نہیں جاتی

بمدٹ سکتا نہیں بکھرا ہوا ملت کا شیرازہ

کہ جب تک نوجوانوں کی تن آسانی نہیں جاتی

بدل کر روپ جمہوری وہی دور شہر نشاہی

مری محکوم دنیا سے جہاں سبانی نہیں جاتی

شیدہ نے مناظر اور خاص طور پر کشمیر کے مناظر پر بھی نظمیں لکھی ہیں۔ ان کی نظری نظموں میں حقیقتاً

جالتھری کی ٹکنیک استعمال ہوئی ہے۔ چھوٹی بھروں میں مفسرعوں کی تعظیم کا وہی انداز ہے جس کو

حقیقت نے مقبول بنا دیا تھا۔ کشمیر پر لکھی ہوئی نظموں میں شیدہ کی نظمیں ایک امتیاز رکھتی ہیں ان کی ہے

پانچوڑ میں ایک شام، کشمیر کے زعفران زاروں کے بارے میں ہے۔ بیرونی شعرا میں سے جو یہ ہے

موضوع پر نظمیں لکھی ہیں کیونکہ زعفران کی شگوفہ کاری اس وقت ہوتی ہے جب شلم میں خوب لغزیر

ہو جاتی ہے اور اس موسم میں کم ہی سیاح یہاں ٹھہر سکتے ہیں، یا ٹھہرتے بھی جانتے ہیں۔ انھوں

نے اس نظم میں پیش کی ہے شیدہ کی کسی نے بیان کی ہو۔ اس نظم کا اقتباس ذیل میں پیش کیا جاتا ہے

ہمارے ہیں کس طرف پس شکر ملک بہار
 فٹے فٹے پھول ہیں پہنے ہوئے رنگیں قب
 دنواز و دلفریب و دل نشیں و دلربا
 شعرا اک پٹا ہوا گویا ہے دود آہ میں
 یا ہے سوز معرفت پہناں دل آگاہ میں
 میں یہ سمجھا ہر طرف شمعیں فروزاں ہو گئیں
 یہ صف آرا رقص کرنے کو یہ سیریاں ہو گئیں
 فقرائے ہر دل میں اپنی ان کو نہلاتا ہے چسند
 موتوں سے ان کا دامن بھر کے چھپ جاتا ہے چاند
 جن کو بھی ہیں پھول اور گاتی ہیں دہقان لڑکیاں
 حسن کی آبادیاں کشمیر کی شہزادیاں

سمجھیں کبھی فارسی اور کشمیری میں بھی فکر شعر کرتے ہیں۔ کچھ فارسی اشعار "سوز و منظر" مجوز میں

بن ہوئے ہیں

محمد طیب شاہ ہمدانی ہنہیم کشمیر کے ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ محمد عابد، محمد کاظم،
 محمد نعیم محمد فاضل اور نور الہدیٰ اس خاندان میں سربراہ کردہ علماء ہوتے ہیں۔ یہ خاندان "لوپی گروہ"
 کہلاتا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس خاندان کے مورث اعلیٰ علامہ محمد یعقوب دہلی سے کشمیر آئے تھے
 اور وہ یہاں کے علمائے برخلاف جو عمامہ باندھتے تھے، لوپی پہنا کرتے تھے۔ جب حضرت خواجہ طاہر نقوی
 اشافی نے انہیں دیکھا تو ہنہیم تھا۔ "لوپی گروہ" یعنی یہ لوپی پہننے والا استاد آگیا۔ کشمیر کے مفتی اعظم
 کے مورث اعلیٰ مولانا قیام الدین اور کئی اور علماء مولانا محمد تقیم اور مولانا نور الہدیٰ کے شاگردوں میں تھے۔

خواجہ خاں ہر پشیمین کی تجارت کرتے تھے۔

طیب شاہ فیغم ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے اور فارسی عربی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی کی اور پھر مولانا محمد حسین زیرک کے مدرسہ میں داخل ہوئے۔ بسہی پرتاپ کالج میں انٹرنس کی تعلیم حاصل کی اور سلسلہ طارمت میں داخل ہو گئے۔ ملازمت کے دوران پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے اور فارسی میں ایم۔ اے کا امتحان کامیاب کیا۔ ۱۹۲۲ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی۔ ٹی اور اردو میں ایم۔ اے کیا۔ ۱۹۲۴ء میں ہری پرتاپ کالج میں اردو کے لیکچرار کی حیثیت سے مامور ہوئے اور فارسی اردو دونوں زبانوں کے درس دیتے رہے۔

فیغم کو شعورث غری کا ذوق زمانہ طالب علمی ہی سے تھا۔ اور اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ غزل ان کی پسندیدہ صنف رہی۔ غزل میں قصوف کی چاشنی بھی مٹی ہے۔ کچھ غزلیں فقیر بھی لکھی ہیں۔ ان کی ایک غزل کے شعر ہیں :

فنائے جنت المادئی اوپر کچھ اور کہتی ہے
ہو اے کو پتہ جاناں ادھر کچھ اور کہی ہے
رُخ جاناں میں جلوہ ذات کا ہم کو نظر آیا
شیدو سے زیادہ تر نظر کچھ اور کہتی ہے
ذیل کے اشعار اعلف اور قصوف کی جھلک ملتی ہے :

زندگی، تعبیر خواب محرمستانِ خیال
سیحہ کیانا آشنا، رازدنی سازِ زندگی
ہر کوئی اسرار سے فیغم نہیں ہے باخبر
غیر کیا سمجھ بھلا یہ درد و مازِ زندگی

بیاں حرف نیاز زاہد اگر نہ سمجھے تو کیا عجب ہے
 فضاے قدسی میں اس کو ہر گرجاں پاے طلب نہیں ہے
 کبھی نہ لکے جو خانقاہ سے خیال اوج ملا کرے کیا
 بلندی حوصلہ کہاں جب خیال درو و لعب نہیں ہے
 یہاں ہے درکار سوزشِ دلی لپیڈ مرغِ نیم و سہل
 مقام اخلائے خود پرستی ہے کوئی لہو و لعب نہیں ہے
 حقیقت دہر کی ہے فہیم کہا یہ پیر مغال نے بیشک
 عمل پہ دار و مدارِ عالم نتیجہ بھی بے سبب نہیں ہے

فہیمؒ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۵ء تک جموں و کشمیر یونیورسٹی کے پوسٹ گریجویٹ شعبہ فارسی میں
 لکچرار کی خدمت بھی انجام دی۔ انہیں تصنیف و تالیف اور ادبی تحقیق سے بھی دلچسپی ہے چنانچہ
 حضرت صوفی کے سوانح حیات مرتب کر کے اس کلام کے انتخاب کے ساتھ شائع کیا ہے حضرت سید علی
 ہمدانیؒ کی جہیل اسرار اور حضرت بابا داؤد خاکیؒ کے قصیدہ ورد المریدین کا منظوم ترجمہ علامہ ابن ہاشم بصری
 کے عربی قصیدے کا اردو مترجم ترجمہ رسالہ فقریہ امیریہ کا اردو ترجمہ فہیمؒ کے قابل ذکر کارنامے ہیں۔
 اس کے علاوہ انہوں نے اخلاقِ جلالی کا ترجمہ انگریزی میں کیا تھا، جو ۱۹۶۲ء میں لاہور شائع
 ہوا۔

پنڈت زنا راون ٹینگ ساغر ایم۔ اے ایل ایل۔ بی سری نگر ہائی کورٹ میں وکالت
 کرتے تھے۔ وہ بلدیہ سری نگر کے کمشنر بھی رہے۔ حیدر آباد سے بھی ان کا تعلق رہا۔ پنڈت سالگرام سالک کی
 ڈائری کے ایک اندراج میں انہیں عثمانیہ یونیورسٹی کا پروفیسر فنانس یونیورسٹی حیدر آباد لکھا ہے۔ لیکن
 ساغر کبھی عثمانیہ یونیورسٹی میں نہیں رہے۔ ان کے فرزند ہری کشن بوفانی پیریم نگر کے نام سے لکھتے ہیں،
 لہ۔ فہیمؒ کا انتقال دو سال پہلے ہو چکا ہے۔

حیدر آباد میں رہ چکے ہیں۔ ساغر شاعر کہتے تھے: "اور اپنے حلقہ میں بہت مقبول تھے۔"

لالہ منوہر لال دلی، جموں کے صاحبِ ذوق اصحاب میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کی شعرو سخن سے دلچسپی کا محرک ان کے زمانے میں جموں کی خوشگوار ادبی فضا تھی، انہیں اپنے زمانے کے بعض سرسبز اور دلیوں اور شاعروں کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے کے مواقع نصیب رہے۔ اثرِ مہربانی اس زمانے میں جموں میں تھے، پنڈت کشی اور نواب جعفر علی خان اشرفی موجودگی نے سخنِ بنجیوں کے لبِ لہجہ میں ایک نئی پیدا کردہ تھی۔ فطرتاً دلی بھی اس فضا سے متاثر ہوئے۔

دلی کی ولادت جموں میں ۱۹۱۳ء میں ہوئی، ان کے والد لالہ شری جواہر دامل بنک کا کاروبار کرتے تھے لیکن ان کے بے وقت انتقال کی وجہ سے دلی کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ ۱۹۲۰ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ منگی کے محکمہ میں ملازم ہو گئے۔ کچھ عرصہ وہ منشی بنک لاہور میں بھی کام کرتے رہے اور لاہور کے قیام سے بھی ان کے شعری مذاق میں نکھار پیدا ہوا۔ شعرو سخن کا ذوق انہیں بچپن ہی سے تھا، لیکن پنڈت میلاد رام و قان کی نوعمری کے زمانے میں جموں آئے تھے اور دلی ہی کے مکان پران کا قیام ہوا تھا۔ اس صحبت نے ان کے شوق کے لئے ہمیز کا کام کیا۔ اور وہ شعر کہنے لگے۔ وفا اور پریم ضیائی اس زمانے میں کارواں نکالتے تھے۔ دلی کو بھی صحافت سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ وہ اپنی نظمیں اخباروں کے لئے بھیجنے لگے۔ ان کی سب سے پہلی نظم جس کا عنوان ہے "میں دیوانہ الفت ہوں" "ویر بھارت" لاہور میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد "شہباز"، "زمیندار"، "ریاست" وغیرہ میں ان کی نظمیں چھپتی رہیں۔

غزل سے دلی کو زیادہ لگاؤ رہا۔ اور ان کا قدیم آساندہ غزل کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ اس لئے ان کی غزل میں آساندہ کی سی خفگی اور شستگی پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن ان کے اسالیب اور فکر پر جمید عہد کا بھی پرتو ہے۔ اس خوشگوار آمیزش سے دلی کی غزل قابلِ مطالعہ بن گئی ہے۔ ان کی ایک غزل کے چند شعر ہیں:-

جب درِ محبت بڑھتا ہے، 'دن آتے ہیں جی اٹھنے کے
 جب داغِ یہ بن کے ابھرتا ہے شمعوں میں نظام آجاتا ہے
 ہم کس کو حقارت سے دیکھیں ہے کون حقیر اس دُنیا میں
 تینکے کا سہارا بھی تو کبھی انسان کے کام آجاتا ہے
 تدبیر کے ہاتھوں ہی اسے دِل دنیا کے مقدر بنتے ہیں
 قایل بہ مقدر رہنے سے، 'حسرت کا مقام آجاتا ہے

ایک اور غزل ہے :-

نہ خضرہ کی 'بدولت' نہ کارواں کے طفیل
 ملی حیات کی منزل غمِ جوان کے طفیل
 تمام عمر رہا ساقی امت کا
 غمِ حبیب کی خاطر غمِ جہاں کے طفیل
 غمِ حیات کی تلخی، 'اے مَذاذِ اللہ
 بولا ہے جانِ حزیں یادِ رفتگاں کے طفیل
 ہر ایک اہلِ سخن 'دل ہے تیسرا گردیدہ
 نئی زمین غزل اور نئے بیاں کے طفیل

دِل نے اپنے کلام کا مجموعہ بھی "نقدِ دل" کے عنوان سے مرتب کیا ہے۔

سید مبارک شاہ فطرت کشمیری فارسی اور اردو، دونوں میں شعر کہتے ہیں۔ علم و ادب اور
 ارشاد و ہدایت کی روایات اس خاندان سے وابستہ رہی ہیں۔ ان کا خاندان سادات گیلانِ خٹا ہے
 سے تعلق رکھتا ہے۔ فطرت کے والد سید غلام محی الدین قادری بھی صاحبِ ذوق عالم تھے۔ فطرت کی

ولادت ۱۳۱۵ء میں ہوئی 'اور ان کی تعلیم و تربیت والد کے ملاوہ شیخ عبدالحمد، ملا اسد اللہ کلاشپوری اور مفتی محمد الدین کے یہاں ہوئی۔ علومِ باطنی میں حضرت سید حسین آفندی سے استفادہ کیا، اور کشمیر کے مشہور بزرگ پیر عزیز اللہ حقانی سے بھی اکتسابِ فیض کیا۔

دینی علوم میں قرآن، حدیث، فقہ اور کلام میں بھی ان کی اچھی تربیت ہوئی ہے۔ علمِ رمل بھی سیکھا اور موسیقی کی تعلیم اس فن کے ماہر استاد محمد غلیل خوشنواسے حاصل کی۔ ملازمہ ستی وہ معلم کی حیثیت سے داخل ہوئے، اور آخر میں ریسرچ ارسٹنٹ ہو گئے تھے۔ وسط ایشیا کے بہت سے حصوں کی سیاحت کی ہے۔ یارِ قند میں اپنے عم زاد بھائی کے یہاں یہ عرصہ تک مقیم رہے، اور وہی بھی وہیں کی۔ یارِ قند سے وہ افسوس، غم، کاشغور اور دوسرے قریب کے مقامات میں بھی وہ مقیم رہے اور اس کا ذکر اپنی ایک فارسی نظم میں اس طرح کیا ہے :

صحبت پاک نژادانِ خُشن روزی چند
شد نصیبِ من بہرِ وطنِ روزی چند
شنگِ مویانِ خطا، عالیہ سامانِ خُشن
نازہ کروند مرادِ رخِ کُہنِ روزی چند
چہ مہارِکِ نفسی ہست و چہ فطرتِ نفسی
کہ بترکانِ خطا کرد وطنِ روزی چند

فطرت نے اپنے اور سلسلہ گیلانیہ کے حالات میں ایک مختصر مثنوی "آئینہ فطرت" کے عنوان سے لکھی جس کا وہ باپ پر اردو میں ہے اور اس میں مثنوی کی تصنیف پر روشنی ڈالی ہے میر غلام کریم خاں نے "جو فطرت سے دوستی اور قربت کے دو گونہ رشتے رکھتے ہیں" "آئینہ فطرت" کے لئے تعارف کیا ہے اس میں ہزم اخوانِ المغا کا بھی تذکرہ کیا ہے جو فطرت اور ان کے خباں دوستوں سے بڑی یاد میں

قائم کی تھی اور اس کی محفلوں میں کشمیر کے مشہور فارسی سخن سنج محمد امین مدراب، میرزا کمال الدین شیدا اور کبھی کبھی سید جالندھری، اثر صہبائی اور احسان دانش بھی شریک ہوتے تھے۔

قطرت اردو میں غزل اور نظم دونوں پر یکساں آسانی سے طبع آزمائی کر سکتے ہیں۔ اُن کی غزل میں تصوف کا بھی رنگ ہے، اور عموماً سلوک و معرفت کے نکات کی طرف توجہ زیادہ رہتی ہے۔ ایک غزل کے شعر ہیں :

اے تیری ارض پاک پر خم یہ سب سجود ہے
وے تیرے کوچے میں میرا شام و سحر قہود ہے
شاہد گل کے رنگ میں موج بہار موجزن
آئینہ جمال میں عکس ترا نمود ہے
غور سے دیکھئے اگر غیر نہیں کوئی بھی بیاں
منزل عشق میں یہود، راہبر جہود ہے

کشمیر کی بہاروں کے نظم و نثر سب ہی شاعر ہیں، لیکن قطرت اس کی خزاں کی تصویر کھینچتے ہیں۔ ان کی نظم "خزان کی ایک رات" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے کچھ شعر ذیل میں درج ہیں :

دہ بھگی رات ہے، تارے ہیں خاموش	زمین نے نوش عالم مست و مدہوش
چمن میں سبزہ کا نام و زشاں گم	زمین گلستاں ہے محلہ بردوش
عجب انسان ہے، عالم ہے ہو کا	خدا کی خود فراموشی میں ہے مدہوش
ابھی گورات ہے آدھی سی باقی	مگر انوار ہیں ظلمت میں روپوش
اسی نیرنگی فطرت میں فطرت	خدا کی یاد میں مست مے ہوش

قطرت کی ایک نظم "نغمہ وحدت" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی، یہ نظم کی شکل

میں ہے۔ اس

بھو اندر و شنت دکوہ میں تیری خود ہے ہر برگ سبز رنگ سے تیرے کپور ہے
ہر نہر تیرے عجزت کو بخود ہے ہر آبشار نغمہ زن یاد و دہ ہے
مولائے بتا تو کہاں ہے اگھر نہیں

فطرت اردو اور فارسی میں کئی رسالوں کے مصنف بھی ہیں۔ ان کی تفصیلی درج ہے :

’شجاعت فطرت‘، ’معارف طبع فطرت‘، ’بیان ہائے فطرت‘، ’چند ہند فطرت‘، ’رباعیات فطرت‘
آئینہ فطرت فارسی میں اور فریاد میرس اور انقلاب اردو میں ہیں۔

پیر عزیز اللہ حقانی کے حالات اور کشمیری میں ان کے کلام کو بھی انہوں نے مرتب کیا ہے اور یہ
رسالہ کچول اکادمی کے سید منتخب منظومات کشمیری میں ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا ہے۔ پیر حقانی کی
شاعری پر تنقید کرتے ہوئے اس رسالے میں لکھتے ہیں :

”اگرچہ پیر عزیز اللہ حقانی صوفی تھے، مگر روانی کی سحر پرور فضا بھی ان کے لئے غیر مانوس
نہ تھی۔ وہ حُسن و عشق کی ناز پروردادی میں بھی اسی طرح پھرے، جس طرح تھوٹ کی
پُربرج گھائیوں میں، چنانچہ متعقباتِ شکر کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں حُسن و عشق کے جلوے
بھی اپنی تمام تر دلفریبیوں کے ساتھ موجود ہیں۔“

پیر زادہ غلام حسن قادری انقلاب پانچور کے ایک گاؤں میں ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے تعلیم
برہنہ مگر میں پائی، بی۔ اے اور بی۔ ٹی کے امتحانات کامیاب کرنے کے بعد محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ پہلے
ماسٹر رہے، پھر صدر مدرس اور ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولس بھی رہے۔ کچھ عرصہ لداخ میں بھی متعین رہے۔
اب ملازمت سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن میں مقیم ہیں۔

پیر زادہ انقلاب کو زمانہ طالب علمی سے ہی شعر و سخن سے دلچسپی رہی۔ اس زمانے میں

مردی ابراہیم کی استاد کا شہرہ انقلاب انہیں کے تلامذہ میں داخل ہو گئے۔ اور بولوی صاحب کی تربیت سے شعربوب کہنے لگے۔ میر غلام رسول ناوکی سے بھی مشورہ کیا۔ لیکن زیادہ خود اپنے کلام کی اصلاح آپ کرتے رہے۔ غزل اور نظم دونوں میں ان کا کلام موجود ہے۔ ان کی غزلیں اور نظمیں ”شہباز“ ”لاہور“ ”زمیند“ ”سرحد (پشاور)“ ”ادب لطیف“ اور ادبی دنیا“ میں شائع ہوتا تھا۔ کچھ کلام مقامی اخباروں اور رسالوں میں بھی شائع ہوا ہے۔ غزل میں ان کا انداز منجھا ہوا ہے اور اپنے عہد کی تحریکوں سے بھی متاثر ہے۔

ان کی ایک غزل کے دو شعر ہیں جو تجلیات کے عنوان سے شائع ہوئی ہے :

میری مستی نہیں منت کیش پیرِ وفاں ساقی
 بچے آتا ہے بے جام و سبب مدہوش ہو جانا
 میرا سینہ بہار بے خزاں ہے لالہ کاری سے
 چمن تو بھی ذرا میری طرح گلپوش ہو جانا

ایک غزل کے کئی کئی قیام کے زمانے میں بھی تھی اس کے شعر ہیں :

ویدہ نیم باز نے مارا	غمرہ کمر کا ز نے مارا
جاں گسل طرز اجتناب ہوئی	روشنِ احترا نے مارا
بھیں سرمایہ اور کہیں افلاس	اِس نشیب و فراز نے مارا
کہاں کشمیر اور کہاں کرگل	راہ دور و دراز نے مارا

ایک نظم میں ”کے عنوان سے کہی تھی“ جو فکرا اور اسلوب کے لحاظ سے اقبال کا آہنگ لکھتی ہے۔
 چمن و شدر ہیں :

گن فکاں کے ساز کی آواز ہوں	یعنی تفسیر نیاز و ناز ہوں
زلزلہ ہے قصرِ استعمار میں	صویرِ اسرائیل کا دمساز ہوں

شاخِ طولی پر پہ میرا آشیان
طاہر سدرہ کا ہم آواز ہوں
ہمنوا کی جستجو میں انقلاب
مدتوں سے گوشِ برآواز ہوں

پسندت پتیا مبرنا تھہ در فانی سیری مگر کے محلے و چارناگ میں رہتے ہیں۔ اسی لئے وہ تخلص کے ساتھ
و چارنائی لکھتے ہیں۔ ان کی ولادت کا سال ۱۹۱۹ء ہے۔ فانی کے والد سچاری تھے۔ فانی کو شاعری اور انشاء
پروری کا شوق زمانہ تعلیم سے تھا۔ ۱۹۳۵ء میں جب وہ نئے کمال فانی اسکول میں پڑھتے تھے، اسکول کے رسالے
”جہلم“ میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں ان کا ایک ”دائم فہم“ میں لاملکاں ہوں کے عنوان سے
شائع ہوا تھا۔ اس تربیتی دور کے بعد وہ وسیع موضوعات پر لکھتے رہے اور اب بھی ان کے قلم کی سیما ہی
سوکھی نہیں ہے۔ فانی کی طبیعت میں تنوع بھی ہے۔ شعر سے بھی ان کو بہت اسے دلچسپی رہی اور قریب
شیروانی سے وہ مشورہ کرتے تھے۔ ان کے دوسرے اساتذہ میں چندت مندلال کول طالب اور
دشونا تھہ در ماہ بھی رہے۔

فانی نے بی۔ اے کی تعلیم سری پرتاپ کالج میں پائی۔ بعد میں اردو میں ایم۔ اے کا امتحان
پاس کیا۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ اسکول میں مدرس مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ انہوں نے ”ہمدرد“ اور ”خدمت“
کی سب ایڈیٹری بھی کی۔ اس زمانے میں کشمیر میں کسان مزدور تحریک شروع ہوئی اور فانی اس سے
دایرہ ہو گئے۔ سیاسی اختلافات کی بنا پر انہیں ریاست چھوڑنا پڑی تھی اور اس زمانے میں وہ مادیہ پرنس
میں اردو زبان بھی سکول میں تعلیمی کی خدمت انجام دیتے رہے۔ ۱۹۵۲ء میں جب سری نگر کوٹے توان
انہیں سیاسی الزامات کی بنا پر نظر بند رکھا گیا۔ رہائی کے بعد دہلی جا کر ایک خانگی سکول میں ملازمت
کر لی۔ ۱۹۵۵ء سے ریاست کے محکمہ تعلیم میں ملازمت کر رہے ہیں۔

فانی گزشتہ پینتیس سال سے مسلسل لکھ رہے ہیں اور اپنے مضامین اور کلام کے مجموعے

مرتب کر لئے ہیں۔ یہ دونوں مجموعے خاصے ضخیم ہیں۔ مضامین میں ادبی، تعلیمی، اخلاقی، سیاسی، سب ہی

نویسندہ کے مضامین شامل ہیں۔ کچھ تنقیدی مضامین بھی انہوں نے لکھے ہیں۔ ان کا ایک اچھا مضمون 'مسلمانوں کے سائنسی ایجادات و اختراعات' "حقیقی شاعری کیا ہے؟" کیا اردو ہندوستان کی مشترک زبان ہے؟ "خجائے فرامین" اور "ہندوستان کی مشترکہ زبان کے بارے میں لکھتے ہوئے وہ ترقی یافتہ زبان کا ایک مبارک ذکر کرتے ہیں، اور اس فوج پر پہنچتے ہیں کہ :

"مسری زبانوں کی طرح اردو بھی ایک ترقی یافتہ زبان ہے جو کہ اپنی ترقی پسندی

کی بدولت دنیا کی سربراہ زدہ زبانوں کے ساتھ ساتھ اردووش بدوش چلنے کے قابل بن

کر بنی الاقوامی شہرت کی مالک ہو بیٹھی ہے۔ یہ امر شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ اس

زبان کو بنانے اور ترقی دینے میں بحیثیت مجموعی تمام ہندوستانیوں کا ہاتھ ہے۔"

فانی کا ایک اور اچھا مضمون فن لطیف اور سماج کے بارے میں کچھل اکادمی کے مجلے "بھلا ادب" ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا تھا، جس میں فن اور فنکار کے لئے آزاد ماحول کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ لکھتے ہیں:-

"فن لطیف اور فن کار کا جب ہی بھلا کر سکتے ہیں جبکہ ان دونوں کو آزاد ماحول مل

ماحول میں پنپنے اور منظر عام پر آنے کے مواقع میسر ہوں۔ اگر فن لطیف جغرافیائی فرقہ وارانہ

اور نسلی حد بندیوں اور سیاسی تیور سے آزاد نہیں ہے تو اس کی جنگی سالمیت اور وسعت کے

زیادہ امکانات نہیں ہو سکتے۔"

فانی غزل بھی کہتے ہیں، لیکن ان کی نظمیں زیادہ اہمیت کی مالک ہیں۔ اور یہ نظمیں ان کے نثری

مضامین کی طرح وسیع اور متنوع موضوعات پر لکھی گئی ہیں۔ ان کی ایک نظم "چاندنی رات" کے کچھ شعر ہیں:

نورِ زاہے شمعِ مرے سے فلک کا سنا بیان

قشقہ سیمیں سے ہے روشن جمینِ آسمان

دھیمی دھیمی روشنی ہے مثلِ موجِ جوئے شیر

یہی شب نے نکالی مانگ ہے کیا دلپذیر
چاندنی ہے یا کہ یہ ایک نور کا سیلاب ہے
رائگاں اب تو فروغ کر کے شب تاب ہے

ہے نغمہ ہر سو سکون آمیز اس دم اس طرح
کیف اور خاموشی زاہد کے دل میں جس طرح
چاند کے طرز عمل سے ہے رواداری عیاں
خشک و تر ہر اس کی یکساں ہیں ضیاء پاشیاں

فانی کی نظموں میں "غروب آفتاب" "طلوع آفتاب" "نظم نو" "ودھوا کی آہ" اچھی نظمیں ہیں۔
"نذر حسین" کے عنوان سے انہوں نے جو نظم لکھی ہے۔ اس میں اسلام کے محاسن کا تذکرہ کیا ہے۔

پرتھوی ناتھ حالی راز کا شہسری اس صدی کے تیسرے دہے کے لکھنے والوں میں ایک مقام پیدا
کر چکے تھے۔ وہ سری نگر میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم یہیں کے ایک سکول میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم سری
پرتاپ کالج میں پائی اس وقت وہ بمبئی میں مقیم ہیں۔ ان کی ایک غزل کے دو شعر ہیں :-

مُسا فر کی طرح جھٹکے ہوئے بازار میں آئے
نئے تھے سیرگشن کو سر کہسار میں آئے

ہیں ہے ہم نشیں منصور کی تقلید کا سودا
مزا پھر کیوں نہ ہم کو آرزوے دار میں آئے

چودھری دینا ناتھ رفیق ایک کہنہ مشق شاعر اور ادیب ہیں، جو اپنی طبع رسا کے سہارے
ہر صنف اور ہر انداز میں شعر کہتے ہیں۔ ان کا وطن پونچھ ہے جہاں وہ ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم مکمل کرنے

کے بعد ۱۹۲۲ء میں محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کی اور کئی سرکاری سکولوں میں معلم اور ہیڈ ماسٹر کے عہدہ پر فائز رہے۔ پھر ٹرننگ سکول پونچھ سے وظیفہ من خدمت پر سبکدوش ہوئے اس کے بعد ہی خالص سکول جموں میں تعلیمی کی خدمات ان کے سپرد ہوئی، اس وقت وہ سناٹن دھرم بھائی اسکینڈری سکول جموں میں کار گزار ہیں۔

رفیق کو اوائل عمر سے ہی شعور سخن سے دلچسپی رہی۔ اس وقت پونچھ کے شعراء میں انہیں استاد کی مرتبہ حاصل ہو چکا ہے۔ اردو کے علاوہ پنجابی ہندی کشمیری حتیٰ کہ انگریزی میں بھی آسانی سے شعر کہہ لیتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء تک ان کے کلام کی ایک مکمل بیاض تیار ہو چکی تھی جو فسادات کے دوران ضائع ہو گئی۔ جو کلام بچ رہا یا فسادات کے بعد سرانجام پایا اس کو مجموعے کی صورت میں سنبل وریحان کے نام سے مرتب کیا ہے۔ اس میں غزلیں، نظمیں شامل ہیں۔ غزل میں ان کا انداز منجھا ہوا ہے۔ شعر کی تکنیک پر انہیں اتنی دست رس ہے کہ وہ طویل بحر، مختصر بحر، طویل ردیفوں، غرض ہر نوع کی تکنیک کے ساتھ آسانی اور روانی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔ ایک غزل کے شعر ہیں :-

کیوں بے خودی سی ہر گدلے میں ہے موجزن
جب میں شریک محفل ہیر منجاں نہ تھا
کرنی پڑے گی ترک و فابھی مال کار
خود مجھ کو اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا
ہر شاخ کے طواف میں بجلی ہے ٹھوکیوں ؟
ہر شاخ پر چین میں مرا آشتیاں نہ تھا
ایسا نہ ایک لمحہ بھی گزرا اے رفیق
معمور اس کی یاد سے میرا جہاں نہ تھا

طویل بحر میں اُن کی ایک غزل کا شعر ہے :

مجھے چاند بن کر روشنی تم نے دی تھی مرے غم زدہ دل کے ظلمت کدو
بنادو گے بھراس کو جاں کاہ ظلمت مجھے خواب میں بھی توقع تھیں تھی

ایک اور غزل کے دو شعر ہیں :

رستمگر مرے دل کے حال زبوں کی تجھے بھی اگر کچھ خبر ہو تو کیا ہو
مرے لب سے نکلے ہوئے نالغَم کا تجھ پر بھی کوئی اثر ہو تو کیا ہو

تیرے فیض کے آج ہر سو میں چرچے ہیں اذکار تیری کرم گستری کے
مری کس مہر سی پر لطف و عطا کی خداوند اگر اک نظر ہو تو کیا ہو

سنبل و ربیعان میں مختلف موضوعات پر نظمیں بھی شامل ہیں۔ مشاہیر ہند اور مشاہیر عالم پر لکھی ہوئی نظموں میں سری کرشنن، "گوتم بدھ"، گردگو بند سنگھ پنڈت، جواہر لال نہرو، سردار دلچھ بھائی، پٹیل، بھاشا چندر بوس، لال بہادر شاستری پر انہوں نے اچھی نظمیں کہی ہیں۔ "جھگوان رام" رفیق کی کافی طویل نظم ہے۔ ایک نظم رفیق نے "شہید اعظم" حضرت امام حسینؑ سے خطاب کے عنوان سے نہایت مؤثر لکھی ہے جس کا ایک بند ذیل میں درج ہے : —

اے حسین ابن علی ستر شہیدانِ جہاں اے عَلم بردار حریتِ اُنیس بے کساں
اے جبری ہمت، اکماند راسپاہِ قدسیاں اے کرم فرمائے ملت، چارہ بے چارگاں

مہتی دنیا تک رہے گی یاد قربانی تری

تیغ کے سائے میں حق کی زمزمہ خوانی تری

رفیق نے ایک نظم میں غالب کو بھی حسانِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اس نظم کے

دو شعر ہیں :-

چاند بن کر جو ذکاوت کے فلک پر چمکا

تاج آسا جو سرِ علم و ادب پر چمکا

نقش دنیا کے زمانہ تو مٹ سکتا ہے

کون غالب کو زمانے میں بھلا سکتا ہے

رفیق کی شاعری کی تہ میں ایک اخلاقی رُحمانِ مضمیر ہوتا ہے، جو کبھی کبھی سطح پر اس طرح ابھرتا ہے:

ہمت ہار کے بیٹھ نہ جاؤ، اٹھو اور پتوڑا سنبھالو

آئی ہے، اگر داب میں کشتی بچنے کی کوئی راہ نکالو

اپنے عہد کے حالات کا ردِ عمل ان کی شاعری میں نمایاں طور پر ظاہر ہوا ہے۔ آزادی وطن کے مابعد مسائل پر

کڑی تنقید میں وہ اپنے عہد کے ترقی پسند شاعروں کے ہم نوا ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں:-

یہ مانا، زبانوں پہ تالے نہیں، میں کسی غیر کے ہم حوالے نہیں ہیں

مگر قحط، ہنگامی، رشوت ستانی یہ جنتا کے ڈسنے کو کالے نہیں ہیں؟

ایک اور شعر میں وہ آزادی سے جو توقعات تھیں، ان کے پورے نہ ہونے پر تنقید کرتے ہیں:

ہم نے رفیق آزادی کے کیا میٹھے پننے دیکھے تھے

سانس کا لینا ہو گیا دو بھر باتِ نیاں پر لائے کون

پننے عہد کے سخنِ ستوں کو رومان کی خیالی دنیا سے نکل کر، ان کے سامنے جو مسائل ہیں، ان سے

نیروازنا ہوتا، اور سماجی برائیوں اور سرمایہ داری کے خلاف صاف آرا ہونے پر اگستاتے ہیں۔

عورتوں کی جلد سے زیادہ آزادی بھی انہیں پسند نہیں۔ اپنے ہم پیشہ مدرٹین کے بارے میں بھی

انہوں نے ایک اچھی نظم لکھی ہے، جس میں ان کی گذشتہ عظمت اور موجودہ دور میں ان کی پستی اور

نبیوں حالی کو نمایاں کیا ہے۔ "یوم آزادی رفیق کی اچھی نظم ہے، جس میں وہ انگریزوں کے ہندوستان

سے جانے اور اس کے جلوے میں جو دنیا عہد طلوع ہو رہا تھا ' اس کی طرف اس طرح اشارے کرتے ہیں :

اسے دیکھنے والے ذرائع رنگ جہاں دیکھ یہ بدلا سماں دیکھ ' زمیں دیکھ نماں دیکھ
اٹھتی ہوئی اس چادر ظلمت پہ نظر کر بڑھتی ہوئی رنگینی فطرت کو عیاں دیکھ
تھی لرزہ بر اندام جس انگریز سے دنیا کا منہ پہ رکھے بوریاں تو اس کو رواں دیکھ
ہاتھوں میں لیا رہتا تھا بودہر کی قسمت ٹوٹی ہوئی اس شاعر عالم کی کھماں دیکھ
ان بدلے مناظر پر ذرا ڈال رنگا میں مٹتے ہوئے دنیا سے غلامی کے نشان دیکھ

پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کے کردار اور پیغام پر رقتی نے ایک خوبصورت نظم لکھی ہے۔ اس کے چند شعر
یہاں درج ہیں :

بانی دین اسلام تیری شہنا ' کس میں طاقت ہے تحریر میں لاسکے
میری تھی زبان ' اس میں قدرت کہاں ' گیت لطف و کرم کے ترے گاسکے
تو غریبوں کا ملجا و مددگار رہا ' تو یقیوں کے دل کا سہارا رہا
تھی جنہوں میں جو کشتی پڑی قوم کی ' اس کا ساحل بنا تو کنارہ بنا
بھول بیٹھے خدا کو تھے اہل عرب ' پوجتے تھے شب و روز اصنام کو
اپنا اپنا تھا معبود ہر ایک کا ' جس پہ بھرا تھی صبح کو شام کو
ایسے بندوں کا تولے سنوارا چلن ' ان کی بڑھتی ہوئی پدعتیں دور کیں
ان کو تہذیب سے آشنا کر دیا ' عادتیں جو بیری تھیں وہ کافر کیں
تیرے حُسن تدبیر سے اہل عرب ' چھوڑے تھے کٹر دلوں کو فخر وطن بن گئے
فون سے سپنج کر گلشن قوم کو ' آپ اس کے ہمار چمن بن گئے
یہ نظم کافی طویل ہے اور اسی طرح کے احترام راجد ہات سے چڑھے۔

پندت موہن کشن، اس زمانے میں عموماً بچوں کی دلچسپی اور ان کے استفادہ کے لئے پھولے چھوٹے مضامین لکھا کرتے تھے، تو ماہنامہ کے شماروں میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کے ایک اور ہم عصر ڈاکٹر اندرسین ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی بھی عام دلچسپی کے مضامین اسی اخبار کے لئے لکھے تھے۔ یوگ دھیان ویاس سنا کرتے اور اخلاقی اور مذہبی نظمیں لکھا کرتے تھے۔ ان کی ایک نظم کے دو شعر ہیں :-

عزیز من نہیں آیا ہے تو آرام پانے کو
تری قسمت میں راحت ہے نہ میں خوشیاں منانے کو
زمانہ تجھ کو امن و چین سے بھینے نہیں دے گا
مگر ستر ہے یہ دنیا، ریشا تیرا مٹانے کو
مردوں کی مخلومت پر بھی نہوں نے کچھ نظمیں لکھی ہیں۔

پندت آفتاب رام کاوشا عز اور انشا پر مول ہیں۔ شعر میں وہ ارشد تھانوی سے اصلاح لیتے تھے۔ غزل قدیم انداز کی کہتے ہیں، پندت نند لال طاب سے ان کے گلہریے روالط ہیں۔
پندت پریم ناتھ پٹواری مسرور کا وطن سولپور ہے۔ ابتدائی تعلیم وہیں پائی پھر سری لکھنؤ میں تعلیم کی تکمیل کی اور محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ کئی سکولوں میں مدرسے کی خدمت انجام دیتے رہے۔ شعر و سخن سے انہیں ابتداء سے دلچسپی رہی۔ رسالہ بہار کشن کشمیر میں ان کی غزلیں اور نظمیں شائع ہوئی ہیں۔ مسرور اچھے مقبر بھی ہیں۔

مولانا سالک بھی اچھے شاعر ہیں۔ ان کا کلام رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوتا رہا۔ پیما انقلاب (۱۱) جی ۱۹۵۵ء میں ان کی پانچ بند کی ایک طویل نظم شائع ہوئی ہے جس سے دو بند ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :-

تمہیں سے اے مجاہدو، جہاں کا ثبات ہے
شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

تمہاری شعل و فانی و غشش حیات ہے تمہاری ہنوت سے پھر قیام جیمیں کائنات ہے
 کو اکب بقاء ہو تم، جہاں اندھیری رات ہے

یہ نکتہ بے نظیر ہے معارف و زکات میں کہ فرق ہے تمہاری اور عوام کی حیات میں
 تمہارا امتیاز ہے دوام میں نبات میں ہمارا ہو کائنات سے تو جو اس کی ذات میں
 بقاء ہے جس کی ذات کو وہ اک خدا کی ذات ہے

پندرت را دھا کشن بھان جنون، خوش فکر اور بڑھ گواہی ہے۔ اُن کی فکر میں تنویر اور ان کے
 اظہار کے اسباب میں بڑی بختی ہے۔ اس صدی کے تیسرے دہے کے شعراء میں وہ اپنی بساویں کی بدولت
 ممتاز تھے، جنون نے ایک نظم 'گل ہائے عقیدت' کے عنوان سے لکھی تھی، جس میں وہ بہرہ کو مخاطب کرتے ہیں۔

مادر ہندوستان کی شان اسے دار وطن

اسے جو اہر لال نہرو، اسے علمدار وطن

کشمیری ہندوؤں کے سالانہ نمونے پر ایک ترجمہ لکھا تھا، جو مارشل کے شمارہ ۶۰ مارچ ۱۹۳۷ء میں شائع
 ہوا۔ اس کے کچھ شعر ہیں :-

ساقیا، آج پلادے میں گھلام مجھے

بادہ کمنہ سے دے بھر کے نئے جام مجھے

سہ قد بندوا، کا بنا خوش دل و خوش کام مجھے

بھول کر یاد نہ ہو گردشِ ایام مجھے

پھول بر سادے بہر دور خدا را سانی

سلاں نو تجھ کو، بارک ہو، دلا آرا سانی

ایک اور نظم کو دو شعر ہیں :-

بانٹ میں گم بھی نہ آئے عادل بھی نہ
 ولولے دل کے تے 'بوش نہ' دل بھی نہ
 مٹیں ہو گئیں۔ یونان کا تختہ اٹل
 فنیسی بھی نیک عالم نہ، کاہل بھی نہ

ان کی منطری نظموں میں آج کی صبح اچھی نظم ہے جس میں صبح کی تجلیوں کا ذکر کرنے کے بعد وہ ایسے
 وقت خواب غفلت میں مرشارہ کوں کو لکارتی ہیں۔

ہے وقت سحر اب تو بیدار ہو جا
 اٹھ اس خواب غفلت سے ہوشیار ہو جا
 تھانہ ہے سہ شاد یادِ خدا میں
 ہے مقبولیت آج ہی کی دعا میں
 جنون آج کی صبح اور یہ بہار
 اٹھنے کیا کوئی نفستہ روزگار

جنون کی رومانی نظموں میں تیری آنکھیں دلچسپ ہے۔ اس کا ایک بند ذیل میں درج ہے۔
 چھلکی ہے جن میں شرابِ محبت جہاں لہریں لیتی ہے استی الفت
 نمایاں ہے رگ رگ میں جن کی شرارت زمانے کا جن سے بدلتی ہے قسمت
 وہ ہیں تیری آنکھیں وہ تیری ہیں آنکھیں

غزل میں جنون کا ایک مقام ہے۔ انہیں کلاسیکی انداز کی غزل پر انہیں قدرت حاصل ہے اس کا
 اندازہ ذیل کی غزل سے ہو سکے گا۔

مرے سوز دروں پر مسکرائے جس کا جی چاہے
 بگرائے بلیاں دل پر، گرائے جس کا جی چاہے
 قفس میں ہوں مجھے کیا کام اب لگئے، گھستان سے
 رکھے شائع نشین یا جلائے جس کا جی چاہے
 ترستم نے میرے سینے کو
 ستائے خوب، جی بھر کر ستائے جس کا جی چاہے
 مری شربت نہیں ہے، یہ نشانی ہے وفاؤں کی
 چڑھائے پھول یا آنسو بہائے جس کا جی چاہے
 بہا راتے ہی افشا کر دیا راز جنوں میں نے
 جنوں اب مجھ کو دیوانہ بنائے جس کا جی چاہے

جنوں کی ایک غزل پھنس گئی طوفان میں کشتی اور ساحل دور ہے کے عنوان سے شائع ہوئی
 تھی اس کے کچھ شعر ہیں :

وہ ابھی میں زلف مشکیں دوش پر ڈالے ہوئے	دامن نور سحر سے ظلمت شب دوز ہے
دیدنی ہے ساتی صن ازل کا فیض عام	جس کو دیکھو وہ شراب عشق سے مخمور ہے
وہ تجھے کیوں وادی امین میں جیسے ٹھونڈنے	تیرے بلبوں کے کرم سے جس کا دل خود ٹو ہے
دیکھئے بحر حوادث سے رہائی کب ملے	پھنس گئی طوفان میں کشتی اور ساحل دور ہے
اسے زبے قسمت کہ صہبائے محبت ہے جنوں	جان بھی، دل بھی، جگر بھی گھر کا گھر مخمور ہے

غلام رسول نشا ط کشتواڑی، سر زمین کشتواڑ کے کہنے مشق کہنے والوں میں سے ہیں۔ ان
 کی ولادت ۱۹۰۷ء میں کشتواڑ میں ہوئی۔ گھر کے حالات سازگارانہ ہیں تھے، اس لیے جو تعلیم میسر کی

اس سے مستفید ہوئے۔ شعر و ادب سے لگاؤ بچپن سے تھا، لیکن کسی باکمال استاد سے استفادہ کیلئے کشتواڑ سے باہر جانے کے مواقع نہیں مل سکے اور کشتواڑ میں بھی کوئی قابل ذکر استاد نہ مل سکا، اس لئے اپنے ذوق اور مطالعے کی مدد سے اس فن پر عبور حاصل کیا۔ آخر میں سیما آپ اکبر آبادی سے رجوع کرنے کا انہیں خیال پیدا ہوا، جو نزدیک اور دور کے شعراء کی تربیت کے لئے ایک ادارہ بن چکے تھے۔ سیما آپ کو جموں و کشمیر کے نوجوان شعراء سے بھی رابطہ پیدا ہو چکا تھا، اور کچھ نوجوان ہدایت اور اصلاح کے لئے ان سے رجوع بھی کرنے لگے تھے۔ انہیں نوجوانوں کی سعی سے ایک انجمن سیما پر بھی سری گرمی قائم ہوئی تھی، جس کا تذکرہ آگے آ رہا ہے۔ نشاط ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۳ء تک سیما آپ کو اپنا کلام بھیجتے رہے۔ غزل ان کی شمری تربیت کی زمین تھی، اور اس میں انہیں اپنی مہارت حاصل ہو گئی۔ لیکن غزل کا اکتفا انہیں نظم کوئی پڑھی اُبھارتا رہا۔ چنانچہ اس وقت ان کی غزلوں اور نظموں کا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ مہیا ہو گیا ہے۔ ایک غزل کے شعر ہیں :-

ہن کا شن و جمال کیا کہنا اور وہ خد و نال کیا کہنا
حور جنت کا تو بھی دلدارہ زاہد با کمال کیا کہنا

ایک اور غزل کے دو شعر بھی یہاں نقل کئے جاتے ہیں :

یہ کیا دستور آئین میخانہ ہے اسے ساقی
کہ رندوں کی یہاں تو بات بھی مانی نہیں جاتی
مُجھلا کر بھی وہ فن شاعری کی پُرکھن راہیں
نشاط اپنی طبیعت کی یہ جو لانی نہیں جاتی

نشاط نے کچھ اخلاقی اور قومی اور کچھ مذہبی نظمیں بھی لکھی ہیں جنہیں 'حسین' کے عنوان سے

لکھی ہوئی ایک نظم ان کے جذباتِ عقیدت کی آئینہ دار ہے۔

بغیر من کا شمیری اور مالک کے ساتھی شعرا میں نیاز کا شمیری بھی اپنے مذاق کے شاعر تھے۔ ان کا اصلی نام عبدالرحمن تھا، لیکن زندگی میں کچھ ناکامیوں کے سبب انہیں نام کے بارے میں کچھ بھڑکنی پیدا ہو گئی اور منظور احمد خان نام اختیار کیا۔ ان کی ولادت پشاور کے قریب ایک گاؤں میں ہوئی تھی۔ ان کے والد موسیٰ خان مسری ہر تپ سکول میں استاد مقرر ہو گئے تھے، انہوں نے نیازی تعلیم و تربیت کی سکول کی تعلیم کے زمانے سے انہیں شعر کہنے کا شوق ہوا۔ والد نے انہیں ٹیکنیکل کالج میں شریک کرایا تھا، لیکن نیاز کو دلچسپی نہیں ہوئی، اس لئے والد نے عریض نویسی کا ارتقا کامیاب کرایا اور عریض نویسی کے کام پر لگا دیا۔ بعد میں وہ امداد باہمی کے محلے میں سرب انسپٹر ہو گئے تھے اور اس تعلق سے کچھ عرصہ مظفر آباد میں بھی رہے۔ اسی زمانے میں کشمیر میں احمد ابراہیم شریک شروع ہوئی، اور نیاز اس کے مکن بن گئے۔ ہمارا جہ کی حکومت نے اس کی منزا میں انہیں خدمت سے ہٹا دیا۔ اس طرح ان کی زندگی میں نشیب و فراز آتے رہے۔ آخری زمانے میں وہ بارہنہ اور ہندوارہ بانچی شاٹھ میں بھی کام کرتے رہے۔ ۱۹۶۸ء میں وہ قج کو گئے اور مکر مغلہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

نیاز کا شمیری نیاز کا مراہی کے نام سے بھی لکھتے تھے۔ جہلم کے کنارے ان کی ابتدائی نظموں میں سے ہے۔ غزلیں بھی انہوں نے کہی ہیں اور کچھ انشائیے بھی لکھے ہیں، لیکن ان کی ایک نظم "وٹاؤں بہت مقبول ہوئی۔ یہ چھ بند کی طویل نظم ہے۔ جس کے ہر بند میں اشعار کی تعداد مختلف ہے۔ اس نظم کا اقتباس درج ذیل ہے :-

وٹاؤں بنا آج کل گلہ بان ہے فدا ہو رہا جس پہ حیرخ کہن ہے
عجب ہے فزاکت عجب بائیں ہے عجب ان دنوں اس کا طور و طیلن ہے

وہ دیکھو کہ ہے دیوہ نس سسراٹھائے

و نادون کو آغوش میں ہے دیا سے

کراشتی کا جسم ہے میرا، یارو لگائی مجھے حسن نے ہتھکڑی ہے

بندت دینا ناتھ عارض کا شیمی اور وید لال گرو دونوں شاعر بھی تھے اور افسانے بھی لکھتے تھے۔ گرو کشمیر سے سولہ سترہ میل کے فاصلے پر اونتی پورہ کے پاس ایک گاؤں ہے 'وید لال' وہیں رہتے ہیں، کچھ عرصہ وہ راولپنڈی میں بھی رہے۔ ان کی ایک اخلاقی نظم کے کچھ شعر یہاں درج ہیں۔ اس نظم میں نئے عہد کی تحریکوں کا ردِ عمل ملتا ہے۔

اٹھ کھڑا ہوا سے دیہاتی تجھ میں گر کچھ جان ہے ناز خالق کو بھی ہے جس پر تو وہ انسان ہے
تو جہاں کو قوت مردانہ کے جوہر دکھا شہر والے جس سے ہوں حیران وہ منظر دکھا

کامل ہمت سے تو اودست قدرت ساتھ ہے

ساری دنیا ہو مخالف، بازی تیرے ہاتھ ہے

صحیح میرا اصل میں کشمیری زبان کے شاعر تھے، ان کو کشمیر میں اردو شاعری کے مرکزوں جیسے بریڈر سے واسطہ نہیں رہا۔ یوں ہمارا کچھ کام ان کا وطن تھا۔ کشمیر میں ان کا مقصودانہ کلام عوام میں مقبول ہے۔ صمد میر کو اپنے گاؤں میں اردو شاعری کی روایت جس طرح پہنچ پائی تھی، اس کا اندازہ ہم کو ذیل کے اشعار سے ہوتا ہے، جن میں کشمیری بھی بعض جگہ ملی جلی ہے۔

قتا سمسار آج یا کل تو سمجھو سوچ کر کے گل

وہ یہ سلا وعدہ قالوا بلا تو سمجھو سوچ کر کے گل

وہ پانی پر چرخ لا کا خودی اپنا بنیاد مودا

چپکی پھرتی سکا پا پھل سو سمجھو سوچ کر کے گل

ڈرو مت اور نہ کوئی دشمن دفا سے دوست دریا من

واعتبار در بدن مجسّم	تو سمجھو سوچ کر کے گل
یہ رغنا چشم ہلالی رو	ٹھنڈا آواز عاشق جو
تو اس کو پای پکڑ مکمل	تو سمجھ سوچ کر کے گل
سوائے چھبے یہ محنت لعل	تو یاد تاک بتا و مال
نہ کچھ رکھ چپکے نہ در بعل	تو سمجھو سوچ کر کے گل
اور ادھر یا نہیں چلتا	رہو بیچ میں کہ راستہ راہ
اگر عاشق تو سینور	تو سمجھو سوچ کر کے گل
یہ اپنا دل طلب شہنشاہ	بنا دمار سچی رنگا د
ہوئی روشن تو روغن مل	تو سمجھو سوچ کر کے گل
یہ دریا درد کھو دو نکا کیا	نہ کشتی دنہ پل نے رام
دو آنکھوں کو نیا د مجھل	تو سمجھو سوچ کر کے گل
تو تر کے مرد گرشاید	دربے بہا بہ کف آید
حلاف سامنے بہر سیکل	تو سمجھو سوچ کر کے گل
صد میر کو تیا راست	نہ میں ہندو نہ مومن غافل
فدا از عشق تو فیصل	تو سمجھو سوچ کر کے گل

جملہ میر کا کلام اور دوسرے کشمیری شعرا کے کلام کی طرح غلام محمد نور محمد کے مطبع سے شایع ہوا تھا
ایک مجموعے کے حقوق کے محفوظ ہونے کا اعلان کرتے ہوئے انہوں نے یہ تحریر لکھ دی تھی۔

ضروری اعلانات

میرے تمام غزلیات کے جملہ حقوق طباعت بحق غلام محمد نور محمد محفوظ ہیں۔ کوئی شخص

لن کے بغیر میرے غزلیات کا جزو یا ہیئتاً قصد طبع نہ کرے۔ اور کوئی گانے والا یا
 یعنی ہادی میری اہانت، میری نظموں کو ریکارڈوں میں لانے کا ارتکاب نہ کرے۔
 خلاف ورزی کرنے والے کے خلاف کاپی رائٹ ریگولیشن ۱۹۶۱ء کے تحت
 قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔ صہ میر جمیل ہار۔

مولانا ابوالحسن مبارک مبارک اہل حدیث کے پیشوا اور واعظ، کشمیری اور اردو میں شہرتے ہیں۔
 ان کے نظموں کا ایک مجموعہ "سوز و ساز" کے عنوان سے محمد امین نقشبتی نے مرتب کر کے ۱۳۵۳ھ میں شایع
 کیا ہے۔ اس مجموعے کی اکثر نظموں میں اردو، کشمیری اور کبھی کبھی فارسی میں بھلی زبان میں نفیس شعر
 اور مہرے آجاتے ہیں۔ نظموں کے عنوانات حسب ذیل ہیں:-

ایجادِ بد رگاہ، تیرا عز و علا، ایتھاس بد رگاہ، خیر الناس، بارغ علم نالہ یتیم، توجہ بد
 صفائی، اسلامیہ ہائی سکول سہری نگر، دردِ دل دنیا رنگ ہے، التجبانی
 حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اول الذکر نظم میں مہاراجہ مہری سنگھ کے لئے بھی دعا کی ہے۔ ریختہ انداز کے کچھ شعر حسب ذیل ہیں:-

اے قوم، یاد کرتو، گو مت زمانہ سارا
 بلکہ اچھ مژد تو تراوت بہانہ ہارا
 اسلاف کی وہ ستمت، اصحاب کی وہ عنفوت

آسوک پر ن کھورن تل اقبال زادہ بارا

اس نظم میں میر واعظ رسول شاہ کی تقریر کی تعریف کی ہے:-

تقریر مہر واعظ، تصویر مہر واعظ

تعمیر مہر واعظ، دل کردہ پارہ پارا

جو نظیں اردو میں ہیں، ان میں سے ایک شاہ کشمیر کی عہداری "نہار بند ہری سنگھ کی سالگرہ موقع پر لکھی گئی تھی۔ اس کا پہلا شعر ہے :-

سری کو اسے خدا جب تک ترے در سے طے پرکاش
ہر سینگہ شاہ کشمیر کی عہداری مبارک ہو

چھہ خلاتی اور مزاجی بھی کہا ہے۔ اپنے جوتا چھوڑ کر بوٹ پہننے کی توجہ معذرت کے ساتھ اس طرح کی ہے :-

چھوڑ کر جوتا مبارک بوٹ کا متناق کیوں
مولوی اور بوٹ، آخر شہرہ آفاق کیوں
دل نے چاہا اس نپے نیش کو کردوں پامال
اس لئے یہ بوٹ پہنا، ورنہ اس سے ہے حلال

مجموعے کے لئے تمہید خود مولانا نے لکھی ہے۔ اور اس میں اس مجموعے کی پیش کشی پر انیسار کے ساتھ معذرت کی ہے۔ مگر اس کا انداز منشیانہ ہے۔ فرماتے ہیں :-

"نہ ناشر ہوں نہ ناظم شعروشاعری سے کام نہیں، شاعرانہ کشمیر میں
نام نہیں سالہاے ماضی میں چند بوسیدہ و فرسودہ خیالات کو اپنے
ٹوٹے بھوٹے الفاظ میں ظاہر کیا تھا شرم و تیا میدان نامیدی (اشاعت)
میں قدم دھرتے مانع تھی اور طبیعت پروردہ گماشتی میں ہی زندگی بسر کرنے پر
قانع آخر اجاب کے اصرار اور عزیز محمد امین نقشبندی کی
بار بار گزارشات نے تجھی عزیز مری نہ کوڑہ مسن طبع دینے پر مجبور کیا۔"

مجموعے کے آخر میں محمد امین نقشبندی "سوز و ساز" کے دوسرے حصے کی جلا ہی اشاعت کی اطلاع
دی ہے مولانا امبارک دوشتری "تھانین" فیصلہ آسانی اور "سالو حضرت" کے بھی مصنف ہیں۔

”دختر شیر فروش“ دلچسپ نظم ہے۔ وہ غزل بھی کہتے ہیں اور غزل میں زیادہ تر غالب کے انداز فکر سے متاثر ہیں۔ ان کی ایک نظم ”صبح پہلگام“ مقامی دلچسپی رکھتی ہے۔ اس کا اقتباس ذیل میں درج ہے۔

صبح پہلگام تھی

حسن ازل عام تھا

ہر برس اک آبشار دوڑتا دیوانہ وار

جیسے کوئی بے قرار میری طرح بار بار

صبح پہلگام تھی

حسن ازل عام تھا

صبح ہاں شام ہو یار لبِ بام ہو

دورے و بام ہو بیشکشی سے کام ہو

صبح ازل عام ہو

حسن ازل عام ہو

کاش کہیں ہو بھر زندگی مختصر

جس کو دیدار پر فاضلی منتظر

صبح پہلگام ہو

حسن ازل عام ہو

غزل کے چند شعرا ہیں :-

جنون کا زور پھر ہونے لگا نفس بہاراں میں جل بھی جائے، یہ آشتیاں تو بہ

میری ڈوبی ہوئی نبضیں یہ کس نے تیز پھر کر دیں یہ کس عیسیٰ نفس کا فیض ہے جاری رگِ جان میں

ہر قدم پر ہیں بجلیاں، توبہ جل بھی جائے، یہ آشیاں توبہ

میری بہاری نقشہ ہے اگر یہ، تو پھر خزاں بہ توبہ

میرزا جمال الدین شیدائیں اور فاضلی میں شرعی رفاقتیں رہیں۔ نوجوانی میں فاضلی بڑے رئیس و راج تھے۔ سندھ میں میرزا شیدائے یہ چند شعر انہیں کو منجانب کر کے کہتے تھے۔

دل میں طوفانِ تخیل سے موجِ خیزیاں

اس پہ میں شاعرِ مزاجی کی جنوں انگیزیاں

مجھ سے کہہ دینا ذرا، اسے نو گرفتارِ حیات

ہو گئی تجھ کو نشتِ طغم یہ کیوں کمرِ سادہ بات

ہے ہوسِ کاری کی اس شطرنج کا انجام رنج

دہرِ دوں کا رکھ دیا ہے عاقلوں نے نام رنج

پندتِ ندلال کو لے ناشاد اور ان کے چھوٹے بھائی پندت گوپی ناتھ رینہ ناتھ، دونوں کو شعر و سخن سے

وچسپی رہی۔ سری نگر کے محلہ درانی یار میں ان کا آبائی گھر ہے۔ ناشاد ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے تھے۔ میٹرک

کا میاں کرنے کے بعد، حکمرانِ کشمیر میں محال دار کے عہدہ پر مامور ہوئے، اور کچھ عرصہ ہائڈرو گرافکس و کرسٹالین

میں بھی کام کیا اور جنوں کشمیر کے کسٹ گارڈ کی خدمت بھی انجام دی۔ ۱۹۳۳ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ناشاد

نے پہلے پہل طالبِ تخلص اختیار کیا تھا۔ لیکن پندتِ ندلال کو لے طالبِ کی شہرت نے انہیں تخلص تبدیل کرنے

پر مجبور کیا اور اس سوا اتفاق نے انہیں ہمیشہ ناشاد اور نامِ راہی رکھا۔ ان کو شعر کہنے کی تحریک پندت پریم ناتھ

پر دہی اور دینا ناتھ چکن مست سے ملی، لیکن ان کی ملازمت کی منسوختوں نے انہیں اپنے فن کو سنوارنے

اور بھارنے کا موقع نہیں دیا۔ یوں وہ غزل اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ ناشاد کی نظمیں زیادہ تر

مذہبی موضوعات پر تھیں۔ کچھ نظمیں انہوں نے یو راج کون سنسکرت (سابقہ گورنر ریاست) حال وزیر یوں

ہوا بازی 'حکومت ہند' کی سالگرہ کے موقعوں پر بھی لکھی ہیں۔ ناشا دنے ایک طویل مثنوی "سہ نامہ نوری ناز" کے عنوان سے لکھی تھی جس میں اپنی حیات کی کہانی پیش کی ہے۔ اس کہانی کو وہ اس طرح شروع کرتے ہیں:

سُناؤں، سفر کا کیسے اپنا حال

زمین سخت ہے، آسمان پر دُوبال

رہا سال تیراں وطن سے بھی دُور

موت میں لکھا تھا، کس کا قصور

مثنوی شعری محاسن کے اعتبار سے بلند پایہ نہیں ہے۔ لیکن یہ ناشا دنے کی جیون کہانی ہے۔ اور کوئی ان اشعار پر مبتلا۔ نوری ایک مقام ہے۔ جہاں تک سفر کی مصوبتیں بیان کی ہیں اور اس مقام کا تصور اس حال تک پہنچا ہے۔

پنڈت گوپی ناتھ: تھہ ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے اور میرٹھ کا میاں کرنے کے بعد حکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ وہ اردو، کشمیری اور ہندی تینوں زبانوں میں شعر کہہ لیتے ہیں۔ ان کی نظمیں اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان کی ایک اچھی نظم "پریم کی یاد کے عنوان سے چھپی تھی، جس کے کچھ شعر یہ ہیں:-

دیر بچے میں وہ بیٹھی گا رہی ہے کس کی یاد، رل تڑپا رہی ہے

وہ ہے شائد سُناؤں آپ بیٹی کہ کس آشا پہ ہے آب تک جیتی

وہ آئے گے سُناؤں گی نئے راگ میں گان کے درشن سے یہ دیراگ

کبھی بچوں سے کہتی ہے کہ "وہ آئے" کبھی بھراہ کہتی ہے کہ "ہائے"

اسی انداز سے ایک پریم کی کہانی سُناؤں ہے۔

پنڈت پریمو ناتھ تھپلو، انت ناگ اسلام آباد کے رہنے والے ہیں۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد یہ دیہات سدھارنے کے محکمے میں کام کرتے تھے اور اس تعلق سے وہ محکمہ کے ترجمان "دیہاتی دنیا" کے ادارہ

سے بھی وابستہ رہے جس کے ادیٹر پنڈت گنگا دھر بھٹ دیہاتی تھے۔ پھلو مارٹنڈ کے ادبی شماروں کے لئے بھی لکھتے تھے۔ فروری ۱۹۳۶ء کے ایک شمارہ میں ان کا ایک اچھا مضمون "عورت کیا ہے" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ایک نظم "پیاری یادیں" بھی شامل ہے جو پانچ بند کی اچھی نظم ہے۔ اس کا اقتباس ہے۔

آسمان پر چھائی ہے 'کالی گھٹا' کیف سے مخوربت ساری فقہا
 آج دم بھر کے لئے آؤ پیسا
 آئی ہے سخن گلستان میں بہار گدانا ہے دل الفت شعار
 میرے دل کو یوں نہ ترساؤ پیسا

نرسنگھ سہائے شوق، جنوں کے کہنے شوق سخن سنج ہیں، اور پورے آداب اور سلیقے کے ساتھ شعر کہتے ہیں۔ ان کا تعلق جموں کے چوہان راجپوت فرقے سے ہے اور غالب کی طرح 'سلاف کا تیر' ان کے ہاتھ میں قلم بن گیا ہے۔ ان کے بزرگ دہلی سے جموں آکر آباد ہو گئے تھے، والد کا انتقال کمسنی میں ہو گیا، اور سرکاری امداد سے تعلیم حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی سے انٹر سائنس کا امتحان کامیاب کیا اور حکم تعلیمات میں ماسٹری کے عہدہ پر مامور ہو گئے۔ اس وقت وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہو چکے ہیں عمر کوئی پچھتر برس کے لگ بھگ ہے اور شعر و سخن کی دلچسپیاں بدستور جاری ہیں۔

شوق کو بچپن سے شعر و سخن کا ذوق رہا جس زمانہ میں وہ چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے شعر کہنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد جو کلام انہوں نے سرانجام کیا اس میں سے اکثر لاہور کے اخباروں جیسے "پرتاپ"، "ملاپ"، "سدرشاہ" وغیرہ میں شائع ہوتا رہا۔ کچھ کلام جالندھر کے اخباروں "پرتاپ" اور "دیپ" میں بھی شائع ہوا ہے۔ جموں کے اخباروں اور رسالوں میں سے "زمیر"، "مکھن دھن"، "چاند"، "قونی آواز" میں بھی ان کی نظمیں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان کی ایک نظم "اندھا لڑکا" کے

عنوان سے شایع ہوئی تھی جو انگریزی سے خود ترجمہ ہے۔ اس نظم کا اقتباس ذیل میں درج ہے۔

یہ نیرت تو مجھے تم ذرا کہ نصیرا و نور ہیں چیز کیا

مزا جن کا میں نے اٹھا سکا میں نظریں برکتیں کیا بلا

کوئی دندہ پر مٹے کو دست بتا

مری کم انہی پر جب کبھی دل دردمند نے آہ کی

مرے گوش ہوش نے سن لی میں نے پھر بھی صبر سے سہل کیا

وہ الم جہ میں نہیں جانتا

قومی نفس بھی شوق نے کئی لکھی ہیں۔ جن میں نوجوان کے حوصلوں کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک نظم کے شعر

ساف کے کارناموں کی نئی ایک داستان تم ہو

شہادت کرو سچی ناز جس پر وہ جوان تم ہو

تمہاری جلاوطنی کا کرے گی تذکرہ دنیا

ہمت دیتی تھی بہت دلکش وطن کی داستان تم ہو

شوق کے کلام کا مجموعہ شائستہ ہوا تھا لیکن اب نایاب ہے۔

پنڈت دھرم پرشاد درجن کا کلام اس صدی کے تیسرے دہائی کے اخباروں میں شائع ہوتا رہا

پنڈت دینا ناتھ ناتھ نے نشاندہی کی کہ کشمیر کی سیاست کی مشہور شخصیت تھی۔ پلی لادو میں ادران

کے کچھ شعر بھی سنائے تھے۔ بعد میں ملوث تھے فوجیوں کو توجہ دینے کے لیے ان کی ایک پوری کمراد ہو

گئی یہ پاکیزہ رومانی مغز بے غویں میں درج کی جارہی ہے۔ اس غزل کو پڑھ کر لگا ہوگا ہے

کہ حضرت یوہانی سیاست کے پیکر میں چمکی کی مشقت برداشت کرتے ہوئے بھی شعر کہنا سب نہیں

..... سمجھا ہے اس فوج کے ساڈھ شدہ بدترنن جھکایا جا چکا ہے۔

راہ مانتہ میں غول پارس روہوتا ہے چاک پر وہ تقدیر دیکھ کے عنوان کے تحت شایع ہوئی ہے۔
غزل کا سیکی رومانی انداز کی ہے جو ذیل میں درج ہے :

وہ عمل میں زیبا نہیں پر وہ بہت بے پیر! دیکھ
آئینہ خانہ میں اکرا حسن کی تصویر دیکھ
بزم خرابیاں میں مجھے سوئے بیاباں لے چلی
کس قدر وحشت طلب ہے عشق کی شیر رکھ
اب بھی باقی ہے دم تیار الفت اے طیب
دور کہ نسخہ ذری کچھ وصل کی تدبیر دیکھ
میکر اگر ناز سے کہتا ہے شیشہ میں وہ شوخ
آئینہ خانے میں آکر عام تصویر دیکھ
کیا نالاش ہو رہی ہے قتل نگاہ ناز میں
ایک سو بھی بڑے ہیں ایک سو نچھیر دیکھ
سوزن تدبیر اے رونق ذرا لے ہاتھ میں
پس روہوتا ہے چاک پر وہ تقدیر دیکھ

مولانا کا ذوق شعرو ذوق اصل میں موزنی ہے۔ ان کے خاندان میں بہت سے صاحب ذوق
نثر کے نمایا ہوئے ہیں تعلیم کے دوران ان کا ذوق شعرا و ج پر تھا۔ ایل۔ ایل۔ بی کے لئے وہ لکھتے رہے۔
بھسماندہ شعری مہمتوں سے بھی انہوں نے استفادہ کیا اور جب علمی سیاست میں داخل ہوئے تب بھی اس
ذوق سے انہوں نے نہایت موقوں کو ہلکا ہلکا بنانے میں بہت کام لیا۔ رونق کا ایک اور شعر بھی منادیم
اکوئی سندھیا۔ جو درج ذیل ہے :-

سکونِ حائل نہیں مجھ کو کہیں سیلاب کی صورت

مثالِ ماہی بے آب سے ہر دمِ تڑپت ہول

غلام مولِ ناز کی وادی کشمیر کے کہنہ مشقِ بشارتوں میں سے ہیں اور اردو زبان میں اظہارِی
نثر اکتوں کے شعورِ بیان کے انداز پر قدرت نے انہیں سادہ کے مرتبہ پر پہنچا دیا ہے۔ سادہ اردو کی روایات
کے وہ وفا شعار پابند ہیں، اسی لئے غزل کی صنفِ زیادہ تران کی فکر کا محور رہی ہے۔ لیکن ان کی غزل
نئے عہد کی نئی غزل ہے۔ جس میں ہمارے اپنے عہد کی فکر کا شعور موجود ہے۔ تیر کی سادہ بیانی کا پرتو
اگر کشمیر کے کسی سخنِ سنج کے کلام میں نظر آتا ہے۔ تو وہ ناز کی ہیں۔

ناز کی کا ایک سوانحی جائزہ ان کے ایک دوست جنسی نرودش نے جو خود بھی اردو میں
لکھتے ہیں ”تعمیر“ (میرٹنگر) کے شمارہ مارچ، اپریل ۱۹۶۱ء میں شائع کیا تھا۔ جس میں ان کے خانہ دانی
حالات اور ان کی شاعری کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ ناز کی کا اسم نسبت کشمیر کے ایک بزرگ
سادات، میر ناز کا قلم کا واسطے سے ہے جو حضرت شیخ حمزہؒ کے زمانے کے کچھ بعد کشمیر آئے اور مرجعِ خانہ
عام بن گئے۔ ناز کی کے والد بزرگوار انہیں کی اولاد میں تھے۔ وہ عربی اور فارسی کے سربراہ اور وہ عالم تھے
اور انہیں کی تربیت سے ناز کی کی طبیعت کو عظیم و ادب سے لگا دیا ہوا شاعر و بچپن سے کہنے لگے تھے
اور ابتدا میں اخبار ”ہمدرد“ اور دوسرے اخباروں میں اپنا کلام ”غنی کشمیری“ کے قلمی نام سے شائع کرتے تھے۔
۱۹۴۸ء تک اپنا کلام اکٹھا ہو گیا کہ ایک مجموعے کی صورت میں جو ”دیدہ ترسے موسم ہے مرتب ہو سکا۔
یہ مجموعہ ۱۹۴۹ء میں ناز کی کے ایک دوست غلام محمد میر طاؤس کے تعارف کے ساتھ شائع ہوا ہے۔
طاؤس شمسۂ ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ اور اردو کے شاعر اور نقاد بھی ہیں۔ ناز کی کی شاعری کی اقدار کا
اندازہ لگاتے ہوئے، طاؤس لکھتے ہیں :-

”آپ کی شاعری، ایک دکھی دل کی پکار ہے۔ ایک غم انگیز پکار۔ آپ کے

یہاں غم، زندگی کی اہم ترین حقیقت سے عبادت ہے۔
نازکی کا شعر ہے :-

محبّت زندگی، اور زندگی غم ہوتی جاتی ہے
قوتی تحلیل ہو کر، غم میں مدغم ہوتی جاتی ہے

نازکی کے احساس غم کافی کی لذتِ اہل سے مقابلہ کرتے ہوئے، طاموس و قحطِ اڑا میں :-

"غم کا یہ فوشگوار تصور، جس کو اردو شاعری میں فانی مرحوم نے مستقل موضوع کے
طور پر روشناس کیا، قنوطیت اور یاسیات کے اس قدیم تصور سے بالکل جداگانہ
ہے۔ یہ غم انسان کو فرار پر مجبور نہیں کرتا، نہ تو بے علمی کی طرف مائل کرتا ہے۔ نازکی
کے یہاں غم کا یہ تصور اس حد تک رفیع ہے کہ آپ کے نزدیک غم ہی بندہ و مولا پہ واجب
ارتباط ہے اور روح کی پائیدگی کے لئے صرف دل اندوگہن کی ضرورت ہے۔"

احمد حسن غم کی اس گہرائی اور گیرائی کے سرچشمے کا سراغ انہوں نے شاعر کے معاشرتی ماحول اور ضمیر کی کھلی
جوش و فہرست تاریخ سے لٹایا ہے۔

"دیدہ تر" قطعات، غزلیات اور نظموں پر مشتمل ہے۔ قطعات چومرہ عری ہیں۔ اور ان میں نازکی کو
ایک امتیاز حاصل ہو گیا ہے۔ ان میں سے بعض ان کی فکر کے نفیس نمونے ہیں، نظمیں شاعر کے انفرادی اثرات
اور تجربیات پر مشتمل ہیں۔ نازکی کا ایک قطعہ ہے جس میں انہوں نے جوانی کی حقیقت و ارفع کی ہے۔
جیتے ہیں :-

کوئی کہتا ہے اس کو جساد دانی کوئی کہتا ہے فانی ہے جوانی
نہ آگاہ اس کا رطاب ہے نہ پیچھا بڑی الجھی ہوئی ہے یہ کہانی

قطعات اور نظموں کی فکر عمیق غزل میں سبک سیری کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ غزل میں بعض جگہ گہرے

طنز سے نازکی کی شاعری میں ایک انفرادیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک غزل کا شعر ہے :-
 اس شوخ کو کیا دیکھا، آنکھوں میں سرمٹ آئی
 شیراز کی رشادابی، کشمیر کی رعنائی
 غزل کا ایک شعر اور ہے :-

اب کس کو یقین آئے جو چیز ہے فانی ہے
 پیغام محبت ہے، اور ان کی زبانی ہے
 ان کے طنز یہ انداز کی مثال ذیل کے شعر میں ملتی ہے :-

مجھے بے طلب زندگی دینے والے
 یہ احسان تیرا نہیں، دشمنی ہے

نازکی فارسی اور اردو کی شعری روایات کا اچھا عرفان رکھتے ہیں۔ اسی لئے ان کے کلام کو پڑھتے ہوئے
 اساتذہ قدیم کی فضا ذہن میں پیدا ہو جاتی ہے۔ کشمیر کے فارسی شعرا میں غنی سے انہیں فطرتاً عقیدت ہے۔
 اور اس عقیدہ مندی کے سبب انہوں نے غنی کے کلام کو مرتب بھی کیا ہے۔ ایک شعر میں اپنی شاعری کو اغنی
 و فیض سے اس طرح تعبیر کرتے ہیں :-

کہاں میں کہاں نغمہ زندگانی
 مرے روپ میں جلوہ فرما غنی ہے

نازکی کی غزل کی سہ حدیں نظم سے مل جاتی ہیں، اسی لئے کئی غزلیں سو اسے قافیہ کی ترتیب صنف کے الزام
 سے بہت کم غزن معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً ذیل کے اشعار کے تیور اسی طرح کے ہیں :

نہ کو جنبش سی ہوئی چہرہ سے زائیں ہٹ گئیں
 شام نے اک خیر خوری سی لی سویرا ہو گیا

دُور تا حدِ نظر میری نظر تھی ہمارے سب
 لوٹ گیا آئی اُجالے میں اندھیرا ہو گیا
 بارہ الفت میں منزل کا تعین کیا کر میں
 جب مسافر ہار بیٹھا ، بسیرا ہو گیا
 ایک نگاہ ناز نے جھکڑے چکاؤ اسے تمام
 میں بھی تیرا ہو گیا ، میرا بھی تیرا ہو گیا

اقبال اردو کے بہت سے شعراء کی طرح کثیر کے اکثر اردو شعراء کے لئے الہام کا باعث ہوئے۔
 نازی کے ذیل کے اقتباس میں اسی اثر کا ردِ عمل ملتا ہے :

گھٹو کل ہو رہی تھی بلبل و شہباز میں
 دے دیا بلبل نے شاہیں کی تعلق کا جواب
 ہے بظاہر تلخ ، لیکن یہ حقیقت ہے ، رخسار
 زندگی ہے سیکڑوں تاروں کی ، مرگِ آفتاب

ناز کی کُل ملازمت کا زمانہ زیادہ تر محکمہ تعلیم میں گذرا۔ بعد میں وہ ریڈیو کثیر سے بھی وابستہ ہو گئے
 تھے۔ محکمہ تعلیم کی ملازمت کے زمانے میں جب خواجہ غلام اسدین ناظم تعلیم تھے ، ایک تعلیمی رسالہ "تعلیم جدید"
 کے نام سے جاری کیا تھا ، اور اس کی ادارت نازی ہی کے تفویض ہوئی تھی۔ نثر میں بھی نازی کا انداز
 مشت اور سادہ پر کار ہوتا ہے۔ انہوں نے کئی مضامین بھی لکھے ہیں۔ جن میں تاریخی اور تنقیدی شعور ابھر رہا ہے۔
 ان کا ایک اچھا نمونہ نعتیہ ادب پر لکھا گیا ہے۔ جس میں عربی اور فارسی نعت نگاری کا جائزہ لیا گیا
 ہے۔ جب وہ اقبال پر پہنچے ہیں تو لکھتے ہیں :-

"مناشرین میں نعت کو ایک نیا روپ اقبال نے بخشا" جاوید نامہ "اسرار و رموز" "مسافر" اور

”پیام مشرق“ نعت کا پہلو ہر کتاب میں غالب ہے۔ ”ارمغان حجاز“ کا مکتوبی خیال ہی نعت رسول ہے۔ اقبال کی نعت ایک الگ مبسوط اور مستقل موضوع ہے۔

کشمیری کے نعت نگار شاعر عبدالاحد نادم کے حالات اور کلام کے انتخاب پر مشتمل ایک رسالہ مرتب کیا ہے جو کلچرل اکادمی سے شائع ہوا ہے۔ اُن کے مضامین کا سلسلہ کشمیری شاعری پر ”شیرازہ“ میں شائع ہوا ہے۔

ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انہوں نے ایک ہفتہ وار ”انفغان“ بھی نکالنے لگے ہیں۔ اس کے اداریوں اور خبروں پر تبصرہ کے لب و لہجے میں ان کے عام مذاق کی سلامت اور طبیعت ہی ضمیر طنز نے، کشمیر کی صحافت میں اسے ایک امتیازی مقام عطا کیا ہے۔ اس کام میں بھی ناز کرنے، اپنی شاعری دلچسپی اس طرح برقرار رکھی ہے کہ اساتذہ کے کام کا انتخاب ہر شمارے میں شامل ہوتا ہے۔ اور شاعرین اقوال اور لطائف کی بھی اس میں گنجائش رکھی ہے۔

میرزا غلام سن بیگ عارف، بہت سی ادبی تحریکوں کے سرگرم رکن رہے۔ جدید کشمیری شاعری اور ادب کے وہ بانیوں میں سے ہیں۔ اور اُن کا شمار کشمیری کے سربراہ و شعرائں ہوتا ہے۔ ان کے خاندان میں علمی اور ادبی روایات عرصہ سے چل رہی ہیں۔ عارف کے والد میرزا اسرفراز بیگ عالم، صوفی اور فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ عارف کی ولادت ۱۹۱۵ء میں اننت نگر اسلام آباد میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اننت نگر میں پائی اور انٹر میڈیٹ کی تعلیم کے لئے سری نگر آئے۔ بی۔ ایس۔ سی اور نمٹ کالج لاہور میں پائی تعلیم لاہور کے زمانے میں وہاں کے ادبی حلقوں میں شریک رہنے کے انہیں موقع ملے اور علامہ اقبال صاحب سے بھی استفادہ کیا۔ ایم۔ ایس۔ سی حیاتیات کے مضمون میں اعلیٰ گزشتہ ۱۹۳۵ء میں پاس کیا اور سربراہ بننے کے بعد اُن کا تقرری سری نگر پرنسپل دیا سسٹر ٹیچر کی اسامی پر ہو گیا۔ ۱۹۳۶ء میں محکمہ تعلیم میں وہ ڈپٹی ڈائریکٹر مقرر ہوئے اور اسی محکمہ سے ناظم کی حیثیت سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔

دفتری مہر و فیثوتوں کے باوجود عارف کے علمی اور ادبی مشاغل میں کمی نہیں ہو سکی کشمیری کی طرف ان کی توجہ کا ایک سبب علامہ اقبال ہوئے تھے۔ ایک موقع پر عارف نے علامہ سے پیام عطا کرنے کے لئے کہا تھا، جس علامہ نے انہیں دو مشورے دیئے تھے۔ ایک یہ کہ قوم کی خودی بیدار ہونی چاہئے دوسرے اس کی زبان زندہ ہو۔ یہ مشورے ان کے دل پر ایسے نقش ہو گئے کہ کشمیر کو طے کے بعد کشمیری بزمِ ادب کی انہوں نے ابتدا کی، جس کے سرگرم اراکین میں ہندرت دینا ناتھ نام، عبدالحی براق اور غلام رسول نازکی، ماسٹر زیدہ کول ثابت، پنڈت ڈی۔ پی۔ دھر، مولانا محمد سعید مسعودی، پروفیسر پی۔ این۔ پشپ، جسٹس جیالال کلیم، مکھن لال جھو اور کئی اور حضرات تھے۔

۱۹۴۷ء میں جب لکھنؤ کا نفرنس کا قیام عمل میں آیا۔ تو خواجہ غلام محمد صادق اس کے صدر اور عارف اس کے جنرل سیکریٹری منتخب ہوئے۔ انجن ترقی پسند مصنفین کی جیب بنیاد رکھی گئی، تو عارف اس کے بھی سرگرم رکن بن گئے۔ ہندوستان کے دستور کی تدوین جس زمانے میں عمل میں آ رہی تھی اصطلاحات تجویز کرنے کے لئے مختلف زبانوں کے ماہرین کی کانفرنس کا سیٹی ٹوٹ اسمبلی کی کشمیری کے ماہرین میں پروفیسر جیالال کول اور عارف کانفرنس کے رکن رہے۔ ایشین رائٹرز کانفرنس، دہلی کے بھی وہ رکن رہے۔ شیخ محمد عبداللہ کی وزارتِ عظمیٰ کے دور میں کشمیری رسم الخط کی اصلاح کے لئے جو کمیٹی بنائی گئی تھی۔ اس کی رکنیت کے ذریعہ بھی انہوں نے انجام دیئے۔ دستور ہند کے کشمیری ترجمہ کے لئے جو کمیٹی بنی تھی اس میں پروفیسر پی۔ این۔ پشپ اور عارف شامل تھے۔

کشمیری بزمِ ادب کی جانب سے اردو اور کشمیری میں جو ترجمان ”مکرمیز“ کے نام سے جاری ہوا تھا، اس کی ادارت کے فرائض بھی عارف نے انجام دیئے۔ اپنی ادبی زندگی کے آغاز سے وہ ایک ڈائری مرتب کر رہے ہیں، جو ان کے عہد کی سیاسی، علمی اور ادبی تحریکوں کی ایک مختصر سی تاریخ بن گئی ہے۔

شعرو سخن کا ذوق عارف کو سن شعور کو پہنچنے کے بعد سے رہا۔ ان کی شاعری کا آغاز کشمیری

کئے بہت سے شعرا کی طرح اردو سے بھا۔ فارسی میں بھی وہ کہہ لیتے تھے، اردو میں غزل اور نظم دونوں، مثلاً
میں ان کا سلسلہ جاری رہتا تو وہ اس وقت اردو کے سربراہ اور وہ شعرا میں شمار ہوتے۔ عذوق کی
غزل اساتذہ قدیم کی غزل کی ساری پابندیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔ اپنے عہد کی فکر کے تاثرات و اثرات پر تو
رکھی ہے۔ غالب کی زبان میں ان کی ایک غزل کے چند شعر ہیں :-

غنیہ گل کی حسرتیں، توبہ	جو نسیم سحر سے دانہ ہوا
جگر، ناد کے اشاروں کا	جان دے کر بھی تھا دانہ ہوا
دل میں طوفان لب پر مہر سکوت	وہ طے تو اُمکر گلا نہ ہوا
تازہ پودہ ورقہ سائے چمن	میرے قسمت ہوا، برانہ ہوا
عارفِ خسرو جال کی آہ و کپار	سُن لو! ایسا غزل سرا نہ ہوا

عارف کی شاعری کے عروج کے زمانے میں ہندوستان میں قرونِ اولاد تصادم اور فسادات کا مرکز
بنا ہوا تھا۔ کشمیر کے سخن سنجوں کے لئے یہ وحشیانہ مظاہرے اجنبی تھے۔ عارف کا دل بھی ان پر دکھتا
تھا اور ان کے جذبات شعر کا ہار پہن کر نمودار ہوتے تھے۔ ایک نظم نامنتر انہوں نے اسی زمانے میں کہی
تھی جس میں انہوں کی گراوٹ کا ماتم کیا ہے، لیکن ایک شدت بھی دی ہے۔ کہتے ہیں :-

خالی کا جوش کلا ہے کیا ہے یہی خاک کی
تفویض میں جس کے ہیں شجر اور جیسے بھی
چالاک لڑاکا کا ہے غلغلہ جس کی
غواص معانی ہے، سمندر بھی گہرے بھی
گلزار جنال چشم براہ اس کے لئے ہے
سورج بھی ہے خدمت میں ستارے بھی قمر بھی

دی قدسیوں نے خالقِ اکبر کی دھماکی
اس ظالم و جاہل کے ذرا دیکھ تم سبھی
فنت ہے بشر روزِ ازلِ عرض یہ کی رہتی
بڑھ کر بت درندے سے، ہوا لاکھ بشر بھی

عارف کی بشارت بامعنی ہے۔ اس زمانے میں اردو شعرا کیونسلٹ طرزِ فکر سے آشنا ہو چکے
تھے اور بعض شعرا جیسے ظفر علی خاں وغیرہ نے اسے انگریزی سامراج کے خلاف حربے کے طور پر استعمال کرنے
کی بجیے کوشش کی تھی۔ آخری شعر اسی کے سدائے بازگشت ہے۔ کہتے ہیں :-
نادان نہ گھبرا، ہم یہ فطرت کا تقاضا۔
مُرخ کی جو شفقت کی ہے تو آتی ہے سحر بھی
عارف نے کچھ نصیحتیں بھی اچھی کہی ہیں :-

چھڑایا ماسوائے جس نے آدم کو محمد ہے
جھکا یا حق کے آگے جس نے عالم کو محمد ہے
وطن اور نسل کے خالوں میں انسانوں کو سنایا تھا
بنایا ایک جس نے نسلِ آدم کو محمد ہے
وہ نورِ ایلہِ نبیل جو رحمتِ اِلٰہی المین بھی ہے
افوت کے اٹھایا جس نے پرچم کو محمد ہے

عارف کو گوشتِ جنہ نے ایک ثقافتی وفد کے ساتھ چین بھیجا تھا۔ جب بمبئی میں تھے کشتیر کے
تجارتی ایجنٹ نے ایک پارٹی دی تھی۔ اُس پارٹی میں ایک حسین لڑکی اور اس کا نوجوان دوست بھی
شریک تھے۔ اُس موقع پر عارف نے ایک نظم کہی تھی جس کے بارے میں خود بیان کرتے ہیں :-

"ڈاکٹرِ اطہر ٹریڈ ایجنٹ نے چین کے سفر پر جانے سے پہلے ایک الوداعی پارٹی دی تھی، کئی

معززین کو مدعو کیا تھا، جن میں ایک سید اور اس کا "بابے فرسٹڈ" بھی تھے۔ خوب مے من طبعی خشک
 بمبئی میں میرے سوا کوئی خشک لب نہ تھا۔ عالم کیف میں سب نے منہ پینے کے جُرم میں اس حسینہ پر "تکم
 ہٹنے پر مجبور کیا۔ مطیع اس کے رنگین ہونٹوں سے بیا۔"

اس طرح شرابِ تاب کی بجائے مئے مسن کی مہر شادی یہ شعر موزوں ہوئے:

تیرے ہونٹوں کی مٹرنی ساتھ اپنے چین لے جائیں

میں اس بے دین دنیا کے لئے یہ دین لئے جاؤں

تیرا نظریں پُرانا دیکھ کر پھر جھینے پست جانا

قسم تیرے تبسم کی یہی تسکین لے جاؤں

تیری زلفوں کی موجوں کے سہارے کشتی ہستی

بلا جبری کے طوفانوں سے باتمسکین لے جاؤں

تیری محفل سے رسم دوستی دستور جانبِ دی

بھلا یہ مسن کی سرکار کا آئین لے جاؤں

جگر کے پادشہ عشوہ گر ہو بھی تو کیا غم ہے

یہ کم تحفہ ہے، پہلو میں دلِ غم گین لے جاؤں

دلِ عارف کو تسکین ہو، خدا حافظِ خودہ کہو

روحائیں اہلِ محفل کی، تیری آئین لے جاؤں

عارف نے "مگریر" کی ادات کے زمانے میں "ترتیب اور تدوین کے متوجہ فراموشی خوں اسلوب سے

انجام دیتے ہیں۔ مطلقاً نوٹ وہ اکثر کھاکرتے تھے اس کے علاوہ انہوں نے مزاحیہ پاروں پر بھی طبع

آزمائی کی۔ انشائیہ کے انداز کی ایک چیز انہوں نے "درمدح ملاوت" کے عنوان سے لکھی تھی جس کا

اقتباس ذیل میں درج ہے:

”۔ ہلون سانگ کو تم جانتے ہو؟ وہ ایک چینی سفیر تھا، جو کوئی چودہ سو برس پہلے برصغیر ہندوستان کا دورہ کرتے ہوئے ایک بین الاقوامی بدھ کا تفرس میں شرکت کے لئے کشمیر آیا تھا۔ اُس نے اور باتوں کے علاوہ ہمارے کردار کو اس طرح بیان کیا ہے، جیسے کوئی غیر ملکی سفیر آج کل کے ریکٹر کا خاکہ کھینچ رہا ہو۔

اس نے برصغیر ہندوستان میں گھوم کر لوگوں کو گائے کے دودھ کا مستند پایا۔ دودھ کی خرید و فروخت کو لوگ پاپ سمجھتے تھے لیکن کشمیر ہی ایک ایسا نقطہ تھا جہاں دودھ کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ اس میں پانی کی ملاوٹ کی جاتی تھی، یہ ہودہ اور نوقمیں کھائی جاتی تھیں، باوجودیکہ بڑے بڑے لاما، بڑے بڑے دانشور، اور علامہ اسی سرزمین سے پیدا ہوئے تھے۔“

پنڈت دیریشیشور، جن کا اصلی نام پریتھوی ناتھ مٹو ہے، ہندی اور شکریت کے عالم تھے اور اپنی مستور دلچسپیوں اور عمدہ تخلیقی صلاحیتوں کی وجہ سے، اس صدی کے تیسرے و چوتھے عشرے کے لوگوں میں نمایاں مقام کے مالک رہے۔ اردو، ہندی اور ہندوستانی پرکیرا قدرت نے انہیں اپنا ایک مخصوص اسلوب نشوونما دینے پر مایل کیا تھا، جو اردو اور ہندی کے درمیان ایک سلیس اور شائستہ اسلوب بن جاتا، اگر ان کی تالیفی کاوشیں جاری رہتیں۔

دیریشیشور کا اصلی نام پریتھوی ناتھ مٹو ہے۔ ان کے والد پنڈت دینا ناتھ مٹو دیگر کے افکار کا ذکر گزرجچکا ہے۔ اور دادل کے بارے میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ وہ فارسی کے اچھے عالم تھے۔ اس پس منظر کے ساتھ تعجب نہیں کہ دیریشیشور ہی سے ادب اور شعر کے میدان میں قدم رکھ چکے تھے۔ چنانچہ اس ہدی کے تیسرے حصے میں جب وہ ایس۔ پی۔ کالج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، وہ کالج کے رسالے ”پرتاپ“ کے لئے لکھنے لگے تھے۔ ہندی سے دلچسپی کی وجہ سے، انہیں رسالے کے ہندی حصے کا ایڈیٹر بھی منتخب

کیا گیا تھا۔ بی۔ اے کامیاب کرنے کے بعد روزنامہ "مارٹنڈ" کے ادبی شماروں کے لئے لکھتے رہے۔ لیکن اس سے انہیں تشفی نہیں ہوئی، بلکہ انہیں خود ادبی رسالہ جاری کرنے کی خواہش ہوئی۔ اس کامیاب کار کے جیسا کہ انہوں نے اپنے ترتیب دیئے ہوئے "سواستکا" کے پہلے شمارہ میں لکھا ہے: "تشریف میں ادیبوں کی تنظیم انہیں ایک مرکز پر جمع کرنے اور ان کے ذوق کو ابھارنے کی خواہش تھی۔ چنانچہ جنوری ۱۹۳۱ء کے شمارہ میں انہوں نے لکھا تھا:۔

"ریاست میں ایک ادبی جرنل کی کمی کو بہت مدت سے محسوس کیا جا رہا ہے۔"

اور اس کمی کو پورا کرنے کے لئے، انہوں نے پہلے ایک ادبی ہفتہ وار "ہمالیہ" نکالا، لیکن یہ زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے بعض اصحاب کی مدد سے ایک ماہ نامہ "نرگس" کے نام سے جاری کرنے کی تجویز مرتب کی، لیکن یہ تجویز عملی جامہ نہ پہن سکی۔ اس سعی ناکام کے بعد وہ لکھتے ہیں:

"ان تمام کوششوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ریاست میں ایک ایسے ادبی

رسالے کی بے حد ضرورت ہے جو یہاں کے ادباء کے خیالات پریشان کو ایک سنگم

پر لاسکے اور ملک کے ادباء کی آواز کو بلا کر ایک ایسا سوز و ساز پیدا کر سکے جو ریاست

کی ادبی فضا میں وجہ آفرین اور سرور کن ارتعاش پیدا کرنے کا موجب ہو۔"

غالباً مالی اور انتظامی دشواریوں کی وجہ سے نیا رسالہ جاری کرنا ممکن نہ ہو سکا، اس لئے انہوں نے ایک راجپتی رسالے "سواستکا" کے حلقہ ادارت کے ساتھ جس میں نمایاں حصہ غالباً کوئی راج گجائی ناتھ درکاتھا انہوں نے

سمجھوتہ کیا، اور اس کامیابی بار خود برداشت کرنے کا پیش کش کرنے کے اُسے ادبی ماہ نامہ میں تبدیل کر دیا، چنانچہ لکھا تھا۔

"سواستکا کے اخراجات کا بار اپنے ناتوان کندھوں پر لینے کے باوجود ہم سمجھ رہے ہیں

کہ "سواستکا" کی کامیابی کی ذمہ داری ریاست کے ادیبوں کے کندھوں پر بھی اسی قدر

عائد ہوتی ہے جس قدر ہم پر۔"

سواستکار کے ادبی روپ اختیار کرنے بعد کویراج جانگی ناتھ دُر اس میں صحت عامہ اور سمیاریوں پر مضامین لکھتے رہے۔

دیر جی گیت، نظمیں اور ادب لطیف کے انداز کے انشائیے خوب لکھتے تھے۔ ان کے گیتوں میں خاص طور پر بڑا رس ہوتا ہے۔ ذیل میں ایک گیت کا اقتباس درج کیا جاتا ہے :

رو رو کر یہ اکھیاں سو بھیس

تر پت بیتے رین

پیتم پیارے روٹھ چلے ہیں

کاہے آئے چین

آن کے پیتم درس دکھاو

و یا کل ہوئے ہیں پران

ویر کی نظموں میں "پر بھوسے" "جیون نوکا" "پھلے گئے پیروں" وغیرہ جذبات کی علامت اور زبان کی سلاست اور لطف کے سبب عمدہ پارے ہیں۔ "پر بھوسے" ایک بھگت کی مناجات ہے۔ اس کا اقتباس ہے :-

دین دیا کر میے سوامی جیون سارا ویر کھ گنوا یا

میں اتی موڑت ہوں کھل کامی پریت کئے پر کچھ نہ پایا

ادھم نیت ہوں اور اتی پاپی جگ کی مایا دھلتی چھپا یا

میں کیا جانوں ہری دوار جھوٹا جگ کا پیار

تم ہی سے آشا ہے بنگوان تم ہی کرو بیڑا پار

ایک اور نظم جس کا عنوان ہے "رہ رہ کے تپاے" زبان میں ہندی اور سکریت لفظوں کی زیادتی کے باوجود دلکشی رکھتی ہے۔ اس کا اقتباس حسب ذیل ہے :-

اگر طے من کی کون لے سُدھ اب کون سُنائے یا ت
 برہ میں ان کے شتھل ہوئے انگ ٹپت ہیں سب گات
 ویریشو نے نظم میں کچھ سے تجربے بھی کئے تھے۔ ان میں "امرگیت" اور بابا بہت دلچسپ ہیں۔
 "امرگیت" غنائیہ انداز کا ایک منظوم ڈراما ہے جس کا موضوع کرشن جی اور رادھا کی داستانِ محبت
 کا ایک رخ ہے۔ یہ نظم طویل ہے اور سات بند پر مشتمل۔ نظم کے یچ یچ میں شری تو مہیجات بھی آجاتی
 ہیں۔ اس کا پہلا بند ہے :-

"رادھا، رادھا،"

روٹھ گئی کیوں

پلگی رادھا

دیکھ میں آیا تیرے پاس

چپکے، چپکے، دھیرے دھیرے

جا کہاں سکتا ہوں میں

ڈال سے پنچھی

جائے کہاں

جل سے مچھلی

جائے کہاں

رادھا... رادھا

روٹھ گئی کیوں؟

پلگی رادھا

روٹھ گئی کیوں —

رادھا کا روٹھنا فخر ہے، مناسے جانے کے لئے تھا، چنانچہ اس دلچسپ چھپر ٹھپاڑ کا انجھام رادھا کے مان جانے پر ہوتا ہے۔

”بابا“ دیر جی کی ایک اور منظوم کہانی ہے جس کا متبادل عنوان انہوں نے ”گیتوں والی کہانی“ بھی مقرر کیا ہے۔ یہ غنائیہ انداز کی کہانی بھی اپنا ایک خاص روپ رکھتی ہے اور اس میں بھی منظوم غنائیہ کے درمیان نثری پارے تو صیغ کے لئے لائے گئے ہیں۔ کہانی ایک درویش اور مہارانی کی ہے۔ مہارانی کو اولاد کی خواہش ہے اور وہ ”بابا“ کے پاس اولاد کی تمنائے کر جاتی ہے۔ بابا اسے لڑکے خوش خبری سناتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتا ہے کہ بیٹے برس کے بعد راجکمار محل کا عیش و آرام ترک کر کے سنیاس اختیار کرے گا۔ لڑکا پیدا ہوتا ہے اور جب کچھ بڑا ہوتا ہے تو ماں کو اکثر لوری سناتے کو کہتا ہے۔ ماں کی لوری اہل میں اس کی اپنی داستان ہوتی ہے نظم کی بجز بہت رواں ہے اور ایسے بیانیہ کے لئے بہت موزوں۔ اس کے کچھ شعر ہیں :-

ایک نگر اک کٹیائیں بستے تھے دو ہرائے
نس دن دونوں ویاہل رہتے پھلی جیوں رہن پانی
دھن کا گتھ تھا کو انہیں پر سکھ سے تھے انجان
جس سکھ کے اچھلاشی تھے وہ وہ سکھ تھا ستان

آسان بول چال کی زبان پر دیر جی کی قدرت اور ان کی طبیعت میں رچے ہوئے ترنم نے ساری نظم میں گویا رس گھول دیا ہے۔

دیریشی شور نے کچھ افسانے بھی لکھے ہیں، جن میں سے کچھ ان کی کالج کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا ایک افسانہ ”ابھائسن“ ذیلی توہنی عنوان ”کالج کی زندگی کا ایک رومان“ کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ اس میں دوسرا پڑھنے والے طالب علموں، موہن اور روجنی کی محبت کی ناکام داستان بیان کی گئی ہے۔

ان کے دوسرے قابل ذکر افسانے "ایکٹرس"، "بابو"، "میر بھی بھینٹ"، "اڈھ ہزادہ"، "بیس"، "ایکٹرس" اور "بابو" سماجی زندگی کی کہانیاں ہیں۔ ان کا ایک اور اچھا افسانہ "ادیب" مارٹنڈ کے شمارہ ۲۸ جون ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ افسانہ ان کے دوسرے روایتی تکنیک کے افسانوں کے مقابلے میں کچھ ندرت رکھتا ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :-

"اس کی پہلی کہانی تھی 'میراجتم' ایک رُلا دینے والا افسانہ، ایک بچے کی پیدائش کی کہانی جس کے جنم پر ایک دل بھی خوشی سے جھوم نہ سکا۔ ایک زبان بھی اسے آسپس نہ دے سکی..... اور اس کے بعد اس نے دوسرا افسانہ لکھا۔ 'میرا گھر'....."

افسانے میں ایک ادیب کی فلا زندہ زندگی کی تصویر برسی خوبی سے ابھادی گئی ہے۔ دیر بشیشور مہا میں بھی لکھتے ہیں۔ ان کا ایک مضمون جو کالج کی زندگی سے متعلق ہے، 'نتیجے کے بعد' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ دیر بشیشور نے بھی پردہ سی اور چند اور معاصر ادیبوں کی طرح ادب لطیف کے انداز کے انشائیے بھی لکھے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں "دو آغاؤں کی تصویر" زندگی اور موت "مجھ سے نہ پوچھو" "مُتنام قبر" اور گنبد قابل مطالعہ ہیں۔ آخری دو انشائیے انگریزی سے منتقل کئے گئے ہیں۔ زندگی اور موت سے ایک اقتباس درج ذیل ہے جس میں ایک ماں ایک سپوت کو سمجھاتی ہے :-

"یہ جیون کیا ہے؟ یہ ایک سنگرام ہے، میرے لال، جہاں سب سے مضبوط نیزہ ناکام رہ جائے، جہاں ہوشیار آنکھیں دھوکا کھا جائیں، اور معصوم کچلے جائیں....."

جہاں دشمن ہر دور سے رکھے ہوئے ہیں، شب و روز آرام نہیں کرنے دیتے اور ہم سنگرام کے درمیان کھڑے ہیں۔"

اس زمانے کے ایک مزاحیہ شاعر پنڈت لمبو درجی کدہ بخوروش میں 'مزاحیہ نظموں کے علاوہ وہ مہاراج بھی لکھا کرتے تھے۔ ان کی ایک نظم جو "ہندو جھاگو" کے عنوان سے چھپی تھی۔ اس کے چند شعر ہیں :-

تلاشِ جاب میں نکلے جو سہ گم فغاں ہو کر
 فلک ہنسنے لگا انگشتِ حیرت در و دہاں ہو کر
 چہرہ دیکھو اور ہر تخفیف کی صورت ہویدا ہے
 دلِ ناداں چلا ہے کس ہوس میں شادیاں ہو کر
 لگا کر شہنشاہیں ڈگریوں کو ڈگریاں والے
 حکیموں نے بنایا ہے یہ نشوونما ہسباں ہو کر
 نہ سر دوس ہے نہ دھندلے غرض روشن یہ آفت ہے
 الہی کاش سن لے تو ہی اس کی ہسباں ہو کر

ایک اور شاعر جنہیں شعری روایات پر اچھی دسترس حاصل تھی قرنِ پوش کے فرضی نام سے
 مزاجِ انداز میں لکھا کرتے تھے۔ ایک نظم کے کچھ شعر ہیں۔

مانع و مصل اسے شرم و حیا ہوتی ہے
 پھیرتا ہوں تو کبھت خفصا ہوتی ہے
 پاکے سوراخ سینوں کو کریں گے مدارج
 کسی امید پہ یہ مجھ کو فتنہ ہوتی ہے
 ناک میں دم ہے، شبِ ہجر کی ایسی تیسی
 سہ پہ نازل یہ سرِ شام بلا ہوتی ہے

لالہ منوہر لال شہنشاہ، جنوں کے شعر میں اردو اور ہندی دونوں کے اسالیب پر قدرت رکھتے کی وجہ سے
 مستاد رہے ہیں۔ قوی اور اخلاقی نظموں کے علاوہ انہوں نے رومانی انداز کی نظمیں بھی کہی ہیں۔ شاعری سے ان
 کے غیر معمولی شغف کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ وہ قانون کے طالب علم رہے اور جنوں میں وکالت کرتے ہیں۔
 ان کی ایک قوی نظم کے چند شعر ذیل میں درج ہیں، جن سے ان کے مزاج پر آفاقی طبع پر روشنی پڑتی ہے۔

جیسی جو انان ملک و ملت می فطرتنگ و نام ہو کر
 نہ یہ کہ منظر موم قدم پر گرہیں وہ ثونی نہنگ ہو کر
 ہو عرش بالا تریں سے بالا تہدی پروازی تختیست
 مگر نہ غیروں کے ہاتھ میں تم اڑو بسنتی پتنگ ہو کر
 گناہ سے پاک، نیک معصوم زندگی ہو شہید تیری
 مگر جھپٹ دشمنوں کے اوپر بیروستہ ہر پلنگ ہو کر

یہ نظم اپریل ۱۹۴۷ء میں 'مازملہ' میں شائع ہوئی تھی، جو اس دور کے قومی انداز کی یادمانہ کر
 دیتی ہے۔ ان کی ایک اور نظم جو اسی زمانے میں 'درس گل' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی، اس میں بھی نوجوانوں
 کو اس طرح نصیحت کرتے ہیں۔

اے کشتہ خور فلک، آہ و فغاں بے سود ہے
 اے آتش خاموش غم، سوز نہاں بے سود ہے
 ہمت سے دکھ کو دور کر، دکھ کا بیاں بے سود ہے

یعنی ابھی دویا سنہ کر
 اشکوں سے منہ دھویا نہ کر
 غفلت میں یوں سویا نہ کر

ہندی کے اسلوب میں ان کی ایک خوبصورت نظم 'انجمن گیت' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی، جس
 کے شعر ہیں:-

آؤ چلیں اُس پار جنیا آؤ چلیں اُس پار
 یہاں کوئی من کا میت نہیں ہے

اس بستی میں پیت نہیں ہے
 پیت یہاں کی ریت نہیں ہے
 کس سے کیجئے پیار سنجیا
 اوچلیں اس پار
 پارندی کے ڈیرہ ڈالیں
 پریم نگر میں ایک بسائیں
 من مندر میں جوت جگائیں

چھڑیں من کے تار سنجیا اوچلیں اس پار
 پنڈت نرائن جوریہ عنقا تخلص خوش فکر شاعر ہیں۔ رعنا داری میں ان کا قیام ہے۔ ان کی نظمیں جو
 عموماً مذہبی موضوعات لکھی ہوئی ہیں، انہماکوں میں شایع ہوتی ہیں۔ انکے کافی طویل نظم امر ناتھ کی یا ترا پر
 "بشری امر ناتھ سوامی" کے عنوان سے لکھی تھی جس کے اقتباسات ذیل میں لکھے جاتے ہیں:-

دور بستی کے تلاطم سے بسا ہے وہ جنگ
 اور برفانی پہاڑوں سے گھری ہے وہ جگہ
 مفطرب تھا دل مرا، خوش دامن کہسا تھا
 دل کسی کے شوق میں وارفتہ ویدھا تھا
 اپنی فیاضی سے فطرت نور پر سنے ... لگی
 دور سے روشن کچھاک کی اک جھلک آنے لگی

آگے اس مقام اور اس کی کیفیت کی تفصیل بیان کرتے ہیں:-

سامنے کشکول رکھا تھا کھول بھی پاس تھا
 دفعتاً ڈمرو سے 'بم بم' کی صدا آنے لگی

پھر عقیدت مندی کا اظہار کرتے ہیں :-

بہرہ دماہ کرتے وہاں ہیں جیئے سائیٰ بندگی
اس طرح ہوتا ہے ہمدام استقام زندگی
اسی طرح ساری نظم جذبات عقیدت مندی سے پر ہے، آخر میں کہتے ہیں :-
کیف کے عالم میں جب مختار کل میں ہو گیا
بخت عنقا اپنی عظمت سے پہل جانے لگا

عنقا مزاحیہ انداز کے انشائیے بھی لکھتے تھے۔ کچھ مضامین اور نظمیں بھی انہوں نے مزاحیہ لکھی ہیں جن میں
”راغب طرب دل“ خاص طور پر دلچسپ ہے۔

پنڈت دینا ناتھ نادام جو نادام کشمیری کے نام سے لکھتے رہے، کشمیری کے سرسبز اور وہ شاعر و شاعر
میں شمار ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی شاعری کا آغاز بھی اردو سے ہوا۔ وہ تاجر مشرقی کے نام سے بھی لکھتے رہے۔
کشمیری اردو شاعری اور ادب کو ترقی پسند تصورات سے روشناس کرنے والے اولین ادیبوں میں نادام بھی
شامل ہیں۔ اپنے عہد کی سیاسی، سماجی اور ادبی تحریکوں کو آگے بڑھانے میں ان کا بڑا حصہ رہا اور ثقافتی اور
تقسیم ملک کے ساتھ برپا ہونے والے ہنگاموں اور کشمیر پر قبائلی حملے کی شکست و ریخت کے بعد ریاست کی
تہذیبی اور ادبی تعمیر نو میں بھی ان کا ہاتھ رہا۔

نادام سری نگم کے ایک متوسط خاندان میں مارچ ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کی تکمیل
کے بعد ہی ۱۹۲۶ء میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور والدہ نے بڑی جدوجہد و مشقت سے انہیں
میرٹک پاس کروایا اور اپنی ذہانت کے سبب انہوں نے وہجا اول حاصل کیا۔ اس کے بعد وہ سری پتھاپ
کالج میں شریک ہوئے لیکن تعلیم کے اخراجات کا بار اٹھانے کی سکت نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے
خانگی طور پر بچوں کو پڑھا کر تعلیم جاری رکھی۔ آخر محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کرنی پڑی اور ایک

مدد میں مدرس ہو گئے۔

اسی زمانے میں نادر علی نے اردو شعریہ کلام کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ شعر و سخن سے انہیں بچپن سے رغبت تھی۔ شعراء کے کلام کے مطالعے اور خاص طور پر چلبست کی قومی، اخلاقی اور تاریخی نظموں اور غزلوں سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ چلبست ہی کے انداز اور انہیں کی بحر میں لکھنے لگے۔ اس زمانے کی کہی ہوئی نظموں میں چلبست ہی کی طرح جوش قومی اور حب وطن کے جذبات اُبھر رہے ہیں۔ یہ جوش و خروش بعد میں انقلابی رہا، خاص طور پر اس زمانے میں جب وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوئے۔

۱۹۳۸ء میں کشمیر میں جب آزادی کی تحریک شروع ہوئی تو نادر علی اپنی ساری ذہنی اور فکری صلاحیتوں کے ساتھ اس تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ اور محنت کش عوام کی مسترتاک زندگی کی ترجمانی کرنے لگے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک، کشمیر کے ادبی حلقوں میں سے ابھی ابھی روشناس ہوئی تھی، نادر علی نے پہلی نظم جو مزہ دور کا خواب کے عنوان سے لکھی تھی، اس کا لب و لہجہ، حکومت کے ٹھیکہ داروں کے لئے بنا تھا، یہ نظم جب ایک جلسہ میں پڑھی گئی، تو اقدار کے کان کھڑے ہو گئے۔ کیونکہ اس سے عوام کو بیدار کرنے اور بغاوت برپا جانے کی بول آتی تھی۔ اس نظم کے چند شعر ہیں۔

رات کا کچھلا پہر تارے ہوئے ہیں مخو خواب

داکن بادل میں جا کر سو چکا ہے ماہ تاب

پھر رہے ہیں چار سوا، مایوس مگر طے ابر کے

گھاٹیوں میں کسنگروں پر ادنگھے ہیں دھندلے

ایک ٹوٹا جھونپڑا، محروں سا ویرانی میں ہے

شب کا سایہ صبح کے بہتے ہوئے پانی میں ہے

اس ٹوٹے جھوٹے اور مزدور کی زندگی کے اٹانے کی آگے حسرتناک تصویر کھینچی ہے۔ یہ نظم سحر مشرقی کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد ان کی دوسری باغیانہ نظم "کشمیر" شائع ہوئی۔ ان کی تیسری نظم "مزدور کی موت" حکومت کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا اور ان کی گرفتاری کے احکام صادر ہو گئے۔

نادیم کی ان نظموں پر لاہور کے مشہور مزدور شاعر 'احسان بن دانش' کا بہت اثر تھا۔ بعد میں جب ان کا ذوق بکھر گیا، تو وہ جوش کی ولولہ انگیز انقلاب پسند شاعری کے اثر میں آ گئے اور اس انداز میں بھی کچھ نظمیں کہی۔ اردو میں ان کی نظم نگاری کا سلسلہ ۱۹۴۱ء تک جاری رہا۔ اس دوران میں انہوں نے غزل بھی کہی اور کئی اچھی غزلیں سرانجام کیں۔ غزل عموماً وہ سحر مشرقی کے نام سے لکھتے تھے۔ ناظم کی غزل کو شہسنگی بخشے اور اس کی تکنیک کا احاطہ کرنے میں، علامہ عابد درویش کی صحبتوں کو بہت دخل رہا۔ ان شعری صحبتوں کو ایک باقاعدہ شکل دینے کے لئے ۱۹۴۷ء میں بزم ساغر کے نام سے ایک انجمن کی بنیاد لی گئی تھی جس کے صدر خود نادیم منتخب ہوئے تھے۔ ساغر زمانہ دن کو ان کا تخلص تھا، جو شعر و سخن کا اچھا مذاق رکھتے تھے۔ بزم ساغر کے اہتمام میں طرح طرح کے پروگرام بھی کیے اور پڑھی جاتی تھیں۔ ان محفلوں میں نادیم اور علامہ عابد درویش کے علاوہ شائع کشمیری، قافی پریم محری، زخمی کشمیری، آغا افضل، راہہ محبوب علی خان محبوب ساغر، شاد کشمیری اور کئی اور اہل ذوق شامل ہوتے تھے۔ غزلوں کے لئے عموماً طرح طرح کی غزلوں سے منتخب کی جاتی تھی۔ اس کی کچھ تفصیل اداروں کے ذکر میں آ رہی ہے۔ پہلے مشاعرے میں مصرعے طرح — "ہدائیں دُور سے گزرے ہوئے زمانہ کو۔" پر نادیم نے دو غزلیں کہی تھیں، ایک خود نادیم کے نام سے شائع ہوئی اور دوسری سحر مشرقی کے نام سے۔ ان دونوں غزلوں سے ایک ایک شعر ذیل میں درج ہے۔

مجھے تمہارا قصور، تمہیں خیالِ قریب میں یاد آنے کو رووں کو بھول جانے کو

کھلی ہے گی پس مرگِ شہم تر میری کہ داریں دردِ دل تیرے آنے جانے کو

ہرم کا دوسرا مشاعرہ جولائی ۱۹۳۹ء میں منعقد ہوا تھا، جس کے لئے طرح بصرہ دیا گیا تھا۔ ایکٹ عالم سامنے بتایا، "عام دل میں ہے۔" نادیم نے اس کے لئے بھی غزل کہی تھی۔ حرم شرقی کی غزلوں نے اہل فیض سے ان کے لئے "موقوفہ طرہ" کا لقب حاصل کر لیا تھا۔ اس زمانے میں نادیم نے ہر غزل کہی تھی، وہ "سحرِ پاشیاں" کے عنوان سے مارٹنڈ کے ادبی ادیشن (۳۱ ستمبر ۱۹۳۹ء) میں شائع ہوئی۔ یہ نادیم کی فکر کے عمدہ نمونوں میں سے ہے۔ غزل کے ساتھ علامہ عامل درویش کا یہ نوٹ بھی شائع ہوا تھا۔

"معنوی لحاظ سے سحر جہاں کھڑا ہے، مرستی و مرشاری، تاثیر و دلفکاری اس کے ہر شعر سے نمایاں ہے۔"

اس غزل کے دو شعر ہیں :-

اسیر عشق ہوا، آبرو کی خاک اڑے زبان پر حرفِ وفا صورت سوال آیا

سحر تو نیکر عمل سے جو بے نیل نہ ہوا زبان و سود کو دریا میں جھاکے ڈال دیا

نادیم کی بعض اچھی رومانی انداز کی نظمیں بھی اسی زمانے میں کہی ہوئی ہیں۔ ان میں "دختر کھسار" اور "جمنائے کنارے" خوب صورت نظمیں ہیں، جن میں منظر کی خوبی اور جذبات نگاری کا حسن جاذبِ توجہ ہے۔

۱۹۳۹ء کے بعد تحریک آزادی کے قائدین نے سرزمین کے ادیبوں اور فنکاروں کی صلاحیتوں کو صحیح بخش تعمیری مددوں پر ڈالنے کے مقصد سے کچھ ل فرنٹ قائم کیا، تو فطرتاً نادیم اس کے سرگرم رکن بن گئے۔ وہ فرنٹ کے جنرل سیکریٹری بھی منتخب ہوئے، اور اس حیثیت سے شیخ محمد عبداللہ وزیر عظیم کشمیر کے معتمد علیہ بھی رہے۔ فرنٹ کی سرگرمیاں جن وسیع شعبوں پر حاوی تھیں۔ ان کے سرانجام اور ان کی تکمیل کے سلسلے میں نادیم کو ریاست کے مختلف حصوں کا دورہ کرنا پڑتا تھا۔ اسی طرح کے ایک دورے میں وہ رائٹر گئے۔ جہاں ان کی ملاقات پیر غلام احمد ہجور سے ہو گئی۔ ہجور جو پہلے اردو میں کہتے تھے کچھ عرصہ

قبل سے کشمیری میں کہنے لگے تھے۔ میرزا غلام حسن بیگ عمارت کی ترغیب پر نادم کو بھی کشمیری میں شعر کہنے کی تحریک ہوئی۔

بندت پریم ناتھ بنما نے ۱۹۳۵ء میں "ہمدرد" ہفت روزہ جاری کیا تھا جس میں نادم کی وہ نظمیں شایع ہوئیں جو حکومت کے خلاف بغاوت پر محمول کی گئیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد بھی اس زمانے میں رکھی گئی جس میں نوجوان ادیب شامل تھے ان میں قابل ذکر عمارت...؛ رامند ساگر کشمیری، سوم ناتھ زتشی اور مہندر مینہ ہیں جو پہلے شاد کشمیری کے نام سے لکھتے تھے۔

نادم نے ۱۹۳۲ء تک ہندو سکول میں کام کیا تھا۔ لیکن سکول کے منتظمین سے اختلافات کی وجہ سے انہوں نے ملازمت ترک کر دی اور لاہور چلے گئے، جہاں علوم مشرقیہ کے ادارے میں وہ شریک ہو گئے اور فارسی میں ایم۔ اے کے امتحان کی تیاری کرنے لگے۔ یہاں ان کا تعارف احسان دانش احمد ندیم قاسمی، ن۔ م۔ راشد اور کئی نوجوان ترقی پسند ادیبوں سے ہوا اور ان کی صحبتوں میں بھی وہ بڑھ رہے۔ لاہور میں قیام کے زمانے میں کچھ عرصہ "دیر بھارت" اور "ملاپ" کے حلقہ ادارت میں بھی انہوں نے کام کیا۔ دو سال بعد کشمیر لوٹے تو آزادی کی تحریک شروع ہو چکی تھی، اور اس کے ساتھ وہ بہتے ہو گئے۔ ترقی پسند تحریک سے گہری وابستگی کے باعث چیمین کے دورہ کے لئے بھی ان کا انتخاب

ہوا تھا، اور چین میں قیام کے زمانے میں وہاں کے ثقافتی اور ادبی اداروں سے انہوں نے رُوشناسی حاصل کی۔ کشمیر میں جب انجمن اساتذہ کا قیام عمل میں آیا تو نادم اس کے بھی جنرل سیکریٹری منتخب ہوئے۔ نوجوان ادیبوں کی کوششوں سے "اُردو اور کشمیری کا ماہ نامہ" کو نچھو پھوٹا "پوش" جاری ہوا، اور اس کی ترتیب کا کام نادم ہی کے ذمہ کیا گیا۔ پھر کشمیری ہفتہ وار "کاش" جب دوسری مرتبہ جاری کیا گیا تو اس کی ادارت کے فریضے بھی وہ انجام دیتے رہے۔ جنوں کشمیر ٹیچرز فیڈریشن کے قیام میں ان کی مساعی کو بہت دخل رہا اور اس کے جنرل سیکریٹری بھی وہی منتخب ہوئے تھے۔ اساتذہ کے حلقے سے وہ ریاست کی قانون ساز کونسل میں رکن بھی چنے گئے تھے۔

۱۹۶۵ء میں نادیم سرکاری ملازمت میں داخل ہوئے، اور اسٹنٹ ڈائریکٹر سوشل ایکویشن کی حیثیت سے ۱۹۶۸ء تک برسر خدمت رہے۔ اس خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد سے ملکہ دید بائیر سیکڈری سکول کے اے۔ ازی صدر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

اردو میں نادیم کی تخلیقات وسیع عنوانات پر مشتمل ہیں۔ نظم اور غزل کے علاوہ انہوں نے چند منظوم کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ کچھ افسانے، نغمات، انشائیے اور ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ سماجی اصلاح سے متعلق ان کا ایک اچھا مضمون "جہیز کی لغت" "مارنڈ" میں شائع ہوا تھا۔ ایک اچھا انشائیہ انہوں نے "کافد کے ٹکڑے" کے عنوان سے لکھا تھا۔ اس کا اقتباس نیچے درج کیا جاتا ہے:-

"جیون خود بھی ایک حادثہ ہے — جیون یا ترا 'حادثات کی یا ترا ہے۔ جنم کا حادثہ — لگاؤ اور انس کا حادثہ — ناحق کے رشتوں کا حادثہ — کیا کیا جائے، چھٹکارے کی سعی لا حاصل ہے — "آپے" سے کیسے بھاگا جائے — ڈبویا جھگ کو ہونے 'نے نہ ہوتا میں تو کیب ہوتا"

آخر لولابی! اچھے کہنے والوں میں سے ہیں۔ ان کا کچھ کلام "پرتاپ" میں شائع ہوا ہے۔ دوسرے ہیں:-

گل کو گلچیں لے گیا تجھ کو خنزاں لے جائے گی
اسے گل لالہ نہ لوں مارے خوشی کے پھول تو

زبان گدی سے کہیں چوں گا تیری اظہارِ الفت پر
جوابِ نامہ میں ملتی ہیں یوں دلیر کی تحریریں

کوثر بیانی کے نام سے شیخ منظور الہی لکھا کرتے تھے۔ سری نگران کا وطن تھا، اور سیاب کبر آبادی سے مشورہ سمجھتے تھے۔ پیشہ وکالت تھا، ملک کی تقسیم کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔ ۱۹۴۷ء تک ان کا

کلام "مرد" اور "پر تپ" میں شایع ہوتا رہا۔ کچھ کلام "مارشڈ" میں بھی شایع ہوا ہے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک سے کوثر بھی متاثر تھے۔ ان کی ایک نظم کا عنوان ہے۔ "آج کے دن بھی مفلس مفلسی سے اشکبار" اس نظم کے چند شعر ہیں :-

کون پیرساں ہے غریبوں کا جہاں میں حالِ زار
اشک آلودہ ہیں آنکھیں اور دامنِ تار تار
چھارہ ہی بے چار سو ابلاس کی کالی گھٹا
زندگی کا ہے مگر فیشن پہ سب دار و مدار
اب نئے اٹھتے جوانوں کا عجب ہے با نکین
جن کے چہرے سے عیاں نسوانیت کی ہے بہار
نازنینوں کی طرح سے آئینہ ہے رو برو
پاؤں سے ہے مطلب اور شانے سے ہے پیار
ریش، موچیں سب صفا گلہ فام سے ناز کیدن
پھر نہ کیوں ان کو کریں ہم نازنینوں میں شمار
مرد میدان ہو نہیں سکتے کبھی ایسے جوان
جن کو راحت کی طلب ہو اور عشرت سے ہو پیار

کشمیر کے موسمِ زمستان پر بہت کم شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے۔ کوثر نے کشمیر کی سردی کے عنوان سے ایک نظم ۱۹۳۶ء میں بھی تھی جس کا اقتباس ذیل میں درج ہے :-

بیان کرنے کے قابل ہے کہاں کشمیر کی سردی

یہاں کب کام آتی ہے جوانوں کی جوانمردی

سدا ابرسیر ہیں چرخ نیلی فام پر چھالے
یہاں تو دن بھی گویا ایک شب ظلمت نظر آئے
لحافِ ابر سے باہر کبھی خورشید آتا ہے
تو قرصِ آتشیں ہوتا ہوا بھی کانپ جاتا ہے
فقط ایک کانگری ہے جو بچھاتی ہے وُفا اپنی
نہی مونس ہے اپنی اور یہی مشکل کُشا اپنی
ننگل ہے اور نہ گچیں اور نہ بلبس کی جدائی
چمن میں رہ گیا کوثر فقط نامِ سدا یاتی

کوثر کو مضمون نگاری سے بھی دلچسپی رہی اور ان کے کچھ مضامین ہندو اور تقریبوں کے موقع پر اخباروں میں شائع ہوتے تھے۔ ایک مضمون جو انہوں شیوراتری کے موقع پر اسی عنوان سے لکھا تھا۔ "مارٹنڈ" (فروری ۱۹۳۱ء) میں شائع ہوا تھا۔

جیب کینوٹی، جنہوں کے ادبوں کے اُس گروہ سے ہیں، جو آزادی اور تقسیم ملک سے پہلے منظرِ عام پر آئے۔ لیکن تقسیم کے بعد کئی اور ادیبوں کی طرح حبیب بھی پاکستان چلے گئے اور اس وقت راترنگلا سے منسلک ہیں اور علم و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ اُن کے قیام جنہوں کے زمانے میں پنڈت برنج موہن دتترہ کینوٹی ریاست کی ملازمت میں تھے۔ حبیب بھی ان کے تلامذہ کے حلقے میں شامل ہو گئے۔ غزل میں انہوں نے اچھی ہمارت ہم پہنچائی ہے اور نظم بھی کہتے ہیں منشی سراج الدین اور چودھری خوشی محمدناظر کی صحبتوں سے بھی حبیب کینوٹی بہرہ یاب ہوئے۔ اس زمانے کی ادبی چہل میں ان کا اور ان کے دوسرے رفقاء کا، قمر قمرازی، ڈاکٹر عطاء الدین سوز، غلام جیلانی اثر، قیس شیرانی کا بڑا حلقہ تھا۔ مشاعروں اور ادبی محفلوں کے حبیب و روح رواں تھے۔ میرزا کمال الدین شیدانے ایک مشاعرے کی تفصیل مجھے بتائی۔

جولائی ۱۹۳۳ء میں سسرئی بھڑکی غار میں گاہ میں مٹی کے زیرِ اہتمام منعقد ہوا تھا۔ مشاعرے کے لئے طرح
”اتہائے عشق نے جنوں کو پسینی کر دیا۔“ مقرر تھی۔ اس طرح پر حبیب نے جو غزل سنائی تھی۔ رشید
کے حافظہ میں محفوظ رہ گئی تھی۔ انہوں نے مجھے عنایت کی تو یہاں درج کر رہا ہوں۔

ہے، یہ کیا کیا تو نے اسے دستِ تنہا کرنا

اس سراپا ناز کو عالمِ مسینِ رسوا کر دیا

میں علاجِ درد سمجھا تھا نگاہِ مہلطف کو

پیر یہ دیکھا درد اس نے اور دونا کر دیا

اسے نگاہِ مستِ ساقی مانگ لے کچھ اور بھی

دل تو بہنے آج نذرِ جامِ و مینِ کر دیا

دیکھ لے جی بھر کے اے شقائقِ حسن سے موت

شوقِ بے پروا نے ان کو عالمِ آرا کر دیا

حبیب ”امر“ جوں میں اکثر لکھتے تھے۔ انہوں نے اس رسالے کی کرن نمبر کے لئے فیڈرک ڈربارک

کی کتاب سے ہمارا جگلاب سنگھ کے کچھ حالات اخذ کر کے ایک مضمون ”شاہی دربار کے عنوان سے

لکھا ہے۔ فیڈرک ڈربارک ۱۸۷۳ء میں ماہرِ علمِ ارضیات کی حیثیت سے ریاست کی ملازمت میں داخل

ہوئے تھے۔ ۱۸۷۳ء میں وہ خدمت سے سبکدوش ہو کر انگلستان واپس گئے اور دو سال کے بعد اپنی

کتاب ”شائع کی مضمون میں زیرِ سنگھ کے نظم و نسق اور خاص طور پر تفصیلِ خصوصیات کے بارے میں مفید

معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ہمارا جگلاب سنگھ روزمرہ زندگی اور ان کی دلچسپیوں اور طریقہ کار کے بارے

میں کچھ تفصیلات پنڈت ہرگوبال خستہ نے بھی اپنی تاریخ ”گلدستہ کشمیر“ میں دی ہیں۔ حبیب کے مضمون سے

نورِ دُرا درِ بسنت کی تقریبوں کے بارے میں دلِ چاہنے والے معلومات بہم پہنچتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :-

بہار کی آمد پر بسنت کا دربار منعقد ہوتا تھا، جس میں تمام لباس بسنتی ہوتا اور
 بعض صرف پگڑی بسنتی پہنتے تھے۔ اس دربار پر ملازمان شاہی حکمران کو
 نذریں پیش کرتے۔ یہ دربار پر پڑ گراؤنڈ میں ایک بڑے شامیانے
 کے نیچے منعقد ہوتا تھا۔ بہار بہادر اور تمام درباری جلوس کی شکل میں گھوڑوں
 کا زین اور سواروں کا بسنتی لباس عجیب بہار سماں پیش کرتا تھا۔ خود بہار بہادر
 بھی بسنتی لباس میں ہوتے۔

حبیب کیفوی، کشمیر سے اپنی دلچسپی کی یادگار کے طور پر اس وقت جموں و کشمیر کے اردو شعراء کا تذکرہ
 مرتب کرنے میں مصروف تھے۔

حبیب کے دوسرے معاصرین میں حسن محمد منہاس، محمد امین شمیم اور کیف اسرائیلی بھی شعر و سخن کی
 دلچسپی میں کسی اور سے پیچھے نہیں تھے۔ حسن محمد منہاس کی طرف حکیم فیروز الدین طغرانی کے شاگرد کی حیثیت
 سے رت رہ گیا جا چکا ہے۔ استاد کی توجہ نے انہیں غزل پر تصرف حاصل کرنے میں بڑی اعانت کی
 اور اس تذکرہ کی روایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے نئے عہد کے تقبولات کو بھی غزل میں سموتے ہیں۔ شمیم
 بانڈی پورہ کے متوطن تھے۔

مردان تانہ آفتاب کی نشوونما پونچھ میں ہوئی تھی، جہاں ان کے والد ریاست میں تحصیلدار
 تھے۔ ان کے آبا کا وطن، بھیرہ، ضلع سرگودھ تھا، جو اب مغربی پاکستان کا علاقہ ہے۔ آفتاب ۱۹۰۸ء میں
 بھیرہ ہی میں پیدا ہوئے۔ لیکن سن شعورت پونچھ میں قیام رہا، اور ابتدائی تعلیم وہیں پائی پھر لاہور
 کے ڈی۔ اے۔ دی۔ کالج سے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا، اس کے بعد وہ دہلی گئے اور آئیور ویدک
 اور یونیورسٹی طب کے کالج میں تعلیم پائی۔ ۱۹۳۸ء میں فارغ التحصیل ہو کر پونچھ لوٹے اور مطب کمرہ رہے ہیں۔ دہلی
 میں قیام کے زمانے میں شاعری سے بھی لگاؤ پیدا ہوا، اور غزل کہہ کر شاعروں میں سنانے لگے تھے۔
 اسے پتہ نہ کہ مرکزی اردو بورڈ، لاہور کے انتظام سے کب کا شایع ہو چکا ہے۔ (ط)

سائنس دہلوی سے انہیں تلمذ رہا۔ غزل کا انداز نیا وہ ترنا شقہ نہ ہوتا ہے جس میں اخلاق اور تصوف کے نکات بھی باندھ جاتے ہیں۔ ایک غزل کے کچھ شعر یہ ہیں :-

جہاں رنگِ درویش حسنِ وافت کے سوا کیا ہے

جس دھڑکھو محبت ہے، محبت کے سوا کیا ہے

نہ جانے کیا سمجھتے ہیں، خدا کو حضرت زاهد

وجودِ کبریا، حسنِ عقیدت کے سوا کیا ہے

حنائے آفتابِ عشق سے دُنیبِ منور ہے

نہ ہو یہ نور تو دنیا میں ظلمت کے سوا کیا ہے

ایک اور غزل کے دو شعر ہیں، جن میں اخلاقی پہلو اپنے مخصوص تصور رکھتے ہیں۔

إحسانِ نافذ کا اعطایا نہ کیجئے

مر جائیے بہ منتِ بیسی نہ کیجئے

سربایہٴ حیات ہے انسان کا ضمیر

اس دُرُشِ اہوار کو بچ نہ کیجئے

آفتاب نے کچھ ظلیں اور کچھ عینیں بھی کہی ہیں۔ ان کی ایک نعت جو پونچھ کے ہفتہ وار (ملعجاہد) میں

چھی تھی اس کا اقتباس ذیل میں درج ہے :-

پیامِ محمدؐ نہ انِ افوت ہے دُنیا میں راحت تو بقی اسی دُور

دیادرس تو حید دنیا کو اس نے اسی نے رکھائے دُورِ محبت

غریبوں کا مولیٰ یتیموں کا آقا فقی ذات اس کی کب لے جائے حجت

آفتاب کو صحافت سے بھی لڑپڑی رہی، چنانچہ ۱۹۳۲ء میں انہوں نے "آفتاب" کے نام سے ایک ہفتہ وار

جباری کیا تھا، جو ۱۹۴۵ء تک شایع ہوتا رہا۔

پنڈت جیالال بھان برقی، ان پنڈت شعرا میں جو اس جدی کے تیسرے دہے میں کافی لکھتے رہے، ایک مقام رکھتے ہیں۔ ان کی ولادت قصبہ دیرنگ میں ۱۹۱۶ء میں ہوئی۔ جہاں ان کی ابتدائی تعلیم بھی ہوئی۔ اس کے بعد سری نگر میں کالج کی تعلیم حاصل کی۔ کالج کی تعلیم کے زمانے میں اپنے صاحبِ ذوق اساتذہ کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے کا انہیں مواقع ملے۔ اور وہ شعر کہنے پر مائل ہوئے۔ پروفیسر نند لال طالب کو کلام دکھاتے تھے۔ تعلیم کے دوران انہیں طب سے بھی دلچسپی پیدا ہو گئی، اور وہ لاہور جا کر میو مو پیتھی کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ ۱۹۴۲ء میں سند حاصل کر کے وہ مریسنگ کر لوٹے اور اپنا مطب قائم کر کے خدمت کر رہے ہیں۔

برقی، غزل اور نظم دونوں کہتے ہیں بلکہ غزل سے زیادہ ان کی دلچسپی نظم سے ہے اور وسیع موضوعات پر وہ طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ ان کا کلام جب کشمیر میں اخبار نہیں تھے۔ لاہور کے بعض اخباروں اور رسالوں اور خاص طور پر ”بہار کشمیر“ میں چھپتا رہا۔ سری نگر سے اخباروں کے اجراء کے بعد وہ یہاں کے اخباروں اور خاص طور پر ”مارشٹ“ میں اپنا کلام چھپواتے رہے۔ اب تک ان کے کلام کا ایک مجموعہ مرتب ہو گیا ہے، جیسے انہوں نے ”عالم خواب“ کے نام سے موسوم کیا یہ مجموعہ غزلوں، نڈائی، مثنوی، اخلاقی اور منظر، اہرہ فطرت پر لکھی ہوئی کوئی ستر کے قریب نظموں پر مشتمل ہے۔ ان کی ایک نظم، ”جو آئینہ فطرت“ کے عنوان سے لکھی گئی ہے۔ اس کا اقتباس ذیل میں درج ہے۔ اس سے شعری تکنیک اور زبانِ بران کی قدرت کا اندازہ ہو سکے گا۔ اس نظم کا پس منظر ظاہر ہے، کشمیر ہے۔

جہاں آئینہ اسرار فطرت کا نظارہ ہے

کہ گویا حلا میں گلزار فطرت کا نظارہ ہے

بہارِ خندہ گل کی نسیم مشک آگئی ہے

نظارہ سوز یاد کیا یہ اپنی برہم رنگیں سے
یہ عالم رونما بیشک ہے بیوہ زارِ فطرت کا
کوئی کب جان سکتا ہے، مہمہ زارِ فطرت کا

اِشطا آرزو میں زمیست کی پنہاں حقیقت ہے
نہیں تو زندگانی ایک تصویرِ منسبت ہے
زمانہ بھی ہے اک خوابِ گراں کی دلکش تعبیر
یہ کالجِ زندگانی بھی ہے مُشتِ خاک کی تعمیر
جو چشمِ دل نہیں دیکھتا تو حق سے آشنائی کیا
جو خطِ کوشِ نہاںِ دل ہے تو لطفِ پارسائی کیا
شبابِ برق کی صورتِ قرارِ زندگانی ہے
گلوں پر صورتِ شبنم بہارِ زندگانی ہے
"جلوہ بہار" بھی ان کی اچھی نظموں میں سے ہے، جس کے دُورِ شریں :-

شعقتِ ہیں گلِ ارماں بہارِ زندگانی سے
نظر آتی ہے دنیا آج خنداںِ شادمانی سے
مجھے اہلِ دنیا ہیں سماں یہ عیشِ عشرت کا
نظر میں برق کے لیکن ہے جلوہِ حُسنِ فطرت کا

برق کی بعض مذہبی نظموں میں ان کے جذبہِ خلوص اور عقیدت نے، لطف و دلچسپی پیدا کر دی ہے۔
"بھگوان شیو سے" اس طرح نظموں میں ان کی شائد یہ سب سے اچھی نظم ہے۔ اس کے کچھ شعر ہیں :-

مجھے اے سُبْحِ فطرت کچھ نیا لطف جوانی دے
مرے جذباتِ پیرِ مرد کو آبِ زندگانی دے

یہ کب کہتا ہوں تو مجھ کو حیاتِ جاودانی دے
مگر دو چار دن کی تو بہارِ شادمانی دے

کبھی کی یاد میں میری طبیعت شاد ہو جائے
کبھی تو دل کی بستی اس طرح آباد ہو جائے

اپنے ہم وطن چلبست پر بھی انہوں نے ایک اچھی نظم "آئینہ چلبست" کے عنوان سے لکھی ہے، اور چلبست پر لکھی ہوئی نظموں میں ان کے ایک ہم وطن کے جذباتِ عقیدت ہونے کے لحاظ سے قابلِ مطالعہ ہے۔
کہتے ہیں:—

تیری صبحِ وطن آئینہ دارِ حسرتِ دل ہے سمجھا مقصدِ سخن سخن کا سخت مشکل ہے
نئے انداز کی تو شاعری کا ایک موجد تھا دل و جان پر بڑا احسان ہے تیری نواؤں کا
اپنے وطن ویری ناگ سے ان کو جو محبت ہے اس کا پر تو، نظم "ویری ناگ" کا مفہوم میں نظر آتا ہے جس کے
تین شعر ہیں:—

ذرت کا دھت یہاں ظاہر ہے اک شانِ ارم
دیکھ کر کشمیر کو مٹتے ہیں اوسانِ ارم

چشمِ کوثرِ رواں ہے دامنِ کہسار سے
اور جنت ہے نمایاں جلوہ گلزار سے

ختم ہیں رعنائیاں سب سُبْحِ فطرت کی یہاں
جلوہ گزینیاں ہیں ساری قدرت کی یہاں

راجہ محمد لطیف خان موزوں کا تذکرہ متعلق نے اپنی "اقوام کشمیر" میں کیا۔ جو اچھا شعر کہتے تھے ان کا تعلق کشمیر کے قدیم راجاؤں کے خاندان سے تھا۔ ان کے مورث اعلیٰ راجہ مل نے اسلام قبول کیا تھا۔ اور اس کا اسلامی نام مل خان رکھا گیا تھا، راجہ کا ایک بیٹا کھکھ خان کے نام سے موسوم تھا، اس کی اولاد کھکھ یا کھش کہلاتی ہے اور یہ لوگ پونچھ اور پنجاب کے شمالی اضلاع میں آباد ہیں۔ موزوں، سیاب اکبر آبادی سے اصلاح لیتے تھے، لیکن اب ان کا کلام دستیاب نہیں ہوتا۔

سہ دار وزیر محمد خان جو ریاست کے محکمہ پولیس کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے، اور آخر میں ڈپٹی انسپکٹر جنرل کی حیثیت سے خدمت سے سبکدوش ہوئے تھے۔ شعر و ادب کا شستہ مذاق رکھتے تھے۔ شاعری کا شوق انہیں سن شہور سے ہی تھا۔ جس زمانے میں جنوں میں مقیم تھے۔ صاحبزادہ محمد عمر اور دوسرے صاحبزادے ادیبوں کے ساتھ مل کر 'وزیر نے بزم سخن کی بنیاد ڈالی تھی۔ جس کی سرپرستی میں سالانہ مشاعرے وسیع پیمانے پر منعقد کئے جاتے تھے اور ان میں کلام سننے کے لئے مشاعرہ پر شعرا مدعو کئے جاتے تھے۔ جنوں میں شعر و سخن کا ذوق پیدا کرنے میں ان مشاعروں نے بڑی مدد دی۔

وزیر ابتدا میں غزل کہتے تھے، اور اساتذہ کی صحبتوں میں اٹھنے بیٹھنے سے ان کی غزل میں بڑی چٹکی پیدا ہو گئی تھی۔ بعد میں جب وہ حج کو گئے۔ تو غزل کی شاعری سے اُن کا جی اُٹا گیا اور نعت اور منقبت کہنے لگے تھے، اور غزل کا سارا سرمایہ انہوں نے نہایت کر دیا تھا۔ نعت گوئی کا جو ذخیرہ وزیر نے چھوڑا ہے اس میں اپنی شعر گوئی کی ساری صلاحیتوں سے کام لیا ہے۔ زبان پر بھی انہیں اچھی قدرت حاصل تھی۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد جب وہ: رہ سہری نگر میں مقیم ہو گئے تھے، اپنی کوٹھی میں شعر و سخن کی محفلیں منعقد کرتے تھے اور خوش فکر شہزاد اور صاحب ذوق سامین کو مدعو کرتے تھے۔ نعت اور منقبت کی شاعری کم اور عقیدت مندی کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے، تاہم وزیر اس نوع کی شاعری میں بھی ایک اچھا رچا پیدا کر لیتے تھے۔ وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں فکر شعر کرتے تھے اور بہت زور تسلیم بھی

کھینچتے تھے۔ کڑی زمینوں میں بچا سوں شعر کہہ لیتے تھے۔ ان کے کلام سے کچھ اقتباسات ذیل میں درج ہیں:

ہوں بنو برا فلک و زمیں جس کے حوالے کیا کہنا پھر اوس بار امانت کے امین کا
 یہ بیچ و خم اپنے ہی متدبر کے تھے سارے اب حال کھلا جاکے کہیں چیں جنیں کا
 دنیا میں وزیران کے سوا کون ہوا ہے جو باعثِ تخلیق ہوا فلک و زمین کا

اگر دل کو کہیں اوس لامکاں کا کھوج مل جاتا
 کہاں کافی پھر اوس کو وسعتِ ارض و سما ہوتی
 میرے شام و ستر اسے کاش کٹ جاتے مدینے میں
 سرور انگیز دین ہوتا شبِ راحتِ منسا ہوتی

بس گئے دل میں جب وہ جان بشکر
 پھر کہاں آپ میں ہم اسنے کے
 دل کی بستی میں جو ہوان کا گذر
 دن پھر میں اس غریب خانے کے
 نقشِ اول بھی نقشِ آخر بھی
 ہیں حضور اس نگار خانے کے

نعت اور منقبت کے علاوہ وزیر نے کئی رباعیاں بھی کہی ہیں۔ رباعیات زیادہ تر
 شہدائے کربلا کے منہا رب کے بارے میں ہیں۔ کچھ اصلاحاتی بھی ہیں۔ ایک رباعی ذیل
 میں درج ہے:—

تقریب گناہ کی سدا ہوتی ہے ہر جرم کی لاریب سزا ہوتی ہے
 مصروفوں کا قتل و خون و غارت کرنا یہ تو دوسرے کی انتہا ہوتی ہے
 کچھ اخلاقی نظمیں بھی وزیر کی یادگار ہیں۔ ایک نظم 'درِ محل' کے عنوان سے لکھی تھی جس کا اقتباس
 یہاں منقول ہے :-

اے اشرف مخلوق 'اے انسان نیکی میں فریضہ بن جا
 گلہاری کے اندھروں میں ایک راہ نما مشعل بن جا
 ہے ایک سلیقہ اے بندے 'دنیا میں تیرے رہنے کا
 تو ماضی کی کچھ منکر ذکر کچھ آج ہو اور کچھ کل بن جا
 یہ بھی کلیاں پھول نہیں گلشن میں تیری تدبیر سے
 ہر شے تجھ سے آساں ہو 'ہر مقدسے کا تو حل بن جا
 یہ شاہ و وزیر امیر و گدا سب تیری نظر میں یکساں ہوں
 نادار کا تو دانا ہو جاو 'اسی لئے دولت بن جا

سردار وزیر محمد خان کا انتقال ۱۹۶۶ء میں جموں جاتے ہوئے 'ہوائی جہاز کے حادثے میں ہو گیا۔
 ان کی نعروں کی بیاں بھی، ان کے ساتھ تھی۔ جو کئی دن برف سے ڈھکی رہی۔
 درگاہ پر شاد و فانی غزل گوئی کی بڑی اچھی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ ان کی ایک غزل 'مارٹلڈ'
 کے ایک خاص شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں کلاسیکی غزل کا سارا رجا و ملتا ہے۔ غزل صوبہ
 ذیل ہے۔ یہ پس رتو ہوتا ہے چاک پر وہ تقدیر دیکھ کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔

۱۔ دی پٹی۔ صاحب ۱۲ جون ۱۹۶۷ء کو سرگوشا ہو گئے۔

وہل میں زیبا نہیں پردہ بت بے پردہ دیکھ
آئینہ خانے میں آکر عالم تصویر پر دیکھ

بزم خواب سے مجھے سوئے بیا بیاں لے چلی
نہیں قدر و عشرت طلب تھی عشق کی تاثیر دیکھ

اب بھی باقی ہے دم تیار الفت، اسے طیب
دور کرنے ذری کچھ وصل کی تدبیر دیکھ

مسکرا کر ناز سے کہتا ہے شیشے میں وہ شوخ
آئینہ خانے میں آکر عالم تصویر دیکھ

کیا نمائش ہو رہی ہے قتل گاہِ ناز میں
ایک سو بیل پڑے ہیں ایک سو بچھر دیکھ

سوزن تدبیراتے رونقِ ذرا لے ہاتھ میں
پس رفر ہوتا ہے چاکِ پردہ لفت دیکھ

پنڈت دنیا ناتھ نادیم نے مجھے اس غزل کے صرف دو شعر سنائے تھے اور یہ بتایا تھا کہ یہ درگاہ پر شاد رونقِ زمیں
کشمیری سیاست کی شہور شخصیت ڈی۔ پی۔ دھر ہیں۔ ان کی تعلیم لکھنؤ میں بھی ہوئی تھی۔ ان کا ادب اور
شعر کا مذاق سحر ہے۔ کشمیری بزمِ ادب سے بھی وابستہ رہے۔

"مارٹنڈ" شمارہ ۲۸، فروری ۱۹۳۵ء میں دھر اور کاشی ناتھ کا پہلو کی مشترکہ نظم "ایکلا ہم سوال"
کے عنوان سے چھپی تھی۔

کشمیر اور جہوں کے نو جوان شاعروں اور ادیبوں میں صمیمِ ذوق کی تربیت اور شوق پیدا کرنے میں
جن بیرونی ادیبوں کا اثر رہا، ان میں سے چند کا تذکرہ گذر چکا ہے۔ اردو غزل کے صاحبِ طرز استاد

نواب جعفر علی خان اشر بھی اُس زمانے میں ریاست میں وزیر مایات تھے۔ اشر شاعری کا بڑا مستعد ذوق رکھتے تھے اور اس بڑے قدیم کے معیاروں کو ملحوظ رکھتے تھے۔ میر تقی میر کے اتباع پر انہیں افتخار تھا۔ اور میر کی زمخول اور انداز پر بہت سی غزلیں کہی گئیں۔ ”بہارستان“ ان کی غزلوں کا مجموعہ فن اور زبان پر لحاظ سے مرتب رکھتا ہے۔

لیکن اشر اپنے عہد کے تقاضوں سے بھی نا آشنا نہ تھے اور نہ ہی انہیں نئے عہد کی فکر اور فن سے بیزار تھی۔ انہوں نے خود بھی نئے انداز کی نظمیں لکھنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ دنیا کی بعض اہم زبانوں کی شکار نظموں کے منظوم ترجمے ہیں جو ان کے نمونے ”رنگ بہت“ میں شامل ہیں۔ کچھ تنقید میں بھی انہوں نے لکھی تھیں، لیکن ان میں زبان اور محاورہ پر زیادہ اور دیا ہے، جو ان کی ذہنی تربیت رکھنے والے استاد کی طبیعت کا تقاضا تھا۔

جس زمانے میں اشر کشمیر میں تھے، انہیں گیتا کے ترجمے کا بھی خیال پیدا ہوا تھا اور اس سلسلے میں وہ لالہ تولی رام، وزیر ریاست اور پروفیسر جلال کول سے مشورہ کرتے تھے۔

اردو شاعری میں فطرت پرستی اور قومیت اور وطنیت کے نئے رجحان کو فروغ دینے اور رسم پرستی کو شاعری کا اساس قرار دینے کے خلاف جدوجہد کرنے میں عالی کے بعد شاید چکبست کا سب سے اہم مقام ہے۔ اس کے علاوہ چکبست نے اردو شاعری کی ایک اہم خدمت یہ بھی انجام دی کہ اپنے ہضم شدہ شاعروں کی مذہبی موضوعات کو شاعری کے دامن میں سمیٹنے کی اگلی رسم سے تجاوز کر کے تاریخی اور بازمعنی اساتیری موضوعات کو شاعری میں جگہ دی اور جس انداز کی فکر اور اظہار پر انہیں قابو حاصل تھا۔ اس کی مدد سے اس نے انداز کو کامیاب بھی بنایا۔ چنانچہ ان کے کئی ہم عصر جن میں سرور جہاں آبادی کا خاص طور پر ذکر کیا جاسکتا ہے۔ انہیں کی تقلید میں رامائن کے اکثر مناظر کو اچھے شاعرانہ پیرایہ میں اردو شاعری روشن کر دیا۔

چکبست خاندان کشمیری ہے اور اس خاندان کے کچھ لوگ تلاش معاش میں لکھنؤ اور فیض آباد
 جا کر بس گئے تھے۔ برصغیر نارائن چکبست فیض آباد میں ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے، لیکن ان کی
 تعلیم اور تربیت لکھنؤ میں ہوئی۔ کیننگ کالج سے انہوں نے ۱۹۰۹ء میں بی۔ اے کا امتحان
 کامیاب کیا اور پھر قانون کی تعلیم حاصل کر کے ۱۹۱۲ء میں ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان پاس کیا اور وکالت
 کرنے لگے۔ نوجوان وکیلوں میں ان کو بہت جلد نمایاں حیثیت بھی حاصل ہو گئی۔ شاعری کا ذوق بچپن
 سے تھا۔ وکالت کے ساتھ ساتھ شعر و سخن کا مشغلہ بھی جاری رہا، وہ اچھی تنقیدی صلاحیتوں کے
 بھی مالک تھے، جس کا اندازہ ان کے مضامین سے ہوتا ہے، جو ”مضامین چکبست“ کی صورت میں
 شائع ہوئے ہیں۔ اپنے ہم قوم نسیم کی ”گلزار نسیم“ کے معرکے میں عبدالحلیم شرر کے مقابلے میں انہوں
 نے جو رویہ اختیار کیا تھا، اس سے بھی ان کے تنقیدی شعور اور سلاست پسند طبیعت پر روشنی پڑتی ہے۔
 چکبست کا ذہنی لگاؤ کشمیر سے ہمیشہ قائم رہا۔ ان کے اکثر مضامین ”کشمیر واپس“ میں شائع ہوئے ہیں۔
 سیاست سے بھی انہیں دلچسپی رہی، جس کا پرتوان کی شاعری اور غاضب طور پر ان کی وطنی نظموں میں
 بکے بکے نظر آتا ہے مثلاً ان کے زمانے میں ہند کے آزادی خواہوں میں انگریز سامراج کے ایک ”سجھاو“
 ”ہوم رول“ پر بڑی سخت سختی ہو رہی تھی، چکبست نے اس بارے میں اپنا نقطہ نظر اس شعر میں ظاہر

کیا تھا

طلب فہول ہے کانسے کی فہول کے بدلے

نہ لیں دہشت بھی ہم ”ہوم رول“ کے بدلے

چکبست کی وفات ۱۹۳۳ء میں ہوئی۔

ایک اور کشمیری نژاد ادیب، جگموہن ناتھ ریڑ شوق کا تذکرہ بھی یہاں ضروری ہے، جو ہشتون

پہلے گئے تھے اور پھر لکھنؤ کے ادبی حلقوں میں بڑا نام پیدا کیا۔ وہ خوش فکر سخن سنج تھے اور

اپنے کلام کا مجموعہ پیسہ شوق کے نام سے مرتب کیا تھا، جو دھنوں میں شایع ہوا۔ پہلا حصہ جو نظامی نظمیں،
 دیوان سے ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۳۵ء سے لے کر ۱۹۳۷ء تک کے کلام پر مشتمل تھا۔ دوسرے
 حصے میں بعد کا کلام ۱۹۳۷ء تک شامل ہے۔ پہلے حصے کا تعارف نظامی بدایونی لکھا تھا۔ حصہ دوم پر
 امیر الدین نے لکھا ہے۔ شوق غزل اچھی کہتے ہیں اور سادہ قدیم کے انداز میں۔ ان کے کچھ شعر ہیں :-

دل جو عشق شاہد عکس جمال ہے

امکان ہے اور وسعت وہم و خیال ہے

دل ہے شکار رنج و ستم ہمارے روزگار

احساس شمع نہ ہو تو یہ حد کمال ہے

کون دمکال کی سیر کا افسانہ کیا کہیں

اب ہم ہیں اور گزشتہ بزم و خیال ہے

شوق نظامی بدایونی کے دوست تھے۔ پنڈت امر ناتھ تھا، منوہر لال، رشتہ اور ڈاکٹر حفیظ سید
 سے بھی ان کے مراسم تھے۔ چنانچہ ان کے مجموعہ کلام کے پہلے حصے پر نظامی بدایونی کے تعارف کے علاوہ امیر الدین
 منوہر لال رشتہ اور ڈاکٹر حفیظ سید نے بھی پیش لفظ کے طور پر لکھا ہے۔ لیکن شوق کا عظیم کارنامہ بہار کشمیر
 کی ترتیب اور اشاعت ہے۔ جس میں فارسی کے کشمیری اور کشمیری شراذ پندت شعراء کا تذکرہ ہے۔ کچھ اردو
 شاعروں کا حال بھی شامل ہے۔ اس یادگار کارنامے کی بدولت کشمیر کی ادبی تاریخ کا ایک اہم باب مدون
 ہو گیا ہے۔

پنڈت آندران ملا، جن کی دو چابھتیں 'اردو اور قانون' ہیں۔ 'ہزارا'، 'دونوں'، 'بڑے
 سلیقہ سے گذشتہ تین قہروں سے زیادہ عرصہ سے نیا ہے چلے آئے ہیں' اور 'عہد کے سخن و سخنور' کے نام سے
 ادبی مقام رکھتے ہیں۔ ان کے والد پنڈت بگت نرائن ملا، لکھنؤ کے سربراہ اور دو کھیلوں میں سے تھے۔ مثلاً

اس میں ایک شہور کشمیری خاندان "ملا" ہے۔ جو لکھنؤ کی فضا میں پہنچ کر "ملا" بن گیا ہے۔ اب پنڈت آنند نرائن جو کشمیر میں ہوتے تو "ملا" رہتے، لکھنؤ میں "ملا" ہو گئے ہیں اور "ملا" سے جھوٹ کر لیا ہے۔ لیکن طبیعت سے قطعاً ملا نہیں بلکہ شاہراہی رہے۔

"ملا" نے اپنے کلام کے حالیہ مجموعے "میری حدیث عمر گریزاں" میں اپنے حالات لکھتے ہیں:-

"میں کشمیری برہمن ہوں۔ میرے والد پنڈت جگت نرائن ملا لکھنؤ میں ایک شہور و معروف وکیل

تھے۔ ۱۹۱۶ء میں انٹر سن پاس کیا۔ ۱۹۲۵ء میں بی۔ اے، ۱۹۲۳ء میں ایم۔ اے اور ۱۹۲۳ء میں قانون کا

امتحان کیننگ کالج، لکھنؤ سے جو ۱۹۲۱ء میں لکھنؤ یونیورسٹی بن گیا تھا، پاس کیا۔"

قانون کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ۱۹۲۶ء سے لکھنؤ میں وکالت شروع کی۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۵۲ء

تک ہند پاک ٹریڈ یونین کے سیکرٹری رہے۔ پھر ۱۹۵۳ء تک وکالت کی۔ اور اسی سن میں الہ آباد ہائی کورٹ

کے جج مقرر ہوئے۔ اس خدمت سے ۱۹۶۱ء میں سبکدوش ہوئے۔ اس وقت ہند پارلیمنٹ نے رکن اور

انجمن ترقی اردو ہند کے نائب صدر بنے، اور ان کی مساعی کا محور اردو ہے، جس کو ہند کے لسانی نقشے میں اپنا

جائزہ مقام دلانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

"ملا" نے شاعری ۱۹۲۶ء میں شروع کی، اس طرح اُس وقت ان کی فکر کے ارتقار پر تقریباً

چار قرن بیت چکے ہیں۔ کلام کے تین مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ "جوئے شیر" ۱۹۳۹ء

میں، "دوسرا" کچھ دترے کچھ تارے" ۱۹۵۹ء میں اور تیسرا مجموعہ "میری حدیث عمر گریزاں" جو اگلے دو مجموعوں

کے انتخاب اور نئے کلام پر مشتمل ہے، ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔ اس کے ساتھ ایک نہایت خیالی زائقہ

بھی پاکیزہ اسلوب میں قلمبند کیا ہے، جس سے ان کے معیاروں پر روشنی پڑتی ہے۔

"ملا" کی شاعری مجموعی طور پر اپنے ہند کے تاریخی، سیاسی اور سماجی شعور اور فکری تحریکوں کی

بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔ شاعر کے منصب کا انہیں جو احساس ہے، اس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے

ہو سکے گا۔ لکھتے ہیں:

"میں شاعر کو ہر فن کار نہیں سمجھتا، بلکہ دانائے راز اور تیرہ بھی سمجھتا ہوں۔

..... میرے نزدیک کوئی شاعر یا افسانہ نگار، نوری ان سے محبت کے بغیر

نہیں ہو سکتا۔ اور نہ وہ ادب عالیہ پیش کر سکتا ہے۔"

اور یہی طرز فکر ان کی زندگی اور ان کی شاعری میں رہنمائی کرتا رہا۔ جدید عہد کے فکری تقاضوں کو ملحوظ رکھتے

ہوئے، ملا کی نظم کی اہمیت کو گھٹا نہیں سکتے۔ لیکن غزل کو جو ان کے اور عالمی شاعری کے معیاروں پر ٹھیک اترتی ہے،

وہ آسانی سے نظم کے ہمدوش 'مانتے ہیں۔ ملا کی نثر روایت پسند نہیں، اجتہاد پسند ہے۔ تاہم وہ جانتے ہیں کہ کلا در

ادیب اپنے عہد کے لئے اپنے سماج کے لئے لکھتا ہے۔ اسی لئے نئے رمزیہ انداز شاعری کو وہ غیر صالح اور گمراہ کن قرار

دیتے ہیں۔ شاعری اور فن کی خوبی کا معیار ان کے پاس اس کی ابلاغی اور تربیتی صلاحیت ہے۔

ملا شاعری کے امکانات اور اس کے صحت بخش اثرات کے معتقد ہیں۔ ان کے آخری مجموعے کی آخری نظم

"اور ایک دن انسان جیتے گا۔ اپنے عہد کے یاس انگیز آشوب خیال میں ایک روشنی کی کرن، ایک پیغام سروش

بنے۔ خیال، اسلوب اور نظم کی ہر اعتبار سے یہ اردو کی حسین نظموں میں سے ہے۔ اس کا خلاصہ آخری بند ہے:-

جب سے یہ دنیا قائم ہے

یہ جنگ برابر جاری ہے

اب تک تو نہی ہوتا آیا، انسان ہمارا، شیطان بھی تا

لیکن جب تک یہ دنیا ہے

یہ جنگ بھی ہوتی جائے گی، میدان بدلتے جائیں گے

اور اک دن انسان جیتے گا

نیا عهد اور نشری ادب

افسانہ نگاری

پریم ناتھ پردیسی - تیرتھ کشمیری - دینا ناتھ وار پیکر شاپہ - شیا م دلا
ایک - گنگا دھر جٹ دہماتی - بہار دلال شاشری - شیا م دلا کی - دینا ناتھ عارفی - دوبار
محمد باشمی - منوہر کاک - شیموڑ تھپی کول - ترلوکی ناتھ نکر - کاشی ناتھ کول - وید لال گروہ
سوسنا تھپی - پرتھوی ناتھ کول -

کثیر رسے باور

سداوت حسن مسطور - کرشن چندر - رام چند ساگر -

ناول اور ڈراما

زمنگداس ڈگس - دیا کرشن گروہش - کاش ناتھ ترچیل خوشتر - صاحبزادہ محمد عمر

نورانی

مضمون نگار

سوم ناتھ ترچیل مے ولف - پریم ناتھ خوشدل - شیمو ناتھ اکو - چراغ حسن حسرت -
غلام احمد میرزا زین جو رینیہ عنقا - شیخ محمد عبداللہ - آند کول باقری - جاگلی ناتھ
در مری ناتھ نکر - جگناتھ دلا - امر ناتھ کاک - جیالال پنڈتا - چندر کشمیری -
کاشی دلال کول - بخشی غلام محمد - غلام احمد مختار - شری پتی مسترا دیوی - شری پتی لانی کول

سند دیری کوئل - شریستی رادھارانی - جے کشوری دیویں در "ش" صاحبہ - کمہاری
 ارن وئی کول -

تصنیف و تالیف

جیالال ناظر - ٹھاکر روگن تھ سنگھ سامیال - ہری کول - شنبو ناتھ کول ناظر وکیل -
 دینا ناتھ در - دینا ناتھ جوگی - جیالال کول - حکیم غلام صفا در - مہدانی - مرزا غلام افضل
 بیگ - مرزا غلام قادر بیگ - منشی محمد اسحاق - سری کنتھ "ش"انی - قاضی غلام اللہ
 میر حبیب اللہ کمالی - غلام محمد الدین - عبدالاحد آزاد - پدم ناتھ گنجو - خواجہ غلام محمد
 صدق - خواجہ غلام نبی گلہار - چودھری غلام عباس - سردار محمد ابراہیم خان - منشی
 فیض الدین - آفتاب کول و انچو - پی - این - پشپ - صاحب زادہ حسن شاہ -
 عزیز احمد قریشی - خلیفہ عبد الیم - ماسٹر موزن لال -

صحافت اور صحیفہ نگار

لال ملک رائے - اور "رہبر و غیرہ - بلراج پوری اور "پیکار" - پریم ناتھ نزار
 اور "دستا" وغیرہ - مولانا محمد سعید مسعودی - پنڈت کشپ بندھو اور
 "ناتھ" وغیرہ - لال داتل اور "خدمت" - دوسرے صحیفہ نگار -

رسائل

جہلم - سواستکا - پرتاپ - لالہ رُخ -

ایک فتویٰ - ایک عرضداشت

ادارے :

نیا عہد اور نثری ادب

مختلف کمزوریوں میں اردو ادب کی نشوونما کی تاریخ کی طرح جہاں اور کثیر میں بھی اس روایت کا اعادہ ملتا ہے کہ ابتدا میں شاعری کی دلچسپیاں، لوگوں کو زیادہ مسحور کئے ہیں۔ چنانچہ پچھلے اوراق سے اندازہ ہوا ہوگا کہ شعر و سخن کے ذوق کی وسعت کے سبب، مختلف اصناف شاعری کو خاطر خواہ فروغ نصیب ہوا تھا۔ شاعری کے بعد اگر کوئی اور صنف اس عہد کے ادیبوں میں مقبول رہی، تو وہ افسانہ نگاری ہے۔ لیکن جو ذوق اور دلولہ اور شعر گوئی کی صلاحیتوں کا ابھار شاعری میں ملتا ہے اور فکر اور تجربات کا وسیع تنوع اس فن کی مختلف صنفوں میں نظر آتا ہے۔ نثری اصناف میں سے کسی میں کم دکھائی دیتا ہے۔ تاہم شاعری کے بعد جنوں اور کشمیر کے ادیبوں کی صلاحیتیں کسی صنف میں نمایاں ہوتی ہیں۔ تو وہ افسانہ نویسی ہے۔ افسانے سے پہلے کردار ادبی اصناف، جیسے ناول یا ڈراما، اس عہد میں برائے نام ہے۔

(افسانہ نگاری کا آغاز یہاں بھی، اس میں شک نہیں کہ روایتی، رومانی اور کسی حد تک رسمی انداز سے ہوا۔ لیکن جوں ہی ان ادیبوں کا شعور بیدار ہوا اور فن پر دسترس کا ايقان پیدا ہو گیا۔ ان کی اپنی ذاتی صلاحیتیں، ابھرنے لگیں اور اپنی مزینت کی حقیقی زندگی کے سماج، معاشی، نفسیاتی، امنیاتی اور بعض وقت سیاسی پس منظر

دلالت اندہ سے انہی کے کہنے جانے لگے جس سے جوں اور کتبیر کے افسانوں میں مقامی رنگ اور انفرادیت نمایاں ہوتے لگی۔

افسانہ نگاری

افسانہ نگاری میں سب سے عظیم نام بھو بارے سامنے آتا ہے، وہ پنڈت پریم ناتھ پردیسی کہ ہے جن کی بے وقت موت نے اس مخصوص افسانہ نگاری کو اپنے وہ ہمد میں فروغ دینے لگے تھے۔ ایک ایک مسہور کردیا اور اس کے ساتھ کئی افسانے میں انتقام کے برائے کائنات تھے انہیں ختم کر دیا اور اردو افسانہ ایک نئے اُبھرتے درختے رجحان سے جو اپنی نوعیت میں کشمیری تھا، محروم ہو گیا۔ پردیسی بڑی رنگارنگ شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا۔ غزل اور بہت سے نوجوانوں کی طرح ان کے لئے بھی دلکشی کا باعث ہوئی اور انہوں نے شعر سوزوں کرنے کی کوششیں کیں۔ لیکن جوں اور کثیر کے کسی شاعر کی طبیعت ان سے بڑھ کر شعر کے لئے ناکوزوں نہیں تھی۔ اور اس کا احساس خود پردیسی کو بھی بلند آہ ہو گیا تھا۔ تاہم اس کا فر عادت کے پھوٹے چھوٹے، انہوں نے کئی غزلیں کہہ دیں۔

نزل سے جی اکتیا تو کچھ غزلیں انما کے ترانے لکھ لئے۔

پردیسی کشمیری پنڈتوں کے ایک نیچے متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی ولادت ساٹھ سال ۱۹۰۹ء زیر ہے۔ گھر کے حالات مساعد نہیں تھے۔ اس زمانے میں کشمیری پنڈتوں کی رسم کے مطابق ان کا بیان بھی کم عمری میں ہو گیا تھا۔ اس لئے جلد تعلیم ختم کر کے ملازمت کی تلاش کرنی پڑی۔ اور کوئی ۲۲-۱۹۳۱ء میں انہوں نے لکھنؤ جنگی میں چھوٹی اسامی قبول کر لی۔ اس محکمہ میں اسسٹنٹ انلیکٹر کے بعد تک پہنچے پہنچے انہیں کوئی چودہ سال گئے۔ پردیسی نے سن شعور

کو پہنچنے کے بعد کثیر کی آزادی نرالی کی دگر شاہی مطلق العنانی کے خلاف بڑھ چلا
 دیکھی تھی۔ ملک کی آزادی کے ساتھ کثیروں کو کسی راجا شاہی ظلام کے بطون سے ایک
 نیا جمہوری نظام، ندرت ہو پر کیا اور ترقی پسند فائدہ مند نے جن میں خواجہ غلام محمد
 صادق پیش پیش تھے۔ اسے ایک تعمیری شکل میں ڈھالنے کے لئے کچرل فرسٹ قائم
 کیا۔ جس میں بہت سے پرجوش نوجوان شامل ہو گئے۔ انہیں میں پر دیسی بھی تھے۔
 اس تحریک سے منسلک ہونے کے بعد پر دیسی کی زندگی میں ایک نیا موڑ آیا۔ اس سے
 پہلے انہوں نے کچھ کہانیاں بھی لکھی تھیں، جو روایتی موضوعات پر رومانی انداز کی
 کہانیاں تھیں، لیکن ترقی پسند تحریک کے اثر کے تحت پر دیسی کثیر کی حقیقی زندگی
 کی طرف متوجہ ہوئے۔ ۱۹۲۷ء کے بعد انہیں ریڈیو کثیر میں ملازمت مل گئی، اور
 پروگرام اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے، پر دیسی نے کئی ڈرامے، فیچر
 اور مضامین لکھے۔ شاعری کا شوق اب کم ہو گیا تھا اور جو باقی رہ گیا تھا۔ انہوں نے اسے
 قبائلی حملہ کے دوران، فوجی ترانے اور اسی طرح کی کچھ منظومات لکھنے میں صرف کیا۔

اپنی متنوع ادبی دلچسپیوں کی بدولت پر دیسی اس صدی کے دو وسطی دہوں
 میں کثیر کی ادبی فضا پر چھل گئے۔ ان کا کلام، ان کے افسانے اور ادب لطیف کی
 طرز کے انشائیے اخباروں اور رسالوں میں پھرتے رہے۔ کلام کے ایک مجموعے بھی
 مرتب کئے اور افسانوں کے مجموعے بھی "شام و سحر"، "ہماری دنیا" اور بہتے چرلغ
 کے نام سے مرتب اور شائع ہوئے۔ ان افسانوں کے علاوہ، جو ان مجموعوں میں شائع
 ہو سکے، بہت افسانے اور ہیں۔ جو اخباروں اور رسالوں کے پرنے والوں خاص طور
 پر "مارتنڈ" کے ادبی شماروں میں محفوظ ہیں۔ اخبار "ہمدرد" کے بعد "مارتنڈ" دراصل
 نوجوان ادیبوں اور خاص طور پر پنڈت ادیبوں کی تخلیقات کا ترجمان بن گیا
 تھا۔

پرتلیسی کچھ تو اپنی تخلیقات کے متعلق کی خاطر اور کچھ اس زمانے کے ادیبوں کی روایت کی پابندی میں ایک سے زیادہ ناموں سے لکھتے تھے۔ پرتلیسی کا شمیری کے نام کے علاوہ، سادھو کشمیری، رونق کشمیری، بابو کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ پنڈت مندلال وائل، مدیر روزنامہ "غابت" نے جو پرتلیسی کے ساتھ اکثر رہتے تھے، بتایا کہ وہ "مارتنڈ" میں اپنے معاصرین کے چہرے "علامہ صدیقی سانہوی" کے نام سے بھی لکھا کرتے تھے۔ لیکن پنڈت تیرتھ کشمیری کا بیان ہے کہ علامہ صدیقی سانہوی کے نام سے پنڈت دینا ناتھ مٹو دیگر چہرے لکھا کرتے تھے اور پرتلیسی علامہ علانی کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ قیصر قلندر نے اپنے ایک مضمون میں جو "پرتلیسی" ایک مطالعہ چندیادیں کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ دو ناموں سادھو کشمیری اور رونق کشمیری کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لیکن اس کی بہتر تفصیل خود ان کے علامہ صدیقی سانہوی کے نام سے لکھے ہوئے ایک مزاجیہ خاکے میں ملتی ہے جو "پرتلیسی کشمیری" کے عنوان سے "مارتنڈ" کے شمارہ ۷ مارچ ۱۹۳۵ میں شائع ہوا ہے۔ اس کا اقتباس درج ذیل ہے۔ جو میں انہوں نے اپنے حلیہ اور عادات پر روشنی ڈالی ہے، لکھتے ہیں۔

"پہلا فرشتہ بولا، ان کا اسم شریف ظاہر کرنا گناہ ہے۔ البتہ ان کا مشہور عام تخلص پرتلیسی ہے۔ کیسی قدر دلاز، خوش شکل، کم گو، ہنس مکھ اور شرمیلے، آنکھوں پر عینک لگاتے ہیں۔

دوسرا فرشتہ بولا۔ ہماری بھی سنو، ان کا ایک ہی تخلص نہیں بقول ان کے صرف تین تخلص ہیں بشیر کے لئے ایک، پنجاب کے لئے دوسرا، یو۔ پی کے لئے تیسرا، کبھی پرتلیسی کا لفظ مرغوب، کبھی بابو کا خطاب مطلوب، کبھی رونق سے ہم آغوش ہیں۔"

پرتلیسی، شاعری میں رونق تخلص کرتے تھے۔ ان کی غزل کے دو شعر

نمونے کے لئے یہاں درج کئے جاتے ہیں:

یار کی قامت قیامت خیز میری خاطر ہے بے سرو پائی
رنگِ گیسو ہے تو تیلے نظر شمع کو شب ہے، دُوبہ بینائی

لیکن جب اوپر اشارہ کیا گیا ہے، شاعری کا نظم، ضبط، فن اور تکنیک کی پابندیاں، پردیسی کی آزاد ادبے چین طبیعت کے لئے ایسی قید و تنہیں۔ جن کی وہ مشتمل نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اس لئے وہ جلد ہی شاعری سے دست کش ہو گئے۔ اور بعد میں جب کبھی یہ شوق اُبھرا۔ تو انہوں نے ادبِ لطیف کی طرز کے انشائیوں کی صورت میں نثری شاعری کی۔ پردیسی کا لکھا ہوا، ایک تراشہ، جو قبائلی حملے کے دوران لکھا گیا تھا اور مقبول بھی تھا ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

قدم قدم بڑھیں گے ہم محاذ پر لڑیں گے ہم
لڑیں گے ہم، لٹیروں اور حملہ آوروں کے ساتھ
لڑیں گے ظالموں کے ساتھ اور مجاہدوں کے ساتھ
وطنِ فروش بے وفاؤں اور شاطروں کے ساتھ

قدم قدم بڑھیں گے ہم محاذ پر لڑیں گے ہم
سوال اب نہیں رہا یہاں کسی کی ذات کا!
یہ مسئلہ نہیں ہے ایک رویا پانچ سات کا!
سوال ہے یہ قوم کی حیات اور مہمات کا!

قدم قدم بڑھیں گے ہم محاذ پر لڑیں گے ہم
اس چرخ میں پردیسی نے کچھ اور لفظیں بھی لکھی تھیں۔

۱۹۴۶ء کے بعد حالات جب سازگار ہوئے اور کلچرل فرنٹ، پھر کلچرل کانگریس قائم ہوئی، تو انجمن ترقی پسند مسنفین کا قیام بھی عمل میں آیا، جس کے

۴۳۴
ساتھ پردیسی بھی وابستہ ہو گئے اور اس کے بعد ان کے افسانوں کی طرح شاعری کا انداز بھی بدل گیا تھا۔ افسانوں کی طرح شاعری میں بھی وہ عوام اور خاص طور پر محنت کش عوام اور سچے طبقے کے لوگوں کی زندگی کی ترجمانی کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ اسی زمانے کی کہیں ہوئی ایک نظم "بیکار نوجوان سے" غالباً اس انداز کی اچھی نغموں میں سے ہے۔ نظم ذیل میں درج ہے :

پیکر درد و مصیبت ہے یا تصویرِ غم
تیرے حصے میں ہے آئی یا کوئی جاگیرِ غم
گردشِ چرخِ جفا پیشہ سے تو بیزار ہے
بزمِ ہستی میں کہاں رست سے لاچار ہے
بے نوا یوں ہو گیا ہے، کس خیالِ غم میں
کس کی خاطر ہو گیا ہے مبتلا آلام میں
ہے دلِ بھور میں کس کی تجھے اب آرزو
چشمِ اشکِ آلود میں رہتی ہے کس کی جستجو
اٹھ ذرا نامِ خدا سے تعریفی سے رکھ
ذلت و ادبار کی سمنان بستی سے رکھ
ٹوٹ جئے گا کہیں غافلِ حبابِ زندگی
اپنی ہمت سے دکھ کچھ انقلابِ زندگی

افسانہ دراصل، پردیسی کا مخصوص میدان تھا، اور اس میں ان کی طبیعت کے جو ہر ٹپکے خاص طور پر ترقی پسند تحریک سے منسلک ہو جانے کے بعد انہوں نے جو افسانے لکھے، ان میں سماجی اور ابلاغی قدروں کی طرف زیادہ توجہ کی گئی چنانچہ انہوں نے ۱۹۳۳ء میں اپنے ایک خط میں اس لئے رجحان کے بطور عہد کی بار بار لکھا تھا :

۹۳۲ء سے ۹۳۸ء تک جو کچھ میں نے لکھا تھا، اس پر میں غریب نہیں
کر سکتا۔۔۔۔۔ اس وقت تک مجھے یہ احساس ہی نہ تھا کہ ایک افسانہ
نگار ہونے کی حیثیت سے مجھ پر اپنے وطن کے کیا فرائض ہیں۔“

ان کے خط سے یہ کہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے رجحان میں یہ تبدیلی افسانوں
کے مشہور اور نمونہ الڈرا مجموعے ”انگلے“ کو پڑھنے کے بعد ہوئی۔ نئے افسانہ کے
باغیانہ رجحانات شاید ان کی اپنی زندگی کے حالات سے ہم آہنگ بھی تھے۔ ان کے
افسانوں کے مجموعے ”شام و سحر“ کا تعارف پروفیسر نند لال کول طالب نے لکھا تھا
”بہتے چراغ“ جو بعد میں لکھے ہوئے افسانوں کا مجموعہ ہے اور ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا،
اس کے لئے خواجہ غلام محمد صادق نے جو اس زمانے میں کلچرل فرنٹ کے روح رواں تھے،
تعارف لکھا ہے۔ اس میں انہوں نے پردیسی کی صلاحیتوں کو ان الفاظ میں خراج
تحسین پیش کیا تھا۔ ”پردیسی ہماری ریاست کے بہت بڑے اساتذہ نگار تھے۔“
اسی تعارف میں، صادق صاحب نے پردیسی کے تین اور مجموعوں ”وصوں“، ”کچھڑ
کے دیوتا“ اور ”جنگ اور لغز“ کا تذکرہ کیا ہے۔ جو چھپ نہیں سکے۔ بہتے چراغ پر
صادق صاحب کے تعارف کے علاوہ پروفیسر احتشام حسین، سہیل عظیم آبادی اور
کثیر کے دوسرے مشہور افسانہ نگار، پریم ناتھ در کے تبصرے بھی شامل ہیں جن میں پردیسی
کے افسانوں کے نمایاں خط و خال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پروفیسر احتشام لکھتے

”فن کار کے لئے سچائی اور سادگی، دو بڑے سہارے ہیں، جن کی
مدد سے وہ فن کی دشوار گزار وادیوں میں سفر کرتا ہے۔ پردیسی کے پاس
یہ دونوں سہارے تھے۔ اس لئے ان کی افسانہ نگاری میں جُسن اور
کشش کے ساتھ تابہ، توازن ہے۔“

نئے شعور کے طلوع ہونے کے بعد، پردیسی نے جتنے افسانے لکھے۔ ان میں کثیر اور کثیر کے محنت کش عوام کی زندگی اور ان کے مسائل کو پیش منظر میں لانے کی سعی نمایاں ہے۔ کثیر کی زندگی اپنے مخصوص سماجی پس منظر کے ساتھ، اپنے مخصوص مسائل رکھتی ہے۔ لیکن کئی افسانہ نگار جن میں کثیر سے کوئی اتفاقی ربط نہ ہو۔ اور جنہوں نے کثیر کو اپنے افسانوں کا موضوع بنانے کی کوشش کی ہو۔ وہ اس کے حقیقی حسنِ قبح کو سمجھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ اس بات کو صادق صاحب نے اپنے تعارف میں صریح طور پر واضح کیا ہے اور پردیسی کے بارے میں لکھا ہے :

”وہ کثیری عوام کی زندگی کی گہرائیوں تک پہنچے اور یہ بیرونی زندگی کے حدود و خال تک محدود نہیں۔ بلکہ ان کی دلی تمنائوں اور اُمیگوں کو محسوس کر کے کہانیوں میں پیش کرتے تھے۔“

پردیسی نے کثیر کے پس افتادہ طبقوں کی زندگی کو پیش کرتے ہوئے، جہاں تک ہوسکا، ان کے شعور کی گہرائیوں کو سلجھانے اور کبھی کبھی ان کے تحت شعور میں جھانکنے کی بھی کوشش کی ہے۔ اس طرح ان کے افسانوں میں فضا کی ایک تازگی اور ان کے بیان میں رچاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ سہیل غنیمت آبادی نے جو خود بھی اچھے افسانہ نگار ہیں۔ پردیسی کے افسانوں میں اس خصوصیت کو نمایاں دیکھا تھا اور لکھا ہے کہ ”پردیسی کی زندگی کثیر کے لئے تھی۔“ ساتھ ہی ان کا یہ خیال بھی ہے کہ ”ان کا فن کثیر کے لئے تھا۔“ تلامذہ یہ تخصیص مطلق مفہوم کے لئے نہیں، کیونکہ پردیسی کے موضوع کی تخصیص، ان کے فن کو مقید نہیں کر دیتی۔ اس کی اپیل عام ہے۔

کثیر کے حسین مناظر، اس کے انسانوں کی ذہانت، اور اس کے عوام کی زندگی کے نشیب و بالاؤں اور فرازوں کے پس منظر میں، پردیسی نے اپنے افسانوں میں حیات

۴۲۴
 کی گونا گونی کو محصور کرنے اور انسانی انقیات کی تہوں کو کھولنے کی جو کوشش کی ہے
 ان کے عہد کے فنی رچاؤ کی نمائندگی کرتی ہے۔ افسانہ "دھول" جو پرانی محل کے تاریخی
 کھنڈر، ڈل کی شاداب فضا اور لمبیوار ڈو کی رنگا رنگ زندگی کے اطراف میں گھومتا
 ہے۔ پردیس کے نمائندہ افسانوں میں سے ہے۔ جس کے تلنے بننے میں ایک غریب
 میاں بیوی کی زندگی کے نقوش اُبھلائے گئے ہیں "ٹیکہ ٹنسی" کشمیری پنڈتوں کے
 گھرانوں میں شادی بیاہ کے مراسم اور ان کے اہتمام کا عمدہ خاکہ ہے۔ بعض افسانوں
 میں انقیاتی اشائے سرشت انسانی سے ان کے عرفان کی گواہی دیتے ہیں۔ اور
 کچھ افسانوں میں عمدہ ڈرامائی مواقع کی تخلیق، پردیس کی فن پر گرفت کا ثبوت ہیں۔
 پردیس کو بیان کے حین انداز پر بھی قدرت تھی۔ چنانچہ اُجالے اندھیرے
 میں صبح کے مناظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے وہ ایک خوبصورت جگہ میں وسیع تصور کو
 سمودیتے ہیں۔ "زندگی" نئی صبح پر سوار ہو کر آگئی تھی۔ کشمیر کے جنتِ نظیر ہونے کے
 دعوے کے وہ منکر نہیں، لیکن جہاں تک اس جنتِ ارضی کے عوام کی زندگیوں
 کا تعلق ہے، وہ اس جنتِ ارضی میں پہلے سے طے کئے ہوئے تصورات لے کر آنے
 والوں پر زہر خند کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"لیکن شاید وہ نہیں جانتی تھی کہ جنتِ ارضی کی میلی مخلوق کی تصویریں
 جہنم کے بے فکر باسی بہت پسند کرتے ہیں۔"

ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ پردیس اپنے افسانوں کو ایک ڈرامائی موڈ
 پر لا کر ختم کرنے کے بہت شائق تھے۔ اس خصوصیت کے لحاظ سے افسانہ "کاری گر"
 بہت بلیغ ہے۔ یہ ایک یورپی سیاح کی کہانی ہے، جو انقیات کا معلم ہے، وہ ایک
 کاری گر کے کام کو پسند کر کے، سگریٹ کیس پر نقش بنانے کی فرمائش کرتا ہے، لیکن
 جب یہ سگریٹ کیس تیار ہو جاتا ہے۔ تو اس کے نقش اور صنایع کو پسند کرتے ہوئے

۴۳۸
اس کے لیتے سے ہیبت ناک گریز جہاں اس معلم نفیات کی ایک پوشیدہ نفسیاتی
الٰجھن کی طرف اشارہ ہے، وہاں کہانی کے لئے ایک اچھا ڈرامائی انجام بھی مہیا کرتا ہے۔
پردیس کے کئی افسانے اردو کے افسانوی ادب میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔

مثلاً "جنت جہنم"، "جھنڈیاں"، "دھول" اور "بیتہ چراغ"۔ افسانہ میں انہوں نے جو
تخصیص حاصل کر لی تھی۔ اس کے لحاظ سے کوئی تعجب نہیں کہ وہ عام طور پر "کشمیر کے
پریم چند" کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ اپنے فن میں اُن کی پیدا کرنے کا رجحان،
جہاں انہیں بیان کے نئے نئے انداز اختیار کرنے پر ابھارتا تھا، انہیں نئے نئے
تجربوں کی طرف بھی مائل کرتا رہا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ انہوں نے پنجاب
کے ایک افسانہ نگار، رنبیر سنگھ دیر کی شرکت میں ایک افسانے کی تکمیل کی تھی۔
اس کا ابتدائی حصہ دیر جی نے لکھا تھا۔ اور اسے ایسے موڑ پر چھوڑا تھا۔ جہاں
بیانیہ کو آگے بڑھانے کے لئے کئی راہیں سمجھائی دیتی تھیں۔ بعد کے حصے کی تکمیل
پر دیسی نے کی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعات کے سلسلے کا انجام اس سے بہتر
نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ افسانہ "مارتنڈ" کے شمارہ ۹ اپریل ۱۹۳۷ء میں اڈیٹر کے
اس نوٹ کے ساتھ شائع ہوا تھا:

"اس کہانی کا پہلا حصہ پنجاب کے مشہور افسانہ نویس شری پت
رنبیر سنگھ جی دیر نے لکھ کر پردیس کو دیا تھا جس نے کہانی کو مکمل کر دیا،
رنبیر جی کی یہ ہدایت تھی کہ شائستگی کا کیریکٹر بلند رکھا جائے۔ آپ
کہانی پڑھ کر دیکھ سکتے ہیں کہ دیر جی کی ہدایت کس حد تک پوری کی گئی
ہے اور جس مقام پر دیر جی نے کہانی کا بیک گراؤ نہ پیدا کیا، اگلا حصہ
لکھنے والے کے لئے کتنا مشکل تھا۔"

کہانی کے ابتدائی حصے میں دیر جی نے شائستگی کے اطراف راز کی ایک

گہری فضا پیدا کی تھی۔ وہ اپنے دس چاہنے والوں میں سے ہر ایک کو رات کے
تین بجے ایک مندر میں ملنے کا وعدہ کرتی ہے۔ اسی مقام پر کہانی ادھوری چھوڑی
گئی تھی۔ پردیس نے راز کی فضا کو اور گہرا بنایا اور ایسا انجام پیدا کیا کہ شالہی
کا کردار ایک دیوی کا کردار بن گیا۔

پردیس اپنی طبیعت کی اُفتاد کے ناطے ہمیشہ سنجیدہ بلکہ المیہ موضوع
منتخب کرتے تھے، حالانکہ قیصر قلندر نے لکھا ہے کہ وہ ظرافت اور بندہ سنجی کا
بے نظیر ملکہ رکھتے تھے۔ غالباً اپنے افسانوی موضوعات کے چھٹکا سے کے طور پر مزاحیہ
خاکے لکھنے شروع کئے تھے۔ ۱۹۳۵ء سے وہ انشائیوں کے انداز کے مزاحیہ خاکے
لکھنے لگے تھے۔ ان نثری پاروں کو وہ نثری شاعری یا آزاد نظم کا عنوان دیتے تھے۔
ان میں سے بعض میں وزن کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ لیکن اکثر محض نثری پائے ہیں
اور ان سے دراصل ان کی نا آسودہ شعری رجحانات کی تکمیل ہو جاتی تھی۔ دونوں نے
ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

تیاگ کر دنیا کو آیا !
ایشور برہم کا روگی !
جیتا تھا وہ نام پر بھوکا
بس دن شام سویرے
گاتا تھا وہ گیت اسی کے
اٹھ کر منہ اندھیرے

دوسرا اقتباس محض نثری پارہ ہے :

جب سے تم پہاڑوں پر چلے گئے ہو
تب سے ہی شام ہونے کے بعد

تمہیں یاد کرتی ہوں، تمہاری پوجا کرتی ہوں
اور کبھی کبھی، اور ہاں کبھی کبھی روتی ہوں۔
اس اُمید پر کہ جب تم واپس آؤ
تو میرے آنسو پھول بن گئے ہوں

اس طرح کی نثری شاعری اس زمانے میں خاص طور پر لاہور کے ادبی حلقوں
میں مقبول تھی اور اس کا اثر ملک اوداد بیوں پر بھی پڑا تھا۔ پردیسی نے ۱۹۳۴ء
سے "سپاہی کے خطوط" کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس کے علاوہ
چند اور پائے جیسے "مت ڈھونڈ اے"، "نغمہ ازلی"، "بھروسے"، "جانے والی پریا"،
"ہم تین"، "پھپھائے رکھ"، "دیکھ اے دل"، "خاصے دلچسپ ہیں"، "مت ڈھونڈ
اے" ایک گہری معنویت رکھتا ہے۔ اس کا اقتباس یہاں درج ہے۔

پہاڑوں کی چوٹیوں پر اے مت ڈھونڈ سکھی
تاریک غاروں میں اے مت دیکھ آؤ
طوفانی دریاؤں میں اس کا کھوج مت لگاؤ
گھنے جنگلوں میں اس کی تلاش مت کرو
واپس آؤ، سکھی

وہ باہر بھی نہیں ملے گا
میرے آنسوؤں نے اس کا راتہ سا گر بن کر روک رکھا ہے۔
میری آہیں، اُس کی منزل پر کھربن کر چھا گئی ہیں۔
اور وہ واپس آ گیا ہے

میں اسے دیکھ کر اب پاگل ہو گئی ہوں
سکھی مت ڈھونڈ اے، مت ڈھونڈ

وہ باہر کہیں نہیں لے گا۔

پیردیس نے، ریڈیو سے منسلک ہونے کے بعد کئی ڈرامے اور فیچر بھی لکھے تھے۔ ان میں سوامی، سنگتراش، "مستعصم کی آخری مات"، "بھتہ ہر" قابل ذکر ہیں۔ شردانی جو قبائلیوں کے حملے کے دوران مارے گئے تھے۔ ان پر ایک ڈرامہ "بساہ شیروانی" کے عنوان سے بھی لکھا تھا۔ یہ ڈرامہ اور ان کے کچھ اور ڈرامے کلچرل فرنٹ کے شعبہ ڈرامہ کے اہتمام سے اسٹیج پر بھی پیش کئے گئے تھے۔ قبائلیوں کے حملے کا ایک روٹا ہوا بھی ان کی یادگار ہے۔ اپنے زمانے کے نوجوانوں میں شاعری کے شوق کے بارے میں انہوں نے ادب لطیف کے انداز کی ایک تنقید بھی لکھی تھی جس میں وہ کہتے ہیں:

"موجودہ زمانے میں ہر اردو، ہندی، انگریزی پڑھنے اور سمجھنے والے کے لئے شعر کہنا فیشن بن گیا ہے۔ ہر شخص کی خواہش ہے کہ وہ شاعر بنے۔ خواہ اس کی نظموں میں کچھ ہو یا نہ ہو۔ اسے اس سے سروکار نہیں اُسے اگر کسی چیز کی آرزو ہے تو یہ کہ اپنے ہم وطنوں میں اور ہم عصروں میں شاعر کہلائے۔"

اس سے اور ان کے ایک جائزے سے جو غیر کشمیری افسانہ نگاروں کے کثیر کو موضوع بنا کر بے بسی باتیں لکھنے کے بارے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی ایک نشست میں پڑھا گیا تھا۔ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پیردیس اچھی تنقیدی صلاحیتوں کے بھی مالک تھے۔

پیریم ناتھ پیردیس نے افسانہ نگاری کی حیثیت سے، ایک خصوصی مقام حاصل کر لیا ہے لیکن ان سے کچھ پہلے ہی پنڈت شیاام لال دلی، جو تیرتھ کا شیر کی نام سے لکھتے رہے اور کشمیر میں اور کشمیر کے باہر ادبی حلقوں میں شہرت حاصل کی، میدان میں اُچکے تھے۔

تیرتھ فراواں لگتا ہے۔ انہوں نے سوکے قریب افسانے لکھے ہیں۔ اسی تعداد میں ان کے مضامین ہیں، جو نہ بے اخلاق اور تاریک کے وسیع موضوعات پر حاوی ہیں۔ انہوں نے ڈرامہ پر بھی منبع آزمائی کی اور ادب لطیف کے انداز کے مختصر انشائیے شمار لکھے اور وہ شعر بھی کہتے ہیں۔ اور پردیسی کی تخلیقی صلاحیتوں کا پھیلاؤ بھی انہیں اصناف تک تھا، لیکن پردیسی ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے بعد چمک اٹھے تھے۔ تیرتھ کی ملازمت کی پابندیاں ان کے قلم کیلئے رکاوٹ بنی رہیں۔

تیرتھ سری نگر کے ایک علم دوست خاندان میں ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے۔ یہیں تعلیم پائی اور انٹر میڈیٹ پاس کرنے کے بعد، محکمہ ناظم حسابات میں ملازم ہو گئے۔ جہاں سیرنٹنڈنٹ کے عہدہ تک ترقی کر کے، وہ چند سال پہلے سبکدوش ہوئے ہیں اور اب بھی ادبی، سماجی اور مذہبی خدمت میں مصروف ہیں۔

(۱۹۲۳ء سے تیرتھ نے قلم اٹھایا اور اب تک بے تکان لکھ رہے ہیں۔ ان کے عرصے میں ان کا کئی اخباروں کی ترتیب سے بھی تعلق رہا۔ لیکن نام کے ساتھ نہیں۔ چنانچہ اس وقت بھی ان کا تعلق "ہفت روزہ" "جیوتی" سے ہے ان کے مضامین بھی اس میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

تیرتھ نے ۱۹۲۳ء سے ہفت روزہ "اخبار عام" لاہور میں لکھنا شروع کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب کشمیر میں اخبار کی اجرائی کی اجازت مہاراجہ کے دربار سے مل سکتی تھی۔ "اخبار عام" کشمیر کے لکھے پڑھ لوگوں میں بہت مقبول تھا۔ اور اس کے مدیر پنڈت بال کرشن گروڈ کو کشمیر کے جوانوں کی ادبی صلاحیتوں کو ابھارنے اور انہیں منظر عام پر لانے کا بڑا خیال تھا۔ جب انہیں اپنی قلمی صلاحیتوں کے بارے میں اعتماد پیدا ہو گیا تو وہ محمد دین فوق کے رسالے "کشمیری" میں بھی لکھنے لگے۔ لیکن ان کا طویل عرصہ ایچے کوئی دس سال تک

۴۳۳
 "ہمارے کثیر سے تعلق رہا۔ جو لاہور ہی سے نکلتا تھا۔ ایک اور ہفتہ وار "صبح کشمیر" میں
 بھی ان کے مضامین اور افسانے شائع ہوتے رہے۔ اردو کے لکھنے والوں میں ان
 کا مقام پیدا ہونے کے بعد ہندوستان کے اور اخباروں اور رسالوں میں بھی انہوں
 نے لکھنا شروع کیا۔ اپنے ہم عصر لکھنے والوں میں ادبی ذوق کو ترقی دینے کے لئے
 ۱۹۲۱ء میں اپنے چند ہم خیال رفقاء کی اعانت سے ایک دارالمطالعہ اہل ریڈنگ
 روم کے نام سے قائم کیا تھا۔ جس کی اجازت ہمارا جہ سے حاصل کی گئی تھی اس
 ریڈنگ روم میں ہندوستان کے اکثر اخبار اور رسائل آتے تھے۔

پھر جب ۱۹۳۱ء سے کشمیر میں اخبار جاری ہوئے تو تیرتھ نے اپنے وطن کے
 اخباروں "وتنا" اور "ہمدرد" اور "مارٹنڈ" کے لئے بھی لکھنا شروع کیا۔ اسی زمانے
 میں پریم ناتھ پردیسی، تارا چند ترسل، وشوناتھ ماہ، دینا ناتھ مٹو، دلگیر بھی منظر
 عام پر آئے۔ نوجوان لکھنے والوں میں جب ادبی ذوق عام ہو گیا۔ تو ان کے لئے
 ایک فورم مہیا کرنے کے مقصد سے انہوں نے کشمیر رائیٹرز لیگ کی بنیاد ڈالی۔
 جس کے سرگرم ارکان میں پردیسی، غلام احمد مجبور، گنگا دھر بھٹ، دیپاتی اشاد
 کاشمیری، دلگیر، وشوناتھ ماہ، کاشی ناتھ ایمہ کنول، سوم ناتھ ترچھل، سونو
 زلشی، زار وغیرہ تھے۔ اشاد اور کنول اچھے شاعر تھے۔ لیکن اب ان کا کلام
 عام طور پر نہیں ملتا۔

۱۹۴۰ء میں پنڈت دلشیر نے "سواستکا" ماہنامہ نکالنا شروع
 کیا تھا اور تیرتھ اس میں بھی اکثر لکھا کرتے تھے۔ لیکن یہ رسالہ ایک سال
 کے اندر بند ہو گیا۔

تیرتھ اپنے افسانوں کے لئے مواد ہر گوشے سے حاصل کرتے ہیں اور انہیں
 نئے نئے انداز اور اسلوب سے پیش کرتے ہیں۔ تاریخ، داستان، غلام زندگی اور

۴۴۴
اس کے اخلاقی پہلوؤں کے بارے میں انہوں نے کئی افسانے لکھے ہیں مثلاً "چندراولی" کا موضوع اساتیری ہے۔ "نزل کے بل رام"۔ "اندھی ماں"۔ "تلاشِ حق"۔ "جگ چھوٹا سرمایہ"۔ اخلاقی پہلو لیتے ہوئے ہیں۔ "پاگل کا خط" میں انہوں نے مکتوبات کے انداز سے کام لیا ہے۔ افسانوں کی طرح ان کے مضامین کا دائرہ بھی وسیع موضوعات پر حاوی ہے۔ ان کے مذہبی مضامین میں "ترجموں سامی"۔ "پریم کا اوتار بھگوان کرشن"۔ "مہاتما کی شیوارتری"۔ "رام نومی کے پھول" اور تاریخی مضامین میں "مکتا پیڑ لگتا دیتیہ" اور "عہد اکبری کا کشمیر میں طلا دان" دلچسپ مضامین ہیں۔

تیرتھ کا خاص میدان انشائیہ اور ادب لطیف ہیں۔ یہ انداز کشمیر کے اس دور کے اکثر ادیبوں میں بہت مقبول رہا ہے اور ان سب لکھنے والوں میں تیرتھ کو ایک خصوصیت حاصل ہو گئی ہے۔ "پارس کا پتھر"۔ "سنان بستی"۔ "کتاب"۔ "ہم ایک ہیں"۔ "میں نے کہا"۔ غرض کئی ایک ایسے ہیں جو ایک دلکش اسلوب میں لکھے گئے ہیں اور گہری معنویت رکھتے ہیں۔ عمر کے ساتھ، ان کی فکر میں گہرائی اور تصوف نمایاں ہے۔ مثال کے طور پر ان کا انشائیہ کے انداز کا ایک مضمون جو "کتاب" کے عنوان سے ہفت روزہ "جیوتی" کے شمارہ ۲۳ مئی ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

۱۔

زندگی کی یہ کتاب

میں نے لکھنا شروع کی اور اس میں لڑکپن، جوانی اور ادھیڑ
پن کے انوکھے تجربے بیان کئے خیال تھا کہ یہ مقبول
ہوگی۔

۴۳۵
 یہ سکن دیکھا۔۔۔۔۔ مقبول ہونے کی کوئی سبیل نہیں۔ اس لئے
 جسم کے انگ انگ میں محسوسات، وسوسات اور خواہشات، درد و کرب
 اور بے چینی کی نہ دیکھی جانے والی لہریں۔۔۔۔۔ روز افزوں اُٹھنے
 لگیں۔

۳

علم اور علم کی باتیں، گیان اور دھیان کے جھپیٹے، فلاسفی اور
 فلاسفوں کے اقوال ریگستان میں ایک پیلے مسافر کی طرح سُراب
 ثابت ہوئے۔۔۔۔۔ شاید میں سمجھنے کے اہل نہ تھا۔۔۔۔۔

کشمیر کی ایک اُجڑی نگری اکھیمو پور پر بھی ان کا ایک اچھا تاریخی
 انشائیہ ہے جس میں اس گاؤں کی زندگی کے ایک خاص رخ کو اس طرح پیش کیا
 ہے:

”اس گاؤں کا نام تھا، اکھیمو پور، جہاں کبھی اکھیمو جی کا آشرم تھا لیکن
 اب چشمے سے دور ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جس میں چند ہندو گھر آباد ہیں زمیندار یا
 ان کا پیشہ ہے۔ غضبِ خدا کا ایک گھر بھی ایسا نہیں جہاں عورت کی صورت دیکھنے
 میں آئے۔۔۔۔۔ عورت ان کے لئے گراں بہا جنس ہے، کیونکہ دیہاتیوں
 کے گھروں میں جہاں لڑکی پیدا ہو۔ اس کا پارسل شہریوں کے نام ہو جاتا ہے اور
 شہری بھی دردِ انِ عرب کی طرح ان کی ناک میں رہتے ہیں۔ جہاں موقوفہ بلا تائیز
 عمر، اپنے لئے ایک توہمی دھونِ تلاش کی اور اپنی غیر آبادی کو زرخیز بنالیا۔“
 تیرتھ نے ڈراما پر بھی طبع آزمائی کی ہے اس کے علاوہ کشمیر کی تاریخ کے ایک
 خاص عہد کے بارے میں ایک رسالہ ”دیونا“ کے نام سے لکھا ہے۔ یہ سلطانِ زین العابدین
 کے عہد کے ایک وید شری بٹ کی داستانِ حیات ہے جس نے بادشاہ کو ایک مہلک

مرض سے نجات دلا کر، اُس کے صلیب میں ہندوؤں کے لئے مراعات مانگ لی تھیں۔ تیرتھ
 کا یہ مختصر سارسالہ شائع ہونے کے بعد بہت معرکتہ آلا راتار گنگا دھر بھٹ دیہاتی
 نے اس رسالے کے لئے ایک پیش لفظ "دیوتا کی پوجا" کے عنوان سے لکھا ہے۔ تیرتھ اردو
 کے علاوہ، انگریزی، کشمیری اور ہندی میں بھی لکھے ہیں۔ ان کے کئی اچھے مضامین اور
 افسانے "وکتا" (کلکتہ) میں شائع ہوئے ہیں۔

تیرتھ نے بہت سی نظمیں بھی کہی ہیں، جو اخباروں اور رسالوں میں شائع
 ہوتی رہی ہیں۔ ان کی نظموں کے موضوع اخلاقی، سماجی اور مذہبی بھی ہیں اور کچھ
 نظمیں مناظر پر بھی لکھی ہیں۔ "جوتے حیات" کے عنوان سے انہوں نے ایک اچھی نظم
 لکھی تھی، جس کا اقتباس ذیل میں درج ہے :

صبح کا تھا وقت اور دھندلی فضا

وہ قمری کی کو کو میں شانِ خدا

کہیں طائر خوشنوا بارغ میں ست

ہوا معتدل، بوسے گل جانفرا تھی

نمودار سبزہ کہیں اور کہیں گل

کہیں آتی جھرنے کی دلکش صدا تھی

کنار ندی ایک لڑکی حسیں تھی

تھی غنچہ دہن لاد خندہ جبیں تھی

طبیعت تھی شاد اور چہرہ گلابی

بجاتی پھرتان میں وہ بیں تھی

۴۴
 کشیر پر بھی انہوں نے کچھ نظمیں کہی ہیں۔ ایک نظم کا اقتباس ہے،
 مخور گلتاں ہے، لو فصل ہیرا آئی
 خاموش فضاؤں میں نکبت کی ہوا لائی
 شاداب ہوا سبز، پانی پر جمی کائی
 تفسیر محبت میں تاثیر نئی پائی

گلچوش ہے سرتاپا کشیر وطن میرا
 سر جوش ہے سرتاپا کشیر وطن میرا

مزاح کا لطیف عنصر بھی کہیں کہیں ان کی تحریروں میں نمایاں ہو جاتا ہے۔
 ایک نظم انہوں نے ”ہیڈ بے کاری میں عشرتِ بیز ہے“ کے عنوان سے لکھی
 تھی۔ جس میں اکبر الہ آبادی کی طرح مغربی تہذیب کا خاکہ اڑایا ہے۔ یہ نظم مارتنڈ کے
 شمارہ ۲۲ ستمبر ۱۹۴۰ء میں ان کے ایک نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ جس میں نظم
 کی شانِ نزول کا تذکرہ کرتے ہیں:

”فقیر، احقر، شاعر نہیں اور نہ شاعری کا دعویٰ ہے۔ ماں گاہ بہ گاہ اس
 میدان میں پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی جرأت کرتا ہے۔ دلی یا لکھنؤ
 کے استاد یہاں موجود کہاں کہ ان کی صحبتوں سے طبیعت خود بخود
 اصلاح پاتی، چونکہ شعر کا عشق ہے، شوکتِ الفاظ، بلند پروازی اور
 نازک خیالی سے دور رہ کر، دل کی اُنگ اور طبیعت کے جوش کے باعث
 شعر کہہ دیا۔۔۔۔۔ چند دن پہلے کی بات ہے کہ ایک پارٹی میں ہم کئی
 دوست شامل رہے، نزدیکی، دوستی، سوز، براہِ ہیڈ، آویزان تھی ریت

۴۳۸
 دینا ناتھ ولی نے ہیٹ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ 'جناب' فرمائیے،
 آپ کیا کہتے ہیں، بیچ اس مسئلے کے۔۔۔ میں نے عرض کی، چند شعر
 ملاحظہ ہوں :

ہیٹ بے کاری میں عشرت بیر ہے
 ہیٹ ہے تو صاحبِ توقیر ہے رعب سے عاجز جوان پیر ہے
 ہے یہ عزت کی نشانی آج کل اور اثر میں اپنے وہ اکیر ہے

تیرھ نے ایک ڈائری بھی لکھنی شروع کی تھی، لیکن اس کے بعض اندراجات کی وجہ
 سے کبھی موقع پر دار و گیر میں پھنس جانے کے خوف سے اسے ضائع کر دیا۔ یہ ڈائری
 ان کے زمانے کے حالات پر اچھی روشنی ڈال سکتی تھی۔ اس وقت "اپنی خود نوشت
 'اپنی کہانی' کے عنوان سے لکھنی شروع کی ہے اور اس کے چار سارے صفحات مکمل
 کر چکے ہیں۔ اس کا ایک باب 'پہلی بات' کے عنوان سے "جوتی" میں شائع ہوا ہے
 اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

"یہ کوئی افسانہ نہیں، زندگی کی سچی کہانی ہے، اس کہانی کے بھوانے
 کا سہرا راقم کے دوست شری جے۔ این۔ زرتشی کے سر ہے۔ بات اکتوبر
 ۱۹۶۱ء کی ہے۔ دودھ گنگا شمشان بھونی سری نگر میں ہمارے ایک ساتھی
 کے پتا کا مرتکب شری چتا پر چل رہا تھا۔ مٹر زیدی سیکرٹری، پھیلر لکادی
 اور شری زرتشی بھی وہاں کھڑے تھے۔ شری زرتشی نے جو اس وقت
 ڈائریٹر انفارمیشن تھے، میرا تعارف زیدی صاحب سے کرایا۔۔۔۔۔"

پہلے بیات مستعار کی اثباتی کے بارے میں جو گفتگو ہوئی۔ بڑے اچھے انداز میں بیان
 کی ہے۔ پھر لکھا ہے کہ زیدی صاحب نے پوچھا کہ کیا آپ اس وقت کچھ لکھ رہے ہیں؟

”میں نے کہا۔ جی، بہت کچھ لکھا ہے،‘ رادھر، رادھر، یہاں، وہاں‘
اب شمشان بھومی پر خیال آیا۔ زندگی مایا کا کھیل اور کال کا گھولنا
ہے۔ تہیہ کیا کر اپنے ذاتی تجربات اور واقعات کو قلمبند کروں، جن
سے میں زندگی میں دوچار ہوا۔ . . . ان واقعات کے بیان میں کسی
مبالغہ سے کام نہیں لوں گا۔ ہاں بیان میں اثر نہ ہو تو، وہ بیان کرنے
والی کی نااہلیت ہوگی۔ واقعات بالکل سچے ہیں۔“

ان واقعات کا تعلق کشمیر کی سیاسی، سماجی، مذہبی اور روحانی

زندگی سے ہے۔

پنڈت دیناناث داریکو، جوشہد کا کشمیری کے نام سے لکھتے تھے، ایک اور
وسیع دلچسپیاں رکھنے والے ادیب ہیں۔ درانی یا رحمان کی جڑے سکونت تھا، اور
تیسرے اور چوتھے رہے ہیں ان کی طبیعت کی روانی عروج پر تھی۔ وہ شاعر تھے اور
خوش فکر۔ اپنے زمانے میں وہ اچھے انشا پرداز بھی تسلیم کئے جاتے تھے۔ نثر میں
حالی کا انداز انہیں بہت پسند تھا۔ اور خود بھی اس کا اتباع کرنا چاہتے تھے۔ مذہبی
اور سماجی موضوعات سے لے کر، وہ ادیب لطیف کے انداز کے پاس بھی لکھتے تھے۔
مزاح نگاری میں بھی ان کی طبیعت کے جوہر نکلتے تھے اور افسانے انہوں نے کافی تعداد
میں لکھے ہیں۔ جو اس زمانے کے رسالوں اور اخباروں اور خاص طور پر ’مازندہ‘ کے
ادبی شاموں میں شائع ہوئے۔ ڈراما پھر بھی انہوں نے طبع آزمائی کی تھی۔

شہد کہ افسانوں میں ”سلاپ“، ”بکھان“ اور ایک مزاحیہ افسانہ ”جواب
دلچپ ہیں۔ ان کے دوسرے افسانے ”ایجاد“، ”انتقام“ اور ”گناہ“ بھی قابل مطالعہ
ہیں۔ ادیب لطیف کے انداز کے انشا بیور میں ”اظہار محبت“ اچھا پارہ ہے۔ شہد کا
ایک ڈراما جو دیہات سدھار کے موضوع پر ہے۔ ”گرام سدھار“ کے عنوان سے شائع

ہوا ہے۔ پہلے یہ "دیہاتی دنیا" میں قسط وار شائع ہوتا رہا بعد میں ۱۹۴۲ء میں یہ کتابی صورت میں شائع ہوا اور یہ بڑی نند لال کول طالب نے اس پر مقدمہ لکھا ہے۔ طالب کے تعارف سے ڈراما کی خصوصیات اور خود مصنف کی صلاحیتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ پروفیسر طالب لکھتے ہیں:

"پلاٹ قابل تعریف ہے اور مناظر دلکش، بعض مناظر میں طرزِ مکالمہ رنگین اور ظرافت آمیز ہونے کے باعث جاذب توجہ بن گیا ہے۔"

یہ بھی لکھا ہے کہ موضوع اور مصنف کے لحاظ سے یہ اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف ہے۔ شاہد کی ایک اور تصنیف امر ناتھ کی مشہور یہ ترا کے بارے میں ہے جو "رہنمائے یاترا" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ مصنف نے ۱۹۲۴ء میں ہمارا جہری سنگھ کے تلمکے موقع پر یہ کتاب پیش کش کی تھی۔ اس کتاب پر بھی طالب نے تقریظ لکھی ہے، اور دینا ناتھ مست کی تقریظ بھی اس کے ساتھ شامل ہے۔

شاہد کے بارے میں علامہ صدیقی سانہوی (پریسی) کا ایک چہرہ "مارٹنڈ" کے کالم "محفل ادب کشمیر" میں شائع ہوا تھا۔ جس کا اقتباس ذیل میں درج ہے:

"فدا رکھ، پرانی وضع کے بزرگ۔۔۔ دکھائی دیتے ہیں۔ دینا ناتھ

صاحب، بن کا تخلص شاہد ہے، ایک دُبے پتلے جوان، پست قد،

سادہ وضع، باوجود جوان ہونے کے جو شراب کی نعمت سے محروم،

شعر بہت کم کہتے ہیں، البتہ نثر اپنے رنگ میں خوب لکھتے ہیں۔ کچھ

دن افسانے لکھتے رہے۔ آپ کا طرزِ تحریر مولانا حالی کی طرزِ تحریر سے

مٹا جلتا ہے۔ اب درسی کتابیں لکھ رہے ہیں۔"

شاہد نے کچھ درسی کتابیں بھی لکھی تھیں، ان کا ایک مضمون اسکالروں کے بارے میں سوانہ "تکا" کے شمارہ اپریل ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا۔ جس کا ایک اقتباس ملے۔ ہمارا جہری سنگھ کا راج ٹیک ۱۹۲۶ء میں ہوا تھا۔

ذیل میں درج ہے :

”کیا کہا“ ”وولف کب“ ہاں وولف کب، لیکن شیر بچہ، کیا اچھا نام ہے۔ اور کتنا پیارا۔ ہاں، سچ بھلا ہو، ان کا جنہوں نے دُنیا کے فائبرے کے لئے اس کرم کو جاری کیا۔ ان کا نام سر رابرٹ بیڈن پاول تھا۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے کہ وہ اس دُنیا سے اُٹھ گئے۔“

شاہد کا ایک مکالمہ، ”اندر۔ اور۔ باہر۔“ کے عنوان سے شائع ہوا تھا، جس میں انہوں نے دو دوستوں کی جنہیں ملنے کی خواہش نہیں، لیکن جب ملتے ہیں، تو ان کے دل اور زبان جس طرح کام کرتے ہیں، اس کا دلچسپ مرقع پیش کیا ہے۔ اس کے ساتھ ان کا ایک توضیحی نوٹ بھی شامل ہے کہ یہ دوست الف اور ب سے موسوم کئے گئے ہیں۔

اندر یعنی دل میں باہر یعنی زبان سے
 ۱۔ بن بُلے آدھکا، پاگل کہیں کا نمستے آؤ، بھائی
 ۲۔ آج پکڑ ہی لیا میں نے تمہیں نمستے، کیوں جی آپ ملتے ہی نہیں
 ۳۔ تم سے ملنے کے سوا اور کام ہی کیا ہے مجھے
 کیوں یہ ہیں تو ہوتا ہوں !

ب: ہاں، میں بلاؤں، تو یہاں نہیں

جھوٹ میں تو آج چوتھی دفعہ آیا ہوں
 یہ مکالمہ طویل ہے اور اس میں اسی طرح دو سطحوں پر گفتگو اور اس کی تہ میں جو حقیقی خیالات ہیں، پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاہد شعر بھی خوب کہتے تھے، گو کم کہتے تھے۔ ذیل میں ان کی ایک نظم ”آمد بہار“ کے چند شعر درج ہیں:

بہار آئی، خزاں کی کھفتوں میں انتشار آیا
 مرے دل میں تصویرِ یار کا بے اختیار آیا
 تیرے گیسوئے مشکین اور روئے نور افشان
 نظر اہل جہاں کو منظرِ لیل و نہار آیا
 رواں ہے سوئے میخانہ جنابِ شیخ بھی شاہد
 فلک پر جھومتا تقوا شکن ابر بہار آیا

شاہد کے معاصر لکھنے والوں میں پنڈت تارا چند ریٹہ شہرِ باش کا شیمیری بھی
 تھے، جو اکثر "مارتنڈ" میں لکھا کرتے تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ شاہد سے کچھ استفسارات
 کئے تھے اور یہ استفسارات "شاہد کا شیمیری" جواب دیں گے عنوان سے "مارتنڈ" (شمارہ ۱۳
 جنوری ۱۹۳۶ء) میں شائع ہوئے تھے۔ لیکن ان کے جوابات غمخوار کا شیمیری نے دیئے۔
 شاہد کے ایک اور ہنر پنڈت شام لال ایسے تھے۔ جو انہیں کی طرح متنوع
 دلچسپیوں کے مالک تھے۔ ان کے افسانے اور مضامین بھی زیادہ تر "مارتنڈ" میں شائع
 ہوتے رہے۔ آئیم ایک معزز برہمن خاندان سے تھے اور مشن سکول میں تعلیم پائی تھی۔
 پنڈت نند مال طالب ان کے ہم جماعت تھے۔ اردو اور فارسی کے امتحانات بھی
 پاس کئے تھے اور محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے تھے۔ مادام مونٹی موری نے اپنے نظام کی تربیت
 جب سری نگر میں قائم کی تھی۔ تو اس میں تربیت حاصل کرنے کے لئے جو اساتذہ منتخب
 کئے گئے تھے۔ ان میں آئیم بھی تھے۔ اور یہ امتحان انہوں نے امتیاز کے ساتھ کامیاب
 کئے۔

لکھنے کا انہیں ابتداء سے شوق رہا۔ "مارتنڈ" کے علاوہ جوں کے بچوں کے رسالوں
 "زن" اور "پھول" میں بچوں کی دلچسپی کی کہانیاں شائع کرتے رہے۔ ان کے افسانوں
 میں "عباد اکو"، "لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا"، "غریت" اور "تمنہ دار پر لٹکائے"

۲۵۳

جانے کے بعد پھر زندہ ہو گیا۔ دلچسپ افسانے ہیں۔ انہی نے بہت سے مضامین بھی لکھے ہیں اور ان کے اکثر مضامین مذہبی موضوعات یا تہواروں پر ہیں مثلاً، نورائرا اور جگوان رام، شری رام چندر جی کے جرنوں میں، "جیون مکت سدرشن" وغیرہ، "نورہ سے خطاب" میں سر سید احمد خان کے ایک مضمون کی طرح کی تمناؤں سے سال سے وابستہ کی ہیں۔

پندرہ گنت دھڑ بھٹ دیہاتی، جو دیہاتی کاشمیری کے نام سے اس صدی کے قیسرے رہے کے بعد سے وسیع موضوعات پر بہتات کے ساتھ لکھتے رہے، بڑے زور قلم لکھنے والے ہیں۔ ان کی تخلیقات، کہانی سے لے کر مضمون، 'انشائیہ' ادب لطیف، ڈراما، اور شاعری پر مبنی ہیں۔ صحافت سے بھی ان کا تعلق رہا۔ ان کا وطن سری نگر سے کوئی تیس سال دور ایک گاؤں، مورن ہے، جہاں سے وہ ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ والد فارسی کے اچھے عالم تھے۔ ابتدائی تعلیم مورن میں پائی پھر سرنگر آگئے۔ جہاں بیٹرک کی تعلیم ختم کی اور صحافت سے متعلق ہو گئے۔ "مارٹنڈ" "کیرسری"، "پری ورتن" کے حلقہ ادارت میں کام کرتے رہے۔ ۱۹۴۰ء میں انہیں ایک سرکاری سکول کی ملازمت مل گئی۔ اسی دوران انٹر میڈیٹ، ادیب فاضل، بی اے اور بی ایڈ کے امتحانات کامیاب کئے اور ۱۹۶۶ء میں کثیر یونیورسٹی سے اُردو میں ایم اے کا امتحان بھی کامیاب کیا۔

شعر و شاعری کا شوق انہیں بچپن سے رہا۔ ابتدائی زمانے میں کچھ شعر کہتے تھے۔ جن میں ایک یہ ہے ۴

سیر و تفریح کا بہت ہی گرچہ میں مشتاق ہوں

لیکن ان افکار دنیاوی سے دل ناساز ہے

لیکن شاعری میں انہیں زیادہ دستگاہ حاصل نہ ہو سکی۔ کچھ قطعات اور نظمیں

ابھی کہہ لی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک قطعہ کہا تھا:

کھاشخ نے، آب کوثر پیا کر برہمن نے چرنامرت کا اُچھالا^۱
مگر جب بڑھا ماتھ ساتی کی جانب ہوا ہر طرف ہی اُجالا اُجالا

۱۹۴۰ء میں پنڈت نہرو کی کثیریں آمد کے موقع پر انہوں نے "خواہر لال نہرو کا سوگند" کے عنوان سے ایک نظم کہی تھی۔ جو "مارتن" کے شمارہ ۱۲۔ اپریل ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کے دو شعر ہیں۔

اے خواہر لال! اے فخر وطن! جان بہار
تیرے آنے سے کھلا ہے کاشمیر کا لالہ زار
پیکرِ حریت ہے تو اور جانِ مضطر کا قرار^۲

مادرِ بھارت کا وابستہ ہے تجھ سے افتخار
پرویس اور کچھ دوسرے لکھنے والوں کی طرح دیہاتی نے بھی "شاعری کے فیود سے آزاد"
قسم کے پارے لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح کا ایک گیت "ایک کہن و دھوا کو
دیکھ کر کے عنوان سے انہوں نے لکھا تھا کہ جس کا اقتباس ذیل میں درج ہے ۵

جب ساری دُنیا ڈوب جائے

تاریکی اور خاموشی میں

اور میں لیٹ جاؤں تمہارے نام کا سرُن کرتے ہوئے

اپنی جھولی پھیل کر

تو تم جُپکے سے آجانا

اور پھر دنیا میری خالی جھولی کو

اس سادھارن سی مرتبہ بھکشا سے

دیہاتی نے کہانیاں بہت لکھی ہیں اور اچھی لکھی ہیں۔ اُن کی کہانیوں
۱۔ نرڈزن گراں ہے

کی تعداد تین سو سے زیادہ ہے۔ اور کہانی میں انہوں نے جدتوں سے بھی کام لیا ہے یعنی کہانیاں مکاتیب کی شکل میں لکھی ہیں۔ مزاج اور طنز ان کی اکثر کہانیوں میں جھلکتا ہے۔ ”ہوتا“ اور ”میری پیاری“ میں لطیف مزاج ہے۔ ”میری پیاری“ اپنی کاکٹری کی کہانی ہے جو ایک دفعہ ان کے خاندان کو برباد کرنے پر تل گئی تھی۔ اس کا ایک اقتباس درج ہے :

”میری پیاری !

نہیں صاحب آپ کا قیاس غلط ہے، میں اپنی کسی محبوبہ کا حال بیان نہیں کرنے لگا ہوں بھلا چار بچوں کے باپ کی محبوبہ کون ہی کہتی ہے۔ عمر بھی ماشاء اللہ اڑتیس سے تجاوز کرنے لگی ہے۔ اس لئے محبوبہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میری پیاری بیوی ! انہیں، یہ بھی نہیں بی بی کے بارے میں کہا بھی کیا جاسکتا ہے۔ ماں باپ نے ایک لڑکی پہلے باندھ دی، بندھ گئے اور دوسروں کی دیکھا دیکھی باپ بھی بنا اور خانداری بھی شوکت تھانوی اور امتیاز علی تاج کے سوا آج تک کسی نے بھی اپنی بیوی کے بارے میں زبان تک نہیں کھولی۔ کھولی ہوتی تو سر کے بالوں کا صفایا ہو جاتا۔“

پنڈت کشپ بندھو کے ایسا سے انہوں نے کچھ نہایت مختصر کہانیاں لکھنے کی بھی کوشش کی۔ اس طرح کی ایک مکمل کہانی ہے۔

”میرا اکھوتا لڑکا دوڑتا ہوا آیا“

”اباجان ! ایک آنہ دو، سب خریدوں گا“

میں نے اپنی جیبوں کو ٹٹولا، سب کی سب خالی تھیں
میری گردن جھک گئی۔

یہ اس روز کی بات ہے جب میں نے اخبار میں پڑھا کہ ہندوستان کے ایک
بہادر نے اپنے راجہ کے لئے اسی لاکھ روپے سے ایک ہوائی جہاز خریدا تھا۔
محکمہ تعلیمات کی جانب سے اساتذہ کا ترجمان "اُستاد" شائع ہونے لگا۔ تو
دیہاتی اس کے لئے بھی لکھتے تھے اور کئی مضامین اور افسانے لکھ کر حکام کی توجہ
اساتذہ کی زبوں حالی کی طرف منقطع کرنے کی کوشش کی۔ اور بعض وقت اس
انداز سے لکھا کہ محکمہ تعلیم کے ارباب حل و عقد ان سے ناخوش ہو گئے۔ بعض وقت
وہ ایک فرضی نام "دکاش کاشمیری" اختیار کر کے بھی لکھتے تھے۔

دیر لشیر سے دیہاتی کے اچھے مراسم تھے۔ ویرجی نے جب "سواستکا" کا
انتظام اپنے ہاتھ میں لیا، تو دیہاتی بھی ان کا ہاتھ بٹاتے رہے اور کچھ کہانیاں اور لک
آدھ ڈرامہ اس کے لئے لکھا۔ حکومت نے دیہات سدھار کے مقصد سے جب ایک
ماہ نامہ "دیہاتی دنیا" جاری کیا، تو دیہاتی اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔

ترقی پسند تحریک کشمیر کے نوجوان لکھنے والوں میں مقبولیت حاصل کرنے لگی
تو دیہاتی بھی اس سے متاثر ہوئے۔ اور کچھ کہانیاں اور ادب لطیف کے انداز کے
پارے لکھے۔ ان کے لکھے ہوئے مضامین کی تعداد بھی کافی ہے۔ ماسٹر زندہ کول ثابت
اور پردیس پران کے مضامین نہایت دلچسپ ہیں۔ ان کی ایک کہانی "شاعر کی موت"
"مارتن" شائع ہوئی تھی، جس کے بارے میں پردیس کا یہ بیان ان تک
پہنچا یا گیا۔ یہ رہبر سنگھ ویر ایڈیٹر ملاپ سے لی گئی ہے۔ اس پر دونوں میں
شکریہ بھی ہو گئی تھی۔ آخر کار پنڈت شیم لال ولی تیرتھ کشمیری نے دونوں میں
صلح صفائی کرا دی۔

پنڈت بہاری لال شاستری، کوٹلی، ضلع میرپور کے نہایت صاحبِ ذوق
ہل قلم، شاعر، اور افسانہ نگار ہیں۔ ان کی ولادت ۱۹۰۹ء میں ہوئی تھی۔ ان

۴۵۷

والد پڑت، دیونیت بھی عام و ادب سے لگاؤ رکھتے ہیں اور اپنے زمانے کے اچھے
ابنِ قلم بھی ملنے ملتے تھے۔ ہماری اعلیٰ کی ابتدائی تعلیم انہیں کے یہاں ہوئی تھی۔
پھر اسکول کی تہذیب تم کے لاہور گئے۔ جہاں کالج کی تعلیم حاصل کی۔ کالج کی تعلیم کے
دوران انہیں اچھے اور صاحبِ ذوق اساتذہ سے تربیت حاصل کرنے اور شعر و سخن
کی محفلوں میں شریک ہونے کے مواقع نصیب ہوئے۔ اور وہ بھی شعر کہنے لگے اور اپنی
خوش فکری کے باعث بہت جلد مشہور بھی ہو گئے۔ سرزمینِ پونچھ کے سربراہ اور وہ
اساتذہ میں ان کا شمار ہونے لگا تھا۔ شعر کے علاوہ افسانہ نویسی سے انہیں خاص
شغف تھا اور عموماً اخلاق و معنیت کے موضوعات پر افسانے لکھا کرتے تھے۔ ان کے
افسانوں کا اچھا خاصہ محبوب و فراہم ہو گیا تھا۔ لیکن یہ سارا سرمایہ ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ
میں تاراج ہو گیا۔

(سنہ ۱۹۲۷ء اور سنہ ۱۹۴۷ء کے درمیان، کشمیر میں کئی اپنے افسانہ نگار منظرِ عام پر آئے
اور یہ صنف اتنی مقبول ہو گئی تھی کہ اکثر ذوق رکھنے والے، قابلِ مطالعہ افسانے انہی
سے لکھ لیتے تھے۔ ان میں پنڈت شمیم لال کبوتر، یا کابو، عارض کا شمیری اور گوپی
ناتھ مٹو کی تخلیقی صلاحیتیں اس صدی کے تیسرے دہے میں بہت خوب رہیں۔
کبوتر، رینہ واری کے باشندے ہیں، ان کے کئی افسانے "مارتنڈ" کے ادبی شماروں
میں شائع ہوتے رہے۔ جن میں "حرامِ نصیب"، "غریت" اور "اوشا" موضوع
کردار اور پیش کشی کے لحاظ سے اچھے افسانے ہیں۔ دینا ناتھ عارض، کشمیر میں
اخباروں کے اجراء کے زمانے سے لکھنے لگے تھے۔ شعر اور افسانہ دونوں میں ان کی
طبیعت رواں تھی۔ وہ پہلے پنڈت پریم ناتھ بزاز کے "ہمدرد" میں لکھا کرتے تھے۔
پھر "مارتنڈ" کے ادبی شماروں کے لئے لکھتے رہے۔ ان کا ایک افسانہ "دل کی تڑپ"
کافی عیاری ہے۔ گوپی ناتھ مٹو دیر تھی، سری نگر کے چنہ کراں محلے کے رہنے والے

تھے۔ ان کا ایک افسانہ "خونی" مقبول ہوا۔ لیکن ان کی صلاحیتیں افسانہ نگاری تک محدود نہیں تھیں، وہ اخلاقی مضامین لکھتے تھے اور بچوں کی دلچسپی کے عنوان پر بھی لکھ لیتے تھے۔ ان کا ایک اصلاحی سماجی مضمون، خطا کی شکل میں "دردہ پٹنی کا بواب بال ودھوا ہو کر" اور ایک اور مضمون "شیدا کا وکٹوریہ" کسی میں بیوہ ہو جانے والی عورتوں کے دوسرے بیاہ کے پرچار کے مقصد سے لکھے گئے تھے۔

پروفیسر محمود ہاشمی جن کا پورا نام سلطان محمود ہے۔ وہ سری پرنٹاپ کلچل سوسائٹی اور امر سنگھ کلچل میں استاد تھے۔ اور اس زمانے کے ترقی پسند ادیبوں میں وہ ایک عظیم مقام رکھتے تھے۔ امر سنگھ کلچل کے رسالے "لالہ رخ" کے ابتدائی دور میں وہ اس کے نگران کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ ان کی دلچسپی اور مشوروں سے ہر رسالے کا معیار خاصا اونچا ہو گیا تھا۔ رسالے میں خود بھی لکھتے تھے۔ چنانچہ اختر شیرانی خواجہ احمد عباس اور حسن سکری کے بارے میں ان کے کئی جائزے شائع ہوئے ہیں۔ جن سے ان کے ذوق اور تنقیدی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اختر شیرانی کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اختر شیرانی کی شاعری میں ایک خاموش احتجاج اور ایک محرم سے رد عمل کی جھلک پائی جاتی ہے۔ جو اپنے مخفیغین کو مٹانے کے لئے نہیں، بلکہ دوسروں کو اپنے وجود کا احساس دلانے کے لئے ہوتی ہو۔"

"اختر اس راہ پر نہیں چلتا، جس پر اقبال چل کر، نئی تہذیب سے لڑتا بھڑتا ہے، مذہب کا دامن پکڑ کر خودی کے راگ الاپتا جا رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ وہ یوں اس لئے نہیں کرتا کہ اسے اقبال سے کد ہے یا وہ اس کے بلند نصب العین کو اور خیالات کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ بلکہ یہ شباب کی اس خود بینی

کا اثر ہے، جس کی نگاہ میں بڑی سے بڑی طاقت بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

یہ جائزہ جو ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا تھا۔ دراصل کٹیمیر میں ترقی پسند تنقید کے آغازی دور کے انداز پر روشنی ڈالتا ہے۔ ایک اور مضمون ہاشمی نے حسن عسکری اور احمد عباس کے بارے میں بھی لکھا تھا۔ جو ۱۹۴۶ء کے ایک شمارہ میں شائع ہوا۔ اس میں ترقی پسند ادب کے مفہوم اور امکانات کو سمجھانے کی بھی کوشش کی تھی۔ ہاشمی نے امتیاز علی تاج کے ڈرامے، انارکلی، کاگوریا، انارکلی کی دہائی کے عنوان سے جواب لکھا تھا۔ ان کے ڈراموں میں "آنکھ بہت مقبول ہوا۔ اس کے علاوہ اچھے مضمون نگار اور افسانہ نگار بھی ہیں۔

ہاشمی، ملک کے بٹوارہ کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔ اس وقت وہ لندن میں مقیم ہیں اور برمنگھم سے ایک مصور ہفت روزہ "ایشیا" کے نام سے شائع کر رہے ہیں۔

دوسرے افسانہ نگاروں میں جن کے افسانے بل جاتے ہیں، پنڈت منوہر کاک، پنڈت شمشو ناتھ جی کول، پنڈت ترلوکی ناتھ ککو، پنڈت کاشی ناتھ کول، پنڈت دیدال گرو، پنڈت سوسناتھ جی، پنڈت پرشور ناتھ کول، اور پنڈت بھائی گرتی کاشمیری قابل ذکر ہیں۔ پنڈت منوہر کاک کی کہانیوں میں "قربانی" ایک دلچسپ کہانی ہے جس میں ایک میاں اور بیوی کی نوک جھونک کی تفصیل اچھے انداز میں پیش کی گئی ہے۔ کاک، اچھے انداز تحریر پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ پنڈت شمشو ناتھ جی کول، سری پرتاپ کالج میں پڑھتے تھے۔ جہاں سے انہوں نے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ وہ قزوئی محلہ، سری نگر کے متوطن ہیں۔ ان کی ایک کہانی جو "مفلسی" کے عنوان سے "مارٹن" کے شمارہ ۱۹- اپریل ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی تھی، دلچسپ کہانی ہے۔

پنڈت ترلوکی ناتھ ایک اچھا افسانہ "ولیشیا" "مارتنڈ میں شائع ہوا تھا جس میں اس طبقے کی ایک عورت کی داستان بیان کی گئی ہے۔ کاشی ناتھ کول کا وطن بارہ مولہ ہے اور ان کے افسانے بھی اس صدی کے تیسرے دہے میں شائع ہوتے رہے تھے۔ ان میں "محبت" قابل ذکر ہے جس میں "حسن و عشق کی کرشمہ سازیوں کا اچھا مرقع پیش کیا ہے۔ پنڈت ویدلال گپرو، سری نگر کے قریب کے ایک گاؤں گپرو کے رہنے والے ہیں جو سری نگر اور جوں کی شاہراہ پر اوتنی پورہ کے قریب واقع ہے۔ ان کا قیام راولپنڈی میں بھی رہا۔ ان کے افسانوں میں "حرام نصیب" شانتا" ایک بد نصیب خاتون کی کہانی ہے۔ ویدلال شعر بھی کہتے تھے اور ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے۔ ایک نظم بو دیہات کے باسیوں کو ابھارنے کے مقصد سے لکھی گئی تھی اس کے کچھ شعر ہیں:

اٹھ کھڑا ہواے دیہاتی تجھ میں گر کچھ جان ہے

ناز خالق کو بھی ہے جس پر تو وہ انسان ہے

تو جہاں کو قوت مردانہ کے جو ہر دکھا

شہر والے جس سے ہوں حیران وہ منظر دکھا

کامل ہمت سے تو، تو دست قدرت ساتھ ہے

چاہے جو بازی بھی ہو دنیا میں تیرے ساتھ ہے

پنڈت سوم ناتھ جی اچھے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ ان کا ایک افسانہ "عجب چور" پرانے انداز کا ہے۔ پرتھوی ناتھ کول، پریم ناتھ بنزاک کے اخبار "ہمدرد" کے ایڈیٹر بھی رہ چکے تھے۔ سری نگر کا مشہور محلہ رینہ واری، جو کبھی حکومت کے وزیروں اور اعلیٰ عہدہ داروں کی رہائش گاہ ہوا کرتا تھا۔ اور جہاں سے کئی ایک اچھے لکھنے والے بھی اُٹھے۔ پرتھوی ناتھ کی جائے قیام ہے۔ یہ بھی اچھے صاحب ذوق ادیب ہیں

۴۶
میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں "کینا آشرم" بے سہارا لڑکیوں کے
ایک ایسے ادارہ سے متعلق کہانی ہے۔ بھائیگرتی کاشمیری کو بھی افسانہ نگاری کا اچھا
ذوق ہے۔ "رفیقہ" ان کے اچھے افسانوں میں سے ہے۔

چند افسانے شری بت رعنا واری (رینہ واری) کے نام سے بھی اس زمانے میں
شائع ہوئے۔ جن میں سے ایک "بھولا پیار" ایک معصوم کی کہانی ہے۔ ایک دو خواتین
بھی افسانہ نگاری کا ذوق رکھتی تھیں۔ ان میں شریبتی سوہن رانی، محلہ ٹہہ یار راہ بابا
صاحب، عالی کدل میں رہتی تھیں۔ ان کی ایک اچھی کہانی ابو جہانگیر کی عدل گستری
کے ایک واقعہ کو موضوع بنا کر لکھی گئی ہے۔ اس زمانے کی کبھی ہوئی کہانیوں میں
شاید واحد تاریخی کہانی ہے۔ اس کا آغاز وہ اس طرح کرتی ہیں :

"یہ انہیں دنوں کی بات ہے جب دہلی کے شاسن پر سمرٹ جہانگیر
براجمان تھے۔ انہوں نے اپنی راجدھانی میں یہ گھوٹنا کرا دی تھی۔ کہ
سمرٹ جہانگیر برترہ دن وقت کا نصف حصہ لوگوں کے اٹھوگ (مصلحتاً)
سننے اور ان پر نیلے بکھٹ وچا کرنے میں لگائیں گے۔"

ان کی زبان پر ہندی کا اثر ہے۔ کثیر میں ہندی کی تحریک شروع ہونے کے بعد سے
پنڈت خواتین عموماً ہندی کو ترجیح دینے لگی تھیں لیکن اکثر اردو حروف میں ملی جلی
زبان لکھا کرتی تھیں۔ شریبتی سوہن رانی کا مذکورہ بالا اقتباس اس کا اچھا نمونہ
ہے۔

کئی افسانے لکھنے والے ایسے بھی تھے۔ جن کی فلمیں کاوشیں محض افسانوں
تک محدود نہیں تھیں۔ وہ مضامین، انشائیے اور ادب لطیف کے انداز کے پاست
بھی لکھا کرتے تھے۔ پردیسی اس کی لچھی مثال ہیں۔ پرتھوی ناتھ کول، جن کا
اوپر ذکر گزر چکا ہے، لچھے صفائی بھی ہیں۔ وہ ہمدرد اور پرتاپ کے حلقہ ادارت میں

شامل رہ چکے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے قریب وہ دہلی چلے گئے۔ جہاں وہ پرتاپ سے متعلق ہو گئے۔

کشمیر سے باہر

سعادت حسن منٹو، مشہور افسانہ نگار کشمیر کے منٹو خاندان سے تھے۔ جس کی ایک شاخ پنجاب میں آباد ہو گئی تھی۔ سعادت حسن لدھیانہ کے ایک گاؤں سمبالہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی تعلیم، والد غلام حسن کی عدم توجہی کی وجہ سے، خاطر خواہ نہ ہو سکی تھی، تاہم بڑی کوشش سے انٹرنس کامیاب کیا اور علی گڑھ یونیورسٹی میں انٹر میڈیٹ کی تعلیم کے لئے داخل ہوئے۔ لیکن وہی میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے تکمیل نہ کر سکے۔ سعادت حسن پہلے لاہور گئے اور پھر بمبئی میں مقیم رہے اور اخبار نویس شروع کی۔ کچھ عرصہ فلمی رسالہ "مقتدر" ہفتہ وار سے وابستہ رہے۔ پھر آل انڈیا ریڈیو دہلی میں انہیں ملازمت مل گئی۔ لیکن ڈیڑھ سال بعد اس ملازمت کو ترک کر کے بمبئی چلے گئے اور فلمی دنیا سے متعلق ہو گئے اور کہانیاں اور مکالمے لکھتے رہے۔ ان کی مشہور فلمی کہانیاں "مرزا غالب"، "آٹھ دن"، "چل چل رہے نوجوان وغیرہ" ہیں۔ کوشن چندر کے اشتراک سے "بنجارہ" اور دوسری کوٹلی کی کہانیاں بھی لکھیں۔

منٹو نے "ہمایوں" لاہور کا روسی ادب نمبر اور "عالمگیر" لاہور کا فرانسیسی ادب نمبر بھی مرتب کیا تھا۔ لاہور ہی سے "پارس" بھی نکلتے تھے اور "کاروان" کے ساتھ ہی وہ منسلک رہتے تھے۔ کچھ ڈرامے اور کئی مضامین بھی لکھے تھے لیکن ان کی شہرت کی بنیاد ان کے افسانے ہیں۔ جن میں انہوں نے نئے سماجی شعور اور حقیقت نگاری کو سمویا ہے۔

ان کا اسلوب بھی اپنا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کا آغاز مغربی افسانوں کے ترجموں سے ہوا تھا۔ اور خاص طور پر روسی افسانوں کے شہکاروں کو اردو سے روشناس کرانے میں انہوں نے پہل کی تھی۔ بعد میں افسانہ ان کا مخصوص فن بن گیا۔ انہوں نے جب افسانے لکھنے شروع کئے، فریڈ کی منسی نفیات کا اثر اردو افسانہ نگاروں پر چھایا ہوا تھا۔ منٹو بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر اس سے متاثر تھے۔ لیکن انہوں نے ان رجحانات کو اپنے مخصوص اسلوب کے ساتھ برتنے کی کوشش کی اور اپنے انفرادی انداز کی وجہ سے اردو کے سارے افسانہ نگاروں میں ایک نمایاں مقام پیدا کر لیا۔ "ہتک" "ٹوبہ ٹیک سنگھ" "موزیل" "ٹھنڈا گوشت" "ممی" "نیا قانون" وغیرہ ان کے معرکہ آکار افسانے ہیں۔

ملک کی تقسیم کے بعد منٹو لاہور چلے گئے تھے۔ فادات کے وہ شاہد عینی تھے اور جو افسانے انہوں نے اس موضوع پر لکھے ہیں، وہ بہترین افسانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ منٹو کا انتقال لاہور میں ۱۹۵۵ء میں ہوا۔

کرشن چندر جو اردو کے ایک اور عظیم افسانہ نگار ہیں، کثیر سے اس طرح وابستہ ہیں کہ ان کے والد ڈاکٹر گودی شنکر ریاست پونچھ میں میڈیکل افسر ہو کر آئے تھے اور ۱۹۱۸ء سے لے کر ۱۹۴۴ء تک یہیں رہے۔ کرشن چندر نے ابتدائی تعلیم مینڈھر اور پونچھ میں حاصل کی۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے لاہور گئے اور پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کا امتحان انگریزی ادب میں اور ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان پاس کیا۔ اور صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ پہلے دوسروں کے ساتھ اشراک میں انگریزی ماہنامے نکالنے پر۔ کچھ عرصہ آل انڈیا میں ملازمت بھی کی۔ اسی دوران ڈبلیو۔ زیڈ احمد کی ترغیب پر وہ شاہیاری پیمبرز سے وابستہ ہو گئے۔ اس وقت بھی وہ بہنی بقیہ ہیں اور فلم سے بھی وابستہ ہیں۔ لیکن ان کی کہانیوں سے ہٹ کر وہ بے شمار

کہانیاں لکھ چکے ہیں۔

کرشن چندر کشمیر سے ایک اور طرح بھی وابستہ ہیں۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز بھی کشمیر سے ہوا اور ابتدائی کہانیاں اور ناولوں نے انہیں "کشمیری کے پسر" کے طور پر پہچانے گئے ہیں۔ "میر تقی" "ہلم ٹیٹا ناویر" "نہ" "مصور کی موت" اور "ناول شکست" کشمیر ہی کی زندگی ہی سے متعلق ہیں۔ ان کی فطرت میں انسان دوستی کے جذبے نے، انہیں جب ترقی پسند تحریک سے منسلک کر دیا۔ ان کی طبیعت کے جوہر نمایاں ہونے لگے اور جو افسانے انہوں نے لکھے ہیں، وہ اردو افسانہ ادب کا لازوال سرمایہ بن گئے ہیں۔ ان کے شہکار افسانوں میں سے "کالو بھنگی" "غالیچہ" "مہاکاشی کا پل" "دور لانگ لمبی سڑک" "ان داتا" "زندگی کے موڑ پر" "برہم پتر" صرف چند نام ہیں۔ ناولوں میں "شکست" کے علاوہ "طوفان کی کلیاں" "جب کھیت جاگے" "سڑک واپس جاتی ہے" اور "دوسری برف باری کے بعد" اور کئی ناولٹ جیسے "ایک گندھانی فامیں" "گدھے کی داپسی" "لادیت" وغیرہ۔ کرشن چندر نے کچھ ڈرامے بھی لکھے ہیں جن میں "مجموعہ" "دروازہ" "نئے ڈراموں میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے لکھے ہوئے کئی رپورٹاژ بھی ادب میں اہم مقام حاصل کر چکے ہیں۔

کرشن چندر کے افسانوں کی تعداد گنتی سے باہر اور ان کے افسانوں کے مجموعوں کی تعداد بھی وسیع ہے۔ چند مجموعوں کے نام ہیں: "علم غیبی" "کالا سورج" "پرانے خدا" "میں انتظار کروں گا" "کشمیریوں کی کہانی" "انسان" "ایک عورت ہزار دیولنے" "میری یادوں کے چنار" "آسمان روشنی" "مزاحیہ افسانے" وغیرہ۔ ان میں سے کئی افسانوں کے ترجمے نہ صرف ہندوستان بلکہ کچھ زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ بنگالی، انگریزی اور دوسری کئی زبانوں میں۔

ترجمہ ہو چکے ہیں۔

راما نند ساگر اس نغمہ کے ادا کرنے والوں میں ایک مقام پیدا کیے ہیں۔ ان کا خاندان پنجاب سے کشمیر آیا تھا اور خود ان کی ولادت کشمیر ہی میں ہوئی تھی۔ سری نگر میں ان کی ابتدائی تعلیم ہوئی لیکن دق کے عارضے میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے انہیں تعلیم کے سلسلے کو منقطع کرنا پڑا۔ اور وہ کافی عرصہ تک ٹانگ ٹرنگ کے سینٹی ٹوریم میں زیر علاج رہے۔ کئی کئی سالوں کا انہوں نے یہی نقطہ بہتادہ کیا تھا اور ان کے قصہ گوئی کے دوق اور اطوار یہ قدر تھے ان کے کہ کو اپنے نسلے اور ناول لکھا۔ اپنے قیام ٹانگ ٹرنگ کے بارہ برس ایک افسانہ ٹانگ ٹرنگ کے اڈیم پر لے نوال سے لکھا تھا جو ستر کہنے اور پندرہ منظر اور زندگی کو بھی خوبی سے پیش کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کے کشمیر کی زندگی پر کئی افسانے لکھے ہیں۔ ایک افسانہ ہو بخشش کے نام سے لکھا ہے اور جس میں کشمیر کے مختلف طبقوں کی زندگی کو انہوں نے انداز پر پیش کیا ہے۔ سولہ اکرابا ناول۔ سینٹی ٹوریم سے خارج ہونے کے بعد وہ کئی چلے گئے اور فلموں کے لئے کہانیاں اور مکالمے لکھنے لگے۔ بعض فلموں کی انہوں نے ہالیوڈ کا بھی کام کیا جو میں "انسانیت" اور "پیغام" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی کامیاب فلموں میں شمار ہوتی ہے۔

ساگر کے افسانوں کا ایک مجموعہ "جوار سمھا" کے نام سے شائع ہوا ہے جو ستر منتخب افسانوں پر مشتمل ہے اور ان کا دوسرا مجموعہ "آئینے" بارہ افسانوں پر۔ ان افسانوں میں "تشنہ تکمیل"، "زود پشیمان"، "آب حیات"، "دل کے خون کرنے کی فرصت ہی سہی"، ان کی فکر اور فن کے اچھے نمونے ہیں۔ "بخشش" دوسرے مجموعے میں شامل ہے۔ ساگر کے ناول "اور انسان مر گیا" کو بڑی شہرت

حاصل ہوئی۔ تقسیم ملک کے دوران فسادات اس کا موضوع ہے، جب ہندوستان میں انسان مچکا تھا اور انسانیت مرجی تھی۔ انہیں انسانی جذبات کو اُکسانے کی خاطر یہ ناول لکھا گیا اور فسادات پر لکھے ہوئے ادب میں اس کا ایک مقام ہے۔ ناول کا دیباچہ خواجہ احمد عباس نے لکھا ہے اور یہ دیباچہ بجائے خود ایک نزاعی پارہ بن گیا ہے۔

ناول اور ڈراما

ناول اور ڈراما اس زمانے میں زیادہ نہیں لکھے گئے۔ کیونکہ لکھنے والوں کی توجہ افسانہ یا مضمون اور انشائیہ کی طرف زیادہ رہی۔ چند تصانیف جو لکھی گئیں ان میں نرسنگداس نرگس اور دو ایک اور لکھنے والوں کے کارنامے اہمیت رکھتے ہیں۔

نرسنگداس نرگس رسالہ "چاند" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ادبی دنیا سے منسوب سے متعارف ہیں لیکن وہ ریاست کے بعض اور لکھنے والوں کی پابندی میں پریم منوہر اور مولارام کوٹی کے دو اور ناموں سے بھی لکھتے ہیں۔ جموں نرگس کا وطن اور ان کی ادبی سرگرمیوں کی نشوونما کام کر رہا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ تحصیل بسوٹی کے ایک جاگیردار کوٹ میں مختار عام کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ سو سال یہ خدمت انجام دینے کے بعد وہ ترک ملازمت کر کے جموں آ گئے اور دیوان پریس قائم کیا جس سے جلد ہی رسالہ "چاند" جاری کیا۔ یہ رسالہ اپنی مقبولیت اور مسلسل اشاعت کی وجہ سے اردو صحافت میں ایک مقام پیدا کر چکا ہے۔ تقسیم ملک سے پہلے کے اکثر اہل قلم اس کیلئے لکھتے تھے۔

نرگس میں ادب کا ذوق ابتداء سے رہا۔ چنانچہ انہوں نے لکھا ہے کہ اردو

شعراء میں خاص طور پر غالب کا مطالعہ ان کے لئے وظیفہ بنتا رہا۔ اور اسی ذوق کی بدولت وہ اس وقت سے شعر کہنے لگے تھے جب وہ اکیسی ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ غالب کے علاوہ الف لیلہ، فسانہ آزاد، ہدیہ وہار، آرائش محفل کے مطالعے نے ان میں افسانہ نگاری کے ذوق کو ابھارا، چنانچہ وہ مولانا مودودی کے نام سے افسانے لکھتے رہے۔ اور ان افسانوں کی تعداد اب سینکڑوں تک پہنچ گئی ہے۔ ان میں سے منتخب افسانے ”دکھیا دیس“، ”پردیسی پریم“ اور ”سندلیہ“ کے مجموعوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

اس زمانے میں انہیں ڈوگرہ دیس کی تاریخ، تہذیب اور زندگی کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا۔ جس کا یادگار کارنامہ ”تاریخ ڈوگرہ دیس“ ہے۔ یہ ڈوگرہ دیس کی تفصیلی تاریخ ہے جو ۱۱۲۲ صفحات پر حاوی ہے اور ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی یہ کتاب نرگس کی گیارہ سال کی محنت کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب کے اختتام پر، نرگس نے اپنے کچھ حالات اور اس موضوع سے دلچسپی کی ابتداء کے بارے میں لکھا ہے کہ رام کوٹ کی ملازمت کے دوران انہیں اطراف کے علاقوں میں دورہ کرنے کے موقع ملے تھے۔ ان مقامات کے آثار اور زندگی کے مشاہدے نے انہیں اس نواح کی تاریخ لکھنے کا شوق دلایا اور وہ مواد اکٹھا کرنے لگے۔ چنانچہ ”وہاں سور سال ملازمت کے دوران قدرت نے وہ کچھ مجھے دکھایا۔

محنت رعام جاگیر کی حیثیت سے سادہ لوح عوام، فادکش اور مفلوک الحال جنتا کی مجبوریوں اور مظلومیت کے وہ گھٹاؤں منظر مشاہدے میں آئے کہ زندگی کو ریختے ”اور انسانیت کو تڑپتے دیکھ کر میرا شعور جاگ اٹھا۔“

پہلے ان کے شعور کی بیداری کے آثار، اس علاقے کے عوام کی زندگی

کے افسانوں کی صورت میں سامنے آئے۔ ترقی پسند تحریک کثیر کی طرح، جوں کے لکھنے والوں اور خاص طور پر شاعروں اور افسانہ نگاروں میں بھی اس زمانے تک مقبولیت حاصل کر چکی تھی، چنانچہ نرگس کے افسانوں میں بھی اس کا پرتو دکھیا دیں گے افسانوں میں نظر آتا ہے۔ ان افسانوں کے موضوع اور کردار اسی نواح کی دیہاتی زندگی سے چنے گئے ہیں۔ اور ان کو پیش کرنے میں حتی الامکان حقیقت شعاری سے کام لیا گیا۔ تاہم ان کے اپنے مخصوص تاثرات نے کہیں کہیں سب افسانوں کی صورت بھی اختیار کر لی ہے۔

”پارتی“ کی اشاعت ۱۹۶۲ء میں ان کے دوسرے فلمی نام پریم منوہر کے ساتھ عمل میں آئی۔ اور چاند پرلیں نے اسے شائع کیا تھا۔ یہ شہر کے ایک غریب خاندان کے نوجوان سندر لال کی زندگی کی کہانی ہے جو اپنے خاندان کی پرورش کھیلے کالج کی تعلیم کر کے کر کے ملازمت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اسے پڑنا پ گڑھے گاؤں میں پنچایت الیکٹرک کی اسانی ملتی ہے، جہاں ہری رام سے اس کی دوستی ہو جاتی ہے۔ ہری رام کے امرا پر وہ اس کے گھر میں قیام کرتا ہے کہ ہری رام کی نوجوان لڑکی پارتی سے اس کا رومان شروع ہوتا ہے، اس سلسلے میں بعض اچھے نفسیاتی مواقع بھی آ جاتے ہیں۔

نرگس جی اپنے اطراف کی دیہاتی زندگی سے بخوبی واقف ہیں اور اسے حتی الامکان صداقت شعارانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ یہ ایک المیہ اس طرح بن گیا ہے کہ سندر لال کی شادی شہر میں ایک انجینئر کی لڑکی سے ہو جاتی ہے اور پارتی جو اس کی وجہ سے بدنام ہو گئی تھی گاؤں کے ایک ادھیڑ عمر کے آدمی سے بیاہ دی جاتی ہے۔ یہ ہماری سماجی زندگی کے مسائل ہیں اور ملتے جلتے ماحول میں بار بار دہرائے گئے نہیں۔ اس سلسلے میں پریم چند کے سماجی ناولوں کو ایک خصوصیت حاصل ہے۔

سندر لال اور پارتی کی حیات معاشرہ پر بھی پریم چند کے مخصوص انداز کا اثر ہے۔ پارتی کے کردار کو بلند رکھنے کی جو کوشش مصنف نے کی ہے، اس کو دیکھ کر پریم چند کی بیوہ ذہن میں گھومنے لگتی ہے، سندر لال کی محبت میں جو مصیبتیں اس پر پڑتی ہیں وہ نہایت صبر اور مستقل مزاجی سے برداشت کر لیتی ہے۔

نرگس جی نے فرزند اقبال نرگس، اچھے شاعر ہیں اور اقبال تمنائی کے نام سے لکھتے ہیں۔ ان کے دو چھوٹے بھائی، دیوان چند دیوان اور گیان چند دیوان بھی ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ گیان چند دیوان لالہ ملک راج صراف کے اخبار "زمیر" کے منبر بھی رہے اور دیوان چند ایک ہفتہ وار "شیر ڈوگر" کے ایڈیٹر ہیں۔

جموں کے ایک اور سربراہ وردہ ادیب، پنڈت دیا کرشن گردیش، انشا پرداز اور شاعری میں ایک مقام رکھتے ہیں۔ ان کے معاصرین انہیں "ادیب العصر" کے لقب سے موسوم کرتے تھے۔ تعلیم سے متعلق بعض موضوعات پر ان کے مضامین امر میں شائع ہوتے ہیں۔ انہیں میں ایک مضمون "استاد کے فرائض" ہے جس میں گردیش نے استاد کے فرائض کی تفصیل لکھی ہے۔ ان کا ایک معلومات آفرین مضمون "ریاست جوں و کشمیر میں فن تحریر و طباعت" جو "امر" ہی میں شائع ہوا تھا ریاست میں اردو پریس کے قیام کے بارے میں بہت مفید معلومات فراہم کرتا ہے۔ اس مضمون کے کچھ اقتباسات گذشتہ صفحات میں دیئے جا چکے ہیں۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد میں ریاست کے پہلے پریس "ودیا پرکاش" کے قیام کے بارے میں وہ لکھتے ہیں :-

"شری مہاراجہ گلاب سنگھ جی ۱۸۴۶ء میں سربراہ آرے سلطنت ہوئے۔

اور آپ نے دوسرے ہی سال ریاست کیلئے ایک چھاپہ خانہ ودیا پرکاش

کا انتظام فرمایا۔ اس چھاپہ خانہ میں ڈوگری، فارسی اور ہندی میں

سرکاری احکام، ڈاک ٹکٹوں اور اشتاپوں اور قانونی کتب کی

۴۰
طباعت شروع ہوئی۔ شری حضور مہاراجہ زنبیر سنگھ جی کے برسر حکومت آنے تک اس چھاپہ خانہ نے کوئی نمایاں کام نہیں کیا۔

قانونی کتب، جہن کا ذکر گردش نے کیا ہے، زیادہ تر اردو میں لکھی گئی تھیں۔ مہاراجہ زنبیر سنگھ کے زمانے میں علوم کی اشاعت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

”آپ نے اشاعتِ علم کی طرف خاص توجہ دی اور سخت نشین کے دوسرے

ہی سال ۱۸۵۸ء میں ایک نئے چھاپہ خانہ دیا ولاس (ودیا بلاس)

پریس کا انتظام کیا۔ اسی سال ٹائپ سازی کے لئے ایک فونڈری

قائم کی گئی۔ جس میں سب سے پہلے آپ نے ڈگری کا ٹائپ کرایا۔“

اس مضمون کے مزید اقتباسات پچھلے صفحات میں بھی نقل کئے جا چکے ہیں۔ گردش

اس وقت جالندھر میں جن سنگھ کے اخبار پر دیپ کے مدیر کی حیثیت سے کام کر رہے

تھے۔

ایک اور خوش نصیب، جن کا انتقال نو عمری میں ہو گیا۔ پنڈت کاشی ناتھ

ترچیل یا ترسل، خوشتر تخلص، پنڈت تارا چند ترسل کے فرزند تھے۔ وہ علم و ادب کا

اچھا ذوق رکھتے تھے۔ سری پرتاپ کالج میں تعلیم کے زمانے سے انہوں نے افسانے لکھنے

شروع کئے تھے۔ اور ایک مجموعہ ”سچی تہی درتا“ کے نام سے مرتب اور شائع کیا تھا۔ افسانوں

میں مذہبیت کا رجحان پایا جاتا ہے۔ افسانوں کے علاوہ خوشتر نے ایک ناول ”گوری کر“

بھی لکھا تھا۔ یہ ناول پنڈت نند لال کول طالب کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا تھا۔

خوشتر کو دیدانت سے گہرا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ انہوں نے سوامی دیوانند کی تصانیف

کا مطالعہ کیا تھا۔ انہوں نے کچھ مضامین بھی لکھے ہیں اور مضامین میں بھی مذہبی رجحان

غالب ہے۔ ادبی ذوق انہیں اپنے والد سے ورثہ میں ملا تھا۔

خوشتر کو زمانہ طالب علمی ہی سے دق کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔ اور اسی مرض سے

صاحب زادہ محمد عمر، جنہوں نے نور الہی کی شرکت میں اردو سٹیج اور ڈراما کی تاریخ پر اپنی تحریر "آلار تصنیف" نامک ساگر" لکھ کر شہرت حاصل کر لی ہے۔ اس صدی کے رابع اول میں ریاست اور خاص طور پر جموں کے ادبی حلقوں کی رت رواں بہ رہے۔ اس کتاب نے ان دونوں ناموں کو ایک دوسرے سے ایسا چپان کر دیا ہے کہ بعض لوگ یہ ایک ہی نام سمجھتے ہیں۔ حالانکہ دونوں میں محض ایک مہربی رشتہ تھا۔ لیکن اس سے زیادہ گہرا، دلچسپیوں کی وحدت کا رشتہ تھا۔

محمد عمر کی ولادت ۱۸۵۵ء میں جموں میں ہوئی تھی، جموں میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ لاہور چلے گئے جہاں نور مین کرسچن کالج میں انہوں نے اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کی۔ کالج کی تعلیم کے زمانے میں اپنی ذہانت اور فطری صلاحیتوں کی بدولت وہ کالج کے پروفیسر یونگ کے منظور نظر بن گئے تھے۔ لاہور کے قیام کے زمانے میں وہ علامہ اقبالؒ کی صحبتوں سے بھی مستفید ہوئے۔ اقبالؒ سے ان کی عقیدتمندی کا ایک واقعہ یہ ہے کہ اقبالؒ نے اپنی نظم "ناتیم" اسی زمانے میں لکھی تھی اور یہ نظم جب انجمن حمایت الاسلام جلسہ میں پڑھی گئی۔ تو صاحب زادہ محمد عمر نے اسے نقل کر لیا، اور ایک رسالہ میں شائع کر دیا۔ لیکن نظم سن کر اس دوران لکھی گئی تھی، اس لئے اس میں غلطیاں رہ گئی تھیں۔ بعد میں اقبالؒ نے خود یہ نظم "مخزن" میں شائع کی۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد جب محمد عمر جموں لوٹے تو انہیں محکمہ عدالت میں ملازمت مل گئی اور بسترٹ کی حیثیت سے وہ ریاست کے مختلف مقامات میں متعین رہے۔ ان کی ادبی دلچسپیوں کی وجہ سے، اخبار زمین کے مدیر لالہ ملک راج مراد سے ان کے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ ایک موقع پر جب محمد عمر سانبہ میں متعین تھے۔ کسی کی غلط مغبری کی وجہ سے، دونوں میں کچھ شکر رنجی پیدا ہو گئی تھی اور بتایا جاتا ہے۔

کہ نوبت عدالتی مقدمہ تک پہنچ گئی تھی، لیکن بعض بزرگوں کے بچے بچاؤ سے معاملہ رفع دفع ہو گیا اور غلط فیصلہ ہوا اور سرگندہ محمد عمرؒ کے لئے لکھتے تھے اور یہ سب ان کے خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی باقی رہا۔

محمد عمر کو ابتداء سے ڈراما اور اسٹیج کے فن سے دلچسپی تھی۔ ان کا نسب سے پہلا نمایاں کام حکیم احمد شجاع کے لڑائے باپ کا گناہ پر تنقید تھی جس پر ڈرامہ کے واقعات کی کئی غلطیاں پائی گئی تھیں۔ اس نمبر پر حکومت وہ ادبی ذہن سے ایک سنجیدہ نقاد کی حیثیت سے مناسف ہوئے۔ اس تنقید کی کامیابی انہیں آغا حشر کاشمیری، احسن، امیر علی، محترمہ اور رحمت علی کے ڈراموں کا تنقید کا بیڑہ لینے پر اہل کیا اور تنقید پر بھی اسی کی نظر سے بھی گئیں۔

ڈراما کے تنقید کے مطالعے بالآخر انہیں ڈراما اور اس کے فن اور اردو اسٹیج کی تاریخ پر ایک اسیلوب انتخاب ترتیب کرنے کا خیال بھڑایا جس کا نتیجہ "ناٹک ساگر" کی تصنیف تھی۔ اس کام میں انہوں نے نواز الہی سے بھی مدد لی اور کتاب دونوں کے نام سے شائع ہوئی۔ پینڈت محبوب من دنا تریہ کیفی اس زمانے میں ریاست کے اسٹنڈنڈ نڈران بکریٹھی تھے اور محمد عمر کے ان سے مراسم تھے۔ کتاب کیلئے کیفی نے ایک بیسٹ منڈر لکھا تھا، جو کتاب کے ساتھ شائع ہوا۔

"ناٹک ساگر" اردو میں ڈراما اور اسٹیج کی پہلی تصنیف تھی اور سب سے توجہ اور محنت سے وہ لکھی گئی تھی، جس کی وجہ سے ادبی اور علمی حلقوں میں اس کی بڑی قدر ہوئی۔ پنجاب یونیورسٹی کی جانب سے اس کتاب پر آٹھ سو روپیہ کا انعام عطا ہوا۔ اور انجمن ترقی اردو، حیدر آباد نے اس کتاب کی تصنیف پر عصف کو ایک ہزار روپیہ کا انعام دیا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کے دربار سے مستنصین کو پانچ پانچ سو روپیہ انعام ملا تھا۔

۴۷۳
اس کتاب کی تصنیف سے پہلے بھی صاحب زادہ محمد عمر کی ڈراما سے دلچسپی
ممتعارف تھی، چنانچہ ہمارا جہ پر تپاں سنگھ نے ڈرامہ سے دلچسپی کو فروغ دینے
کیلئے ایک کتاب رایل ایسچور ڈرامیٹک کلب کے نام سے قائم کیا تھا، جس کا
اہتمام انہوں نے محمد عمر کے ذمہ کیا تھا۔ "نایک ساگر" کے علاوہ محمد عمر اور نور آہی
نے متعدد طور پر اور الگ الگ بھی کئی ڈرامے لکھے تھے۔ جن میں اکثر ایک منظری اور
ایک دو طویل ڈرامے ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے۔

تین ٹوپیاں : مزاحیہ ڈراموں کا مجموعہ ہے جو فرانسیسی سے ماخوذ ہیں۔
بگڑے دل : ایک فرانسیسی کومیڈی کا ترجمہ ہے۔
فطرت کی موت : جس کا موضوع انسان کی موت سے کشمکش ہے، موت کے
فرشتے کا بہن کی گود سے اس کے مصوم بھائی کو چھین لے جانے
کا منظر بہت دردناک ہے۔

سکندر -

قزاق -

موجودہ لندن کے اسرار۔ جس میں لندن جیسے مہذب شہر کے اندر اجرام اور
خفیہ قتل کی وارداتوں کی منظم کوششوں کا حال ملتا ہے۔
روح ریاست۔ ابراہم لنکن کی زندگی سے متعلق ایک ڈرامہ ہے جس
کے واقعات ۱۸۶۱ء سے متعلق ہیں۔ ڈرامہ کا تعارف دیا جا
چہ میں اس طرح کرایا گیا ہے۔

یہ ڈراما، امریکہ کے زندہ جاوید پرنیڈنٹ ابراہم لنکن کی زندگی کے چند
جستہ واقعات پر مبنی ہے اور کتھا کے سلسلے کا التزام نہ ایسے ڈراموں
میں ہوا کرتا ہے اور نہ ہے۔

اس کا پہلا ایڈیشن ۱۳۳۹ میں چھپا تھا۔ اور حکیم فیروز الدین احمد قیروز
نظرانی نے اس کے لئے قطعہ تاریخ کہا تھا جس کا آخری شعر ہے :

لکھ دو، لکھ دو روئے طرب سے روج سیاست، جانِ سیاست

اس کا دوسرا ایڈیشن مُصنّفین کی نظرانی کے بعد ۱۹۳۲ میں اردو بک شال، لاہور
سے شائع ہوا۔ اس کے آغاز میں ایک منظوم "تقریب" ہے۔ ڈراما طویل ہے اور سات
مناظر پر مشتمل۔

پہلی پیشی : مختصر ڈراما جو پہلے "ہمایون" لاہور (مارچ ۱۹۲۹ء) میں شائع ہوا تھا۔
ڈرامے چند : حسب ذیل سات ڈراموں کا مجموعہ ہے :

ادامتی : جنون ادب، چپ کی داد، لاگ ڈانس، ہمہ خاندانِ آفتاب، ہمالی،
ہمالی : ہوشہنشاہ اکبر کی زندگی کے ایک رخ سے متعلق ان کا مشہور
ڈرامہ ہے۔

پہلی پیشی : جو "ہمایون" میں شائع ہو چکا تھا، اس پر ابھی شائع ہے۔
ان ڈراموں میں دو تین کے موضوع اور کردار مغربی ڈراموں سے ماخوذ ہیں۔ "ادامتی"
میں قدیم سنسکرت کی طرح ایک "اناونسر" ڈرامے کے واقعات کا تعارف ان الفاظ
میں کرتا ہے :

"سنو۔ دس کا گھنٹہ بچ رہا ہے اور اہل، مقدمہ کے دل دھڑک

رہے ہیں۔ تماشائیوں کا قصر عدالت میں تانا بندھا ہے اور وہ ہم جج
کی کشمکش کے نزے لے رہے ہیں۔ کیونکہ آج انجینینا بنام اڈون
کا مقدمہ سماعت ہوگا۔"

یہ دراصل "فارس" کے انداز کا ڈرامہ ہے۔ مدرف کے اعلان کے بعد عدالت کا منظر
پیش ہوتا ہے اور سرزشتہ درجہ دار جوتی سے اپیل کرتا ہے کہ وہ مدعیہ کے حسن، ملائیک

فریب سے متاثر نہ ہوں۔ سررشتہ دار کا انداز خطیبانہ ہے اور مدحیہ کا بیان شاعرانہ۔ مزاج میں گہرائی نہیں۔ مثلاً مدعا علیہ کی زبانی انجیلینے اس کے عشق کی داستان سن کر، جیوری کا قایم کہتا ہے،

”جوانی میں مجھے بھی ایسا ہی اتفاق ہوا، اور میرا طریق عمل بد معاشوں ایسا ہو گیا۔ مگر وہ دن گزر گئے اب تو میں شرانت کی جان اور عزت کا ایمان ہوں۔“
”مہابلی“ اس مجموعے کا سب سے اچھا ڈرامہ ہے، جس میں اکبر کی رواداری اور راجپوت سرداروں کی دلیری کا بڑا عمدہ موقع پیش کیا گیا ہے۔

محمد عمر نے ”تاریخ جہوں“ بھی تصنیف کی تھی۔

محمد عمر اور ان کے ساتھ نور الہی نے زبان اور اسلوب میں جو نئی روش اختیار کی تھی، وہ اردو کے اسالیب میں ایک پسندیدہ رجحان کی رہبری کرتی ہے۔ ہندی کے آسان اور مزاج کے موافق لفظوں کو اپنی تحریروں میں جگہ دے کر انہوں نے ایک نئے اسلوب کی بنیاد رکھنے کی کوشش کی تھی۔ ان ڈراموں کے علاوہ ہندی، سنسکرت یا پراکرت کے بعض مشہور ڈراموں کو بھی اردو میں منتقل کرنے کی ان مصنفین نے بڑی مستحسن کوشش شروع کی تھی۔ چنانچہ پراکرت کے دو مشہور ڈراموں ”مدرا رکشس“ اور ”مرچ کیشکا“ کو بھی انہوں نے اردو میں منتقل کیا تھا۔

محمد عمر کا ایک اور اہم کارنامہ ”ناٹک کتھا“ بھی قابل ذکر ہے جس میں قدیم ہندوستانی ڈراموں کو پیش کیا ہے۔ آخری زمانے میں محمد عمر نے ریڈیو سے نشر کے لئے بھی کئی ڈرامے لکھے تھے جن میں ”ہمد خاندان آفتاب“ اور ”آبیل مجھے مار“ اچھے ڈرامے ہیں شعری کارناموں پر تنقید میں مصنفز شکوہ آبادی کی مثنوی ”حجاب زنان“ پر تنقید اہمیت رکھتی ہے۔

صاحب زادہ محمد عمر کا انتقال ۱۹۴۶ء میں ہوا۔ انتقال کے موقع پر امر سنگھ
 کلچ کے رسالے "لال رخ" میں ایک نوٹ شایع ہوا تھا۔ جس میں ان کے دو فرزند
 صاحب زادہ محمود احمد اور صاحب زادہ حسن شاہ کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا گیا تھا۔
 نور الہی، محمد عمر کے خسر کے چھوٹے بھائی تھے۔ وہ ریاست کے محکمہ مال میں
 ملازم تھے اور ترقی کرتے کرتے وزیر وزارت کے عہدہ تک ترقی کر لی تھی۔ انہیں بھی ادب
 کا اچھا ذوق تھا اور اکثر کاموں میں وہ محمد عمر کے ساتھ شریک رہے لیکن جس طرح
 محمد عمر نے کچھ ڈرامے تنہا بھی لکھے تھے۔ نور الہی نے بھی ڈراما کا ایک مجموعہ "مدہم بخیم"
 کے نام سے شایع کیا تھا۔ اس میں اکثر موضوع مزاحیہ ہیں۔

مضمون نگار

افسانہ نگاری کے علاوہ مضمون لکھنے کا ذوق بھی اس زمانے کے لکھنے والوں میں عام تھا، اور سماجی زندگی کے مسائل، مذہبی موضوعات، علمی اور ادبی تاثرات کے اظہار کے لئے یہ بکار آمد صنف سہولت بخش ثابت ہوتی تھی۔ اس لئے وسعت کے ساتھ استعمال ہوتی تھی۔ اور جہاں افسانہ نگاروں کا تذکرہ گذر چکا ہے ان میں سے کئی مضمون بھی لکھتے تھے۔ اور خصوصی طور پر مضمون لکھنے والوں میں سے چند شعرو سخن سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ انہیں میں سے ایک سوم ناتھ ترپیل بھی ہیں جو معروف تخلص کرتے تھے۔ ابتدائی دور کے ماہ نامہ "بہار" کے علاوہ "مارتنڈ" میں بھی ان کے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ان کا ایک اچھا مضمون "کیوں؟" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ جس میں اپنی کچھ ذاتی وارداتوں کو بیان کیا ہے۔ اس کی ابتداء وہ اس طرح کرتے ہیں:

نور کے تڑکے، پھولوں کے چین میں ٹہکتا ہوں، گلِ نوشگفتہ
کی بوگد گداتی ہے۔ زنگیں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتی ہے
دل بے اختیار ان کی طرف کھینچ جاتا ہے، مجھ میں تردد نازگی آجاتی
ہے اور میں اس تردد نازگی کے احساس سے پروردہ سا بن جاتا ہوں
کیوں؟

پریم ناتھ درانت ناگ کے رہنے والے ٹاڈن ایریا میں ملازم تھے۔
وہ بھی اچھے مضمون نگار تھے۔

ادھار ناتھ کول ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں عرائض نویس ہیں لیکن شہزاد
کا اچھا مذاق رکھتے ہیں۔

ان کے ان شریعت تھے۔ پنڈت ہریشور ناتھ کو خوش حال کا شیری "مارتھ" میں
 دیکھتے تھے۔ سری نگر کا محلہ کدال، ان کی جائے رہائش ہے۔ ان کے والد نند لال
 پتو، مہاراجہ ہری سنگھ کے آرکیٹیکٹ تھے۔ وہ بھی ادب دوست اور صاحبِ حال
 انسان تھے۔ خوشدل مضمون لکھتے اور شعر بھی کہتے ہیں۔ نظمیں وہ بعض وقت
 بدلتوں سے بھی کام لیتے تھے۔ مثلاً انہوں نے ایک زبانی میں ایک نظم لکھی ہے
 جس کا عنوان لکھا ہے :-

”مردانِ خندا، بیچِ فرفری نہہند“

پنڈت شبھوناتھ بکھو، پنڈت لمبودری پد کے صاحب زادے، ادب اور شاعری
 کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ بی۔ اے کامیاب کرنے کے بعد حنفیہ ہائی سکول انٹنگ
 میں مدرس ہو گئے تھے۔ بعد میں محکمہ جنگی میں ملازمت کی اور سپرنٹنڈنٹ کے عہدے
 سے سبکدوش ہوئے۔ سماجی اصلاح سے بھی ان کو دلچسپی رہی۔ ان کے مضامین
 "مارتھ" میں شائع ہوتے رہے تھے۔ ان کا ایک اچھا مضمون "پیغام نوروز" کے
 عنوان سے شائع ہوا تھا۔ جس میں نوروز کی اہمیت اور اس کے تقاضوں پر روشنی
 دی ہے۔

جراغ حسن حسرت جن کی شاعر، مزاح نگار اور صحیفہ نگار کی ممنوع
 ملاجیتوں سے اس صدی کے ربع ثانی کے آغاز سے خراج تحسین حاصل کرنا شروع
 تھا۔ جموں کے ضلع پونچھ کے قریب ایک گاؤں بمیار میں پیدا ہوئے تھے۔ ان
 کی ولادت کا سنہ ۱۹۰۴ء ہے۔ حسرت کے والد شیخ بدرالدین اور ناناجناب
 جن کی نگرانی میں حسرت کی تربیت ہوئی۔ دونوں عربی اور فارسی کے عالم تھے۔
 بزرگ کا امتحان پونچھ میں کامیاب کرنے کے بعد حسرت لاہور گئے اور پنجاب
 یونیورسٹی سے ۱۹۲۴ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے

بعد استاد کی حیثیت سے مختلف سکولوں میں کام کرتے رہے لیکن ان کی گونا گوں ضرورتوں نے اس کام میں آسودگی نہیں محسوس کی اور وہ عقلی کا پیشہ ترک کر کے، کلکتہ گئے اور صحافت سے منسلک ہو گئے۔ ابتدا میں مختلف جرائد جیسے "عصر جدید"، "نئی دنیا"، "جمہور"، "استقلال" وغیرہ کے حلقہ ادارت میں شامل رہے۔ اس کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار "پیام" کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ مولانا آزاد کا ان کو اپنے اخبار کے لئے منتخب کرنا، حسرت کی قلمی اور ذہنی صلاحیتوں کا اعتراف ہے لیکن یہ سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا۔ اردو کے ایک اور سربراہ کردہ ادیب، شاعر اور مصنف نگار، مولانا ظفر علی خان ۱۹۲۸ء میں جب کلکتہ گئے تو حسرت کی قابلیت سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہیں اپنے ساتھ لاہور لے گئے۔ اور "زمیندار" کے حلقہ ادارت میں شامل کر لیا۔ لیکن حسرت کو مبدی فاض سے جو بے چین طبیعت عطا ہوئی تھی، اسے اس کام میں بھی سکون نصیب نہیں ہوا۔ مختلف اوقات میں "انصاف"، "احسان"، "اصرار"، "شہباز"، "شیراز"، "غزن" کئی اخباروں کے ساتھ وابستہ رہے۔ ۱۹۲۹ء میں دوسری جنگ عظیم کے آغاز پر "فوجی اخبار" کی ادارت ان کے تفویض ہوئی۔ اس سلسلے میں وہ برما اور ملایا بھی رہے۔ پھر اخبار "امروز" کے مدیر کی خدمت بھی کچھ عرصہ تک اس اخبار کی ادارت کے خرابیض انجام دینے کے بعد ۱۹۵۱ء میں اس خدمت کو ترک کر کے حسرت کراچی گئے اور ریڈیو پاکستان نے ان کو ملازم رکھ لیا۔ اس کام سے بھی ان کی طبیعت کچھ عرصہ کے بعد اُٹا گئی اور وہ لاہور جا کر رسلور سیرٹل کمپنی میں ملازم ہو گئے۔ اس اثناء میں انہیں قلب کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ چار سال فریض رہے، تاہم اس حالت میں بھی ان کی علمی اور ادبی دلچسپیاں جاری تھیں۔ آخر ۱۹۵۵ء میں حسرت کا انتقال ہو گیا۔

حسرت شہر دشمن کا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے، لیکن شاعری سے زیادہ ان کی طبیعت کے جوہر طنز و مزاح اور خاص طور پر سیرٹل میں خوب چلے۔ اس شعبہ ادب میں

تربیں ایک انفرادی رنگ رکھتی ہیں۔ "پنجاب کا جغرافیہ" ان کا بہت مقبول مضمون ہے۔ جو پطرس کے بعض اسی نوع کے مضامین کے ساتھ اردو ادب میں زندہ رہے گا۔ وہ عموماً "سند باد جہازی" کے قلمی نام سے لکھتے تھے۔ ان کی پیر وڑی کے کچھ نمونے اردو میں اس صنف کے قابل قدر پائے مانے گئے ہیں۔ مثلاً اختر شیرانی کی مشہور نظم "بہی داوی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی" کی پیر وڑی کی تھی۔ اختر کے حسن گفتار کی بھلک تو اس میں نہ آسکی لیکن نظم کا آہنگ پیدا کرنے اور موقف کو مفکوخیز بنانے میں وہ کامیاب رہے۔ اس کا پہلا بند ہے :-

یہی کوچہ ہے وہ ہمدم، جہاں رمضان رہتا تھا

وہ اس کوچہ کا بلبردار، آزاد رہتا تھا
بہت سرور رہتا تھا، بہت دلشاد رہتا تھا
یہ شان قیسِ عامر، صورتِ فرار رہتا تھا
جو اس کو یاد رکھتا تھا، وہ اس کو یاد رہتا تھا

اور اس دالان میں اس کا چچا رحمان رہتا تھا

یہی کوچہ ہے وہ ہمدم، جہاں رمضان رہتا تھا

حسرت کی شعری دلچسپیاں بھی وسیع تھیں۔ انہوں نے غزل بھی نظمیں لکھیں، قومی اور وطنی موضوعات پر طبع آزمائی کی۔ سیاسی مسائل بھی ان کے موضوع رہے اور کچھ نظمیں انہوں نے بچوں اور عورتوں کے لئے بھی لکھی تھیں۔ غزل سے حسرت کی طبیعت کو خاص لگاؤ تھا اور اگر ان کی صحافتی دلچسپیاں ان کے وقت پر حادی نہ ہو گئی ہوتیں تو اس میں شبہ نہیں کہ وہ غزل میں ایک مقام حاصل کر لیتے جو سربایہ غزل کا انہوں نے چھوٹا ہے، وہ حسن و عشق کی وارداتوں کی پیش کش کے مخصوص اسلوب انفسِ انسانی کی باریکیوں کو نمایاں کرنے، اندازِ شعر کی چمکنی اور

حسن گفتار کی بدولت ایک انتہا رکھتا ہے۔ ایک غزل کے کچھ شعر ذیل میں دیئے گئے جاتے ہیں۔

حسن کی برسی معاذ اللہ گہروں کے بھرنے کے انداز
میں ہوں اور میری بے پڑہالی دل ہے اور دل کی صورت پر داز
زُلفِ برہم ٹھکلی ہوئی نظریں گردنِ نازیں گہرے نیاز
تسہ بالا دامنِ کوٹاہ منزلِ عشق سے نشیبِ فراز
قطع ہونے لگا ہے پر شمعِ دلیت اسے غم نارا، تری عمر دراز

غلام احمد میر، مولوی فاضل، علی موضوعات پر مضمون لکھتے ہیں۔ ان کا ایک خیال آرا مضمون "کشمیری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کا مسئلہ" کے عنوان پر شائع ہوا تھا جس میں کشمیری زبان کے مسائل اور خاص طور پر اس کے رسم خط کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"وطن اور وطن کی ہر چیز پیاری ہوتی ہے اور ہونی چاہیئے، لیکن پیارِ محبت کو نادان دوست کی طرح استعمال کرنا، کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔ کشمیری ہماری ملکی زبان ہے، اس کے ساتھ ہمیں محبت ہے..... لیکن یہ کہ اس محبت میں اس درجہ غلو سے کام لیا جائے کہ باقی تمام ملکی مفاد کو بکسر نظر انداز کیا جائے، دیانت داری سے بعید ہے۔

غالب کشمیری زبان ایک محدود احاطے میں پھولی جاتی ہے۔ ریاست کے شمالی حصہ میں مشنا وغیرہ مختلف زبانیں رایج ہیں۔ جن کا کشمیری زبان سے دھماکا بھی واسطہ نہیں۔ جنوب اور مغرب کی طرف پنجابی کے اثر ہوئے ڈھانچے یا ڈگر کی زبانیں مستعمل ہیں، جن کا کشمیری زبان کے ساتھ

۴۸۲
 کوئی لگاؤ نہیں..... کیا گریز وغیرہ کے علاقوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ کشمیری
 زبان پڑھیں جو ان کے لئے انگریزی کا درجہ رکھتی ہے اور روزمرہ
 کی زندگی میں بے کار ہے؟
 رسم خط کے بارے میں کہتے ہیں:-

”کشمیری زبان کا کوئی رسم الخط نہیں۔ فارسی رسم الخط، اس زبان
 کی خوبصورتی کو قائم نہیں رکھ سکتا۔ ہاں انگریزی اور ہندی رسم الخط
 میں یہ صلاحیت ہے کہ اپنی پوری خوبصورتی کو قائم رکھ سکے۔“

پنڈت ترائن جو رینہ عنقا، سری نگر کے مردم خیز محلے رینہ داری سے
 اٹھتے تھے۔ روزی کے لئے وہ محکمہ برقی میں کام کرتے تھے اور دلچسپی کے لئے مضمون اور
 انشائیے لکھتے تھے۔ ان دونوں میں انہیں بڑی دستگاہ حاصل تھی۔ ان کا ایک
 تنیلی الشایہ ”شکستہ دل اور بیل“ ”مارتنڈ“ میں شائع ہوا تھا جس میں ایک
 غمزہ ان کا بیل کے چھپے ٹسن کر جو صدمہ ہوتا ہے، اس کو بیان کیا ہے۔ وہ
 بیل کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

”مجھ مایوس محبت اور شکستہ دل کے چھپڑنے سے بچھڑ گیا ملے گا۔
 کچھ نہیں، حسرت و افسوس کے سوا کچھ نہیں.....“

شیخ محمد عبداللہ کشمیر کے ہر ولعزیز قاید جو "شیر کشمیر" کے مقبول لقب سے ملقب ہیں، کشمیر کی آزادی کی جدوجہد میں، نصف اول کے مجاہد رہے۔ ان کے عقیدوں میں کشمیر کے دیگر حکمرانوں کے مطلق العنانی اور سرزمین کے لوگوں کی زبوں حالی اور خاص طور پر نیچے طبقے کے انسانوں کی کمپرسی نے انہیں ملازمت ترک کر کے میدان سیاست میں آنے پر مجبور کیا۔ جیسا کہ ایک سیاسی قاید کا کام ہے وہ اپنی تقریروں کے ذریعے اپنے خیالات عوام تک پہنچاتے رہے۔ لیکن زبان کے ساتھ ساتھ وہ قلم سے بھی کام لیتے رہے۔

شیخ صاحب کے خاندان کے بعض افراد ریاست کے اہم ذمہ دار عہدوں پر بھی مامور رہے، چنانچہ ملک سیف الدین سلطان سکندر کے وزیر اعظم تھے۔ شیخ صاحب اس معاملے میں بھی اسلاف کے صمیم جانشین ہیں۔ ان کی ولادت سری نگر سے چھ سات میل دور صورہ میں ہوئی۔ جو کبھی ایک گاؤں سمجھا جاتا تھا، لیکن اب سری نگر کا ایک محلہ ہے۔ اگلے شاہی دور کی دینی خدمات اور امارت کے بعد اس خاندان نے ایک آزاد پیشہ شالابی اختیار کیا تھا۔ جو کشمیر میں معزز پیشہ ہے۔ شیخ صاحب کے والد شیخ محمد ابراہیم اپنے عہد کے ثقہ لوگوں میں سے تھے۔ شیخ صاحب کی ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم سری نگر میں ہوئی لیکن ہم ایس سی کی تعلیم مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں پائی۔ علی گڑھ کے قیام نے ان کے ذہنی آفتاب میں بہت وسعت پیدا کی۔ کشمیر لوٹنے کے بعد ایک سکول میں مدرس مقرر ہوئے۔ لیکن اقبال کے الفاظ میں عشق انسانیت نے انہیں ذوقِ تپش سے آشا کر دیا تھا۔ وہ بزم کو مثل شمع بزم حاصل سوز و ساز دینے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ نوجوانوں کے لئے ایک مطالعہ گھر قائم کیا، جسے حالات نے جلد ہی اپنے عہد کے انقلابی نوجوانوں کی سیاسی جدوجہد کا مرکز بنادیا۔ دیگر حکمران اور ان کے عہدہ دار جو مسلمانوں کے کسی طرح کے بھی

۴۸۴

اجتماع سے نایف رہت تھے۔ اس مطلقے کو انہوں پر کڑی نگرانی رکھنے لگے۔ آخر شیخ صاحب نے محسوس کیا کہ وہ عشق ساتھ ساتھ نبھ نہیں سکتے۔ عشق کمال و معشیت اور عشق قوم انہوں نے اول الذکر خدا کے بھروسہ پر چھوڑا۔ اور صحرائے سیاست میں قدم رکھ دیا۔ پہلے مسٹر کانفرنس کے ذریعے اور بعد میں نیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم سے ملک میں ذمہ داران حکومت کی صدا بلند کی۔ جس ریاست کے حکمرانوں کے پاس اخبار کے اجراء کا خیال اور اجتماع، بغاوت کے تصور کے مترادف تھا۔ یہ مائتہ سیاسی تحریک کا ہوا بغاوت تھی۔ جس کی پاداش میں ان کو اور ان کے بعض ساتھیوں کو قید و بند کی سزائیں بھیجی گئیں۔ یہ کشمکش ۱۹۴۰ء میں ملک کی آزادی تک جاری رہی۔ آزادی کی اسی جدوجہد نے انہیں پنڈت جواہر لال نہرو سے متعارف کیا اور انہیں ان سے متاثر کیا اور انہیں ان کا دوست بنا دیا۔

کشمیر چھوڑ دو تحریک کی کامیابی کے بعد جب ذمہ دار حکومت قائم ہوئی۔ تو شیخ صاحب کو حکومت کی ذمہ داری سنبھالنی پڑی۔ پہلے وہ ایڈمنسٹریٹر رہے۔ پھر وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز ہوئے لیکن جلد ہی حکومت ہند سے تصوراتی اختلاف نے انہیں شیکسپئر کے کردار فالساف کے الفاظ میں دار کے صعد سے دار کی سیڑھی کے ہبوط تک پہنچا دیا۔ اور تاریخ کو ڈھرانے کے لئے، وہ قید کے شکنجے میں کس گئے۔ کبھی سلاخوں کے پیچھے اور کبھی سلاخوں سے آگے کے ڈرانے کے بعد اب وہ انقلاب پسند سے تعمیر پسند بن گئے ہیں اور ملک کے وسیع اذقاف اور اس کے ساتھ ملک کے نوجوانوں کی اخلاقی، مذہبی اور تعلیمی باز تعمیر میں مصروف ہیں۔

شیخ صاحب بڑے فصیح مقرر ہیں اور لاکھوں عوام کے دل ان کی سٹھی میں ہیں لیکن اپنی سائنسی تربیت کے ساتھ ساتھ وہ ادبی ذوق بھی رکھتے ہیں۔ وہ شعر کہتے تھے۔ چنانچہ ان کا ایک مشہور شعر ہے :-

۴۸۵
اب تو سنا کے رہیں گے جو کہیں گے اے شیخ
گولیاں کھانے کو حاضر ہے یہ سینہ اپنا

شیخ صاحب وقتاً فوقتاً اخباروں میں سیاسی مسائل پر لکھتے رہے ہیں۔ ان کا
ایک پیغام "محاذ" ہفت روزہ سری نگر کے پہلے شمارہ میں شائع ہوا ہے جس میں انہوں
نے کشمیر میں آزادی کی جدوجہد کی تاریخ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے :-
"آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس نے اپنے سیاسی پروگرام "نیا کشمیر"
میں مختلف علاقوں میں بسنے والی تہذیبی قومیتوں کو حق خود ارادیت
عطا کیا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ یہی ایک ذریعہ ہے جس سے فرقہ وارانہ سوال
کے بنیادی اختلاف کو مٹایا جاسکتا ہے اور موجودہ درپیش اہم مسئلے کا
فیصلہ کرنے کے لئے یہی موزون وقت ہے۔"

"نیا کشمیر" نیشنل کانفرنس کا اہم نظام نامہ اور سیاسی دستاویز ہے جو شیخ صاحب
کے دیباچے کے ساتھ آج سے کوئی ربع صدی قبل شائع ہوئی تھی۔ دیباچہ کے آغاز
میں ایک سیاسی مفکر کے خیالات نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"آج سے کچھ دن قبل میں اس مشہور اہل قلم کے مندرجہ صدر الفاظ
پڑھ رہا تھا جو دنیا کے حریت پرست جمہور کی جدوجہد میں بہت
بڑا کارنامہ سرانجام دے رہا ہے۔ ان الفاظ کو پڑھتے ہی خیال گزرا کہ
ہم ممبران آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس بھی یہی لڑائی لڑ رہے ہیں۔
یہ جہاد ہمارے لئے نیا نہیں۔ ماضی کی تاریخ اس جہاد کے اپنے
کارناموں کا مرقع ہے اور مستقبل کی نسبت اس کا اپنا مستقل نظریہ
ہے۔ لیکن جہاد کے بنیادی عناصر ہر جگہ ایک ہیں۔ غریبوں کا یہ جہاد

ان لوگوں کے برخلاف ہے جو ان کی کمائی کا استحصال کرتے ہیں۔“

شیخ صاحب کے ادبی انکا کا ایک مضمون اہمیت رکھتا ہے جو ”ہما“ (دہلی) کے غالب کی سو سال برسی کے شمارہ میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں غالب کی قومی اور بین قومی اہمیت کو واضح کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

”اس فخر روزگار شاعر کی ہر نوا میں رازِ زندگی و نعمتِ حیاتِ مُفمر

تہ۔ شوخیِ تحریر سے لبِ تصویر بھی گویا نظر آتا ہے۔ کلام میں

تصوف کی چاشنی بھی بھر ہے اور وہ اس حُسنِ اُزلی کو دیکھنے کے

متمنی نظر آتے ہیں جو کہ سوزِ زندگی بن کر ہر شے میں پنہاں ہے۔“

کثیر کے مشہور عالم، شاعر اور مضمون نگار، پنڈت اندکول بامزنی

پنڈتوں کے ایک معتبر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انگریزی میں ان کی دو تین

تصانیف کی طرف، جسے انگریزی میں اشارہ کیا گیا ہے۔ انگریزی کے علاوہ اردو

میں بھی کبھی کبھی مضمون لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کا ایک اچھا مضمون ”سباک سالِ نو“

کے عنوان سے مارننگ کے شمارہ ۹ اپریل ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا۔ ان کے فرزند

پنڈت پرغوی ناتھ کول بامزنی بھی انگریزی کے مصنف ہیں۔ چنانچہ ان کی تاریخ

کثیر ہمارے عہد کی اہم تصانیف میں سے ہے۔

کوی راج جانی ناتھ دوسنکرت کے عالم ہیں اور سری نگر میں آغا حامد کے

قریب رہتے ہیں۔ ان کا تعلق کشمیر میں آریہ سماج تحریک سے گہرا ہے۔ وہ بھی اردو میں

مضامین لکھا کرتے ہیں۔ ان کا ایک مضمون ”بھاشا“ کے عنوان پر شائع ہوا تھا جس

میں زبان کے مسائل پر بحث کی ہے۔ محمد عمر رضوانی بھی مضمون لکھا کرتے تھے۔ ان

کا ایک اہم مضمون ”ادبی چوریاں کرنے والوں کا گروہ“ بغیر حوالے کے دوسروں کی تحریروں

پر قبضہ کرنے والوں کے خلاف سخت تنقید ہے۔

کوئی راج ڈاکٹر سری ناتھ بکوشا ستری سنسکرت کے عالم ہیں۔ مٹن، ان کا وطن ہے۔ سنسکرت اور طب کے علاوہ انہیں تاریخ سے بھی گہری دلچسپی ہے۔ اخبار "ہندو" (سری گڑا میں) انہوں نے ۱۹۲۲ء میں تاریخ علم و ادب کے مختلف موضوعات پر مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ ان کا ایک اہم مضمون "سنسکرت ادب اور کشمیری مسلمانوں" کے عنوان سے اسی اخبار کے ۱۸ جنوری ۱۹۲۳ء کے شماروں میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں کشمیری مسلمانوں کے فرقہ پرست یا بھٹ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اس بات کی وضاحت کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ کشمیر کے ہندوؤں کو عام طور پر بھٹ کہا جاتا ہے جس طرح بہت سے کشمیری پنڈت بھٹ فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو "بھٹ" کہلاتے ہوں۔ بھٹ اس کو کہتے ہیں جو چاروں دیدوں کا جاننے والا ہو اور بھٹ دینی کہلاتا تھا جو چاروں دیدوں کا پنڈت ہوتا تھا۔ جب کشمیر میں مسلمان آئے تو انہوں نے کشمیری برہمنوں کو بھٹ ہی کہنا شروع کر دیا اور جو مسلمان بھٹ ہیں، وہ بھی انہیں کی اولاد ہیں۔"

جگن ناتھ دلی ادب اہل محالمت دونوں سے لگاؤ رکھتے تھے۔ لکھنے کا

شوق انہیں زمانہ طالب علمی سے تھا، اور کالم کے رسائل اور اخبارات میں مضامین شائع کرتے تھے۔ اسی زمانے میں کئی سنجیدہ علمی موضوعات پر ان کے مضامین شائع ہوئے تھے، جن میں سے ایک مضمون "ہماری ادبی دنیا" کے عنوان پر لکھا تھا۔ یہ مضمون "مارتنڈ" کے شمارہ ۲۹، فروری ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا تھا۔ مضمون میں دلی نے اس زمانے میں کشمیر میں اخباروں کی کثرت کا تذکرہ کرتے ہوئے، ان کے بنیادی فرایض کی تکمیل کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اخبار کے مدیر، کہ ایک ایسا شخص ہے کہ وہ اپنے کونجواؤں، میں

ذوقِ پیہ اکر نہ کہ گوشتِ ش کی ہلے اور ادبی ماحول پیدا کر کے، انہیں لکھنے پر ابھارا جائے۔ اپنے زمانے کے لکھنے والوں کو ایک اچھا مشورہ یہ دیا ہے کہ انہیں فرسودہ آثارِ تحریر کو ترک کر کے اپنے لکھنے والوں کا اتباع کرنا چاہیے۔ کشمیریوں اور ادبی رسالوں کی تباہی کی ہند بھی انہیں ہر آن محسوس کیا ہے۔

وہی اچھے نقیب، یہ فرسودہ بھی مانگا جینے، انہوں نے یہ باب "کے عنوان سے لکھے ہوئے ایک مضمون میں یہ باب "اگر گامی کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا ہے جس میں اردو شاعری اور زبان سے متعلق بیجا کتاب کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

"وہ فرسودہ، بے نشان، بے کلمہ، بے اثر اور بے اثر ہے۔ آپ کو ٹھوکر کھا تھا، یہ باب "ان ہندوؤں کے لیے آپ کو آزاد کر لیا ہے، ہر چیز کی طرف اہمیت دیتی ہو رہی ہے اور غائب اور رہا ہوا ہے۔ وہ کسی طرح متوجہ ہو کر نہیں۔ انہوں نے "نکلتے شاعری کو بہت اچھا کیا، ہٹا لے اور فرسودہ معنایں "نکلتے گل و لہلہ، ارفاقہ و کامل، گنجی ہوئی وغیرہ کو "نکلتے گل و لہلہ" میں نظمیں لکھنی شروع کیں اور ایسے مضامین بھی لکھے ہیں "نکلتے گل و لہلہ، ارفاقہ و کامل اور آمد کی رو

آئی گل، ہیکل، لڑتے ترک گشت۔"

پنڈت، امر ناتھ کاکا مشہور کاکا خاندان سے تھے۔ اس خاندان میں علم و ادب کی روایت رہی ہے۔ امر ناتھ کاکا کے چھوٹے بھائی ماسٹر بہا د پندت راجندر کاکا ریاست کے وزیر اعظم بھی رہے۔ امر ناتھ کاکا گیل تھے لیکن علم و ادب کا ذوق ان کی تربیت کا نتیجہ تھا۔ قومی خدمت سے بھی انہیں دلچسپی تھی اور پنڈتوں کی سماجی اصلاح کے لئے بہت کام کرتے رہے تھے۔ دو گراہم کی پر جاسما کے وہ نایب صدر بھی رہے تھے۔ سماجی اصلاح اور تہواروں پر وہ مضامین لکھتے تھے۔

نوروز پر جو کثیری پنڈتوں کا اہم تہوار ہے اور 'نورہ' کہلاتا ہے۔ انہوں نے ایک اچھا مضمون لکھا تھا اس مضمون میں انہوں نے 'نورہ' کی اہمیت اور خود اس لفظ کے اشتقاق پر بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "کثیری پنڈت چیت شدی ایک ہی نئے سال کی ابتداء تصور کرتے ہیں اور اس دن کا نام 'نورہ' ہے سنکرت میں نئے سال کو 'نودیش' کہتے ہیں۔ 'نودیش' کثیری میں پرکرت (پشچاد) کے قواعد کے مطابق حرف 'ش' حرف 'ھ' میں تبدیل ہو جاتا ہے جیسے شکھ کو ہاک رشت کو ہست کہتے ہیں۔ اسبطرے 'نودیش' بدل کر 'نورہ' ہو گیا۔ اسی زمانے کے ایک اور ذی علم پنڈت جیالال پنڈتا تھے جن کے خاندان میں علم و ادب کی روداد رہی تھیں۔ ان کے بھائی رام چند پنڈتا فارسی کے عالم تھے۔ فلسفہ اور مذہب سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ وہ ایک کالج میں پروفیسر بھی تھے اور قواعد پر کتاب بھی لکھی تھی۔ جیالال پنڈتا کو انشا پردازی کا ذوق تھا اور مضامین لکھتے تھے۔

ایک اور مضمون 'نکار چندر کاشمیری' تھے، جن کے کئی مضامین اس صدی کے تیسرے دہے میں شائع ہوئے۔ ان کا ایک قابل مطالعہ مضمون 'سورما' کی شاعری پر تھا۔ 'نذیر احمد خان پونچھی' جو سری پرنٹاپ کالج میں زیر تعلیم رہے، زمانہ طالب علمی میں کارل کے 'رمانا' کتاب میں مضمون لکھتے تھے۔

پنڈت گواشہ لال کول 'انگریزی اخباروں سے متوسل رہے۔ 'کثیر ٹائمز' کے وہ ایڈیٹر رہے، اس کے علاوہ وہ 'کثیر کرانیکل' بھی لکھتے تھے۔ ان کی تصنیف 'کثیر تھرو' 'ایجو' کا تذکرہ انگریزی کے حصے میں گذر چکا ہے۔ اُردو میں وہ عموماً پنڈتوں کے قومی تہواروں کے موقع پر مضامین لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے کئی مضامین اخباروں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ۱۹۳۳ء کے مارتنڈ کے ایک شمارہ میں ان کا ایک مضمون 'نیا سال نئی جدوجہد' ۱۹۳۶ء کے ایک شمارہ میں 'شیو اور شکتی' اور ۱۹۳۸ء (۲۸ فروری) میں 'شیو راتری' میں شائع ہوئے ہیں۔

بخشی غلام محمد جو کثیری کی جدوجہد آزادی میں شیخ محمد عبداللہ، مرزا محمد افضل بیگ، خواجہ غلام محمد صادق وغیرہ کے مددش بدوش حصہ لیتے رہے تھے۔ شیخ صاحب کی دولت علی بیگ و ذریعہ ۵۲ء میں غوث زبیر اعظم ہو گئے اور ۱۹۳۱ء کے ستمبر ۵۲ء

۴۹۰
 پرفائزر ہے۔ کامراج پلان کے تحت وہ بھی اپنی خدمت سے مستعفی ہو گئے اور
 اب پارلیمنٹ کے رکن کی حیثیت سے ملک کی سیاست میں سرگرم حصہ لے رہے
 ہیں اور نیشنل کانفرنس کو جس کا وجود کثیر میں کانگریس کے قیام کے بعد ختم ہو رہا
 تھا، اسے زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

بحیثیت ایک عملی سیاست دان کے عوام کے ساتھ ان کے ربط کا ذریعہ
 تقریر ہے۔ چنانچہ وہ اچھے اور فصیح بیان مقرر ہیں اور ان کی تقریریں بعض وقت
 نفیس مزاحیہ اشاروں سے بھی متصف ہوتی ہیں۔ وہ اپنی تقریروں کو موثر بنانے کے "گر"
 سے بھی واقف ہیں اور ان کی تقریریں عام طور پر اخباروں میں چھپتی رہتی ہیں۔

وزیر اعظم کی حیثیت سے بخشی صاحب کا رشتہ ثقافتی اور ادبی امور کے ساتھ
 بھی گہرا رہا۔ اہل صحافت کی خواہش اور درخواست پر انہیں مضمون بھی لکھنے پڑتے تھے۔
 چنانچہ ان کے اس طرح کے مضامین اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ ایک
 مضمون جو انہوں نے یوم آزادی کے موقع پر لکھا تھا، "تیز تر گام زن" کے عنوان سے
 شائع ہوا ہے۔ اس کا اقتباس ذیل میں درج ہے :-

"آزادی کا ایک ایک برس گزرنے کے ساتھ ساتھ، ہماری نئی قوم
 اقتصادی اور سماجی ترقی کے مختلف شعبوں میں اپنے قدم تیزی سے اٹک
 بڑھا رہی ہے اور آج بھی مقصود ہندی کے ذریعے خود کمتنی معیشت
 کی منزل پالینے کے لئے ٹھوس اور جاندار کوشش کی جا رہی ہے۔"

غلام احمد مختار، معتمد تعلیم میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ناظم
 تعلیمات رہنے کے بعد وہ کچھ عرصہ تک مشیر تعلیم بھی رہے اور آخر میں جنوں و کثیر یونیورسٹی
 کے پرنسپل چائلر ہو گئے تھے۔ ان کا انتقال سری نگر سے جنوں جلتے ہوئے ہوائی
 حادثہ میں ہو گیا۔ مختار صاحب کے بارے میں مشہور ہفتہ وار "آئینہ" نے ایک
 لے۔ بخش صاحب کا انتقال ۱۹۷۲ء میں ہوا۔

نوٹ شائع کیا تھا جس میں ان کی صلاحیتوں اور کام کے بارے میں لکھا تھا :-
 "مختار صاحب بے پناہ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ وہ دن رات کام
 کر سکتے ہیں، دورِ دعوپ کر سکتے ہیں، ہنگامہ بپا کر سکتے ہیں۔ لیکن ان
 کے چہرہ پر کبھی تنہکوں کے آثار نمودار نہ ہوں گے۔ . . . انہیں بچہ فطرت
 بہت مرغوب ہے۔"

مختار صاحب کبھی کبھی تعلیمی مسائل پر لکھتے تھے۔ ان کا ایک خیال "مضمون، تعلیم کا نیا نظریہ
 کے عنوان سے" امر (جموں) میں شائع ہوا تھا، اس مضمون میں تعلیم کے نئے تصور کے
 بارے میں وہ لکھتے ہیں :-

"ہمارے ملک کا اہم ترین مسئلہ عوام کو تعلیم یافتہ بنانے کا ہے۔ نہ کہ
 چند ایک چمیدہ طبقات کو غریب اور جاہل لوگوں کی تعلیمی ضروریات
 پورا کرنا، نئی تعلیم میں ہمارا فرضِ اولین ہے۔"

اسیروکاشیری اچھی اُشا پر دانائے صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ ادبِ لطیف
 کے انداز کے مضامین میں ان کا مضمون "دل کی باتیں" قابلِ مطالعہ ہے۔

اس زمانے کی کچھ خواتین بھی اچھی مضمون نگار ہوئی ہیں۔ ان میں شریتمتی
 مستہرا دیوی، شریتمتی ارنی کول، مسز دیری کول، شریتمتی رادھارانی اور کماری بے کشوری
 دیوی در قابلِ ذکر ہیں۔ مستہرا دیوی دیری ناگ کی رہنے والی ہیں۔ اور مذہبی مسائل
 پر لکھتی تھیں۔ ان کے زمانے میں بیج بہارہ کے پنڈتوں میں کچھ اختلافات ہو گئے
 تھے۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں جو "بیج بہارہ کے ہندوؤں سے" کے عنوان سے
 مارتنڈ میں شائع ہوا تھا، سربراہِ درہ پنڈتوں سے اپیل کی ہے کہ — "ان کو سنبھالو۔"

کہ آپس میں صلح کرادیں تاکہ سب پریم بھاؤ سے رہیں۔
 شریتمتی ارنی کول نے بھی کچھ مضامین لکھے ہیں۔ ایک مضمون میں انہوں نے

عہدِ قدیم کے کچھ واقعات کو افسانے کی شکل میں لکھا تھا۔ جن میں ایک مضمون 'راجہ پتھری سوکیتا' کے بارے میں لکھا تھا۔ راجہ پتھری سوکیتا "پانچالی دیش کے راجہ کیربادی کی لڑکی تھی جو لہک پوشی کے پرچار کے اثر سے 'تیسویں بن گئی تھی' تاہم اس نے اپنے شوہر کی پوری خدمت گزاری کی اور اس کے کاموں میں مدد دیتی رہی تھی۔

سنز دیری کوئل کا ایک دلچسپ مضمون "بڑے بڑوں کے دھم" بھرتی "مارتن" کے ۱۹۳۸ء کے ایک شمارہ میں شائع ہوا تھا، جس میں اس نے کچھ مثالیہ کی مثالیں دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بڑے آدمیوں میں کسی نہ کسی طرح کا غلبہ یا سادگی ہوتی ہے۔ لکھتی ہیں:-

"آدمیوں کے اندر کسی نہ کسی طرح کا جنون پایا جاتا ہے۔ عام انسان کے اندر جن طرح کسی سے نفرت اور کسی سے محبت پائی جاتی ہے، بڑے بڑے اشخاص کے اندر بھی ایسی عادات پائی جاتی ہیں جو کہ جنوں کی حد تک پہنچتی ہیں۔"

آگے کچھ مثالوں سے اس کی وضاحت کی ہے۔

شریتی رادھارانی نے مذہبی موضوعات پر کچھ مضامین لکھے ہیں۔ ان کا ایک دلچسپ مضمون طلاق کے خلاف شائع ہوا تھا۔ جس میں طلاق سے پیدا ہونے والی برائیوں کو ایک کہانی کے انداز سے پیش کیا ہے۔ مضمون کا عنوان ہے "طلاق توبہ"۔ ایک نوجوان لڑکی اپنی بھانج سے کہتی ہے:-

"بھابی، آپ کی بات میری سمجھ میں آگئی جہاں پہلے میرا یہ خیال تھا کہ عورت محض کچھ بھوگنے کے لئے بنائی گئی ہے۔ اس کی بلا دکھ بھوگے، وہ کیوں بے عزتی ہے۔ بیاہ کنٹرکٹ ہوا ہی جاتا ہے، پھر کیا، ہاں اب میں اچھی طرح سے سمجھ گئی کہ سونا تینہ سے کیسی نکھرتا ہے۔ جب ہم

۴۶۳
 میں لیاقت ہی نہیں تو عزت کی کیسی اُمید؟ زندگی کا مقصد تو عیش
 کونہ ہے۔ بُرد باری ہم سے کوسوں دور ہے، نیک صفات نفی کے برابر ہوں
 تو پھر عزت کیسی۔ جب بیاہ کنٹرکٹ ٹھہرا تو بیاہ کی ضرورت ہی
 کیا رہی۔ یہ دودھ تو بازاری عورتوں میں بھی ہوتا ہے۔ جب تک دل
 چاہا اس مرد سے ملتی رہی، جب کسی دھڑے دل اُگتا تو ہنت تیری کی۔
 اچھی ترکیب ہے۔ یہ عیاشی ہے یا تہذیب؟ قطع تعلق کے
 بارے میں مجھے ایک سوال اور کرنا ہے۔

کھاری سچے کشوری دیوی در "مارٹنڈ" کے "خاری بگت" کے کالموں
 میں لکھتی تھیں۔ ان مضامین میں عورتوں اور لڑکیوں کی دلچسپی کے مسائل سے گفتگو
 کی جاتی تھی۔ ایک مضمون میں جب کا عنوان ہے۔ "کیا پڑھ لکھ کر لڑکیاں کھاری رہیں
 گی۔" میں قدیم زمانے میں لڑکیوں کی قدر و منزلت اور موجودہ زمانے میں ان کی شادی
 بیاہ کی راہ میں حائل دفتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ سچے کشوری کی زبان سنسکرت سے لدی
 ہوئی ہوتی ہے۔

ایک اچھی صاحب ذوق خاتون اسی زمانے میں ادب لطیف کے اندازے کے
 پاسے لکھتی تھیں۔ یہ "مارٹنڈ" اور دوسرے اخباروں میں "شس صاحبہ" کے نام
 سے شائع ہوئے ہیں۔ "ادبیات" کے عنوان کے تحت ان کے جو دلچسپ پارے
 شائع ہوتے رہے ان میں سے ایک کا عنوان ہے "میں چاہتی ہوں"۔ اس کا
 اقتباس ذیل میں درج ہے:-

میں چاہتی ہوں، اے مرے محبوب
 زندگی کی وہ خوشگوار گھڑیاں، حیات کے وہ شیریں لمحات، جب تیری یاد
 — تیرا خیال مجھ پر ایسی محویت طاری کرے، مجھیوں بے خود و

۴۹۴

مدہوش بنادے کر دنیا کی تمام رعنائیاں، میرے لئے محض بیکار
 ہو جائیں اور اس چہاں کی سب دلکش زیبائشوں سے بیگانہ ہو جائیں۔
 ایک اور قافلہ کاری زندگی کو بٹ یا رملہ، سری نگر کی رہنے والی، ہندی آئینہ اردو میں
 مضامین لکھتی تھیں۔ وہ ہندی پرچار کا کام کرتی تھیں اس لئے فطرتاً ان کی زبان پر
 سسکت کا گہرا اثر ہے۔ ان کا ایک مضمون جو "منش سماج سے سبھیستا سیکھتا ہے" کے
 عنوان سے شائع ہوا تھا۔ جس میں سماجی یک جہتی پر زور دیا گیا ہے اور اسی یک جہتی کو
 تہذیب شائستگی کی افزائش کا وسیلہ بنایا ہے۔ لکھتی ہیں:-
 "سماج کے بغیر، ایکٹا کے بغیر الگ الگ منش نہ تو دھرم انتی کر
 سکتے ہیں نہ دھمکی ہو سکتے ہیں اور نہ وہ گورو اور شانتی کی پراپتی
 کر سکتے ہیں۔ اس لئے منشوں کو سماج کی ترقی ضرور کرنی چاہیئے۔"

تصنیف و تالیف

تصنیف و تالیف کے اعتبار سے یہ دور کافی زرخیز رہا۔ مختلف اور متنوع موضوعات، جیسے تاریخ، علمی موضوعات، درسِ تدریس، سیاسی سائل اور کچھ افادی علوم پر اس دور کی کئی کتابیں شائع ہوئیں۔

پنڈت جلال کول ناظر، جن کا ابھی ابھی انتقال ہو گیا۔ وسیع دلچسپیاں رکھنے والے عالم تھے۔ جغرافیہ، تاریخ اور کچھ تہذیبی موضوعات پر بھی انہوں نے کچھ لکھا ہے اور ان کی کئی کتابیں شائع بھی ہو چکی ہیں وہ شعر بھی کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ تحقیق سے بھی انہیں گہرا لگاؤ رہا ہے۔

ناظر کی ولادت ۱۸۹۵ء میں سری نگر میں ہوئی۔ ان کا خاندان کشمیر کے ذی رتبہ خاندانوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس خاندان میں کئی عالم، فارسی اور سنسکرت میں دستگاہ رکھنے والے صوفی اور سنت بھی ہوئے ہیں۔ خود ناظر کے والد پنڈت ریش کول فارسی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ گھر پر ابتدائی تعلیم کے بعد، وہ سری پرنسپ کالج میں شریک ہوئے اور اپنی ذہانت، علمی اور ادبی اور خاص طور پر شعر گوئی کے ذوق کی وجہ سے، وہ کالج کے ممتاز طلباء میں شمار ہونے لگے تھے۔ کالج میں پنڈت سند لال کول طالب ان کے ہم عصر تھے۔

ناظر کو کالج کے اساتذہ میں ادبی ذوق رکھنے والے کئی ہمدرد اساتذہ میسر آئے۔ ان اساتذہ کی توجہ، دلچسپی اور ہمت افزائی کی بدولت ان کی ادبی اور علمی صلاحیتوں کو نشوونما پانے اور بروئے کار آنے کے بھی مواقع حاصل ہوئے۔ ان اساتذہ میں سب سے پہلے کالج کے پرنسپ، پنڈت اقبال کشن شرٹھن یا شرکا ناظر کی ادبی صلاحیتوں سے بہت متاثر تھے۔ اساتذہ میں مولوی عزیز الدین کشمیری اور قاضی محمد اسحاق

نے ان کی تربیت میں خاص دلچسپی لی۔ قاضی اسحاق، گجرات، پنجاب کے رہنے والے تھے۔ اور کالج کے اساتذہ میں اپنے ادبی ذوق کی وجہ سے نمایاں مقام رکھتے تھے۔ فلم فنانس کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کا بھی وہ پاکیزہ مذاق رکھتے تھے۔ مولوی عزیز الدین فارسی کے عالم تھے۔ اقبال کشن شرما بڑے اچھے سخن فہم اور سخن سنج بھی تھے۔ چنانچہ بہار گلشنِ کبریا میں ان کا تذکرہ شامل ہے۔ منشی امیر الدین بھی کچھ عرصہ کالج کے اساتذہ میں شامل رہے۔ وہ اپنے تلامذہ میں شعر و ادب کے ذوق کو ابھارنے میں مشہور تھے۔

کالج میں بزمِ ادب قائم ہو چکی تھی جس کی سرگرمیوں میں ناظر بھی نمایاں حصہ لیتے تھے۔ اور کالج کے رسالے "پرتاپ" میں وہ لکھتے تھے۔ بزمِ ادب کے اہتمام سے شعر و سخن کی محفلیں بھی منعقد ہوتی تھیں۔ ان محفلوں یا مشاعروں کے لئے طرحی مہر پر غزلیں بھی جاتی تھیں۔ ایک مشاعرہ میں، جس کی طرح — "خورشید نکلتا ہے سدا پر وہ شب" مقرر تھی۔ ناظر نے جو غزل بھی کہی تھی۔ اس کا مطلع اور گمراہ کا شعر یہاں منقول ہے :

میں منتظر جلوہ جانانہ ہوں کب سے

چھٹا نہیں، اندھیر ہے اس رنج و تعب سے

چہرے کو ترے دیکھ کے زلفوں نے کہا یوں

خورشید نکلتا ہے سدا پر وہ شب سے

بزم کا ایک اور مشاعرہ بھی قابلِ ذکر ہے جس کی طرح تھی :

"یہ ہیں نقشِ قدم ان کے نہیں ہیں پتلیاں میری"

ناظر نے گمراہ لگائی تھی۔

وہ ملائے آنکھ کے رستے سے ہیں دل میں میرے تشریف

یہ ہیں نقشِ قدم ان کے نہیں ہیں پتلیاں میری

کالج کے اہتمام سے جشنِ بہار و سیعِ پیمانے پر منایا جاتا تھا اور اس تعریف کے

۴۶۴
کے سلسلے میں مشاعرہ کا انعقاد، جشن کی دلچسپیوں میں ایک شائستہ اضافہ ہوتا تھا۔ ایک
مشاعرے کے لئے پرنسپل نے کالج کے صاحبِ ذوق طلباء سے نظم لکھنے کی فرمائش کی تھی۔
ناظر اور طالب دونوں نے اس موقع پر نظمیں کہی تھیں۔ ناظر کی نظم کے کچھ شعر ہیں:-

یاد آتی ہے مجھے وہ شرفِ شاہن وطن
نحزینِ علم و ادب تھا یہ ہمارا سکُن
طفلِ مکتب بھی یہاں کا تھا فلاطون کی نظر
بے بدل تھے خوبیوں میں لوگ اور فخرِ زمن
وہ زمانہ اب کہاں ہے، آگئی بادِ خزاں
بلبل و قمری کے بدلے اب نہیں یاں زلغ و زمن

اس زمانے میں کئی نظموں میں انہوں نے اپنی مادرِ علمی کو خزانِ عقیدت پیش
کیا تھا۔ دو شعر ہیں:

نورِ پرتاپ سے پُر نور ہوئے ہیں گلزار
میں تعلیم سے پھر جام و سبوتیں سرشار

ہر برس یہ سیرگلی اور جستمِ احباب ہو
رشکِ گلزارِ ارم بہ کالجِ پرتاپ ہو

ناظر نے ۱۹۱۹ء میں بی۔ اے کا امتحان کامیاب کیا اور اس کے بعد وہ مرہٹن
گئے۔ جہاں ساتھی و ہمراز کو "مدرسہ مقرر ہو گئے۔ جہاں وہ اس سکول
کے ہیڈ۔ ماسٹر بن گئے۔ لاہور سے پیدسا کا امتحان پاس کر کے وہ شیرپور آئے
اور نیکمہ تعلیم میں ملازمت کر لی۔ اسی زمانے میں میڈم شیوہن کشپور قیس۔ انہوں نے
اپنے مخصوص نظامِ ترویج کے لئے جب کداس جہاں تھے ان کو اپنے ساتھ

۱۸۲۱-۲۲ء میں وہ گلگت میں تحصیلدار لینڈ ریکارڈس تھے۔ اپنے گلگت کے قیام کے زمانے میں انہوں نے رشتہ زبان سے واقفیت حاصل کی اور اس زبان کے بارے میں 'شنا' کے نام سے ایک کتاب لکھی جو شائع ہو چکی ہے۔ کتاب کی وجہ تصنیف کے سلسلے میں انہوں نے لکھا ہے:

”مجھے اگرچہ ایک سال سے کم عرصہ یہاں آنے ہوئے گذرے، اس کی کو محسوس کر کے میں نے چند تعلیم یافتہ اشخاص کی رہنمائی میں اس زبان میں بہ طریق صرف و نحو ترتیب کا امکان موجود پکار یہ حقیر تحفہ مرتب کیا۔“

پنڈت ہری کول نے محدثہ انعامہ کے موضوع پر کچھ رسالے لکھے ہیں۔ ادبی تنقید کا بھی ان کو اچھا ملکہ تھا اور کچھ تنقیدیں بھی ان کی یادگار ہیں۔ اقبال کول سرینگر سے دہلی چلے گئے ہیں۔ انہیں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھنے کا ذوق ہے اور مضامین اور رسالے لکھے ہیں۔

پنڈت سالگرام کول سالک کا تذکرہ گذر چکا ہے۔ ان کے فرزند پنڈت شبون ناتھ کول وکیل ناظر کو بھی علم و ادب سے دلچسپی تھی۔ ادبی ذوق کے ساتھ معائنات کا شوق بھی انہیں ورثہ میں ملا تھا۔ سری نگر میں تعلیم ختم کرنے کے بعد سالک نے انہیں پریں کا کام سیکھنے کے لئے دہلی بھیج دیا تھا۔ ناظر نے قانون کا امتحان پاس کیا تھا۔ اس لئے سری نگر لوٹنے کے بعد ان کا تقرر عدالت کے ناظر کی حیثیت سے ہو گیا تھا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد انہوں نے حکام سے کسی بات پر ناامنی ہو کر نوکری ترک کر دی اور وکالت کرنے لگے تھے۔ ایک ہفتہ دلا وکیل کے نام سے جاری کیا تھا۔ ناظر کا انتقال جوانی میں ہوائی جہاز کے حادثے میں ہو گیا۔ ناظر نے کچھ مذاہن رسالے لکھے تھے۔ ان میں سے ایک سماجی مذہبی رسالہ بیوگان کی فریاد پر ناظر کی اپیل ہے۔

جس میں کس بیواؤں کی دوبارہ شادی پر زور دیا ہے۔ اس زمانے کے پنڈت سلط کا یہ اہم مسئلہ تھا۔ ان کے تاپا پنڈت ہر گر پال شستہ نے اس سلسلے میں جو کوششیں کی تھیں، ان کا ذکر گذر چکا ہے۔ کمن دیوہ کی حالت زار کو موثر انداز سے پیش کرنے کے لئے، غافرنے کچھ اشار بھی لکھے ہیں۔ مثلاً

روتی ہے بدھوا جو کھو بیٹھی ہے شہر اپنا

کہ وہ ہے کوئی پسر اور وہ بھادر اپنا

روتی ہے کوئی کر لے باپ کردل میں اب کیا

مے دیا دارغ۔ تہی مجھے تو نے کیسا

یہ منظر پیش کر کے وہ ان لوگوں کو جمع ہوڑتے ہیں، جو بیواؤں کے دوسرے بیاہ کے مخالف ہیں۔ لکھتے ہیں:

پُرانی لکیر کے فقیر و اور نئی روشنی کے امرو، ترا دیکھو تو سہی، آپ

کی قومی بیوگاں کی کیا حالت ہے، وہ کس رنج و غم میں مبتلا ہیں اور

کس طرح زندگی بسر کر رہی ہیں۔

صحت عامہ پر بھی انہوں نے دو رسالے "تندرستی کے سہی اصول" اور "دلو صحت" کے نام سے لکھے تھے۔ ان کا ایک اہم رسالہ کشمیر میں پنڈتوں کے مشہور تیرتھ گھیر جوائی کے بارے میں ہے۔ اس رسالے میں وہ انہوں نے "کشمیر میں جگت امبا شری راگیا بھگوتی جی کے استھاپنا کا ادھر" کے عنوان سے لکھا ہے، مذہبی موضوع کی رعایت سے زبان میں سنسکرت کے لفظ بھی استعمال کئے ہیں۔ کشمیر میں تیرتھوں کی اہمیت کو جتاتے ہوئے پنڈتوں کی ان سے غفلت پر افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"جن رکھیدیوں مینوں نے اس پوتر بھومی پر اپنی عبادت اور روحانی

طاقت سے ہر دیوی دیوتا کی تھاپنا پر گھٹ کی ہے اور اپنی آنے والی

۵۰۱
نولاد کے لئے مرکب ہونے کا سہانہ پیدا کر رکھا ہے۔ آج ان کی پہلا
نہ صرف ان تیرتھوں سے آہستہ آہستہ متنفر ہو رہی ہے بلکہ دھرم کرم
سے گر کر اپنے بزرگوں کے ندیں اہل کو کھو بیٹھی ہے۔

ناظر کا ایک اور رسالہ "دینا کا دھرم کو" ۱۹۷۵ء میں چھپا تھا۔ جس میں
مازی جرمنی اور ہٹلر کی بے راہ روی پر مذمت کی ہے۔ کثیر کی ایک مختصر تاریخ بھی انہوں
نے لکھی تھی۔ جس میں تاریخ سے زیادہ قابل دید مقامات کی تفصیل لکھی ہے۔ ناظر کا اہم
ادبی کارنامہ ایک مختصر داستان ہے جس میں انہوں نے شہزادی ندر جمال بمک رسائی
حاصل کرنے کے لئے ایک شہزادہ کی مہمات لکھی ہیں۔

پنڈت دینا ناتھ در ریاست کے محکمہ تعلیم میں ملازم تھے۔ اس تعلق سے انہوں نے
تعلیمی موضوعات پر لکھا ہے۔ ان کی پیدائش کا سال ۱۸۹۹ء ہے، سری نگر ان کی جائے
پیدائش ہے۔ سری پرتاپ کالج میں وہ پروفیسر جیالال کول کے ہم جماعت تھے اور وہ توں
نے ساتھ مل کر کچھ تصانیف بھی لکھی ہیں۔ ان کا خاندان مشہور در خاندان کی وہ شاخ ہے
جو "صاحب در" کے نام سے موسوم ہے۔ "در خاندان نے کئی سیاستدان، عہدہ دار، عالم
اور سنت صوفی پیدا کئے۔ مشہور عارف اور قادی کی شاعر، دیبا بھوانی کے شاعر
چیلے شری بالا پنڈت در، جس کے نام شری روپا بھوانی نے فارسی میں خطوط لکھے ہیں۔
ان کے مورث اعلیٰ ہوتے ہیں۔

سری پرتاپ کالج سے بی۔ اے۔ آنرز کامیاب کرنے کے بعد پنڈت دینا ناتھ
در سکول میں مدرس مقرر ہو گئے اور ریاست کے مختلف علاقوں میں متعین رہے۔
لدان میں تعیناتی کے زمانہ میں انہوں نے دہان کے تعلیمی نظام کی بہت کچھ اصلاح کی
اور لدان بدمصطفی ایسولس ایشن کے قیام میں پنڈت شری دھرم کول کو بڑا کامیاب
۴۲-۱۹۴۲ء میں جب کثیر اساتذہ کی ایسولس ایشن جی تو اس کی مدد کے لئے

ان کا انتخاب عمل میں آیا۔ کئی سکولوں میں کام کرنے کے بعد وہ ٹیچرز ٹریننگ سکول اور
آخر میں سکولوں کے انسپکٹر کے عہدہ سے وظیفہ پرسبکدوش ہوئے اور اس وقت نارن
ہرائس کو جو سب سے قیمتی ترین مطبع میں سے ہے چلا رہے ہیں۔

پنڈت دینا ناتھ کے مضامین انگریزی اور اردو رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔
تعلیم جدید میں تعلیمی نفسیات پر انہوں نے جو مضامین شائع کیے تھے، انہیں اب کتابی
شکل میں مرتب کر رہے ہیں۔ انگریزی میں انہوں نے پروفیسر جلال کول کے ساتھ مل کر
ایک رسالہ "اپلائیڈ انٹیلیجنس گرامر" لکھا تھا اور پنڈت سند لال کپور کی معیت میں
معلم التعلیم پر مختصر نوٹس کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔

پنڈت دینا ناتھ جوگی کی شرکت میں پنڈت درسنے، جغرافیہ جموں و کشمیر لکھا، جو
شاید بڑا کامیاب ہو گا ہے۔ وہ بھی ہمیں محکمہ تعلیم میں ملازم تھے۔ سری پتاپ کا بل کے وہ بھی طالب علم
ہے جہاں سے بی۔ اے اور پنجاب سے بی۔ اے کا امتحان کامیاب کیا۔ گورنمنٹ سکولوں
میں مدرسہ ہے۔ آخر اودھم پور سکول سے بحیثیت ہیڈ ماسٹر وظیفہ پرسبکدوش ہوئے
اور اس وقت سری نگر میں مقیم ہیں۔

پروفیسر جلال کول، جن کا ابھی اوپر ذکر ہوا، انگریزی کے پروفیسر ہے، ایک کثیر
ادب کی ترقی میں بڑی سرگرمی سے کام کرتے ہیں۔ وہ انگریزی، کشمیری اور اردو
تینوں زبانوں میں لکھتے رہے ہیں۔ پروفیسر کول کا تعلق ایک ذی علم خاندان سے ہے ان
کے والد پنڈت لال کول، فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے۔ فارسی شاعری کے وہ بہت
دراودہ تھے۔ اُسے کابھی وہ اچھا ذوق رکھتے تھے۔ اقبال کی اردو اور فارسی شاعری
کا لال کول نے بڑی دلچسپی سے مطالعہ کیا تھا۔ اور ان کی فارسی شاعری کو اردو شاعری
پر مرتب مانتے تھے۔ کشمیری فلسفہ کا مطالعہ ان کا مخصوص مطالعہ رہا تھا۔

پروفیسر کول نے فارسی پر کتاب لکھی ہے۔ اے اور پنجاب سے ایم۔ اے کے لیے

بعد ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان پاس کر کے دو تین سال تک وکالت بھی کی۔ پھر کلچر میں
انگریزی کے پڑھار ہو گئے۔ اور پرنسپل کے عہدے سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے جس زمانے میں
وہ امر سنگھ کلچر میں پروفیسر تھے ڈاکٹر محمد الدین تاثیر کلچر کے پرنسپل تھے۔ مذاق کا اشتراک
کے سبب دونوں میں گہرے مراسم ہو گئے تھے۔ خواجہ قلام السیدین اس زمانے میں ریاست
کے محکمہ تعلیم کے ناظم تھے۔ پروفیسر کو لکھی صلاحتوں سے وہ بہت متاثر تھے چنانچہ
انہوں نے ہی ان کو میرٹھ کلچر کا پرنسپل مقرر کر کے بھیجا تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین سابق صدر
جمہوریہ ہند بھی اکثر کشمیر آتے تھے۔ اور ان سے بھی پروفیسر کو لکھنؤ کا تعارف ہو گیا تھا۔
پروفیسر کو لکھنؤ نے جب انگریزی میں "اسٹریٹجیشن آف غالب" نامی رسالہ لکھا تو، ڈاکٹر
ساجب اہل نے اس کا پیش لفظ لکھا تھا۔

ذاب جعفر علی خان آغا، اردو کے صاحب ذوق، سخن سنج بھی اس زمانے میں کشمیر
ہی میں وزارت کے عہدہ پر فائز تھے۔ پروفیسر کو لکھنؤ کی ادبی صحبتوں میں شریک
ہوتے اور مباحث میں بھی حصہ لیتے تھے۔ اکثر کو جب "گیتا" کا ترجمہ اردو میں کرنے کا
خیال پیدا ہوا تو اکثر وزیر دہلی نام اور پروفیسر کو لکھنؤ سے اس سلسلے میں مشورہ کرتے تھے۔
محکمہ تعلیم کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد پروفیسر کو لکھنؤ ریاست کی مچل
اکادمی کے مقرر ہوئے اور ۱۹۶۶ء تک اس خدمت پر فائز رہے۔ اس تعلق سے
انہیں ریاست کے سامنے علمی اور ادبی امداد اور اس قسم کے کام کرنے والوں سے
سابقہ راج اور ان کی تشکیل میں اپنے مخصوص رجحان کے مطابق رہنمائی کرنے کا موقع ملا۔
جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے کشمیری زبان اور ادب کی ترقی سے انہیں گہری دلچسپی
رہی۔ چنانچہ اپنے مطالعے کے نتائج کو "اسٹڈیز ان کشمیری" کے رسالے کی شکل
میں مدون اور شائع کیا۔ پروفیسر موصوف نے اردو میں کئی لمبے مضامین بھی لکھے
ہیں۔ جن میں سے اکثر ریڈیو کشمیر سے شائع ہوئے اور کچھ اکادمی کے دو ماہی رسالے
میں، اس نے جو کہ فزیکل سائنس کا شعبہ تھا، اس کا نام "سائنس" رکھا۔ (صفحہ ۵۴)

۵۰۴
 - شیرازہ میں بھی شائع ہوئے۔ انہیں مضامین میں پنڈت جواہر لال نہرو کا ایک
 خیال نامطالعہ بھی ہے جو "جواہر لال نہرو" - چند پہلوؤں کے عنوان سے مذکورہ بالا
 رسالے کے نہرو نمبر میں شائع ہوا۔ مضمون خاصہ جذبات سے پُر ادا اس کا انداز بہت
 دلچسپ ہے۔ اس کا آغاز ایک ڈرامائی انداز میں اس طرح کرتے ہیں:

"جب ۱۲ جنوری ۱۹۳۸ء کے اس پُر آشوب دن، گاندھی جی کو قتل
 کیا گیا اور خود جواہر لال نہرو کے الفاظ میں، روشنی گہلی ہو گئی اور
 ہمارے دل طرف اندھیرا چھا گیا، کچھ جانتے ہیں کہ غیر متزلزل سروجنی ٹائیڈ
 برطانویوں کے اس گمبے میں داخل ہوئی، جہاں ماتم کرنے والے لوگ
 - تہمت بنے ہوئے اور غم کے عالم میں ڈوبے ہوئے بیٹھے تھے، اور پکاری -
 کیا آپ اس کے لئے کسی اور طرح کی موت چنتے ؟"

انگریزی کے ایک عالم کے اظہار اور اسلوب کا یہ انداز، اردو کے لئے نیا، لیکن اس
 کے لئے ایک فطری اقتضائے۔ ان کا ایک اور مضمون اسی رسالے میں "قوی یک جہتی اور
 مُصنّف کا فرض" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، جس میں ملک کے مختلف عناصر میں
 یک جہتی پیدا کرنے میں 'ادیب پر جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت کی ہے۔
 کشمیری میں، اور کشمیری پر پروفیسر کول کی چند تصانیف بھی ہیں جو کشمیری ادب
 کی تنقید اور تشکیل میں نمونے کا کام دیتی ہیں۔ پروفیسر نند لال کول طالب کی شرکت
 میں انہوں نے عائدہ لادید پر جو رسالہ اردو میں لکھا ہے، اس کا تذکرہ گند چک ہے۔
 یہ رسالہ ایک بسیط مقدمہ کے علاوہ 'لادید کے منتخب کلام کا مجموعہ ہے۔ کلام کی
 خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"یہ مجموعہ کلام بہریرت، جذبات، عشق حقیقی اور غلوں و صدق کا
 ایسا مرقعہ ہے کہ تہمت جس میں حقیقت کی جھلک نمایاں طور پر

نظر آتی ہے۔ بلند پایہ سننوں اور صوفیوں کے کلام میں یقیناً یہی
 اوصاف پائے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک فرد بیک وقت کئی عالموں
 میں رہتا ہے؛ جن کو مجموعی طور پر دو عالموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔۔۔
 آگے ان دو عالموں یعنی خارجی اور داخلی کی تفصیل لکھی ہے، جو بہت خیال نا ہے۔
 پروفیسر کول نے کشمیری رسم خط پر بھی کافی غور و غوض کیا ہے اور کشمیری کی
 مخصوص اصوات کے لئے کچھ علامتیں بھی تجویز کی ہیں، جن کی تفصیل انہوں نے اپنے ایک
 مضمون 'کشمیری زبان اور رسم الخط' میں لکھی ہے۔ یہ مضمون ریاست کے رسالے
 'تعمیر' کے شمارہ اگست ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا ہے۔ پروفیسر اچھے مکتوب نگار بھی ہیں۔ ان
 کے مکتوبات میں بھی ان کی اور تجزیوں کی طرح ان کا شخصی اسلوب جھلکتا ہے۔ ایک
 خط میں وہ لکھتے ہیں:

”آپ کا انتظار ہے، مشکل یہ ہے کہ اردو میں لکھنے کی جرات کروا
 ہوں۔۔۔“

اور ایسی جرات وہ موندت کے ساتھ یا سعادت کے بغیر اکثر کرتے رہے ہیں۔ خط
 میں آگے لکھتے ہیں:

”میں پہلے بھی ایک بار اس خوبصورت شہر میں آیا ہوں۔۔۔۔۔ اور
 چار دن یہاں یونیورسٹی میں ٹھہرا تھا۔ سکند آباد کی گشاہ سڑکوں
 پر چلنے اور موٹر چلانے کا موقع ملا اور دوپہار وقفہ حیدر آباد بھی گیا۔
 پارک دیکھا، رادیندر بھارتی کو بھی دیکھا اور ساہتیہ اکادمی کے آفس
 سیکرٹری سے بھی ملا۔ اس نے تیلیگرم میں دو کتابیں پیش کیں۔
 جن میں میرے دو تصانیف بذریعہ ترجمہ شامل ہیں۔ کل سے ٹیسٹ
 میچ لال بہادر شستیم میں دیکھوں گا۔ ایک دفعہ انگلش انسٹی ٹیوٹ

بھی گیا اور ہاں گو گنڈہ فورٹ بھی مگر ان مشاغل سے میری
تشفی نہیں ہوئی۔ آپ آئیں تو اس مقام کی بہت ساری اور
دلچسپیوں سے میرا تعارف ہوگا اور یقیناً ہوگا۔

پروفیسر کول کی انگریزی میں اطلاق قواعد کا ذکر اور کیا گیا، جو انہوں نے پنڈت دینا ناتھ
در کے ساتھ مل کر لکھا تھا۔ ان کی مرتب کی ہوئی ریڈریں اور انداز کی کتب بھی لغت
میں شامل رہیں۔

اس وقت بھی پروفیسر کول اپنے علمی اور ادبی مشاغل میں مصروف ہیں۔
کثیر میں شیعہ مسلک کی اشاعت، شیعہ شاہیر اور ان کے سیاسی، علمی اور ادبی
موضوعوں کی ایک تفصیلی تاریخ حکیم غلام مقدر ہمدانی نے عرصہ پہلے لکھنی شروع کی تھی۔
۱۹۰۰ء میں شیعیان کشمیر کے نام سے شائع ہوئی۔ ہمدانی سرکاری ملازمت میں ہے۔
اور ریاست کے محکمہ حسابات میں مختلف عہدوں پر مامور ہے اور ۱۹۶۱ء میں فائنانس
سیکریٹری کے عہدے سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ ان مصروفیات کے دوران بھی اپنے
علمی کام کو جاری رکھا۔

عہدے کی ان مصروفیتوں کے علاوہ بھی 'اہمائی زمانے میں وہ کچھ علمی اور بعض
وقت سیاسی کاموں میں لگے رہے۔ ۱۹۳۰ء میں اپنے کچھ ہم خیال ساتھیوں کی مدد سے
انہوں نے ایک خفیہ سیاسی مجلس بنائی تھی۔ امداد اور انگریزی میں ان کے مضامین
'سُلم آؤٹ لک'، 'سول ملٹری گزٹ'، 'لاہور ایسٹرن ٹائمز'، 'سن رائیز'، 'سفینہ سترنگر'
'ارشاد'، 'مداقت' وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔ کثیر میں عزاداری امام حسینؑ
پر بھی انہوں نے لکھا ہے اور کشمیری علماء کی بعض بے راہرویوں پر اظہار حقیقت
کے نام سے ایک رسالہ 'مسرد کشمیری' کے فرضی نام سے لکھا ہے جو شائع ہو چکا ہے۔
کشمیری زبان میں لکھے ہوئے مراٹھی کو ہمدانی نے 'کاشمیر ٹریڈ' کے عنوان سے مرتب اور

شائع کیلئے۔ لیکن حکیم صفدر ہمدانی کا یادگار کام ان کی تصنیف 'شیعیان کشمیر' ہے۔
یہ تفصیلی تاریخ بھی ہے اور شیعیان کشمیر کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں ان
کے ازالہ کی کوشش بھی۔

کتاب کا آغاز کشمیریوں اسلام کی اشاعت سے ہوتا ہے اور اس زمانے سے دودگرہ
عہد تک کے سلسلہ شیعہ پیشواؤں کے کارناموں، شعراء علماء اور حکماء کے حالات، شعراء
اور ادبی اور کثیر کلام کے اقتباسات اس میں اکٹھے کر دیئے گئے ہیں۔ میرٹس الدین عراقی
کے حالات اور چوں کے دور حکومت کے واقعات تفصیل سے لکھے ہیں۔ اس طرح اس
قابل قدر کتاب سے کشمیر کی ادبی تاریخ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

میرزا محمد افضل بیگ، جو شیخ محمد عبداللہ 'شیر کشمیر' کے گہرے دوست اور
سیاسی مساعروں میں ان کے قریبی رفیق کار ہے۔ آزادی کشمیر کے بعد حکومت کی زراعتی
پالیسی کے بارے میں ایک رسالے کے مصنف بھی ہیں، جو زرعی اصلاحات کے نام سے
مشہور ہے اور آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس کی جانب سے شائع ہوا ہے۔ یہ رسالہ میرزا
محمد عبداللہ کی شخصیت، مشیران ریاست جموں و کشمیر کے ساتھ اور اسے مولانا محمد سعید سعوی
بزرگ سیکرٹری نیشنل کانفرنس نے پیش لفظ کے ساتھ ۱۹۵۰ء میں شائع کیلئے ہے۔

میرزا محمد افضل بیگ، شیخ محمد عبداللہ کی طرح، اپنے سیاسی خیالات، اظہارات
اور عمل کی بدولت نزاعی شخصیت ہے، تاہم جہاں تک کشمیر کے مستقبل کا مسئلہ ہے
ان کے لڑنے میں ایک بنیادی استقلال نظر آتا ہے۔ میرزا صاحب کی جلسے پیدائش اسلام آباد
انتہا ناگ ہے اور سنہ پیدائش ۱۹۱۰ء۔ ان کے والد میرزا نظام الدین بیگ کشمیر
کے ثقہ لوگوں میں سے تھے۔ محمد دین فوق نے اپنی تاریخ اقوام کشمیر میں ان کے خاندان کے
حالات لکھے ہیں لیکن یہ بات غلط درج کی ہے کہ میرزا صاحب کے بزرگ شال کا کاروبار
کھرتے تھے۔ اصل میں اس خاندان کا تعلق فوجی خدمات سے رہا اور یہ سرہنگ زاد انداز

۵۰۸
 ان کی تقریروں میں جھلک جاتا ہے۔ میرزا صاحب کی تعلیم سری نگر اور پھر علی گڑھ میں ہوئی۔
 بی۔ اے انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے کاسیاب کیا، اس کے بعد علی گڑھ میں ڈس سال
 مقیم ہے اور ایل ایل بی کی تکمیل کی جس کے بعد وہ ریاست میں وکالت کرتے رہے۔
 اسی زمانے میں اپنے ذاتی رجحان اور شیخ صاحب کی رفاقت نے، انہیں سیاسی میدان
 میں لا کھڑا کیا اور باپ دادا نے جو ہمیں میدانِ کارِ ناز میں سرکیں تھیں، میرزا صاحب نے
 میدانِ سیاست میں جیتیں۔ چنانچہ آزادی کی جدوجہد کے وہ سربراہ اور وہ قایدین میں شمار
 ہوتے ہیں۔ نیشنل کانفرنس کے وہ سرگرم رکن رہے اور کانفرنس کی ذمہ دار حکومت کی تحریک
 کی کامیابی کے بعد جب ریاست میں قانون ساز مجلس قائم ہوئی تو وہ اس کے رکن منتخب
 ہوئے اور شیخ محمد عبداللہ نے جب حکومت تشکیل دی تو میرزا صاحب وزیر امور عامر
 رہے۔ کچھ عرصہ شیر مال بھی ہے۔ پھر جب شیخ محمد عبداللہ حکومت سے ہٹائے گئے اور
 گرفتار ہوئے تو میرزا صاحب نے قید میں بھی ان کی رفاقت نہیں چھوڑی۔ قید سے رہا
 ہونے کے بعد سب سے وہ محاذ رائے شماری کے صدر کی حیثیت سے رائے عامہ کو منظم کرنے کی
 کوشش کرتے رہے۔

بیگ صاحب قانون میں اپنے نکتہ رس دماغ کی بدولت امتیاز رکھتے ہیں۔ اپنی
 وزارت کے زمانے میں انہوں نے ریاست کے لئے کئی نئے قوانین مدون کئے۔ ان میں قانون
 اصلاح اراضی اور قانون تسخیر قرضہ جات اور اس اہمیت کے مالک ہیں۔ چنانچہ اول الذکر
 کی اہمیت کی طرف، امریکی سفیر ہند میٹر چسٹر بولز نے بھی ایک موقع پر اشارہ کیا ہے۔
 بیگ صاحب کا رسالہ "ذریعہ اصلاحات" ریاست کی اقتصادیات کی نئی تشکیل میں
 اس اثر کی رجحان کا آئینہ دار ہے جس کو شیخ محمد عبداللہ کے اقتدار کے زمانے میں
 ان کے رفقاء، بیگ صاحب اور خواجہ غلام محمد صادق نے نشوونما دینے کی کوشش کی تھی۔
 چنانچہ رسالہ میں سرمایہ دارانہ نظام کی خامیاں اور اشتراکِ نظام کے نایہ دلی پر روشنی

ڈولنے کے بعد، بیگ صاحب ہمارا فیصلہ کی ذیلی سرخی کے تحت لکھتے ہیں:

"جہاں تک ریاست جوں و کشیر کا تعلق ہے، ہم نے اس نظام کو اپنانے کا فیصلہ کیا ہے، جس میں نجی یا پرائیویٹ ملکیت کا اصول کارفرما نہ ہو، جہاں صرف ایسے اشخاص کے ہاتھ میں محنت کش عوام کی باگ ڈور نہ ہو جو ذاتی مفاد کی خاطر، کبھی مصنوعی قحط اور کبھی اقتصادی بحران پیدا کر کے عوام کو مبتلائے مصیبت کر دیتے ہیں۔"

مولانا مسعودی نے اپنے پیش لفظ میں اس رسالے کی ترتیب اور اس کے محرک پر روشنی ڈالی ہے۔ پہلے یہ رسالہ کئی تقریروں میں ریڈیو کشمیر سے نشر ہو چکا تھا اور اس کا محرک شیخ محمد عبداللہ کا زمین کسوں کی ملکیت قرار دینے کا وہ تاریخی اعلان تھا جو ۱۲ جولائی ۱۹۵۰ کو کیا گیا تھا۔ مولانا مسعودی نے اس طرح کے جرات مندانہ اقدام کی ضرورت پر روشنی ڈالی ہے۔

بیگ صاحب نے سیاسی مسائل پر کئی مضامین بھی انگریزی اور اردو میں لکھے ہیں۔ اردو میں ان کا ایک اچھا مضمون "محاذ ہفت روزہ (سری نگر) کے اجراء کے موقع پر تنظیم اور کارکن" کے عنوان سے لکھا تھا۔ جس میں ان دونوں کے باہمی رشتے کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تنظیم، افراد کا ایک مجموعہ ہوتی ہے، افراد کے خیالات و محسوسات کی ہم آہنگی ہی دراصل کسی تنظیم کے وجود کا باعث بنتی ہے، افراد کو جب اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ ان کے مقصد کو ہمہ گیر طریقے پر آگے بڑھانے اور اس میں ایک قسم کی افادیت پیدا کرنے کی ضرورت درپیش ہے تو ان کے منتشر رجحانات اور بکھرے ہوئے غور و فکر کا رد عمل ایک وحدت کی صورت اختیار کر کے تنظیم کو

تشکیل دیتا ہے۔ تاکہ ان کی آواز نفاذ میں ایک پُختہ گونج کا طرح
چھا جائے اور اس آواز کے ہر پردے سے ایک سوئی اور ہم آہنگی
کے جاودانی نغمے تخلیق ہوں۔

میرزا محمد افضل بیگ کے بڑے بھائی میرزا غلام قادر بیگ جو جرّار کو آپریشن کے
عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ کشمیر کی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیتے رہے، اور
قید و بند کی مصیبتوں میں بھی گرفتار رہے۔ سازش کشمیر کے مقدمہ میں بھی وہ لازم
قرار دیئے گئے تھے۔ ان حوصلہ شکن حالات میں ادب و دلچسپی ان کے لئے کچھ سہارا
کا کام دیتی رہی۔ وہ کہانیاں لکھتے رہے۔ اس کے علاوہ سیاسی اور اقتصادی امور
پر وہ مزاحیہ انداز میں بھی لکھتے رہے۔ "سفیر یاد دہ" اور "توپ کی کھنٹی" ان کے
اچھے مضامین ہیں۔ ان کو ایک امتیاز یہ حاصل ہوا کہ انہوں نے اسرائیل حکومت کی حیات
کی ہے اور تین مہینے تک مختلف حصوں میں گھوم پھر کر وہاں کی روزمرہ زندگی، ان کے اقتصادی
نظام اور طرز فکر کا مطالعہ کیا، اور ایک ضخیم کتاب بھی مڈن کی ہے، جس کے کچھ
حصے مقامی اخبارات میں شائع ہوئے ہیں۔ میرزا غلام قادر بیگ۔ اشتراکی نظام
کے بہت قائل ہیں۔ چنانچہ انہوں نے عرب اسرائیل آدریش کا علاج، اشتراکی
نظام کی اشاعت بتائی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ عربوں پر اسرائیلی برتری، اسرائیل
میں اقتصادی مساوات اور عربوں میں عدم مساوات کا ایک نتیجہ ہے اور اس نتیجے
پر پہنچے ہیں کہ جب تک عرب سماج میں اقتصادی مساوات رائج نہیں ہوگی، وہ
اسرائیل سے عہدہ برا نہیں ہو سکیں گے۔ اپنے دعوے کی تائید میں انہوں نے
چیکو سلواکیہ، شمالی کوریا، شمالی دیت نام، روس اور چین کی مثالیں پیش کی ہیں۔
حسن ابن علی کے فرزند منشی محمد اسماعیل کی آزادی کشمیر کی جدوجہد کے ہر اہل دستے
میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ لیکن اپنی سیاسی سمرفہمیتوں کے ساتھ ساتھ، انہوں

نے اردو میں کئی رسالے لکھے ہیں جن میں سے اکثر مذہبی موضوعات پر ہیں یا اصلاحی اور تنظیمی نوعیت رکھتے ہیں۔ ان کی ولادت ۱۳۱۹ھ کو سری نگر میں ہوئی۔ دسویں جماعت تک تعلیم پائی تھی کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ اور تعلیم کا سلسلہ ختم کرنا پڑا۔ ابتدا میں حنفیہ سکول میں ملازمت کی پھر کچھ عرصہ محکمہ جنگلات میں کام کیا، آخر میں سوہن لال اینڈ سنز کی ٹرانسپورٹ کمپنی میں ملازم ہو گئے۔ ان کی دیانتداری کی وجہ سے سارا کام ان پر چھوڑ دیا گیا تھا اور وہ فرم کے منیجر بنادیئے گئے تھے۔ اس کام کے سلسلہ میں انہیں اتنا تجربہ حاصل ہو گیا کہ خود اپنی فرم قائم کر لی۔ اور اسے لمیٹڈ بنا دیا۔ جس کے منیجر وہ خود ہو گئے تھے۔ ان کی گاڑیاں راولپنڈی سے سری نگر تک چلتی تھیں۔ پینا پھر جب یہ آزادی کی لڑائی میں گتھے گئے تو حمل و نقل اور اخبار وغیرہ کے سری نگر پہنچانے میں ان کی گاڑیوں سے بہت کام لیا گیا۔

غشی صاحب نے کچھ عرصہ ایک ہفتہ وار اخبار 'ذوالفقار' کے نام سے بھی جاری کیا تھا جس کے ایڈیٹر حکیم غلام حسین مخمور تھے۔ مخمور اچھے انشا پرداز اور شاعر بھی ہیں۔ وہ جوں و کشیر شیو فیڈریشن کے جرنل سیکرٹری بھی تھے۔ اور تنظیمی مہامیل کے بارے میں ایک رسالہ "پیش کش" کے نام سے مرتب کیا تھا جس کا پیش لفظ غشی اسٹی نے بہ حیثیت صدر فیڈریشن قلمبند کیا تھا۔ اسی رسالے کے آخر میں مخمور کے یہ دو شعر بھی درج ہیں :

کچھ زیرِ چین میرے نشیمن کی کہانی
افلاک سے ٹوٹے ہوئے رشتہ کی کہانی

ہاں ہاں، وہی کہ طائر بے بال بھی نہیں
ہاں ہاں، مگر کہ مایل پر داز بھی نہیں

۱۹۳۱ء میں منشی اسحق نے اپنے والد مرحوم کے قدم پر قدم چلتے ہوئے انجمن
ہندوؤں کی شیعہ بھی قائم کی تھی۔ پہلے وہ بھی مسلم کانفرنس کے سرگرم کارکن تھے لیکن
۱۹۳۸ء میں جب یہ کانفرنس نیشنل کانفرنس میں تبدیل ہو گئی، تو منشی صاحب اس کے
رکن رکیں بن گئے۔ اسی سلسلے میں پہلی دفعہ ۱۹۳۸ء میں جیل بھیجے گئے اور اس کے
بعد کئی دفعہ قید و بند میں رہے۔ کثیر چھوڑ دو تحریک میں یہ پیش پیش رہے
اور جب ان کا کثیر میں داخلہ ممنوع قرار دیا گیا، تو بخشی غلام محمد اور خواجہ غلام محمد صداد
کے ساتھ لاہور میں رہ کر اس تحریک کو چلاتے رہے۔

آزادی ملک کے بعد جب امیر جنسی نظم و نسق قائم ہوا اور شیخ محمد عبد اللہ
اس کے سربراہ مقرر ہوئے تو منشی اسحق کو امیر جنسی افسر مقرر کیا گیا، لیکن چھ ماہ بعد اس
خدمت سے وہ الگ ہو گئے۔ اور تنظیم کاموں میں لگ گئے۔ کئی جوں و کشیر شیو فیڈریشن
کے وہ بانی اور اس کے صدر بھی رہے اور آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے نائب
صدر منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۵۲ء میں فریضہ حج ادا کرنے گئے اور شام، عراق اور ایران
کا دورہ کر کے کثیر لوٹے۔ ۱۹۵۴ء میں محاذ رائے شماری کے بانی ارکان میں وہ بھی
شامل تھے۔ اور اس کے خزانہ دار منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۵۶ء میں جب وہ محاذ کے کارگذار
صدر تھے، انہیں گرفتار کر لیا گیا اور دو سال دو مہینے کے بعد رہا ہوئے۔ اور رہا ہونے
کے بعد محاذ کے صدر بنائے گئے تو پھر گرفتاری عمل میں آئی۔ ۱۹۶۳ء میں سوئے مقدس
کی تحریک میں حصہ لینے کی پاداش میں انہیں پھر قید کر دیا گیا۔ ایک سال بعد رہا ہوئے
تو پھر صدر محاذ کی حیثیت سے گرفتار ہو گئے۔ آخری مرتبہ ۱۹۶۷ء میں بیماری کی وجہ
سے انہیں رہا کیا گیا۔ بیماری کے دوران بھی وہ لکھتے پڑھتے رہے چنانچہ ان کا آخری
رسالہ "بذات حق" ان کے انتقال سے چند ہی دن پہلے ۲۸ اکتوبر ۱۹۶۹ء میں
شائع ہوا تھا۔ اس وقت ان کی عمر ۶۸ برس کی تھی۔

ان کے لکھے ہوئے رسائل میں "نمائے حق" کے علاوہ "حالات حضرت علیؑ" "پیام علیؑ" "صور اسرافیل" "جامع المتفرقین" "کارملانی سبیل اللہ قاضی شامل" "پیش کش" کی ترتیب میں بھی ان کا بڑا حصہ رہا۔ ایک اور اہم رسالہ "چودھویں صدی" جو چار حصوں پر مشتمل ہے، ان کا اہم رسالہ ہے، جس میں شیعیان کشمیر کی تنظیم اور اصلاح کے مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ "صور اسرافیل" کی ابتداء میں حسن ابن علی کا مرتبہ رسالہ "ترجمہ نماز" کشمیری بھی شامل ہے۔ اس رسالے میں شیعیان کشمیر میں اتحاد اور ترقی اصلاح اور تنظیم کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی تہدید میں وہ لکھتے ہیں:

کبھی کتاب کے لکھنے سے قبل میرے ذہن میں کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ لکھوں تو کیوں لکھوں، کیا لکھوں اور کون کے لئے لکھوں، اور آخر الامر فریضہ انسانیت کے 'عوام کی بہبودی کی خاطر، جو کچھ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے، لکھ لیتا ہوں۔"

"نمائے حق" کے آغاز میں وہ پڑھنے والوں کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جو کچھ کرتے رہے ہیں، وہ دینی منفعت یا نام و نمود کے لئے ہے۔ اسی سلسلے میں اپنے والد مرحوم کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

"میرے پاس اپنے والد صاحب کی لکھی ہوئی چھبیس سالہ ڈائری ہمارا جرنل سرنگم کے دور کی ذمہ مطالعہ ہے جو کہ میرے لئے موجب تسکین و اطمینان ہے۔ اس سے یہ جائزہ لینے میں مدد مل رہی ہے کہ اس دور حکومت اور موجودہ نام نہاد عوامی رائج میں موازنہ اور فرق معلوم ہو۔ اگر اول الذکر دور میں مذہبی بنیادوں پر فساد اور جھگڑے ہوتے رہے تو مؤخر الذکر دور میں سیاسی بنیادوں پر ان کا

دوبدوئل میں آیا۔

آگے دونوں ادوار کا مقابلہ اور موازنہ کیا ہے۔ منشی صاحب کو اپنے اگلے سیاسی کارکن ساتھیوں سے بنیادی اختلاف ہو گئے تھے۔ چنانچہ اس رسلے میں مرزا محمد افضل بیگ، صدر الدین مجاہد، وغیرہ سے اپنی مراسلت کی نقلیں بھی دی ہیں اور اپنے مسلک کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

پروفیسر سری کسٹھ تو ششانی سنسکرت اور فلسفہ کے عالم، کالج کی ملازمت سے حال میں سبکدوش ہوئے ہیں۔ ۱۹۱۰ء میں انہوں نے بی۔ اے کیا اور ۱۹۲۰ء میں ایم۔ اے ایل ایل بی کا پہلا امتحان بھی انہوں نے کامیاب کیا۔ لیکن بعد میں ریاست میں وکالت کا امتحان کامیاب کر کے کچھ عرصہ تک وکالت کی۔ ۱۹۲۹ء میں وہ کالج کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ کچھ عرصہ سکول میں ہیڈ ماسٹر بھی رہے۔ اور اسٹنٹ انسپکٹر آف سکولز کی خدمت بھی انجام دی۔ آخر میں کالج کے پرنسپل ہو گئے۔ کالج کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ریاست کی کلچرل اکادمی میں وہ کشمیری ڈکشنری کی تدوین کا کام پروفیسر نند لال کول طالب کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ پروفیسر تو ششانی نے مشہور صوفی شاعر پرمانند کے حالات اور کلام کا انتخاب

ایک رسالے کی صورت میں کیا ہے جو پرمانند کے نام سے ۱۹۶۰ء میں کلچرل اکادمی کے سلسلہ انتخابات منظومات کشمیری میں شایع ہوا ہے۔ ابتداء میں "عارف" کے عنوان کے تحت پرمانند کے مختصر حالات لکھے ہیں اور کلام کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ کشمیری شاعری کو پرمانند کی دین کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"پرمانند نے پڑانے رنگ کی شاعری میں ایک انقلاب پیدا کیا،

مدحیہ نظموں کو مناجات کی صورت دی، حکایات اور واقعات پر
بنی اشیا کو تمثیلی نظموں کی شکل میں پیش کیا، اخلاق یا پند

۵۱۵
سے متعلق خیالات کو وعظ خوانی سے نکالا اور حقایق کی طرف توجہ دلا کر
عمل پیرا ہونے کی تلقین کی۔

پنڈت دینا ناتھ کول، کشمیر کے آریہ سماجی نیتا "مارتنڈ" میں آریہ سماج
کے مسائل پر لکھتے تھے۔ اہل کشمیر کو آریہ سماج عقاید سے روشناس کرانے کے مقصد سے
انہوں نے ایک مضمون "آریہ سماج کا مشن" کے عنوان سے لکھا تھا۔ مضمون میں ان
غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے جو اس فرقے کے بارے میں کشمیر میں رائج تھے۔
قاضی غلام الدین، فارسی کے اچھے عالم تھے۔ غنشی فاضل کے علاوہ ایم۔ اے
اور بی۔ اے کا امتحان پاس کر کے وہ محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے تھے۔ ان کے والد قاضی
محمد الدین بھی اپنے زمانہ کے سربراہان فارسی عالم اور استاد تھے۔ چنانچہ پنڈت
نند لال کول طالب نے قاضی غلام الدین کے ساتھ ان سے "نخزین اسرار" کے درس
لے رکھے۔ قاضی غلام الدین کے بھائی قاضی سیف الدین بھی فارسی اور اردو کا
اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ قاضی غلام الدین کا انتقال حج سے واپس ہوتے لڑھکانہ
میں ہو گیا۔ انہوں نے فارسی زبان کی ایک قواعد اردو میں لکھی تھی۔

میر حبیب اللہ کالی، حضرت شیخ اکمل الدین مرزا محمد کابل، بیگ خاں بدخشی
کے سلسلے کے صاحب علم و صاحب ذوق اصحاب ہیں سے ہیں کشمیر میں وہ حکومت ہند کے
محکمہ مردم شماری کے بہتم رہے۔ اس عہدہ سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ اب جموں کشمیر
پبلک سروس کمیشن کے رکن ہیں۔ میر حبیب اللہ نے حضرت اکمل بدخشی کی ضخیم مثنوی
"بحر العرفان" کی پہلی جلد یا پہلے دفتر کو مرتب کر کے اپنے بسیط مقدمہ کے ساتھ
۱۳۸۱ھ میں شائع کیا۔ "بحر العرفان" کا تذکرہ حصہ فارسی میں کیا جا چکا ہے۔ مولانا
رومی کے اتباع میں لکھی ہوئی اسی ہزار اشعار کی یہ ضخیم مثنوی اللہ تعالیٰ میں اختتام
کو پہنچی تھی۔ میر حبیب اللہ نے مقدمہ میں حضرت اکمل کے حالات زندگی اور ان کے

۵۱۶
 خلفاء اور شہزادی کے بارے میں تفصیل لکھی ہے۔ اس اہم کارنامہ کو منظر عام پر لانے کی ضرورت کے بارے میں مختلف نقطہ ہائے خیال کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں :
 ”موجودہ دور میں عام طور پر ہر چیز کی قیمت مادی پیمانوں سے ناپی جاتی ہے۔ کچھ نقادوں کی رائے ہے کہ ادب برائے ادب ہونا چاہیئے مگر اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ ادب برائے ادب دماغی عیاشی کے علاوہ کچھ نہیں۔ ان کا مقولہ ہے کہ ادب زندگی کا ترجمان ہونا چاہیئے۔“

لیکن آگے وہ وضاحت کرتے ہیں کہ زندگی کا مقصد محض کھانے پینے اور آرام و اطمینان تک محدود نہیں ہے بلکہ زندگی کا ایک اہم پہلو روحانی بھی ہے اور اس پہلو کی تربیت اور تکمیل میں ”بحر العرفان“ جیسی تصانیف معاون ہوتی ہیں اس کارنامہ کی اشاعت حقیقت میں مبرا آزماکام تھا جسے میر جیب اللہ کی عقیدت نے انجام دینا چاہا۔

غلام محی الدین، ہمدانی، ریاست کے ایک سیاسی کارکن تھے اور زمانہ طالب علمی سے وہ اہل ان کے ساتھی غلام نبی گلکار جدوجہد میں حصہ لینے لگے تھے۔ وہ نیشنل کانفرنس کے سرگرم رکن رہے اور کانفرنس کی جدوجہد آزادی کے سلسلے میں انہوں نے ایک مختصر رسالہ ”کثیر کہان سے کہاں“ کے عنوان سے لکھا جو ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا۔ ہمدانی نیشنل کانفرنس کے ضلع سری نگر کے صدر رہے۔ رسالے میں اٹھارہ سو سال کی مختصر تاریخ اور حکمرانوں کی عیش کوکشی اور استحصال کی دُکھ دینے والی داستان اور عوام کے مصائب کی تفصیل اختصار کے ساتھ بیان کی ہے۔ اس پس منظر میں نئے محشر کے معماروں، شیخ محمد عبداللہ، مرزا محمد افضل بیگ، بخشی غلام محمد، خواجہ غلام محمد صادق، مولانا محمد سعید مسعودی، شام لال صرافی، صوفی محمد اکبر، جودھری غلام عباس، اور دوسرے ساتھیوں کی جدوجہد پر روشنی ڈالی۔

مسلم کانفرنس کے حلقہ عمل کو وسیع کرنے کے لئے مسلم کانفرنس کے ۱۹۲۸ء کے تاریخی اجلاس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

۱۹۳۵ء میں قومیت کی جھلکیں نمایاں ہونے لگیں، فرقہ پرستوں کی کرٹھ گئی اور قاید اعظم شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ چھ ملہ کی قید بھگتنے کے بعد جیل سے باہر آئے تو انہوں نے جناب غلام محمد صادق کی صدارت میں مسلم کانفرنس کا ایک خصوصی اجلاس شاہی مسجد احاطہ میں بلایا۔ . . . اس اجلاس میں یہ ہنگامہ خیز تجویز مولانا محمد سعید مسعودی، جرنل سیکرٹری آل جوں و کشمیر مسلم کانفرنس نے نمائندوں کے سامنے رکھی۔

یہ تجویز مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنے کی تھی، جو منظور ہو گئی اور اس کے بعد سے ریاست میں سیاسی جدوجہد کا ایک نیا عہد شروع ہوا۔ اس عہد کے سربراہ آدرہ کشمیری شعراء میں جنہوں نے اردو میں بھی اپنے آثار چھوڑے ہیں، عبدالاحد آزاد کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ کشمیری شاعروں کو نئے معیاروں سے روشناس کرانے میں ان کا بڑا ہاتھ رہا۔ ان کی شعری تحصیلات اردو سے شروع ہوئی تھیں، لیکن جلد ہی وہ کشمیری کی طرف رجوع ہو گئے اور اس زبان میں اپنی فکر کے لازوال آثار چھوڑ گئے۔

آزاد کشمیر کے ایک موضع رائگر کے ایک متوسط زمیندار گھرانے میں ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد سلطان ولد، ایک سو فی منش انسان تھے۔ ان کے بارے میں خود آزاد نے لکھا ہے کہ دو عربی اور فارسی میں اچھی استعداد رکھتے تھے۔ آزاد نے ابتدائے میں انہیں سے قرآن پڑھا، پھر اپنے بھائی غلام علی کے مکتب میں تحصیل کی۔ انہیں اعلیٰ تعلیم کا شوق تھا، لیکن یہ شوق پورا نہ ہو سکا۔ جلد ہی انہیں ایک

سکول میں تیرہ روپیہ ماہوار پر مدرسہ کی خدمت اختیار کرنی پڑی۔ لیکن ملازمت
تعلیم کے سلسلہ شوق کے لئے منقطع ثابت نہیں ہوئی۔ اپنے طور پر مطالعہ کر کے ۱۹۲۵-۲۶ء
میں انہوں نے منشی خاں کا امتحان کامیاب کیا۔ پھر منشی خاں کے امتحان کی تیاری
کر رہے تھے۔ کرمونیا کے مرض میں مبتلا ہو گئے اور امتحان نہ دے سکے لیکن ان کی
تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا جہاں نواز اردو ادب سے وہ بخوبی واقف تھے۔ خاص طور
پر شبلی کی "شعر العجم" کا مطالعہ انہوں نے گہری نظر سے کیا تھا جس پر بعد میں انہوں
نے اپنی تصنیف "کشمیری زبان اور شاعری" کا ڈول رکھا۔

آزاد پہلے آمد تخلص کرتے تھے، بعد میں جانا باز تخلص اختیار کیا تھا لیکن
اس تخلص کی وجہ سے سیاسی سرگرمیوں میں ان کے حصہ لینے کا شبہ حکومت کے عہدیداروں
کو ہوا۔ اور انہیں وطن سے دور قصبہ ترائی کے سکول میں تبدیل کر دیا گیا۔ اسی
زمانے میں ان کا اکلوتا چار سال کا لڑکا فوت ہو گیا۔ اس دہرے دکھ کو دور کرنے کیلئے
وہ اکثر شاہ محمدان کی خانقاہ میں جا بیٹھتے۔ ایسی ہی ایک نشست میں انہیں
آزاد تخلص اختیار کرنے کا خیال پیدا ہوا اور اس تخلص کے ساتھ ہی "ان کی کشمیری
شاعری میں نیا موڑ آیا۔

مدرسہ کی تربیت کے سلسلے میں آزاد کچھ عرصہ سری نگر میں بھی رہے۔ صحت
کے لحاظ سے وہ کبھی مطمئن نہیں رہ سکے۔ آخر اپنڈی سٹیٹس کے اسپرینج کچھ عرصہ بعد ۱۹۴۸ء
میں وہ دنیا سے چل بسے لیکن اپنے پیچھے ایسے نغمے چھوڑ گئے جو ان کے نام کو ہمیشہ
زندہ رکھنے کے ضامن ہیں۔ آزاد کے سائے کشمیری کلام کو بڑی محنت سے جمع کر کے
لن کے دوست ڈاکٹر پدم ناتھ گجنونے اردو میں اپنے بسیط مقدمہ اور کچھ نظموں اور
اشعار کے اردو ترجمے کے ساتھ کلچرل اکادمی کی جانب سے ۱۹۶۷ء میں شائع
کیا ہے۔

آزاد کے کچھ اردو شعر اور نظمیں جو دستیاب ہوئی ہیں وہ ان کے ابتدائی دور کی
 مشقیں ہیں رجن کے بارے میں ڈاکٹر پیم ناتھ گنجوانے لکھا ہے کہ اس دور میں اردو
 میں بھی کچھ کلام موزون ہوا۔ لیکن آزاد کو اس پر کوئی ناز نہ تھا۔ ذیل میں ان کی ایک
 مناجات کے انداز کی نظم کے چند شعر درج ہیں :

جہاں کے پالنے والے تو ہی ہے مہرباں میرا
 ہوا معصوم تیری دین سے ہی غامغاں میرا
 بنایا اشرف المخلوق مجھ ناچیز ہستی کو
 تو ہے ابرم کوہم گلستاں میرا
 بٹھایا معرفت کی شاخ پر اس بیٹیل دل کو
 فضاے عرش اعلیٰ میں سجایا آئیناں میرا

آزاد کے زمانے میں محکمہ تعلیم کا حال جیسا ابر تھا۔ اور اساتذہ کی حالت جیسی
 ناگفتہ بہ تھی۔ اس کے بارے میں بعض اساتذہ نے لکھا ہے۔ آزاد نے بھی اپنی ایک
 نظم میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں :-

تشدد کی پھری دیکھی، مدرس کا گلا دیکھا
 کہاں سے گائے کو لاؤں کہ تھوڑا دودھ ہی پاؤں
 بے کمین تو میں کھاؤں، ذرا آرام جاں پاؤں
 دبائے کھوپری کوئی، صبح سے درد سر دیکھا

کشمیری زبان اور ادب آزاد کا منت اور کاوش سے سرانجام کیا ہوا کا نام
 ہے۔ جسے کلچرل اکادمی نے ترتیب دے کر تین جلدوں میں شائع کیا ہے۔ ابھی
 اس کی ترتیب کا کام باقی تھا کہ آزاد کا انتقال ہو گیا۔ پہلے حصے میں کشمیری زبان کی
 قدامت، پراکرتوں اور آپ بھرنش مرحلے سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس میں آزاد نے اپنی ذاتی تحقیق سے کام نہیں لیا ہے۔ کیونکہ وہ علم زبان سے نا آشنا تھے۔ کشمیری رسم خط پر انہوں نے کسی قدر تفصیل سے بحث کی ہے اور کچھ پٹرت مصنفین کی طرح انہوں نے بھی فارسی رسم خط کو اس کے لئے ناموزون قرار دیا ہے۔ کشمیری کے ایک لفظ "کر" کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہوئے بحث کی ہے کہ:

”یہ معنوی تغیرات تلفظ کے تابع ہیں، جو فارسی حرکات ثلاثہ سے ادا

نہیں ہو سکتا۔“

زبان کے آغاز اور رسم الخط کی یہ بخشیں علمی اور مخصوص بحثیں ہیں۔ جمہور پر سند کے ساتھ کچھ لکھنے کے لئے لسانی تربیت کی ضرورت ہے اور اس کے مواقع آزاد کو نہیں مل سکے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے ان مسائل سے نبرد آزما ہونے کی جو کوشش کی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس موضوع پر جو مواد انہیں مل سکتا تھا، اس سے استفادہ کیا تھا اور اس پر خود بھی غور و فکر کیا تھا۔ کتاب کے وہ حصے جن میں کشمیری شاعروں کا تذکرہ درج کیا ہے۔ وہ آزاد کی ذاتی تلاش کا نتیجہ ہے اور یہ شاید کشمیری شاعری کو تاریخی ترتیب اور تنقیدی نقطہ نظر سے پیش کرنے کی پہلی کوشش ہے۔ آزاد کے مطالعے کا ایک اہم پہلو "کشمیری ریختہ" کے بار میں ان کے اشارے ہیں۔ کشمیری زبان بھی ابتداء میں اظہار کے سہاروں کے طور پر اُردو کی طرح فارسی الفاظ اور فقرات سے کام لیتی رہی اور بعد کے ادوار میں کچھ شعرا نے یہ کام اُردو سے بھی لیا۔ آزاد نے کشمیری اور اُردو ریختہ کی صورت میں جو اختلاف دکھایا ہے۔ اس پر ٹکڑا انداز میں بحث کی ہے۔ کشمیری فارسی ریختہ نمونے لکھے ہیں۔ لیکن کشمیری اُردو ریختہ کا کوئی نمونہ درج نہیں کیا۔ جن کے چند نمونے اس کتاب میں دیئے گئے ہیں۔

جہاں تک تنقیدی ارزیابی کا تعلق ہے۔ آزاد کا انداز شبلی اور طاقی کا

اتباع ہے۔ وہ بعض وقت ضمنی بحثوں میں بھی پڑ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر تقلید و تتبع پر وہ بحث کرتے ہیں:-

”ہر فن کے موجد بھی ہیں اور مقلد بھی۔ اس لئے فن شاعری کا اس کلیہ سے مستثنیٰ ہونا ممکن نہیں۔ موجد نئی بات پیدا کرتا ہے۔ اگر موجد اس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ایجاد کو ترقی دے تو اس کی تقلید تقلید مناسب کہلائے گی۔ تقلید مناسب کا رجبہ ایجاد کے دوش بدوش ہے۔ اگر تقلید سے ایجاد کو کوئی ترقی نہیں مل سکتی تو تقلید بے جا کہلائے گی۔ اگر مقلد کو، موجد کے نقش قدم پر چلنے کا ڈھنگ نہیں آتا اور اس میں مناسب تقلید کی صلاحیت نہیں تو اس کی تقلید نقالی کہلاتی ہے۔ ایسی تقلید سے ایجاد کو صدمہ پہنچتا ہے“

کشمیری شعرا کا جائزہ لیتے ہوئے آزاد نے کہیں کہیں، ان کے الہام کے لحظوں کی طرف بھی اشارے کئے ہیں جس سے ان کے مطالعے کی وسعت کا پتہ چلتا ہے لیکن جہاں انہوں نے اپنے قابل احترام معاصر مجبور کے بعض اشعار کے مانع ہونے کا ذکر کیا ہے، احتیاط ملحوظ رکھا ہے۔ مثلاً ان کا ایک شعر نقل کر کے وہ صرف یہ لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ — ”ان کا اور غالب کا مانع مشترک معلوم ہوتا ہے۔“

آزاد کے اردو مکتوب و لمپٹ ہوتے ہیں۔ انہوں نے ڈاکٹر پدم ناتھ گنجو کے نام جو خطوط لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک خط کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

”بھلا حسرت و یاس، درد و کرب کے خیالات کو کہاں تک فروغ دیں؟

اپنا دل تو کمر درختا، اوروں کے وبال بھی کیوں اپنی گردن پر لے لیں؟

ردنا گناہ ہے، اور رلانا گناہ کبیرہ“

آزاد کے ساتھ ہی ان کے دوست ڈاکٹر پدم ناتھ گنجو کا ذکر ضروری ہے۔ ڈاکٹر

گنجو آزاد کے دوست، معالج اور ہمدرد رہے اور ان کے انتقال کے بعد ان کے کلام کو اکٹھا کر کے شائع کیا۔ آزاد سے اپنے تعلقات کی ابتداء کے بارے میں وہ اپنے مرتبہ کلیات کی تمہید میں لکھتے ہیں:-

”مرحوم آزاد کے ساتھ میرے دوستانہ تعلقات ۱۹۳۶ء میں بھوجور صاحب مرحوم کے توسط سے شروع ہوئے تھے۔ پہلی ہی ملاقات میں ایک دوسرے کا رجحان طبیعت دیکھ کر ہم میں باہمی موانست قائم ہو گئی۔“
اور یہ موانست آزاد کے انتقال تک قائم رہی۔ ڈاکٹر گنجو لکھتے ہیں کہ انتقال سے ایک دن پہلے آزاد نے وصیت کی تھی کہ

”میرے پاس دنیاوی ثروت اور سرمایہ تو کچھ نہیں، مگر فقط نظموں کے کچھ مسودے اور عمر بھر کی عرق ریزی کا نچوڑ تاریخ ادبیات میرا سارا سرمایہ ہے۔ میری خواہش ہے کہ میرے بعد ان کاغذات کو پبلیشنگ پریس ناتھ بزاز صاحب یا ڈاکٹر پدم ناتھ گنجو کے حوالے کیا جائے تاکہ وہ ان کاغذات کی تکمیل، ترتیب و اشاعت جس طرح مناسب ہو کریں۔“

ڈاکٹر گنجو سرنیگر شہر میں مشغول ہیں پیدا ہوئے۔ بی۔ اے تک یہیں تعلیم پائی۔ اس کے بعد امرتسر جاکر طب یعنی ڈاکٹری کا امتحان کامیاب کیا اور کثیر لٹریچر، سرکاری ملازمت میں منسلک ہو گئے۔ ادب سے انہیں یوں بھی لگاؤ ہے لیکن اردو میں آنرز کا امتحان پاس کرنے کے بعد ان کے مطالعے کے ذوق میں اور بھی ترقی ہوئی۔ چنانچہ تحریر اور انشاپردازی کے گردن پر انہیں پورا قابل حاصل ہے۔ انہوں نے کچھ مضامین بھی لکھے ہیں لیکن ان کا قابل قدر کارنامہ کلیات آزاد ہے جو ۶۳ صفحات پر حاوی اور ترتیب اور ترمیم کے لحاظ سے اچھی تصنیف ہے۔ مقدمہ جو کوئی دو سو صفحات پر مشتمل ہے، آزاد کی حیات اور شاعری کا تنقیدی جائزہ ہے۔

کثیر کی جدوجہد آزادی کے قایدین میں، جو اس وقت چوٹی تک ابھر آئے ہیں۔
خواجہ غلام محمد صادق سیاست اور سماجی زندگی میں اپنے ترقی پسند رجحانات اور
اپنی علمی اور ادبی دلچسپی کی بدولت، ایک اہم مقام پر فائز ہیں۔ ان کی ولادت سرگڑ
میں ۱۹۱۲ء میں ہوئی۔ ان کا خاندان عالموں اور ادیبوں کا ایک سربراہ اور وہ خاندان آج
صادق صاحب کے والد عبدالغفار فارسی کے عالم، اردو کے اچھے متعلم اور کشمیری کے
قابل ذکر شاعر تھے۔ وہ فارغ تخلص کرتے تھے اور کشمیری میں ان کے دوسرے کلام
کے علاوہ ان کا حالی کے ”مسدس مدو جزر اسلام“ کا منظوم کشمیری ترجمہ، کشمیری ادب
میں ایک مقام رکھتا ہے۔

صادق صاحب کی ابتدائی تعلیم گھر پر اور پھر مرٹن اسکول میں ہوئی۔ اعلیٰ
تعلیم کے سلسلے میں کچھ عرصہ وہ لاہور میں رہے اور پھر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے
بی۔ اے اور این۔ ایل۔ بی کے امتحان ۱۹۳۲ء میں کامیاب کئے۔ وطن لوٹنے کے
بعد وکالت شروع کی، لیکن اس زمانے میں کشمیر کی تاریک سیاسی فضائے حساس
اور قومی درد رکھنے والے نوجوانوں کی طرح، صادق صاحب کو بھی سیاست میں جھڑ
یلنے پر مجبور کر دیا۔ اس وقت مسلم کانفرنس جموں و کشمیر میں برسر عمل تھی، صادق
صاحب اس کے رکن بن گئے لیکن اس کی بنیادیں وسیع کرنے کی دھن میں لگے رہے
چنانچہ ۱۹۳۹ء میں اس کا موقع آیا اور جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے مسلم کانفرنس
کا ایک خصوصی اجلاس خود صادق صاحب کی عداوت میں منعقد ہوا جس میں مولانا
محمد سعید مسعودی، جنرل سیکرٹری، مسلم کانفرنس نے، کانفرنس کو آل جموں و کشمیر
نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنے کی قرارداد پیش کی، جس کی تائید چودھری غلام
عباس نے کی۔ اور یہ قرارداد منظور ہو گئی، جس کے بعد سے جموں و کشمیر کی سیاست
میں ایک نئے عہد کا آغاز ہوا۔ نئی کانفرنس کے پہلے صدر صادق صاحب منتخب ہوئے۔

۱۹۴۷ء کے فرتہ دامنہ فادات میں شیخ محمد عبداللہ اور کانفرنس کے عہدیداروں کی صحیح رہنمائی کی وجہ سے کشمیر کی فضا پاک و صاف رہی، اسی بناء پر گاندھی جی نے کہا تھا کہ کشمیر میں انہیں روشنی کی کرن نظر آئی۔ ۱۹۴۸ء میں جب ریاست میں نمائندہ حکومت قائم ہوئی۔ تو صادق صاحب وزیر بنے۔ ۱۹۵۱ء میں ریاست کا دستور مرتب کرنے کے لئے دستور ساز مجلس بنی، اور اس کے صدر صادق صاحب ہی چنے گئے۔ نئے دستور کے تحت جو حکومت بنی اس میں ان کے علمی رجحانات کے بدل نظر، صادق صاحب کو وزیر تعلیم چنا گیا۔ اور ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۶ء تک وزیر تعلیم رہے۔ بخشی ظلام محمد صاحب کی وزارت عظمیٰ کے مہلے میں ان سے اختلاف کی وجہ سے ۱۹۵۶ء میں صادق صاحب نے ایک الگ ڈیپو کریٹک نیشنل کانفرنس قائم کی اور اس کے صدر کی حیثیت سے ۱۹۶۲ء تک اسمبلی میں حزب مخالف کی رہنمائی کرتے رہے۔ بخشی ظلام محمد کے مستعفی ہونے کے بعد، شمس الدین صاحب کچھ عرصہ وزارت عظمیٰ پر فائز رہے اس کے بعد صادق صاحب وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے۔

سیاست کے ساتھ ساتھ، صادق صاحب کو علم و ادب سمجھی گہرا لگاؤ ہے۔ تاریخ اور سیاست ان کے مخصوص موضوع مطالعہ ہیں اور ادب میں وہ ترقی پسند رجحانات کی طرف مائل ہیں۔ عنوان میں وہ شعر بھی کہتے تھے اور صادق تخلص اختیار کیا تھا۔ لیکن اب تلاشی کے باوجود ان کا کہا ہوا کلام دستیاب نہیں ہوتا۔ جنوں و کشمیر میں ترقی پسند تحریک اور اداروں سے ان کا قریبی ربط رہا۔ آل جنوں کشمیر سٹیٹ کلچرل فرنٹ کے وہ بانی ہیں، جو بعد میں کلچرل کانگریس میں تبدیل ہو گئی تھی۔ کلچرل فرنٹ کے کئی شعبے تھے جن کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ فرنٹ کی مختلف مانیوں نے ریاست میں ادب اور آرٹ کے نئے رجحانات کو ترقی دینے میں بڑی مساعرت کی۔ تلخیص، آثار قدیمہ، تعلیمی اور تہذیبی مسائل کے بارے میں ان

۵۲۵
کے تصورات کا اندازہ ان کی مختلف تحریروں اور تقریروں سے ہوتا ہے۔ ۱۹۶۲ء میں کلچرل اکادمی کے زیر اہتمام جرمن ڈیوکرٹیک ری پبلک کی جانب سے جو نمائش تصاویر سری نگر میں منعقد کی گئی تھی، اس کا خطبہ افتتاحیہ صادق صاحب ہی نے دیا تھا۔ خطبہ میں جرمن آرٹ کے ارتقاء پر جس طرح روشنی ڈالی ہے۔ اس آرٹ کے ارتقاء کے بارے میں ان کی واقفیت اور فن کی پرکھ کے معیاروں کا تھوڑا بہت اندازہ ہوتا ہے۔ جرمنی میں نشاۃ ثانیہ کے سربراہ اور وہ مصوروں کا تذکرہ کرتے کہا تھا:-

”دیویر نے گرائف آرٹ کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا، اس نے بائبل کے موضوعات کی تصویر کشی کو بھی اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ مگر یہ تصاویر ابتدائی کلیسیائی مصوروں کی غیر حقیقی تصاویر سے مختلف تھیں، کیونکہ اُس کے یہاں گو بائبل کے کردار مدحیہ طہارت کا مظہر ہوتے تھے مگر بھی جامد تصورات کی زنجیروں سے آزاد تھے۔“

کشمیر کا تمدنی درجہ کے عنوان سے، صادق صاحب کا ایک مضمون ہفت روزہ ”آئینہ“ (سری نگر اگست ۱۹۶۶ء) میں شائع ہوا تھا، جس میں کشمیر میں تمدنی آثار کی ابتداء، برزہ کے آثار الضادہ سے لے کر موجودہ دور تک، تمدن کے عہد بہ عہد ارتقاء کے نمایاں رجحانات کا جائزہ لیا ہے اور پشایچ اور ناگ تہنزیب، بدھ مت کے شیورج سے سماجی اور تمدنی اُفتی کی دعوت، کشنوں کے زمانے کی مذہبی اور تمدنی سرگرمیوں، ٹیکسلا کے قدیم علمی مرکز سے کشمیر کے باہمی علمی اور تمدنی ربط اشوک کے عہد سے ثقافتی لین دین کے آغاز اور اس کے اہم خط وخال پر اجمال سے روشنی ڈالنے کے بعد اسلامی عہد میں احیائے ثقافت کا تذکرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:-

”اسلام کی آمد سے کشمیری ثقافت کے بنیادی ڈھنگ میں ایک نئی قوت پیدا ہوئی اور فرسودگی کا خاتمہ ہوا۔۔۔۔۔ اسلامی تمدن اور عہدِ وسطیٰ کی ترقی یافتہ ہندو ثقافت کے باہمی ملاپ سے ایک نیا کلچر ابھرا، جو آج ہمارا تمدنی ورثہ بن گیا ہے۔“

تاریخ اور تعلیم، صادق صاحب کے دو محبوب موضوع رہے ہیں۔ تعلیم کے جدید نصب العین کے بارے میں ان کے چند مضامین شائع ہوئے ہیں۔ انہیں میں سے ایک ”تعلیم — فلاح و بہبود کے لئے“ ایک خیال نامہ مضمون ہے جس میں تعلیم کے بدلتے ہوئے تصور کی تفصیل لکھی ہے۔ سیاست میں سماجی اور معاشی مساوات، ان کا اور ان کے ہم خیال قایدین کا اصول رہنما ہے۔ چنانچہ اس بارے میں انہوں نے ”تعمیرِ امریکہ، جنوری فردی ۱۹۶۲ء میں“ ہمارا نصب العین — مکمل معاشی، مادی مساوات کے عنوان سے جو مضمون لکھا تھا اس میں ان اصلاحات اور ترقیوں کا خاص طور پر تذکرہ کیا ہے۔ جو مذکورہ بالا نصب العین کے حصول کے لئے ریاست میں اختیار کی گئیں۔

نیشنل کانفرنس نے جابر اقدار کے خلاف اپنا آخری وار ”کشمیر چھوڑ دو“ کی قرارداد منظور کر کے اور اس تحریک کو چلا کر کیا اور صادق صاحب نے اسی عنوان سے ایک کتاب ترتیب دی، جو ایک اچھے لکھے ہوئے اور خیال آفرین مقدمہ کے علاوہ چار حصوں پر مشتمل ہے۔ نیشنل کانفرنس کی درکنگ کمیٹی کا فیصلہ، شیخ محمد عبداللہ شیر کشمیر کی ایک تاریخی تقریر۔ بد، ذلتی رشن کے نام شیر کشمیر کا تار اور لہ، ابوالاثر حفیظ جالندھری کی ایک نظم — کتاب میں کشمیری کی آزادی کے بارے میں مشہور سیاسی مفکرین کے بیانات اور سرسبز آدرہ شعراء کی نظمیں، ۱۹۴۶ء میں شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری پر اخبارات کے تبصروں کے اقتباسات اور نظمیں، ریاست میں آنے ہوئے بدلتے ہوئے گرفتاری اور اس پر اخبارات کے تبصرے، ”کشمیر چھوڑ دو“ تحریک

کاپس منظر اور اس کے منفردات، سب کچھ شامل کر دیا گیا ہے۔ اور ان الگ الگ اجزاء کو اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ صادق صاحب کے ان پرتیوروں کے بغیر بھی مسئلہ کی صورت حاصل لگتی ہوگی۔ یہ مقدمہ جو سلیس اور صاف ستھری زبان میں لکھا گیا ہے، ایقان کا وزن اور تبلیغ کا جوش بھی رکھتا ہے۔ آزادی چاہنے والی قوتوں کو سرنگون کرنے کے لئے ڈیڑھ سو سال سے استبداد کا جو رویہ اختیار کیا تھا، اس کی مذمت جس طرح کی ہے، اس کا اندازہ خطیبانہ قہقہے ہی، لیکن اس میں ادبی آہنگ بھی پیدا ہو گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

لیکن دنیا کا فیصلہ ان کے خلاف ہے، دقت کا تقاضا ان کو تباہی کی طرف دھکیں رہا ہے اور ملک بھر کی انقلابی اور ترقی پسند طاقتیں ان پر ہنس رہی ہیں۔ آج اگر کشمیر کی سرسبز وادی کو ہمارے بچوں اور ہماری ماؤں اور ہمارے بوڑھوں کے خون سے لالہ زار بنایا جا رہا ہے تو یہ ہمارے واسطے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی:

کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

اس خون کی بولی سے ہمارے ارادے مضبوط ہو گئے ہیں، ہمارے پاؤں آزادی کے میدان میں جم چکے ہیں۔ ہمارے دلوں میں روح انقلاب پورے طور پر بیدار ہو چکی ہے اور ہم انقلاب کے پرچم کو لہراتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتے جائیں گے اور کشمیر کی سرزمین میں ایسا راج قائم کریں گے، جہاں تاج شاہی مزدوروں اور کسانوں کے سر پہ ہوگا اور نسل اور قومیت کے نام سے کوئی کسی پر ظلم نہیں کر سکے گا۔ اور جہاں انسان آزاد ہوگا اور اسے بازاروں میں بکنے والی چیز نہیں سمجھا جائے گا۔ ہمارا کشمیر بھوک، مفلسی اور بیماریوں کا شکار نہیں ہو گیا۔ ہمارے کشمیر میں مابج ہوں گے اور نہ عوام کے خون پر پلنے والے جاگیردار۔

اپنی سیاسی مصروفیتوں کو بھی علمی اور ادبی دلچسپیوں کا رنگ دینے کا صادق صاحب کا ایک اپنا انداز ہے۔ ادب کے بارے میں وہ سوچے سمجھے فقط نظر رکھتے ہیں۔ اس کا اندازہ ان کی ادبی رفتاروں سے ہوتا ہے اور اس تصور سے ہوتا ہے جو انہوں نے کشمیر کے پریم چند، پریم ناتھ پر دیسی کے افسانوں کے مجموعے "ہستے چراغ" پر لکھا ہے۔ کشمیر کو جنت ارضی کہہ کر مطمئن ہو جاتے والے باہر کے ایسے شاعر اور افسانہ نگاروں پر تنقید کرتے ہوئے، جنہوں نے کشمیر کی حقیقی زندگی کی تصویر نہیں دیکھی، صادق صاحب کہتے ہیں:-

• خود پر دیسی کو باہر کے افسانہ نگاروں سے سخت شکایت تھی جنہوں نے کشمیر کے قدرتی اور خوبصورت مناظر کے نیلی اور مدنی خاکے کھینچے ہیں، جن کا یہاں کی زندگی اور یہاں کی خارجی حقیقتوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ جنہوں نے جنت کو تو دیکھا، لیکن جہنم کی آگ میں دھکتی ہوئی زندگیوں کو نظر انداز کیا۔ جنہوں نے کشمیر کے کسی پہاڑی قبضے کو ریاست کشمیر کا نام دے کر اپنے آپ کو کشمیر کی سیاسی اور سماجی زندگی کا ترجمان بتایا۔ جنہوں نے چناب کے کنارے واقع کسی گاؤں کو اٹھارہ لاکھ کشمیری بولنے والے عوام کا نمائندہ بتایا اور چناب کی مناسبت سے من گھڑت اور رد ملی قصے بیان کئے۔

خواجہ غلام نبی گلکار کشمیر کی آزادی کی جدوجہد کے لئے کام کرنے والے نیناؤں میں سے ہیں۔ وہ آزاد کشمیر کے علمبردار ہیں اور اس موضوع پر "آزاد کشمیر" نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ سرنی گران کا وطن ہے، لیکن آج کل راولپنڈی میں مقیم ہیں۔ ان کی تعلیم سری پرتاپ کالج میں ہوئی۔ تعلیم کے نفلے سے انہیں سیاست

• صادق صاحب اللہ کو جیلے ہوئے ہیں

ان کے لکھے ہوئے رسائل میں ”نڈائے حق“ کے علاوہ ”حالات حضرت علیؑ“
 ”پیام علیؑ“ ”صور اسرافیل“ ”جامع المتفرقین“ ”کارِ مکاری فی سبیل اللہ قاذو شابل
 ہیں۔ ”پیش کش“ کی ترتیب میں بھی ان کا بڑا حصہ رہا۔ ایک اور اہم رسالہ ”چودھویں
 صدی“ جو چار حصوں پر مشتمل ہے، ان کا اہم رسالہ ہے، جس میں شیعیان کشمیر کی تنظیم
 اور اصلاح کے مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ ”صور اسرافیل“ کی ابتداء میں حسن ابن
 علی کا مرتبہ رسالہ ”ترجمہ نذام“ کشمیری بھی شامل ہے۔ اس رسالے میں شیعیان کشمیر میں
 اتحاد اور ترقی اصلاح اور تنظیم کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی تہدید
 میں وہ لکھتے ہیں:

”کسی کتاب کے لکھنے سے قبل میرے ذہن میں کئی سوالات پیدا ہوتے
 ہیں۔ لکھوں تو کیوں لکھوں، کیا لکھوں اور کین کے لئے لکھوں، اور
 آخر الامر خلیفہ انسانیت کے حوام کی بہبودی کی خاطر، جو کچھ بھی
 مناسب معلوم ہوتا ہے، لکھ لیتا ہوں۔“

”نڈائے حق“ کے آغاز میں وہ پڑھنے والوں کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کی
 کوشش کرتے ہیں کہ وہ جو کچھ کرتے رہے ہیں، وہ دینی منفعت یا نام و نمود کے لئے
 ہے۔ اسی سلسلے میں اپنے والد مرحوم کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

”میرے پاس اپنے والد صاحب کی لکھی ہوئی چوبیس سالہ ڈائری
 بہاراجہ رنبیر سنگھ کے دور کی مزید مطالعہ ہے جو کہ میرے لئے موجب
 تسکین و اطمینان ہے۔ اس سے یہ جائزہ لینے میں مدد مل رہی ہے
 کہ اس دور حکومت اور موجودہ نام نہاد عوامی رائج میں موازنہ اور
 فرق معلوم ہو۔ اگر اول الذکر دور میں مذہبی بنیادوں پر فساد اور
 جھگڑے ہوتے رہے تو مؤخر الذکر دور میں سیاسی بنیادوں پر ان کا

وجود عمل میں آیا۔

آگے دونوں اقدار کا مقابلہ اور موازنہ کیا ہے۔ منشی صاحب کو اپنے اگلے سیاسی کارکن ساتھیوں سے بنیادی اختلاف ہو گئے تھے۔ چنانچہ اس رسلہ میں مرزا محمد افضل بیگ، صدر الدین مجاہد، وغیرہ سے اپنی مراسلت کی نقلیں بھی دی ہیں اور اپنے مشکل کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

پروفیسر سرجی کنٹھ تو شخانی سنسکرت اور فلسفہ کے عالم، کالج کی ملازمت سے حال میں سبکدوش ہوئے ہیں۔ ۱۹۱۸ء میں انہوں نے بی۔ اے کیا اور ۱۹۲۰ء میں ایم۔ اے ایل ایل بی کا پہلا امتحان بھی انہوں نے کامیاب کیا۔ لیکن بعد میں ریاست میں وکالت کا امتحان کامیاب کر کے کچھ عرصہ تک وکالت کی مشق میں وہ کالج کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ کچھ عرصہ سکول میں ہیڈ ماسٹر بھی رہے۔ اور اسٹنٹ انسپکٹر آف سکولز کی خدمت بھی انجام دی۔ آخر میں کالج کے پروفیسر ہو گئے۔ کالج کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ریاست کی کلچرل اکادمی میں وہ کشمیری ڈکشنری کی تدوین کا کام پروفیسر نند لال کول طالب کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ پروفیسر تو شخانی نے مشہور صوفی شاعر پرمانند کے حالات اور کلام کا انتخاب ایک رسالے کی صورت میں کیا ہے جو پرمانند کے نام سے ۱۹۴۰ء میں کلچرل اکادمی کے سلسلہ انتظامات منقولات کشمیری میں شائع ہوا ہے۔ ابتداء میں "تعارف" کے عنوان کے تحت پرمانند کے مختصر حالات لکھے ہیں اور کلام کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ کشمیری شاعری کو پرمانند کی دین کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"پرمانند نے پُرانے رنگ کی شاعری میں ایک انقلاب پیدا کیا،

مدحیہ نظموں کو مناجات کی صورت دی، حکایات اور واقعات پر
مبنی اشیاء کو تمثیلی نظموں کی شکل میں پیش کیا، اخلاق یا پند

سے متعلق خیالات کو وعظ خوانی سے نکالنا اور حقائق کی طرف توجہ دلا کر
عمل پیرا ہونے کی تلقین کی۔

پنڈت دیناناث کول، کشمیر کے آریہ سماجی نیا "مارتنڈ" میں آریہ سماج
کے مسائل پر لکھتے تھے۔ اہل کشمیر کو آریہ سماج عقاید سے روشناس کروانے کے مقصد سے
انہوں نے ایک مضمون "آریہ سماج کا مشن" کے عنوان سے لکھا تھا۔ مضمون میں ان
غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے جو اس فرقے کے بارے میں کشمیر میں رائج تھیں۔
قاضی غلام الدین، فارسی کے اچھے عالم تھے۔ منشی فاضل کے علاوہ ایم۔ اے
اور بی۔ اے کا امتحان پاس کر کے وہ محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے تھے۔ ان کے والد قاضی
محی الدین بھی اپنے زمانہ کے سربراہان فارسی عالم اور استاد تھے۔ چنانچہ پنڈت
نند لال کول طالب نے قاضی غلام الدین کے ساتھ ان سے "مخزن اسرار" کے درس
لئے تھے۔ قاضی غلام الدین کے بھائی قاضی سیف الدین بھی فارسی اور اردو کا
اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ قاضی غلام الدین کا انتقال حج سے واپس ہوتے لڑھکانہ
میں ہو گیا۔ انہوں نے فارسی زبان کی ایک قواعد اردو میں لکھی تھی۔

میر حبیب اللہ کالمی، حضرت شیخ اکمل الدین مرزا محمد کابل بیگ خاں بدخشی
کے سلسلے کے صاحب علم و صاحب ذوق اصحاب میں سے ہیں۔ کشمیر میں وہ حکومت ہند کے
محکمہ مردم شماری کے مہتمم رہے۔ اس عہدہ سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ آب جہوں کشمیر
پبلک سروس کمیشن کے رکن ہیں۔ میر حبیب اللہ نے حضرت اکمل بدخشی کی ضخیم مثنوی
"بحر العرفان" کی پہلی جلد یا پہلے دفتر کو مرتب کر کے اپنے بسیط مقدمہ کے ساتھ
۱۳۸۱ھ میں شائع کیا۔ "بحر العرفان" کا تذکرہ حصہ فارسی میں کیا جا چکا ہے۔ مولانا
ردوی کے ابداع میں لکھی ہوئی اسی ہزار اشعار کی یہ ضخیم مثنوی سالانہ میں اختتام
کو پہنچی تھی۔ میر حبیب اللہ نے مقدمہ میں حضرت اکمل کے حالات زندگی اور ان کے

خلفاء اور شہزی کے بارے میں تفصیل لکھی ہے۔ اس اہم کارنامہ کو منظر عام پر لانے کی ضرورت کے بارے میں مختلف نقطہ نظر خیاں کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں :
 "موجودہ دور میں عام طور پر ہر چیز کی قیمت مادی پیمانوں سے ناپی جاتی ہے۔ کچھ نقادوں کی رائے ہے کہ ادب برائے ادب ہونا چاہیے۔ مگر اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ ادب برائے ادب دماغی عیاشی کے علاوہ کچھ نہیں۔ ان کا مقولہ ہے کہ ادب زندگی کا ترجمان ہونا چاہیے۔"

لیکن آگے وہ وضاحت کرتے ہیں کہ زندگی کا مقصد محض کھانے پینے اور آرام و اطمینان تک محدود نہیں ہے بلکہ زندگی کا ایک اہم پہلو روحانی بھی ہے اور اس پہلو کی تربیت اور تکمیل میں "بحر العرفان" جیسی تصانیف معاون ہوتی ہیں اس کارنامہ کی اشاعت حقیقت میں مبصر آدما کا کام تھا جسے میر حبیب اللہ کی عقیدت نے انجام دینا چاہیہ۔

غلام محی الدین ہمدانی، ریاست کے ایک سیاسی کارکن تھے اور زمانہ طالب علمی سے وہ ادا ان کے ساتھی غلام نبی گلکار جدوجہد میں حصہ لینے لگے تھے۔ وہ نیشنل کانفرنس کے سرگرم رکن رہے اور کانفرنس کی جدوجہد آزادی کے سلسلے میں انہوں نے ایک مختصر رسالہ "کثیر کہاں سے کہاں" کے عنوان سے لکھا جو ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا۔ ہمدانی نیشنل کانفرنس کے ضلع سری نگر کے صدر رہے۔ رسالے میں اٹھارہ سو سال کی مختصر تاریخ اور حکمرانوں کی عیش کوشی اور استحصال کی دُکھ دینے والی داستان اور عوام کے مصائب کی تفصیل اختصار کے ساتھ بیان کی ہے۔ اس پس منظر میں نئے محشر کے معماروں شیخ محمد عبداللہ، مرزا محمد افضل بیگ، بخشی غلام محمد، خواجہ غلام محمد صادق، مولانا محمد سعید مسعودی، شیا م لال صراف، صوفی محمد اکبر، جودھری غلام عباس، اور دوسرے ساتھیوں کی جدوجہد پر روشنی ڈالی ہے۔

۵۱۷
 مسلم کانفرنس کے متعلق عمل کو وسیع کرنے کے لئے مسلم کانفرنس کے ۱۹۳۸ء کے تاریخی
 اجلاس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

۱۹۳۷ء میں قومیت کی جھلکیں نمایاں ہونے لگیں، فرقہ پرستوں
 کی کر ٹوٹ گئی اور قائد اعظم شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ چھ ماہ کی
 قید بھگتے کے بعد جیل سے باہر آئے تو انہوں نے جناب غلام محمد صادق
 کی صدارت میں مسلم کانفرنس کا ایک خصوصی اجلاس شاہی مسجد کے
 احاطہ میں بلایا۔ . . . اس اجلاس میں یہ ہنگامہ خیز تجویز مولانا
 محمد سعید مسعودی، جرنل سیکریٹری آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس
 نے نمائندوں کے سامنے رکھی۔

یہ تجویز مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنے کی تھی، جو منظور ہوگئی اور
 اس کے بعد سے ریاست میں سیاسی جدوجہد کا ایک نیا عہد شروع ہوا۔
 اس عہد کے سربراہان کشمیری شعراء میں جنہوں نے اردو میں بھی اپنے آثار
 چھوڑے ہیں، عبداللہ آزاد کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ کشمیری شاعروں کو نئے
 سیاروں سے روشناس کرانے میں ان کا بڑا ہاتھ رہا۔ ان کی شعری تحصیلات اردو
 سے شروع ہوئی تھیں، لیکن جلد ہی وہ کشمیری کی طرف رجوع ہو گئے اور اس زبان
 میں اپنی فکر کے لازوال آثار چھوڑ گئے۔

آزاد کشمیر کے ایک موضع رانگر کے ایک متوسط زمیندار گھرانے میں ۱۹۰۳ء میں
 پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد سلطان ولد، ایک صوفی منش انسان تھے۔ ان کے بارے
 میں خود آزاد نے لکھا ہے کہ وہ عربی اور فارسی میں اچھی استعداد رکھتے تھے۔ آزاد
 نے ابتداء میں انہیں سے قرآن پڑھا، پھر اپنے بھائی غلام علی کے مکتب میں تحصیل
 کی۔ انہیں اعلیٰ تعلیم کا شوق تھا، لیکن یہ شوق پورا نہ ہو سکا۔ جلد ہی انہیں ایک

سکول میں تیرہ روپیہ ماہوار پر مدرسہ کی خدمت اختیار کرنی پڑی۔ لیکن ملازمت تعلیم کے سلسلہ شوق کے لئے منقطع ثابت نہیں ہوئی۔ اپنے طور پر مطالعہ کر کے ۱۹۲۵ء میں انہوں نے منشی عالم کا امتحان کامیاب کیا۔ پھر منشی فاضل کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے۔ مگر دنیا کے مرض میں مبتلا ہو گئے اور امتحان نہ دے سکے لیکن ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا اردو ادب سے وہ بخوبی واقف تھے۔ خاص طور پر شبلی کی "شعر البعہ" کا مطالعہ انہوں نے گہری نظر سے کیا تھا جس پر بعد میں انہوں نے اپنی تصنیف "کشیری زبان اور شاعری" کا ڈول رکھا۔

آزاد پہلے آمد تخلص کرتے تھے، بعد میں جانناز تخلص اختیار کیا تھا لیکن اس تخلص کی وجہ سے سیاسی سرگرمیوں میں ان کے حصہ لینے کا شبہ حکومت کے عہدیداروں کو ہوا۔ اور انہیں وطن سے دور، قصبہ تھال کے سکول میں تبدیل کر دیا گیا۔ اسی زمانے میں ان کا اکلوتا چار سال کا لڑکا فوت ہو گیا۔ اس دہرے دکھ کو دور کرنے کیلئے وہ اکثر شام میدان کی خانقاہ میں جا بیٹھتے۔ ایسی ہی ایک نشست میں انہیں آزاد تخلص اختیار کرنے کا خیال پیدا ہوا اور اس تخلص کے ساتھ ہی ان کی کشمیری شاعری میں نیا موڑ آیا۔

مدرسہ کی تربیت کے سلسلے میں آزاد کچھ عرصہ سری نگر میں بھی رہے۔ مدت کے لحاظ سے وہ کبھی مطہین نہیں رہ سکے۔ آخر اپنی سسٹم کے آپریشن کچھ عرصہ بعد ۱۹۴۸ء میں وہ دنیا سے چل بے لیکن اپنے پیچھے ایسے نغے چھوڑ گئے جو ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے ضامن ہیں۔ آزاد کے سارے کشمیری کلام کو بڑی محنت سے جمع کر کے لان کے دوست ڈاکٹر پدم ناتھ گنجوان نے اردو میں اپنے بسط مقدمہ اور کچھ نظموں اور اشعار کے اردو ترجمے کے ساتھ کلچرل اکادمی کی جانب سے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا ہے۔

آزاد کے کچھ اُردو شعر اور نظمیں جو دستیاب ہوئی ہیں وہ ان کے ابتدائی دور کی
 مشقیں ہیں رجنی کے بارے میں ڈاکٹر پی م ناتھ گنگو نے لکھا ہے کہ اس دور میں اُردو
 میں بھی کچھ کلام موزون ہوا۔ لیکن آزاد کو اس پر کوئی تاثر نہ تھا۔ ذیل میں ان کی ایک
 مناجات کے انداز کی نظم کے چند شعر مدج ہیں :

جہاں کے پالنے والے تو ہی ہے ہر ماں میرا

ہوا مسعود تیری دین سے اسی خانماں میرا

بنایا اشرف المخلوق مجھ تاجپزاستی کو

تو ہے لبر کرم گلستاں میرا

چٹھیا معرفت کی شاخ پر اس بیٹیل دل کو

فنائے عرش اعلیٰ میں سجایا آئیناں میرا

آزاد کے زمانے میں محکمہ تعلیم کا حال جیسا اب تھا۔ اور اساتذہ کی حالت جیسی
 ناگفتہ بہ تھی۔ اس کے بارے میں بعض اساتذہ نے لکھا ہے۔ آزاد نے بھی اپنی ایک
 نظم میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں :-

تشدد کی چہری دیکھی، مدرس کا گلا دیکھا

کہاں سے گلے کو لاؤں کہ تھوڑا دوڑھی پاؤں

بے کھن تو میں کھاؤں، ذرا آرام جہاں پاؤں

دبائے کھوپری کوئی، صبح سے دردِ سر دیکھا

دکھیری زبان اور ادب۔ آزاد کا منت اور کاؤش سے سرانجام کیا ہوا کارنامہ
 ہے۔ جسے کلچرل اکادمی نے ترتیب دے کر تین جلدوں میں شائع کیا ہے۔ ابھی
 اس کی ترتیب کا کام باقی تھا کہ آزاد کا انتقال ہو گیا۔ پہلے حصے میں دکھیری زبان کی
 قدامت پر کرتوں اور آپ بھرنش مرحلے سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس میں آزاد نے اپنی ذاتی تحقیق سے کام نہیں لیا ہے۔ کیونکہ وہ علم زبان سے نا آشنا تھے۔ کشمیری رسم خط پر انہوں نے کسی قدر تفصیل سے بحث کی ہے اور کچھ پنڈت مفسرین کی طرح انہوں نے بھی فارسی رسم خط کو اس کے لئے ناموزوں قرار دیا ہے۔ کشمیری کے ایک لفظ 'کر' کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہوئے بحث کی ہے کہ۔

یہ مثنوی تغیرات تلفظ کے تابع ہیں، جو فارسی حرکات ثلاثہ سے ادا

نہیں ہو سکتا۔

زبان کے آغاز اور رسم الخط کی یہ بحثیں علمی اور مخصوص بحثیں ہیں۔ جمعی پر سند کے ساتھ کچھ لکھنے کے لئے لسانی تربیت کی ضرورت ہے اور اس کے مواقع آزاد کو نہیں مل سکے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے ان مسائل سے نبرد آزما ہونے کی جو کوشش کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس موضوع پر جو مواد انہیں مل سکتا تھا، اس سے استفادہ کیا تھا اور اس پر خود بھی غور و فکر کیا تھا۔ کتاب کے وہ حصے جن میں کشمیری شاعروں کا تذکرہ درج کیا ہے۔ وہ آزاد کی ذاتی تلاش کا نتیجہ ہے اور یہ شاید کشمیری شاعری کو تاریخی ترتیب اور تنقیدی نقطہ نظر سے پیش کرنے کی پہلی کوشش ہے۔ آزاد کے مطالعے کا ایک اہم پہلو "کشمیری ریختہ" کے بارے میں ان کے اشارے ہیں۔ کشمیری زبان بھی ابتداء میں اظہار کے سہاروں کے طور پر اردو کی طرح فارسی الفاظ اور فقروں سے کام لیتی رہی اور بعد کے ادوار میں کچھ شعرا نے یہ کام اردو سے بھی لیا۔ آزاد نے کشمیری اور اردو ریختہ کی صورت میں جو اختلاف دکھایا ہے۔ اس پر ٹکڑا انداز میں بحث کی ہے۔ کشمیری فارسی ریختہ نمونے لکھے ہیں۔ لیکن کشمیری اردو ریختہ کا کوئی نمونہ درج نہیں کیا۔ جن کے چند نمونے اس کتاب میں دیئے گئے ہیں۔

جہاں تک تنقیدی ادنیابی کا تعلق ہے۔ آزاد کا انداز شبہی اور طاقی کا

۵۲۱
اتباع ہے۔ وہ بعض وقت ضمنی بحثوں میں بھی پڑ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر تقلید و تتبع پر وہ بحث کرتے ہیں:-

”ہر فن کے موجد بھی ہیں اور مقلد بھی۔ اس لئے فن شاعری کا اس کلیہ سے مستثنیٰ ہونا ممکن نہیں۔ موجد نئی بات پیدا کرتا ہے۔ اگر موجد اس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ایجاد کو ترقی دے تو اس کی تقلید تقلید مناسب کہلائے گی۔ تقلید مناسب کا رعبہ ایجاد کے دوش بدوش ہے۔ اگر تقلید سے ایجاد کو کوئی ترقی نہیں مل سکتی تو تقلید بے جا کہلائے گی۔ اگر مقلد کو، موجد کے نقش قدم پر چلنے کا ڈھنگ نہیں آتا اور اس میں مناسب تقلید کی صلاحیت نہیں تو اس کی تقلید نقالی کہلاتی ہے۔ ایسی تقلید سے ایجاد کو صدمہ پہنچتا ہے“

کشمیری شعرا کا جائزہ لیتے ہوئے آزاد نے کہیں کہیں، ان کے الہام کے لحاظوں کی طرف بھی اشارے کئے ہیں۔ جس سے ان کے مطالعے کی وسعت کا پتہ چلتا ہے لیکن جہاں انہوں نے اپنے قابل احترام معاصر ہجور کے بعض اشعار کے ماخوذ ہونے کا ذکر کیا ہے، احتیاط ملحوظ رکھا ہے۔ مثلاً ان کا ایک شعر نقل کر کے وہ صرف یہ لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ — ”ان کا اور غالب کا ماخذ مشترک معلوم ہوتا ہے۔“

آزاد کے اردو مکتوب دلچسپ ہوتے ہیں۔ انہوں نے ڈاکٹر پدم ناتھ گنجو کے نام جو خطوط لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک خط کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

”بھلا حسرت دیاس، درد و کرب کے خیالات کو کہاں تک فروغ دیں؟

اپنا دل تو کر دیتا، اردوں کے دباں بھی کیوں اپنی گردن پر لے لیں؟

ردنا گناہ ہے، اور رُلانا گناہ کبیرہ“

آزاد کے ساتھ ہی ان کے دوست ڈاکٹر پدم ناتھ گنجو کا ذکر ضروری ہے۔ ڈاکٹر

گجو آزاد کے دوست، معالج اور ہمدرد رہے اور ان کے انتقال کے بعد ان کے کلام کو اکٹھا کر کے شائع کیا۔ آزاد سے اپنے تعلقات کی ابتداء کے بارے میں وہ اپنے مرتبہ کلیات کی تمہید میں لکھتے ہیں:-

”مروج آزاد کے ساتھ میرے دوستانہ تعلقات ۱۹۳۶ء میں بھوجور صاحب

مروج کے توسط سے شروع ہوئے تھے۔ پہلی ہی ملاقات میں ایک دوسرے

کا رجحان طبیعت دیکھ کر ہم میں باہمی موانست قائم ہو گئی۔“

اور یہ موانست آزاد کے انتقال تک قائم رہی۔ ڈاکٹر گجو لکھتے ہیں کہ انتقال سے ایک دن پہلے آزاد نے وصیت کی تھی کہ

”میرے پاس دنیاوی ثروت اور سرمایہ تو کچھ نہیں، میں فقط نظموں کے

کچھ مسودے اور عمر بھر کی عرق ریزی کا پتھر تاریخ ادبیات میرا سارا

سرمایہ ہے۔ میری خواہش ہے کہ میرے بعد ان کاغذات کو پندت پریم

ناتھ بزاز صاحب یا ڈاکٹر پریم ناتھ گن جو کے حوالے کیا جائے تاکہ وہ ان

کاغذات کی تکمیل، ترتیب و اشاعت جس طرح مناسب ہو کریں۔“

ڈاکٹر گجو سرینگر شہر میں مشغول ہیں پیدا ہوئے۔ بی۔ اے تک یہیں تعلیم پائی۔ اس کے

بعد انٹر سجا کر طب یعنی ڈاکٹری کا امتحان کامیاب کیا اور کثیر لوٹ کر، سرکاری ملازمت

میں منسلک ہو گئے۔ ادب سے انہیں یوں بھی لگاؤ ہے لیکن اردو میں آنرز کا امتحان

پاس کرنے کے بعد ان کے مطالعے کے ذوق میں اور بھی ترقی ہوئی۔ چنانچہ تحریر اور

انشاء بردازی کے گردوں پر انہیں پورا قابل حاصل ہے۔ انہوں نے کچھ مضامین بھی لکھے

ہیں لیکن ان کا قابل قدر کارنامہ کلیات آزاد ہے جو ۶۳ صفحات پر حاوی اور ترتیب

اور تزیین کے لحاظ سے اچھی تصنیف ہے۔ مقدمہ جو کوئی دو سو صفحات پر مشتمل ہے

آزاد کی حیات اور شاعری کا تنقیدی جائزہ ہے۔

کشمیر کے بعد وجود آزادی کے قایدین ہیں، جو اس وقت چوٹی تک ابھر آئے ہیں۔
خواجہ غلام محمد صادق، سیاست اور سماجی زندگی میں اپنے ترقی پسند رجحانات اور
اپنی علمی اور ادبی دلچسپی کی بدولت، ایک اہم مقام پر فائز ہیں۔ ان کی ولادت سیکٹر
میں ۱۹۱۴ء میں ہوئی۔ ان کا خاندان عالموں اور ادیبوں کا ایک سربراہ اور وہ خاندان آج
صادق صاحب کے والد عبدالغفار قاری کے عالم، اردو کے اچھے متعلم اور کشمیری کے
قابل ذکر شاعر تھے۔ وہ فارغ تخلص کرتے تھے اور کشمیری میں ان کے دوسرے کلام
کے علاوہ ان کا ہائی کے "سندس مدوجزر اسلام" کا منظوم کشمیری ترجمہ، کشمیری ادب
میں ایک مقام رکھتا ہے۔

صادق صاحب کی ابتدائی تعلیم گھر پر اور پھر مرشن اسکول میں ہوئی۔ اعلیٰ
تعلیم کے سلسلے میں کچھ عرصہ وہ لاہور میں رہے اور پھر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے
بی۔ اے اور این۔ ایل۔ بی کے امتحان ۱۹۳۲ء میں کامیاب کئے۔ وطن لوٹنے کے
بعد وکالت شروع کی، لیکن اس زمانے میں کشمیر کی تاریک سیاسی فضائے حساس
اور قومی درد رکھنے والے نوجوانوں کی طرح، صادق صاحب کو بھی سیاست میں حصہ
لینے پر مجبور کر دیا۔ اس وقت مسلم کانفرنس جوں کی توں کشمیر میں برسر عمل تھی، صادق
صاحب اس کے رکن بن گئے، لیکن اس کی بنیادیں وسیع کرنے کی دھن میں لگے رہے۔
چنانچہ ۱۹۳۹ء میں اس کا موقع آیا اور جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے، مسلم کانفرنس
کا ایک خصوصی اجلاس خود صادق صاحب کی عمارت میں منعقد ہوا جس میں مولانا
محمد سعید مسعودی، جنرل سیکرٹری، مسلم کانفرنس نے، کانفرنس کو آل جوں کی توں
نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنے کی قرارداد پیش کی، جس کی تائید چودھری غلام
عباس نے کی۔ اور یہ قرارداد منظور ہو گئی، جس کے بعد سے جوں کی توں کشمیر کی سیاست
میں ایک نئے عہد کا آغاز ہوا، نئی کانفرنس کے پہلے صدر صادق صاحب چنے گئے۔

۱۹۴۷ء کے فرقة دلائل فادات میں شیخ محمد عبداللہ اور کانفرنس کے عہدیداروں کی صحیح رہنمائی کی وجہ سے کشمیر کی فضا پاک صاف رہی، اسی بناء پر گاندھی جی نے کہا تھا کہ کشمیر میں انہیں روشنی کی کمر لکھن نظر آئی۔ ۱۹۴۸ء میں جب ریاست میں نایندہ حکومت قائم ہوئی۔ تو صادق صاحب دزیر بنے۔ ۱۹۵۱ء میں ریاست کا دستور مرتب کرنے کے لئے دستور ساز مجلس بنی، اور اس کے صدر صادق صاحب ہی چنے گئے۔ نئے دستور کے تحت جو حکومت بنی اس میں ان کے علمی رجحانات کے بد نظر، صادق صاحب کو وزیر تعلیم چنا گیا۔ اور ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۷ء تک وزیر تعلیم رہے۔ بخشی غلام محمد صاحب کی وزارت عظمیٰ کے مہلے میں ان سے اختلاف کی وجہ سے ۱۹۵۷ء میں صادق صاحب نے ایک الگ ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس قائم کی اور اس کے صدر کی حیثیت سے ۱۹۶۲ء تک اسمبلی میں حزب مخالف کی رہنمائی کرتے رہے۔ بخشی غلام محمد کے مستعفی ہونے کے بعد شمس الدین صاحب کچھ عرصہ وزارت عظمیٰ پر فائز رہے اس کے بعد صادق صاحب وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے۔

سیاست کے ساتھ ساتھ صادق صاحب کو علم و ادب سمجھی گہرا لگاؤ ہے۔ تاریخ اور سیاست ان کے مخصوص موضوع مطالعہ ہیں اور ادب میں وہ ترقی پسند رجحانات کی طرف مائل ہیں۔ عقوان میں وہ شعر بھی کہتے تھے اور صادق تخلص اختیار کیا تھا۔ لیکن اب تلاشی کے یا وجود ان کا کہا ہوا کلام دستیاب نہیں ہوتا۔ جنوں و کشمیر میں ترقی پسند تحریک اور اداروں سے ان کا قریبی ربط رہا۔ آل جول کشمیر سٹیٹ کلچرل فرنٹ کے وہ بانی ہیں، جو بعد میں کلچرل کانگریس میں تبدیلی ہوگئی تھی کلچرل فرنٹ کے کئی شعبے تھے جن کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ فرنٹ کی مختلف ایٹوں نے ریاست میں ادب اور آرٹ کے نئے رجحانات کو ترقی دینے میں بڑی ساعدت کی۔ تلخیص، آثار قدیمہ، تعلیمی اور تہذیبی مسائل کے بارے میں ان

۵۶۵
 کے تصورات کا اندازہ ان کی مختلف تحریروں اور تقریروں سے ہوتا ہے۔ ۱۹۶۲ء میں کلچرل اکادمی کے زیر اہتمام جرمن ڈیوگریٹک ری پبلک کی جانب سے جو نمائش تصاویر سری نگر میں منعقد کی گئی تھی، اس کا خطبہ افتتاحیہ صادق صاحب ہی نے دیا تھا۔ خطبہ میں جرمن آرٹ کے ارتقاء پر جس طرح روشنی ڈالی ہے، اس آرٹ کے ارتقاء کے بارے میں ان کی واقفیت اور فن کی پرکھ کے معیاروں کا تقویراً بہت اندازہ ہوتا ہے۔ جرمنی میں نشاۃ ثانیہ کے سربراہ آوردہ مصوروں کا تذکرہ کرتے کہا تھا:-

• دیویر نے گرائف آرٹ کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا، اس نے بائبل کے موضوعات کی تصویر کشی کو بھی اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ مگر یہ تصاویر ابتدائی کلیسیائی مصوروں کی غیر حقیقی تصاویر سے مختلف تھیں، کیونکہ اُس کے یہاں گوبائیل کے کوحار روحانی طہارت کا مظہر ہوتے تھے پھر بھی جامد تصورات کی زنجیروں سے آزاد تھے۔“

کثیر کا تمدنی درجہ کے عنوان سے، صادق صاحب کا ایک مضمون ہفت روزہ ”آئینہ“ (سری نگر اگست ۱۹۶۶ء) میں شائع ہوا تھا، جس میں کثیر میں تمدنی آثار کی ابتداء، برزخہ کے آثار الضادیہ سے لے کر موجودہ دور تک، تمدن کے عہد بہ عہد ارتقاء کے نمایاں رجحانات کا جائزہ لیا ہے اور پشایع اور ناگ تہنریب، بدعت کے شیوع سے سماجی اور تمدنی اُفتی کی دعوت، کشنوں کے زمانے کی مذہبی اور تمدنی سرگرمیوں، ٹیکسیلا کے قدیم علمی مرکوز سے کثیر کے باہمی علمی اور تمدنی ربط اشوک کے عہد سے ثقافتی لین دین کے آغاز اور اس کے اہم خط وخال پر اجمال سے روشنی ڈالنے کے بعد اسلامی عہد میں احیائے ثقافت کا تذکرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:-

”اسلام کی آمد سے کشمیری ثقافت کے بنیادی ڈھنگ میں ایک نئی قوت پیدا ہوئی اور فرسودگی کا خاتمہ ہوا۔۔۔۔۔ اسلامی تمدن اور عہدِ وسطیٰ کی ترقی یافتہ ہندو ثقافت کے باہمی ملاپ سے ایک نیا کلچر ابھرا، جو آج ہمارا تمدنی ورثہ بن گیا ہے۔“

تاریخ اور تعلیم، صادق صاحب کے دو محبوب موضوع رہے ہیں تعلیم کے جدید نصب العین کے بارے میں ان کے چند مضامین شائع ہوئے ہیں۔ انہیں میں سے ایک ”تعلیم — فلاح و بہبود کے لئے“ ایک خیالی نامزد مضمون ہے جس میں تعلیم کے بدلتے ہوئے تصور کی تفصیل لکھی ہے۔ ریاست میں سماجی اور معاشی مسادات، ان کا اور ان کے ہم خیال قائدین کا اصول رہنما ہے۔ چنانچہ اس بارے میں انہوں نے ”تعمیر (سری نگر، جنوری فردری ۱۹۶۲ء) میں“ ہمارا نصب العین — مکمل معاشی، مادی مسادات کے عنوان سے جو مضمون لکھا تھا۔ اس میں ان اصلاحات اور ترقیوں کا خاص طور پر تذکرہ کیا ہے۔ مذکورہ بالا نصب العین کے حصول کے لئے ریاست میں اختیار کی گئیں۔

نیشنل کانفرنس نے جابر اقتدار کے خلاف اپنا آخری وار ”کشمیر جھڑ دو“ کی قرارداد منظور کر کے اور اس تحریک کو چلا کر کیا اور صادق صاحب نے اسی عنوان سے ایک کتاب ترتیب دی، جو ایک اچھے لکھے ہوئے اور خیال آفرین مقدمہ کے علاوہ چار حصوں پر مشتمل ہے۔ ۱۔ نیشنل کانفرنس کی درکنگ کمیٹی کا فیصلہ، ۲۔ شیخ محمد عبداللہ شیر کشمیر کی ایک تاریخی تقریر۔ ۳۔ ذرا لقی رشن کے نام شیر کشمیر کا تار اور لہ، ۴۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری کی ایک نظم۔ کتاب میں کشمیری کی آزادی کے بارے میں مشہور سیاسی مفکرین کے بیانات اور سرسماوردہ شعرا کی نظمیں، ۱۹۶۱ء میں شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری پر اخبارات کے تبسروں کے اقتباسات اور نظمیں، ریاست میں آتے ہوئے بندت نہرو کی گرفتاری اور اس میں اخباروں کے تبصرے، ”کشمیر جھڑ دو“ تحریک

۵۲۷
 کا پس منظر اور اس کے مغفرت، سب کچھ شامل کر دیا گیا ہے۔ اور ان الگ الگ اجزاء کو اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ صادق صاحب کے ان پرتصوروں کے بغیر بھی مسئلہ کی صورت حاصل ابھی طرح سمجھ لیں آجاتی ہے۔ یہ مقدمہ جو سلیس اور صاف ستھری زبان میں لکھا گیا ہے، یقیناً کا وزن اور تبلیغ کا جوش بھی رکھتا ہے۔ آزادی چاہنے والی قوتوں کو سرنگوں کرنے کے لئے دگر دگر حکومت نے استبداد کا جو ذوق اختیار کیا تھا، اس کی خدمت جس طرح کی ہے اس کا اندازہ خطیبانہ قہ ہے ہی، لیکن اس میں ادبی آہنگ بھی پیدا ہو گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

• لیکن دنیا کا فیصلہ ان کے خلاف ہے، وقت کا تقاضا ان کو تباہی کی طرف دھکیل رہا ہے اور ملک بھر کی انقلابی اور ترقی پسند طاقتیں ان پر ہنس رہی ہیں۔ آج اگر کشمیر کی سرسبز دادی کو ہمارے بچوں اور ہماری ماؤں اور ہمارے بوڑھوں کے خون سے لالہ زار بنایا جا رہا ہے تو یہ ہمارے واسطے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی:

کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
 اس خون کی بولی سے ہمارے ارادے مضبوط ہو گئے ہیں، ہمارے پاؤں آزادی کے میدان میں جم چکے ہیں۔ ہمارے دلوں میں روح انقلاب پورے طور پر بیدار ہو چکی ہے اور ہم انقلاب کے پرچم کو لہراتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتے جائیں گے اور کشمیر کی سرزمین میں ایسا راج قائم کریں گے، جہاں تاج شاہی مزدوروں اور کانوں کے سر پر ہوگا اور نسل اور قومیت کے نام سے کوئی کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔ اور جہاں انسان آزاد ہوگا اور اسے بازاروں میں پکتے والی چیز نہیں سمجھا جائے گا۔ ہمارا کشمیر بھوک، مفلسی اور بیماریوں کا شکار نہیں ہو گیا۔ ہمارے کشمیر میں مابجے ہوں گے اور نہ عوام کے خون پر پلنے والے جاگیردار۔

اپنی سیاسی مصروفیتوں کو بھی علمی اور ادبی دلچسپیوں کا رنگ دینے کا صادق صاحب کا ایک اپنا انداز ہے۔ ادب کے بارے میں وہ سوچ کچھ فقط نظر رکھتے ہیں، اس کا اندازہ ان کی ادبی رفاقتوں سے ہوتا ہے اور اس تعارف سے ہوتا ہے جو انہوں نے، کثیر کے پریم چند، پریم ناتھ پر دیسی کے افسانوں کے مجموعے "بہتے چراغ" پر لکھا ہے۔ کثیر کو جنت ارضی کہہ کر مطمئن ہو جانے والے باہر کے ایسے شاعروں اور افسانہ نگاروں پر تنقید کرتے ہوئے، جنہوں نے کثیر کی حقیقی زندگی کی تصویر نہیں دیکھی، صادق صاحب کہتے ہیں:-

• خود پر دیسی کو باہر کے افسانہ نگاروں سے سخت شکایت تھی جنہوں نے کثیر کے تصدی اور خوبصورت مناظر کے تخیلی اور مدنی خاکے کینے ہیں، جہاں کہاں کی زندگی اور یہاں کی خارجی حقیقتوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ جنہوں نے جنت کو تو دیکھا، لیکن جہنم کی آگ میں دیکھی ہوئی زندگیوں کو نظر انداز کیا۔ جنہوں نے کثیر کے کسی پہاڑی قبضے کو ریاست کثیر کا نام نہ کر اپنے آپ کو کثیر کی سیاسی اور سماجی زندگی کا ترجمان بتایا۔ جنہوں نے پنجاب کے کنارے واقع کسی گاؤں کو اٹھارہ لاکھ کثیری بولنے والے عوام کا نمائندہ بتایا اور پنجاب کی مناسبت سے من گھڑت اور ردملی قبضے بیان کئے۔

خواجہ غلام نبی گلکار، کثیر کی آزادی کی جدوجہد کے لئے کام کرنے والے نیناؤں میں سے ہیں۔ وہ آزاد کثیر کے علمبردار ہیں اور اس موضوع پر آزاد کثیر ہی کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ سرنی گران کا وطن ہے، لیکن آج کل راولپنڈی میں مقیم ہیں۔ ان کی تعلیم سری پرنٹاپ کالج میں ہوئی۔ تعلیم کے فیلڈ سے انہیں امتیاز ملے۔ صادق صاحب اللہ کو ہمارے ہوتے ہیں۔

میں تبصرہ لینے کا شوق ہوا۔ اور ایک سٹوڈنٹ فیڈریشن بھی بنایا تھا۔ جس کے وہ
صدر رہے۔ لکھنے کا شوق بھی زمانہ طالب علمی سے رہا۔ اور کانٹے رسالے پرتاب
میں لکھتے تھے۔ کشمیر چھوڑ دو تحریک کے سلسلے میں جس کا اوپر ذکر کیا گیا، شیخ محمد
عبداللہ پر جو مقدمہ چلایا گیا تھا۔ اس کی روداد اس کتاب میں مرتب کی ہے۔ ۱۹۲۱ء
میں کشمیر میں آزادی کی جدوجہد کی تاریخ بیان کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں:

”بعض اوقات اہل کشمیر نے آزادی کے لئے تحریک شروع کی مگر وہ حالات

ناسازگار ہونے کے باعث دب جاتی رہی۔ ۱۹۲۱ء میں ایک زبردست

تحریک حریت شروع ہوئی اور اہل کشمیر کو حقوق ملکیت ادا فرماتے

کے علاوہ اہل ریاست کو پریس کی آزادی پلیٹ فارم کی آزادی، کیلی

گوٹا نص کے قیام وغیرہ کے حقوق مل گئے۔“

آگے ان حالات کی تفصیل بیان کی ہے، جن کے تحت شیخ محمد عبداللہ کشمیر چھوڑ دو
تحریک کا آغاز کرنے پر مجبور ہو گئے۔

”خواجہ گلکار کو جیسا کہ شمیم احمد شمیم، ایڈیٹر آئینہ نے اخبار کے سالانہ شمارہ

میں ان کے مضمون ”سری نگر کو خوبصورت بنانے کا منصوبہ کے تعارفی نوٹ میں لکھا

ہے۔“ کشمیر سے عشق ہے اور اس عشق نے انہیں دیباغہ غریب بھی خیال یا رکھنا شروع

حیات بننے کا حوصلہ بخشا ہے۔ مضمون میں خواجہ صاحب نے ان سائے و سایہ

اور مسائل پر تفصیل سے نظر ڈالی ہے۔ جن سے شہر سری نگر کو اس کے گمراہی قیام کا

کے لئے خوبصورت بنایا جاسکتا ہے۔

آزادی کشمیر کے مجاہدین کی اسی صف میں چودھری غلام عباس اور سردار محمد

ابراہیم خان بھی تھے۔ جنہوں نے اپنے اپنے مخصوص نقطہ نظر سے اس جنگ میں حصہ

لیا اور دونوں نے اپنی اپنی خودنوشت ’مرتب کی ہے۔

۵۳۰
 سردار محمد ابراہیم خان، تقسیم سے پہلے جوں و کثیر کے اسمبلی میں ایڈوکیٹ جنرل
 تھے۔ ۱۹۴۶ء میں وہ ملازمت سے مستعفی ہو کر ریاستی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے
 تھے۔ تقسیم ملک کے بعد وہ پاکستان چلے گئے اور ۱۹۴۷ء میں "آزاد کشمیر" کے پہلے صدر
 بنائے گئے۔ ۱۹۴۹ء میں وہ اس عہدے سے ہٹائے گئے، لیکن ۱۹۵۵ء میں وہ دوبارہ
 "آزاد کشمیر" کے صدر بنے۔ کچھ عرصہ گرفتار بھی رہے۔ اس وقت لاہور کی عدالت عالیہ
 میں وکالت کر رہے ہیں۔

چودھری غلام عباس نے اپنی خود نوشت سوانح عمری "کشمکش" کے نام سے
 لکھی ہے۔ اس میں اپنے ذاتی حالات، مشاہدات اور تاثرات کو جہد و جد آزادی کے
 سوانحات کے ساتھ مربوط کر کے پیش کیا ہے۔ یہ کتاب چھپ گئی ہے، لیکن اس
 کے نسخے یہاں نہیں دستیاب ہوتے۔ شیم احمد شیم ایڈیٹر "آئینہ" سری نگر، اس کا
 اور سردار محمد ابراہیم خان کی متعلقہ زندگی کے فنسے پاکستان سے اپنے ساتھ لائے
 تھے اور ان کے الجاب وہ اپنے ہفتہ وار میں شایع بھی کرتے رہے۔ "کشمکش" کے
 بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ — چودھری صاحب کی یہ کتاب ان کی سوانح
 حیات ہی نہیں، تحریک حریت کشمیر کی تاریخ بھی ہے۔ "اور یہ بھی لکھا ہے کہ "کشمکش"
 میں واقعت کی صحت سے زیادہ جذبات کی شدت نمایاں ہے۔"

اس خود نوشت کے ایک حصے سے جو ماہ الزارع نہیں ہے، ایک اقتباس
 ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ نواب بہادر یار جنگ کے سری نگر میں درود سے تعلق
 رکھتا ہے، جو مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لئے کانفرنس کی
 دعوت پر آئے تھے۔ لیکن حکومت نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا، اس کے بارے
 میں لکھتے ہیں۔

"میر واعظ منزل میں پہنچ کر نواب صاحب نے ابھی دم بھی نہ لیاتھا

کہ حکومت کی جانب سے سری نگر سے ان کے اخراج کا حکم پہنچ گیا۔ اس
 خبر سے ہم سب گم شرم ہو گئے۔ ہمارے سامنے دو ہی راستے تھے کہ
 نواب صاحب خلاف ورزی احکام کریں یا وہ امر بھوری کشمیر سے
 واپس تشریف لے جائیں۔ ہمیں یہ خاطر کے اکثر ممبروں کی خواہش
 تھی کہ نواب صاحب قید ہو جائیں۔ لیکن نواب صاحب کو یہ پولیشن
 معتدل وجہ کی بناء پر منظور نہ تھی۔ مجھے بھی اس سے اتفاق تھا کیونکہ
 نواب صاحب کی گرفتاری سے مسلم لیگ کی پولیشن مخدوش ہونے
 کا احتمال تھا۔ امیدیں حالات ہم نے بمصداق "ہمارے
 صحبت باقی" نواب صاحب کو رخصت کیا۔

۱ سردار محمد ابراہیم خاں کی "منازعہ زندگی" میں جذبات
 کی وہ شدت نہیں ہے جس کے نمونے "کش کش" میں ملتے ہیں۔
 اس کے علاوہ ان کو ایک زیادہ سلیس انداز بیان پر قدرت ہے۔
 ایک بات ضرور ہے کہ "کش کش" میں مصنف کے ہر جگہ پیش نظر
 میں موجود رہنے کی وجہ سے اس کا مطالعہ دلچسپ بن جاتا ہے اس
 کے مقابلے میں سردار ابراہیم کی پیش کشی کا انداز زیادہ معروضی اور
 عموماً واقعاتی ہے تاہم واقعات اس میں دلچسپی پیدا کر رہے ہیں۔
 ذیل کے اقتباس سے اس کا اندازہ ہو سکے گا۔

"ان صاحب کے قاتی تجربہ زندگی کا یہ حال تھا کہ ان کے علم میں جمیل
 و لر بھی ایک افسانوی معاملہ تھا، تحقیق وجود ہی نہ تھا۔ ان صاحب
 کا ایک چکر ایک ماہ کے اندر کراچی سے ماہ پولیٹری نہ تھا تھا۔ اس طرح
 کہ کشمیر کے آزاد کرنے میں گویا وہ بہت بڑا کردار ادا کر رہے تھے۔

۵۳۲

ان کے انہروں نے غرشاہ کر کے ان کا دماغ اس قدر خراب کر دیا
تھا کہ واقعی وہ سکندر اعظم کے جانشین اپنے آپ کو سمجھنے لگے۔
”منشی نصیر الدین جن کو ”آئینہ“ کے ایڈیٹر نے ”بے نام مجاہد“
یہ شمار کیا ہے، آزادی کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے قربانیاں
دیئے ہیں اور اسی ایڈیٹر کے الفاظ میں ”ان کے فطوس اور ان کے
ایشانے بڑے لیڈروں کو جنم دیا۔ سلسلہ سے پہلے کئی عوامی حقوق
منوانے کے لئے انہوں نے جدوجہد کی تھی اور بعد میں بھی عرصہ تک
وہ سیاست کشمیر میں ایک سرگرم کارکن کی حیثیت سے جسد لیتے رہے۔
اب وہ عملی سیاست سے کنارہ کش ہو کر آزادی کی جدوجہد کی تاریخ
مُرتب کرنے میں مصروف ہیں جو جلد ہی مکمل اور شائع ہو جائے گی۔

پروفیسر بی۔ این۔ پٹیل (ولادت سری نگر ۱۹۰۸ء) سنسکرت کے عالم
فادری میں بھی دستگاہ رکھتے ہیں۔ محکمہ تعلیم سے ان کی ملازمت کی ابتداء ہوئی۔ کئی
کاجوں میں سنسکرت کے پروفیسر رہے۔ آخر میں پرنسپل ہو گئے تھے۔ جہاں سے وہ اب
ریسرچ لائبریریئر اور آرکائیور کی نظامت پر منتہل ہو گئے ہیں۔ پٹیل کے خاندان
میں علمی روایات عرصہ سے چلی آئی ہیں۔ ان کے خسر پونڈت لچھی نرائن کول کا تعلق
”بہار کشمیر“ لاہور سے ملا۔ پروفیسر پٹیل خود اپنے صاحبِ قلم ہیں۔ انگریزی میں لکھتے
ہیں اور سنسکرت ادب پر ان کی نظر گہری ہے۔ اردو میں بھی پروفیسر پٹیل
روانی سے لکھتے ہیں۔ ان کا خاص مطالعہ کشمیری شاعری ہے جس کے بعض پہلوؤں پر
انہوں نے مضامین لکھے ہیں۔ ایک مضمون جو کشمیری شاعری میں جذبات نگاری کے

۱۔ یہ تاریخ سری نگر کے ایک پبلشر علی محمد اینڈ سن کی طرف سے شائع کی جا چکی ہے۔

۲۔ پٹیل صاحب اب وظیفہ حسن خدمت حاصل کر رہے ہیں۔

عنوان سے کوئٹہ پوسٹس (جون ۱۹۵۴ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس میں لادیسے کے کر خود اپنے عہد تک شعرا، عارف، نادیم، روشن، امباردار، عارض، پریمی اور لاجی کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیلیت۔ اس کا اہتمام وہ اس طرح کرتے ہیں:

”موجودہ دور کی بہت ساری انبساطی شاعری، حال کی نہیں مستقبل کی کسی معلوم ہوتی ہے۔ اور ایسا لگتا ہے کہ مسرت کا اظہار حقیقی اور فطری بننے کے لئے ابھی بھی سازگار ماحول کی تلاش میں سرگرداں ہے۔“

پروفیسر ٹیپ نے کشمیری کے دو اہم شاعروں کے حالات اور انتخاب کلام پر رسالے مرتب کئے ہیں۔ ان میں سے ایک مہجور پر ہے اور دوسرا آفا پر۔ یہ دونوں رسالے کلچرل اکادمی کے لئے مرتب کئے گئے ہیں۔ اور سلسلہ انتخاب منظومات کشمیری میں شائع ہوئے ہیں۔ آزاد سے متعلق رسالہ ۱۹۵۹ء میں اور مہجور پر ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔ دونوں رسالوں میں پہلے شاعر کا تعارف ہے جس میں اس کی حیات کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد کلام پر تبصرہ، تبصرے، کشمیری شاعری کے بارے میں قدردانی کے جذبات کے ساتھ ساتھ تنقیدی شعور سے بھی پُر ہیں۔ ان کا اپنا مخصوص اسلوب بھی ہے اور اس کو وہ عرون تک کس طرح پہنچاتے ہیں، ذیل کے اقتباس سے واضح ہوگا:

”آزاد کی شاعری کا روشن ترین پہلو، ان کی انسان دوستی ہے۔

ان کے کلام میں جو بلیغ اور وسیع نظریہ ٹھہرا ہوا ملتا ہے وہ جمال اور جلال کی ہم آہنگی ہی میں پنپ سکتا ہے۔“

کشمیری ادبیات کا جائزہ دیتے ہوئے، انہیں ادبیات کے سماجی محرکات پر بھی غور کرنے کا موقع ملا۔ اور ان کی تخلیقی صلاحیتیں بھی تو آنا ہوتی گئیں۔ بہت جلد یہ اس مقام پر جا پہنچے جہاں غم جاناں اور غم دوران ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔

ہجور کی غزل کا چایزہ لیتے ہوئے، وہ کشمیری شاعری کے گونا گوں رجحانات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں اور ہجور کی غزل پر رسول میر کے اثر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”بے شک، ان سے پہلے رسول میر نے غزل کو تصوف کے کئی تصرف سے آزاد کر کے ناز و نیاز کی فطری کیفیتوں کا حسین ترین ترجمان بنا دیا تھا۔ اور شہاب کی تظام خیزوں کا ایک رنگین رقعہ پیش کیا تھا۔ لیکن میر کا انداز فارسی روایات کے بوجھ سے دبا دبا سا جان پڑتا ہے۔ اس کی بے ساختہ سُپردگی اور بے باک شوخی کا علاج ہوتے ہوئے بھی ہجور کو اس کی مختصر ترکیبیں اور اجنبی تشبیہیں ایک آنکھ نہ بھاسکیں۔ اسی لئے بہت جلد ان کی غزلوں میں رکبا خارجی کیا داخل، دونوں پہلوؤں سے) مقامی رنگ نکھر تا گیا۔“

غالب کا مطالعہ پروفیسر لُپٹ نے گہری نظر سے کیا ہے، چنانچہ ”غالب کا طنز و ظرافت“ کے عنوان سے انہوں نے ایک دلچسپ مضمون لکھا تھا، جو ماہنامہ ”تعمیر“ (شمارہ جنوری، فروری، ۱۹۶۰ء) میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون سے ایک اقتباس ذیل میں درج ہے، جس میں غالب کے عہد کے حوصلہ شکن حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”غرض کہ غالب کے لئے دنیا ایک ہیبت ناک غمکدہ بن گئی۔ انہیں کے الفاظ میں پوچھو کہ غم کیا ہے، غم مرگ، غم فراق، غم رزق، غم عزت، اس کثرت غم سے بھی اگر غالب سوداؤ بن جاتے اور قوت ہو کر یہ نہیں کھو بیٹھے تو اسے ان کی توانا شخصیت کا ہی کوشہ سمجھ لیجئے۔“

اردو کے شہرہ آفاق ادیب، ڈراما نگار اور یادگار کارنامہ "ٹائلنگ سنگر" کے مصنف صاحبزادہ محمد عمر کے فرزند صاحب زادہ حسن شاہ تاریخ کے اچھے عالم اور اردو ادب کے متعلم ہیں۔ جنہوں نے ان کے خاندان کا وطن ہے۔ جہاں انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اور اعلیٰ تعلیم کی تکمیل پنجاب میں کی، جہاں پنجاب یونیورسٹی سے انہوں نے تاریخ میں ایم۔ اے کا امتحان کامیاب کیا۔ اس کے بعد محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ پہلے لیکچرار رہے بعد میں پروفیسر اور پھر امر سنگھ کالج سری نگر کے پرنسپل ہو گئے تھے۔ کچھ عرصہ وہ ریسرچ لائبریری اور آرکائیوز کے ناظم بھی رہے۔ اس زمانے میں لائبریری میں جموں اور کشمیر کے مصنفین اور شعراء کے کارناموں کو اکٹھا کرنے کی سعی بلیغ کی۔ جو کتابیں دستیاب نہیں ہو سکی تھیں۔ ان کی نقلیں، میکروفلم یا فوٹو اسٹاٹ، سائے ملک اور بیرون ملک کے کتب خانوں سے فراہم کئے۔ رنیر کلکشن جس میں اردو کے بہت سے مخطوطات شامل ہیں اور جن کی تفصیل پچھلے صفحات میں دی گئی ہے اس کی تہذیب کی۔

صاحب زادہ حسن شاہ مستقر اعلیٰ اور ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ وہ عرصہ تک کلچرل اکیڈمی کے ترجمان "شیرازہ" کی مجلس مشاورت کے رکن رہے۔ کثیر کی تاریخ اور تمدن پر انہوں نے نئی معلومات آفرین مضامین لکھے اور شائع کئے ہیں، جن میں "عہدِ سلطانین میں کثیر کی تمدنی ترقی" اور "کثیر کا پہلا عوامی شاعر" — کشیشمند — قابل ذکر ہیں۔ کشیشمند کثیر میں بدھ مت کے زوال کے بعد منظرِ عام پر آیا تھا۔ اس نے اپنے زمانے میں کثیر کی سماجی زندگی کے بارے میں جو تاثرات چھوڑے ہیں وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے آج کے کبھی طنز نگار کے افکار معلوم ہوتے ہیں۔ اس زمانے کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے، شاہ صاحب لکھتے ہیں:-

”کشمیر میں بودھ تہذیب کے زوال کے بعد نویں سے بارہویں صدی کا دور برہمنی تہذیب کی نشاۃ ثانیہ کا زمانہ مانا جاتا ہے۔ اس زمانے میں سنسکرت شعر و ادب، شیو فلسفہ اور فن تعمیر کے شاندار شاہکار معرض وجود میں آئے۔ لیکن علماء، فلسفی اور فنکار سب انسانوں کی دنیا سے دور، دیوی، دیوتاؤں، عالم بالا، اور حیات بعد الممات کے دقیق مسائل کے محدود دائرے سے باہر نکلے نہ۔“

مبتذل سمجھتے تھے۔۔۔۔۔“
اس پس منظر میں، انہوں نے کھیشندر کے سماجی شعور اور عوامی اہمیت کے کاغذوں کو اُبھاڑا ہے۔ جس نے اپنے عہد کے مختلف سماجی طبقوں، جیسے طوائف، قحباؤں، بخیلوں کے بڑے دلچسپ اور مؤثر کردار پیش کئے ہیں۔

شاہ صاحب کئی کتابوں کے مختلف اور مرتب ہیں۔ ان کی مختصر تاریخ کشمیر، وسیع مطالعے کا پنچوڑ ہے جو مسلمین اور عام قارئین کو مجمل طور پر کشمیر کی کسی اور تمدنی تاریخ سے واقف کرانے میں بہت مفید ہے۔ ان کا قابل قدر کارنامہ پیر غلام حسن کی فارسی تاریخ کشمیر کی ترتیب اور تدوین ہے جس کی تین جلدیں اول، دوم اور چہارم، بسیط علما، مقدمے اور حواشی کے ساتھ سرکاری محکمہ ریسرچ کی جانب سے شائع ہوئی ہیں۔ پہلی جلد ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی۔

ڈاکٹر عزیز احمد قریشی وسیع دلچسپیوں کے حامل ہیں۔ جو ادب، تاریخ آثار قدیمہ اور مذہب پر لکھتے رہے ہیں۔ ان کے خاندان کا وطن مظفر آباد ہے جہاں وہ ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم لاہور اور دہلی میں پائی اور انگریزی میں ایم۔ اے کیا۔ پی۔ ایچ۔ ڈی تاریخ میں فرانسیسی اور جرمن زبانیں بھی جانتے ہیں اور ایل عمرے لکھ رہے ہیں۔ لاہور میں قیام کے زمانے میں وہاں کی علمی اور ادبی محفلوں

میں شریک ہونے کے موقعے نصیب ہوئے۔ چنانچہ علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان، پیرا خ حسن حسرت، ہری چند اختر، جیسے صاحب ذوق اصحاب کی صحبتوں میں ان کی ادبی تربیت ہوئی۔ ان کی تصانیف میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں:

۱۔ جدید تنقیدی زاویے، جس میں شاعری کے بارے میں اکثر جدید نقادوں کے تصورات کو پیش کر کے، اس کے مفہوم کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ شاعری کے متعلقات، تخیل، وجدانیت، لاشعوریت، ابہام اور اسلوب اور بنیادوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

۲۔ ہماری قومی انقلابی شاعری۔ اس میں سیاسی شاعری، قومی شاعری

انقلابی شاعری کی تفہیم اور ان موضوعات پر اردو شاعری کے اچھے انتخابات اکٹھے کر دیئے ہیں۔ آزادی ہند اور بٹوارہ کے بارے میں جن شعراء نے نظمیں کہی ہیں ان کو منتخب کر کے شامل کر لیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۵۹ء میں لکھی گئی۔

تاریخی موضوعات، خاص طور پر کشمیر کی تاریخ پر ان کی تصنیف "اسرائل کشمیر" جو چار جلدوں میں لکھی گئی ہے، کشمیری قوم، اس کے آثار، رسم و رواج اور زبان کے بارے میں ہے، جس کی صرف ایک جلد شایع ہو سکی ہے۔ ان کی دوسری تاریخی تصانیف میں کشمیری کتبوں کے بارے میں ایک کتاب قابل مطالعہ ہے۔

مذہب اور اس کے مخصوص موضوعات پر بھی ان کی تصانیف ہیں جن میں "حجتہ السالکین" جس میں اپنے روحانی تجربوں کو سائنسی دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس موضوع پر ان کی دوسری تصانیف، حجتہ الامامہ، سُرُہ بصیرت

اسلام میں طریقہ طلاق، مسئلہ ختم نبوت، خیال تصانیف ہیں۔ مارکس اور اس کے نظریوں پر بھی انہوں نے کچھ رسالے لکھے ہیں۔

ڈاکٹر عزیز احمد کو شعر و سخن سے بھی لگاؤ ہے۔ اور کافی ذخیرہ نظموں کا

لے قریشی صاحب کا انتقال سری نگر میں ہو چکا ہے۔

اکٹھا کر لیا ہے۔ جن میں سے چند رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ کچھ عرصہ وہ رسالہ "گلبریز" کو بھی مرتب کرتے رہے۔

مشہور عالم فلسفہ، خلیفہ عبدالحکیم، جو اقبال کے نقاد کی حیثیت سے دنیائے ادب میں ممتاز ہیں، کثیر سی نثر لکھے۔ ان کا خاندان پنجاب میں منتقل ہو گیا تھا۔ لاہور میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی اور پنجاب یونیورسٹی سے فلسفہ میں ایم۔ اے کرنے کے بعد وہ عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد میں فلسفہ کے استاد ہو گئے تھے۔ یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران وہ جرمنی گئے اور ٹیڈ لبرگ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی حاصل کی۔ حیدرآباد لوٹنے کے بعد وہ فلسفہ کے ریڈر ہو گئے اور آخر میں پروفیسر بھی رہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے وظیفہ پرسبکدوش ہونے سے قبل، وہ کثیر بلائے گئے اور ناظم تعلیم اور امر سنگھ کالج کے پرنسپل بھی رہے۔ ۱۹۴۸ء میں عثمانیہ یونیورسٹی لوٹے، جہاں فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین منتخب ہوئے۔ اس کے بعد وہ لاہور چلے گئے، جہاں اقبال اکادمی کے ناظم کی حیثیت سے اقبال کے فکرو فن کی توضیح اور تشریح کی اہم خدمات انجام دیں اور کئی تصانیف کیں۔

خلیفہ کو شعر و سخن سے بھی لگاؤ تھا۔ انہوں نے کئی خیالی زانظیں لکھی ہیں، کثیر میں قیام کے زمانے میں انہوں نے کثیر پر ایک نظم بھی لکھی جو اپنے وطن سے ان کے جذبات محبت کا آئینہ دار ہے۔ نظم حسب ذیل ہے:-

وادی تری ایمن ہے تو پرست ترا سینا	دھرتی کا نگینہ
اس پر یہ غلامانہ مشقت کا پسینا	اذکار ہے سینہ
مرنے سے ہے بدتر تما اس طرح سے جینا	یوں زہر کا پینا
کریادو ذرا موسیٰ عمران کی تدبیر	اسے خطہ کثیر

افسوس کہ اٹھتی نہیں سینے سے فغاں ایک
 ہے گرچہ زباں ایک
 مقصد نہیں رکھتے ہیں ترے پیر و جاں ایک
 مطلب ہے کہاں ایک
 لازم ہے کہ ہو قوم عیاں، ایک نہاں ایک
 سب غور و کلاں ایک
 وابستہ ہوں باہم صفت، علقہ زنجیر
 اسے خطہ کشمیر

کچھ لعل تری کان کے بیرون وطن ہیں
 جو فخرِ زمین ہیں
 بیرونِ چمن بھی ترے کچھ سروِ کمن ہیں
 اور تابہ دکن ہیں
 بنِ نافوں کی خوشبو سے معطر ہوئے بن ہیں
 بیرونِ ختن ہیں
 ماتم میں ترے صورتِ گلِ سینہ دیا چہر
 اسے خطہ کشمیر

ماسٹر موہن لال جنہوں نے تعلیمی موضوعات پر کچھ تصانیف لکھی ہیں، میرپور
 کے متوطن تھے۔ اور وہاں ایک سکول میں اُردو کی تعلیم دیتے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد وہ
 جموں آگئے اور یہاں بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ اب سرکاری ملازمت
 سے سبکدوشی کے بعد، خود علومِ مشرقی کی تعلیم کا ایک ادارہ قائم کیا ہے اور کشمیر اور
 جموں یونیورسٹی، علی گڑھ اور جامعہ اُردو کے امتحانات کے لئے امیدواروں کو تیار
 کر رہے ہیں۔

صحافت اور صحیفہ نگار

برطانوی ہند کے علاقوں میں، عوامی اخباروں کی اجماعی کے بعد سے ریاست کے اہل قلم اصحاب میں 'ریاست سے بھی عوامی اخبار جاری کرنے کی جو خواہش پیدا ہو گئی تھی، اور جس کی پیش رفت کے لئے کوششیں بھی ہوئیں۔ ان میں سے پنڈت سنگرام سنگھ اور ان کے بھائی پنڈت ہرگوبال کوئلہ کی جدوجہد کی طرف پچھلے صفحات میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ مہاراجہ کے دربار سے نا اُمید ہو کر، کئی دلچسپی رکھنے والوں نے، لاہور، امرتسر اور سیالکوٹ وغیرہ سے جو اخبار نکالے تھے، ان کی تفصیل بھی دی جا چکی ہے۔ سنگھ کے بعد ان مساعی میں جو پیش پیش رہے ان میں لالہ ملک راج صرف خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ صراف نے سب سے پہلے ۱۹۲۱ء میں مہاراجہ پر تپ سنگھ کے پاس پریس کے قیام اور اخبار کے اجراء کے لئے درخواست پیش کی تھی، جو نا منظور ہوئی۔ لیکن وہ نا اُمید نہیں ہوئے اور اپنی کوشش برابر جاری رکھی۔ چنانچہ ۱۹۲۲ء میں پھر درخواست پیش کی۔ لیکن اس کا انجام بھی پہلی درخواست سے کچھ بہتر نہیں ہوا۔ آخر ۱۹۲۴ء میں حالات کچھ ایسے سازگار ہوئے کہ انہیں اجازت مل گئی۔ اور ان کے ہفتہ وار "دنبیر" کا پہلا شمارہ ۲۴ جون ۱۹۲۴ء کو جموں سے شائع ہوا۔ لالہ ملک راج صراف نے اپنی ان مساعی کی تفصیل اپنی خود نوشت "فضلی ایبز اینز اے جرنلسٹ" میں اپنی زندگی کے حالات کے ساتھ وہ اپنا اخبار جاری کرنے کی فکر میں لگ گئے۔

"دنبیر" کے پہلے شمارہ میں انہوں نے اخبار کے مقاصد میں تعلیمی ترقی سماجی اصلاح اور بہبودی، بے گار کے طریقے کی مسدودی، دیہاتی قرضداری کی سبکدوشی، ملک کی زراعتی، صنعتی، مالی اور تجارتی ترقی کی سعی، ریاست میں آمد و رفت کے وسائل

کی ترقی اور صحت عامہ کے لئے کوششوں کو شامل کیا تھا۔ اخبار کے سرنامے پر یہ اشعار درج تھے۔

مل جل کے ہم ترانے حب وطن کے گائیں
بلبل ہیں جس جن کے گیت اس چن کے گائیں
اظہار حال ملکی خاص اس کا مدعا ہے
رنبیر نام کا یہ جسم، جہاں نما ہے

اس شماره کے ادارہ میں اغراض و مقاصد کی تفصیل لکھی تھی۔ اس کے علاوہ مشاہیر کے مبارک باد کے پیامات بھی اس میں شامل ہیں۔ جن میں پریم چند کا نام خاص طور قابل ذکر ہے۔ پہلے صفحہ پر اخبار کی تعریف میں ایک نظم بھی درج کی تھی، جس کے کچھ شعر حسب ذیل ہیں:-

آوپیدا کریں پھر مل کے وہ آن رنبیر
پھر سے عالم کو دکھادیں وہی شانِ رنبیر
اس کے آنے سے سدھر جائے گی حالت اپنی
خیر مقدم کو بڑھو، آیا جوانِ رنبیر
ہندو مسلم کی حمایت یہ کرے گا دل سے
فقرہ بازی سے نہ پُر ہوگا بیانِ رنبیر

اخبار میں خبریں، خبروں پر تبصرے اور نقلیں بھی شامل ہوتی تھیں، اس کے مکملنے والوں میں لالہ ہنس راج دکیل، سروا بیدہ سنگھ، پنڈت ہرکشن لال حبیب، سید ذوالفقار علی نسیم رضوی، مولوی محمد زین العابدین کو ہی پنڈت رام سرن داس شاندار، ایڈیٹر، راجستان ڈاکٹر برکت رام، لالہ ہالکھ ورم، سرو شری وشنو ناتھ کونی، حبیب اللہ، شری رام، گمردھاری لال آنند، ایس، ایس، انشلا، سرن ناتھ

آفتاب، ارجن سنگھ غرٹس، بنی لال سوہی، قیس شیرانی، منوہر لال دلی،
 مستقر اداس، میرزا مبارک بیگ، ماسٹر زندہ کول ثابت، نرسنگ مہاں چٹان،
 امر ناتھ شاہد، سیوک رام بھیر، غلام حیدر خاں چستی، محمد اکبر انگر، صاحب بازو
 محمد عمر، محی الدین قمر قراری، گوسائیں تارا چند، پنڈت انند رام ڈوگرہ، پنڈت
 لوک ناتھ شرما، سردار ہند سنگھ، لالہ رام مرن داس ملہوترا، پنڈت پنڈی داس
 گوسامی، سردار کاہن سنگھ بلاوریہ، ڈاکٹر ہری چند ہری، پنڈت نند لال کول
 طالب، سردار دلپ سنگھ، رائے زادہ لکشی چند کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں؛
 ان میں بہت سے ریاست کے اہل قلم ہیں، جن کا ذکر اس کتاب میں شامل ہے۔ شعراء
 میں کشن سیل پوری، لالہ بدری ناتھ وکیل، پنڈت پریم ناتھ سادھو پردیس، رونی،
 میرزا مبارک بیگ، مبارک، رام کشن فاضل کے افکار اس میں وقتاً فوقتاً شائع
 ہوتے تھے۔

آر ایس۔ داس، بھی کبھی کبھی رنیز میں لکھتے تھے۔ ان کا ایک معلومات سے
 پُر مضمون راجپوت اور ٹھکڑے کے باہمی رشتے پر اخبار کے ایک شمارہ (۱۷ سادون ۱۹۹۵
 بکرمی) میں شائع ہوا تھا۔

رنیز پہلی دفعہ چھ سال جاری رہنے کے بعد ۱۹۳۰ء میں 'مہاتما گاندھی کی گرفتاری
 کے بارے میں خیر اور تبصرو چھپانے کی پاداش میں بند کر دیا گیا۔ ایڈیٹر کی اس سلسلے میں
 مہاراجہ کے پاس نمائندگی کے باوجود، جب مسودہ کی احکام منسوخ نہیں ہوئے تو
 صرف نے لاہور جاکر وہاں سے 'امن ہفتہ' وار جاری کیا اور پنڈت گنگا ناتھ شرما اور
 لالہ شیو رام گپتا جو 'رنیز' کے جوائنٹ ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ اخبار کی ادارت اور
 انتظام میں صرف کے شریک تھے لیکن کچھ عرصے کے بعد یہ اخبار بند ہو گیا۔ اس اخبار
 کے بند ہونے کے بعد کشن سیل پوری کے ساتھ مل کر انہوں نے 'رنیز' جاری کیا جس میں

۵۲۳

کشمیر میں سے متعلق خبریں زیادہ چھپی تھیں۔

صراف کو ریاست اور باہر کی صیافتی برادری میں اہم مقام حاصل ہو چکا تھا۔ ان کی کوششوں سے ریاست میں آل جوں ایڈ کثیر جرنلسٹ ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا اور وہی اس کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۳۲ء میں آل جوں و کشمیر نیوز ایڈیٹرز ایڈیٹرز کانفرنس منعقد ہوئی تو اس کی صدارت کے لئے بھی انہیں کا انتخاب عمل میں آیا۔ ہیلنکی میں عالمی صحیفہ نگاروں کا چھپلا اجلاس منعقد ہوا تھا۔ اسی میں ہندوستان کی نمائندگی کے لئے صراف کو نامزد کیا گیا تھا۔ اسی زمانے میں وہ روس کے دورہ پر بھی گئے۔ ۱۹۶۶ء میں وہ انڈین فیڈریشن آف ورکنگ جرنلسٹ کی مجلس عاملہ کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۶ء میں بحیثیت صحیفہ نگار انہوں نے پچاس سال پورے کمرے تو اس کی گولڈن جوبلی منائی گئی۔ اس سال انہوں نے اپنی خود نوشت بھی شائع کی۔

صراف نے رنیر کے ادوار سے بچوں کے لئے ایک رسالہ "رتن" کے نام سے بھی جاری کیا تھا۔ اس کے پہلے ایڈیٹر شانتی سرورپ نشاٹ مقرر ہوئے تھے جو رنیر کے اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی تھے۔ اس کا اجراء ۱۹۳۴ء کے اواخر میں ہوا تھا۔ اس زمانے میں بچوں کی دلچسپی کے بہت کم رسالے شائع ہوتے تھے۔ اس لئے "رتن" کو ہندوستان بھر کے ادبی حلقوں میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ رسالہ مضامین کے تنوع اور ترتیب کے سلیقے کی وجہ سے ایک مقام حاصل کر چکا تھا۔ بچوں کی ذہنی سطح کے ادبی مضامین کے علاوہ اس میں افسانے اور نظمیں بھی شامل ہوتی تھیں۔ "رتن" کے ابتدائی دور کے لکھنے والوں میں ہندوستان کے مشہور اہل قلم حضرات کے علاوہ لالہ ہنس راج، اندر پرکاش، پر تاپ سنگھ، آگیا رام، عشرت رحمانی، دینا ناتھ صراف، پنڈت شیم لال ایم، سہیل عظیم آبادی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

رسالے کے اجراء کے دو سال بعد، شانتی سرورپ نشاٹ کی بھلنے، لالہ

۵۳۴

ملک راج صرف کے فرزند اوم پکا کشن صرف اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ
 گھڑن لال نے بھی اس کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ لیکن جب وہ دہلی یونیورسٹی
 میں تاریخ کے استاد ہو کر چلے گئے۔ تو صرف نے اس کی ترتیب اشاعت کی نگرانی
 خود اپنے ذمہ لی، یوں بھی وہ عام طور پر اس کی ترتیب اور اشاعت میں ہاتھ بٹاتے
 تھے۔ پندرہ برس موہن دتا تریہ کیفی اس زمانے میں ریاست کی ملازمت میں تھے۔
 انہوں نے ایک موقع پر اس کے ہائے میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ اس میں جو مضامین
 جمع کئے جاتے ہیں اور جس انداز سے اس کی ترتیب ہوتی ہے، قابلِ تعریف ہے۔ "رتن"
 کے خاص مصور شمسے بھی شائع ہوتے تھے۔ یوراج کرن سنگھ کی سال گرہ کے موقع
 پر بھی اس کے خاص شماروں کی اشاعت کا انتظام کیا جاتا تھا۔ ۱۹۴۵ء کے لگ بھگ
 اس رسالے کی اشاعت پچیس ہزار تک پہنچ گئی تھی اور جب کہ لال ملک راج صرف
 نے اپنی خود نوشت "ففتی ایریز ایز اس جرنلسٹ" میں لکھا ہے :-

"ان ریاستوں اور برطانوی ہند میں جہاں اردو بولی جاتی ہے"

اربابِ تعلیم نے اسے منظومہ رسائل کی فہرست میں شامل کر لیا تھا۔"

"دبیر" کے اجراء کے بعد سے جنوں میں اخبار کے اجراء کا راستہ گویا کھل گیا۔

اور کئی شوق اخبار اور کچھ رسالے شائع ہونے لگے۔ لال شیو رام گپتا کا "امر" اور
 نرسنگ داس ترگس کا چاند" کافی مقبول رہے۔ شیو رام گپتا جنوں کے مشہور انشا پرداز
 اور صحیفہ نگار ہیں اور لال ملک راج صرف کے رفیق کار رہے ہیں۔ "امر" میں بچوں
 کی دلچسپی کے مضامین خاص طور پر شائع ہوتے تھے۔ اس کے خاص شمارے بھی
 نکلتے۔ جن میں تعلیم بالغاں، دیہات سدھار نمبر اور یوراج کرن سنگھ (سابق صدر
 ریاست اور گورنر اور مرکزی دبیر، ہند) کی سال گرہ کے موقع پر نکالا ہوا "کرن نمبر"
 کچھ پائیدار دلچسپی رکھنے والے مضامین پر مشتمل ہیں۔ غلام حیدر خاں چستی ان

خاص نمبروں کی ترتیب میں لالہ شیو رام کی مدد کرتے تھے۔

دیوان نرسنگ داس نرگس، جن کا تذکرہ گذر چکا ہے، ایک ادارہ کی حیثیت حاصل کر چکے تھے۔ تعینف و تالیف اور صحیفہ نگاری کا یہ ادارہ ایک سادی نام دیوان برادر س سے متعارف ہے جس سے چاند کے علاوہ رسالہ پریم بھی نکلتا تھا۔ یہ رسالہ ملک بھر میں مقبول رہا۔ اس کے ایڈیٹر نرگس کے فرزند اقبال تمنائی تھے۔ گلزار احمد فدائے بھی اس کی ادارت کی۔ یہ ۲۳-۱۹۲۲ء سے ۱۹۴۶ء تک نکلتا رہا۔ اس زمانے کے سارے مشہور انشاء پرداز اور شاعر، اس میں لکھتے تھے۔ جن میں خاص طور پر اندرجیت لطف، منوہر لال دلی، محبوب یاسمین، پردیسی، منہاس، انند رکھا ساغر، صادق کاشمیری، رونق کاشمیری، رسا جادوانی، اعجاز ساقی، دیا کرن گرویش، کشن سیل پوری، حمید نظامی، حبیب کیفوی، معراج الدین احمد، اور غلام حیدر خاں جیتی قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے بعض کا اس تاریخ میں شاید اور کہیں تذکرہ نہ آ سکے گا۔

جوں سے ایک اور ماہ نامہ "فردوس" کے نام سے قیس شیردانی نکالتے گئے تھے اور کشمیری لال ذکر بھی قیس کے ساتھ ادارت میں شامل تھے۔ "گلاب" بھی جوں سے نکلتا تھا اور دینو بھائی پنٹ اس کے سربراہ تھے۔ "کشمیر پرنس" اور "پکار" بلراج پوری نکالتے تھے۔ جو جوں کے مشہور سیاست دان اور قائد ہیں۔ ان کی ولادت جوں ہی میں ۱۹۲۸ء میں ہوئی۔ وہیں پرنس آف ویلز کالج میں تعلیم پائی اور بی۔ اے کامیاب کرنے کے بعد، دہلی گئے اور دہلی یونیورسٹی میں معاشیات میں ایم۔ اے کیا۔ سیاست اور صحافت سے انہیں نوعمری ہی سے لگاؤ رہا۔ چنانچہ ابھی وہ پندرہ برس کے تھے کہ اخبار نکالنے کی خواہش ہوئی۔ لیکن مبالغہ کرنے کی وجہ سے خود اخبار نہیں نکال سکتے تھے۔ اس لئے ایک اور صاحب

کو ایڈیٹر بنایا اور ۱۹۴۲ء میں "کثیر سنسار" ہفتہ وار نکالا۔ اخبار مقبول بھی ہوا جس کی وجہ سے ایڈیٹر میں اور ان میں اخبار کی ملکیت کے بارے میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ تو خود انہوں نے ایک نیا اخبار "لیکار" ۱۹۴۴ء میں جاری کیا۔ جسے وہ خود مرتب کرتے تھے۔ اس اخبار کا ایک حقتہ ادبی بھی ہوتا تھا۔ جس کے لئے وہ خود اور اثر کھنوی قیس شیروانی، صاحب زادہ محمد عمر اور دوسرے ادیب لکھنا کرتے تھے۔

کالج میں تعلیم کے دوران پوری کے سپر و کالج کے رسالے "طی" کی ادارت بھی رہی۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ نیشنل کانفرنس کے سرگرم رکن بن گئے۔ لیکن ۱۹۵۱ء میں نیشنل کانفرنس سے علیحدہ ہو گئے۔ اور اگلے سال پر جاسوشلسٹ پارٹی میں شامل ہو کر اس کی ریاستی شاخ منظم کی۔ اسٹیٹس، پیپلز کانفرنس کی سٹیرنگ کمیٹی کے بھی وہ رکن رہے اور ۱۹۶۶ء میں جوں اٹانوی فورم کے نام سے ایک سیاسی تنظیم قائم کی، جو اب بھی موجود ہے۔

پوری کی ادبی دلچسپیاں ابتداء سے تھیں۔ وہ بزم اُردو کے رکن رہے اور ۱۹۴۷ء میں جب ڈوگری سنسٹھا قائم ہوئی تو وہ اس کے رکن منتخب ہوئے۔ اپنے اخبار کے علاوہ وہ دوسرے مقامی اور باہر کے اخباروں میں مضامین لکھتے رہے۔ مضامین کا مجموعہ "گلدستہ مضامین" کے نام سے مرتب کیا ہے۔ جس میں ادبی سماجی، سیاسی اور معاشی موضوعات پر مضامین شامل ہیں۔ ان کی ایک اور دلچسپ اور مفید کتاب "سائنس دانوں کی کہانی" ہے جو عنقریب شائع ہو سکے گی۔ ایک دو محقر کتابیں یا رسالے بھی انہوں نے لکھے ہیں۔ جن میں "نئے بھارت کی تعمیر کا نقشہ" اور "ترقی کی حقیقت چھپ چکے ہیں"۔ "ششیر" سردار گھیسر سنگھ ملک نکالتے تھے۔

۷۔ یہ دراصل اسٹیٹ پیپلز کونشن ہونا چاہیے۔ جو شیخ محمد عبداللہ نے سرنگرم میں طلب کیا تھا۔

لالہ ملک راج مراد نے اپنی تصنیف "فغنی ایروزا اے جرنلسٹ" میں اس زمانے کے جموں کے اخباروں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی تعداد تین درجن کے قریب بتائی ہے۔ جموں کے اخباروں کی اس کثیر تعداد کے علاوہ جموں کے ملحقہ علاقوں جیسے پونچھ اور میر پور سے بھی اس زمانے میں اخبار نکالنے لگے تھے۔ پونچھ کا مردم خیز علاقہ ریاست اور غاص طور پر جموں میں شعر و ادب کا ذوق پھیلنے کے ساتھ ہی انشاء پردازوں اور خوش فکر شعراء کی افزائش کا مرکز بن گیا تھا۔ چنانچہ چراغ حسن حسرت، سروں ناتھ آفتاب اور کٹی سخن سنج اور انشاء پرداز یہاں سے اُٹھے۔ پونچھ میں صحافت کی ابتدائی کوششیں، دیانند کپور سے شروع ہوئیں جو چراغ حسن کے گہرے دوست تھے۔ انہوں نے ایک ہفتہ وار "پرکھات" کے نام سے جاری کیا تھا جس میں خود ان کے علاوہ حسرت اور اس زمانے کے مشہور لکھنے والے قلمی طور پر لکھتے تھے۔

منش سراج الدین اس زمانے کے مشہور صحیفہ نگاروں میں سے تھے، وہ "پاسبان" لکھتے تھے۔ اور اس زمانے کے دوسرے اخباروں میں بھی لکھتے تھے۔ ان کا ایک اچھا مضمون ہے "مذہب نہیں سکھاتا، آپس میں سیر رکھنا" جو ان کے اخبار میں شائع ہوا تھا۔ اس کا ایک اقتباس ذیل میں درج ہے د

کاش انسان اساز فطرت پر چھپرے ہوئے لغویں کو لئے اور ان لغویں کے اندر جو درس پایا جاتا ہے، ان کی ماہیت کو سمجھے تو پھر بتلائے کہ مذہب جس منزل کی طرف لے جاتا ہے، جس ہستی کے نام کا وظیفہ پڑھنے کا حکم دیتا ہے اور جس ابدی خوشی کو منانے کی ترغیب دیتا ہے۔ وہاں دشمنی کے لئے کسی گوشے میں بھی جگہ ہے۔"

اس میں عام دلچسپی کی خبروں اور تبصروں کے علاوہ، خاص طور پر مسلمانوں
 بسکھوں اور ہندوؤں کے مفاد کے مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ پونچھ کے مزید
 اخباروں کے نام یہ ہیں: "صداق"، "الجماد"، "آفتاب"، "دہبر"، "صداق" ضیاء
 ضیائی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اور زیادہ تر مسلمانوں کے مفادات سے تعلق رکھتا
 تھا۔ یہی صورت "الجماد" کی بھی ہے، جو ۱۹۳۲ء میں شیخ نبی بخش نظامی کی ادارت
 میں شائع ہونے لگا تھا۔ کچھ عرصہ جاری رہنے کے بعد یہ دونوں اخبار بند ہو گئے۔
 "آفتاب" سروں ناتھ آفتاب کا اخبار تھا۔ جس کی اشاعت ۱۹۲۷ء سے عمل میں
 آنے لگی تھی۔

میرپور سے نکلنے والے اخباروں میں "صداقت"، "ہمت"، اور "سچ" بہت
 اہم ہیں۔ "ہمت" لالہ گیان چند کا اخبار تھا۔ جو اس صدی کے تیسرے دہے
 میں جاری کیا گیا تھا اور ۱۹۲۸ء تک جاری رہا۔ اس کا مقصد ہندوؤں کے مفاد
 کی نگہداشت تھی۔ "ہمت"، میرپور کے مشہور فداۓ قوم راجہ محمد اکبر خان نے
 جاری کیا تھا۔ راجہ ریاستی مسلم کانفرنس کے سرگرم کارکن اور قائد تھے۔ اور
 ابتداء میں مسلم مفادات کی خاطر لڑتے رہے۔ ان کے خلوص اور ان کی لگن کا یہ علم
 تھا کہ وہ میرپور سے پاپیادہ سفر کرتے ہوئے سری نگر آتے تھے۔ اور راستہ بھر تنظیم
 کے کاموں میں لگے رہتے تھے۔ حکومت کے احکام سے جب یہ اخبار بند ہو گیا تو انہوں
 نے "سچ" جاری کیا تھا۔ جو "ہمت" کی طرح ہفتہ وار تھا۔ "سچ" ۱۹۴۰ء میں
 جاری ہوا تھا۔ لیکن جب مسلم کانفرنس، نیشنل کانفرنس میں تبدیل ہو گئی، تو راجہ
 محمد اکبر خان قوم پرست لیڈر بن گئے۔ اور شیخ محمد عبداللہ کے دوش بدوش
 آزادی کی جدوجہد کے لئے کام کیا۔ ابتداء میں وہ فوج میں ملازم تھے، لیکن قومی
 خدمت کے جذبے نے ان سے ملازمت ترک کرائی اور وہ سیاست میں جھٹھ لینے

۵۴۹

لگے۔ راجہ قشمریال مقرر بھی تھے۔ چنانچہ ان کی تقریروں کی اثر آفرینی کے واسطے
میں صدر الدین مجاہد لکھتے ہیں کہ — ”وہ بہترین مقرر تھے، ان کی تقریریں
میں مجاہد کا اثر تھا“ (مخاڑہ سری نگر، شمارہ اول)۔ ڈوگر مطلق العنانی کے خلاف
ان کی سیاسی سرگرمیوں کی پاداش میں انہیں کئی بار قید و بند میں رہنا پڑا۔
”سچ“ بہت صاف سقا اختیار تھا۔ جس میں ملکی ضرورتوں کے علاوہ خبروں
پر تبصرے بھی شائع ہوتے تھے۔ قومی نقطہ نظر سے وہ ترقی پسند اصول حکومت اور
سماجی اصلاح کے تصورات کا وکیل تھا۔ ۲۴ جنوری ۱۹۵۲ء کے اخبار میں اس کی پالیسی
کا اعادہ اس طرح کیا گیا ہے۔

”سچ“ مطلق العنان حکومت کے خلاف آواز بلند کرتے، جاگیردارانہ
نظام کو ختم کرنے، غریب اور نادار عوام کو سرمایہ داروں کے چنگل سے
آزاد کرنے، تباہ کن بد رسوم کو ملک سے ہٹانے، فرد پرستی کو ختم
کرنے اور نیشنل کانفرنس کا اتحاد اور پریم بھڑا پیام عوام تک
پہنچانے کے لئے میدان میں آیا۔“

راجہ محمد اکبر خان کے انتقال کے بعد اس کی ترتیب اور اشاعت کا کام ماسٹر
روشن لال نے سنبھالا اور اب تک یہ اخبار جاری ہے اور مدعا نہ کر دیا گیا ہے۔
”سچ“ نیشنل کانفرنس کے ترجمان کی حیثیت سے شائع ہو رہا ہے۔

سری نگر میں مصافحتی جدوجہد کا علما آغا ۱۹۶۲ء سے ہوا۔ جب پریم ناتھ بزاز
نے اپنا اخبار ”وقت“ ہفتہ وار جاری کیا۔ سری نگر اور عام طور پر کشمیر میں مصافحتی اور
انشا پردازی کا شوق پیدا کرنے میں اس اخبار کو وہی اہمیت حاصل ہے جو جوں
اور اس پاکستان کے علاقوں میں رہنے کو حاصل رہی۔ یہ اخبار آزاد پالیسی کا حامل
تھا۔ اس لئے اسے حکومت کے حکم سے کچھ عرصہ بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد بنانے

ایک اور اخبار ہمدرد کے نام سے جاری کیا۔ اس طرح بڑا کثیر کے لئے بابائے صحافت کا مقام رکھتے ہیں۔

بزاز کی ولادت ۱۹۱۷ء میں سری نگر کے ایک برہمن خاندان میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم سری نگر میں حاصل کی، پھر پنجاب سے ۱۹۲۷ء میں بی اے کامیاب کیا۔ اس کے بعد سے وہ عوامی زندگی میں حصہ لینے لگے۔ پہلے وہ سری نگر کے ایک گورنر اسکول کے سوپر وائزر رہے۔ ۱۹۳۱ء میں جب حکومت کی جانب سے عوام کی شکایات کی تفتیش کے لئے کمیشن مقرر ہوا، تو بزاز اس کے رکن بن گئے۔ اور دستوری اصلاحات کمیشن کے بھی وہ رکن رہے۔ ۱۹۳۶ء میں انہوں نے صحافت میں قدم رکھا اور اپنا روزنامہ "وہستہ" جاری کیا، جس کا مقصد سیاست میں غیر مذہبیت اور آزادی اور جمہوریت کے تصورات کی اشاعت تھی۔ ۱۹۳۵ء میں انہوں نے ایک ہفتہ وار "ہمدرد" کے نام سے بھی جاری کیا تھا۔ کشمیر میں آزادی کی جدوجہد کی صف اول کے قائدین میں ان کا مقام ہے۔ چنانچہ اسی کی پاداش میں ۱۹۳۸ء میں وہ گرفتار ہوئے اور چھ ماہ بعد رہا کئے گئے۔ ۱۹۴۵ء میں وہ دوبارہ قید ہوئے اور اس دفعہ تین سال بعد رہا ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں وہ کشمیر میں خارج البلد بھی کئے گئے۔

بزاز سیاسی میدان میں عرصہ تک شیخ محمد عبداللہ کے دوش بدوش کام کرتے رہے اور سیکولر ازم، جمہوریت اور آزادی کا پرچار کرتے رہے۔ بزاز کا تعلق ایم۔ این۔ رائے کی ریپبلکن ڈیموکریٹک پارٹی سے بھی رہا۔ غرض کشمیر کی سیاست میں وہ بہت سے اہم کولے کھاتے رہے، یہاں تک کہ اب ان کے صحیح سیاسی عقائد کا اندازہ لگانا دشوار ہو گیا ہے۔

وہستہ چار پانچ سال جاری رہنے کے بعد سیاسی اسباب پر بند

۱۔ بزاز کے والد دراصل سنیل (سوناداری) کے رہنے والے تھے (ٹینگ)

کر دیا گیا۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے تو ہزار نے "ہمدرد" کے نام سے ایک اور ہفتہ وار جاری کیا۔ جس کے حلقہ ادارت میں پنڈت، منہ لال، وائل، پرستوی، ناتھ کول اور پتیسر ناتھ فانی بھی ان کے ساتھ شامل تھے۔ ہزار کی سیاسی زندگی کی طرح، ان کے مشاغل بھی متنوع رہے۔ جب کبھی قید بھی ہوئے، قید سے چھوٹنے کے بعد نئے عزائم کے ساتھ میدان سیاست میں آتے رہے۔ ۱۹۵۵ء میں جب انہیں کشمیر سے خارج البلد کیا گیا تو وہ دہلی میں مقیم رہے اور وہاں سے "دیس آف کشمیر" کے نام سے ایک ماہنامہ انگریزی میں جاری کیا تھا۔ ۱۹۴۴ء کے بعد "دستقا" جب دوسری بار ریٹکھنے لگا تو کچھ عرصہ بعد انہوں نے اسے ہندی میں منتقل کر دیا۔ "ہمدرد" کے ایڈیٹر ۱۹۴۸ء میں پنڈت جگن ناتھ سمٹو تھے۔

ہزار انگریزی اور اردو میں کئی مستقل تصانیف اور رسالوں کے مصنف ہیں۔ انگریزی تصانیف "تذکرہ حصہ انگریزی میں آیا ہے۔ ان کی مستقل اردو تصانیف میں "کشمیر کا گاندھی" جو شیخ محمد عبدالقد کی سوانح حیات ہے — "شاعر انسانیت" کشمیری کے شہور شاعر عبداللہ آزاد کے حالات اور کلام پر تبصرہ اور "گاندھی ازم، جناح ازم اور سوشلزم" وقتی مسائل کی تصانیف سے کچھ زیادہ اہمیت ہی رکھتی ہیں۔ ان کے جاری کردہ اخباروں میں تو ان کی تحریر کا حصہ زیادہ ہوتا تھا۔ لیکن اپنے اخباروں سے ہٹ کر بھی وہ مضمون لکھتے رہے۔ ۱۸ دسمبر ۱۹۴۰ء کے شمارہ "مارننگ" میں انہوں نے "قومی زبان اور اس کا رہنم خط" کے عنوان سے ایک خیال آفرین مضمون شائع کیا تھا۔ اس کے ایک ذیلی عنوان "ہندو لیڈر کیا کہتے ہیں" کے تحت انہوں نے دیوناگری رسم خط کی اہمیت کے بارے میں جو خیالات ظاہر کئے تھے اس کا اقتباس ذیل میں درج ہے:

"یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندو لڑکے اردو زبان اور فارسی رسم خط

کو پسند کرتے ہیں اور حکومت نے ان کی مرضی کے خلاف ہندو
لیڈروں کو خوش کرنے کے لئے، ایسا کیا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو وقت
بتلا دے گا، کوئی لڑکا دیوناگری رسم خط پڑھنے کی خواہش ظاہر نہ
کرے گا، یا ان کی تعداد بہت کم ہوگی اور پندرہ فی صد کی شرط کو
پورا نہ کرے گی۔ حکومت مجبور ہوگی کہ اپنے احکام واپس لے، ورنہ
احکام خود ہی مرجا جائیں گے۔ لیکن اس کے لئے بھی ضروری تھا کہ مسلمان
اس مسئلے کو زیادہ اہمیت نہ دیتے۔ کیونکہ اب تو یہ حالت ہو چکا
ہے کہ فرقہ پرست ہندو لیڈروں کو اپنے پرسیٹج کی خاطر زبردست
پر دیا گندا کرتا پڑے گا۔

مولانا محمد سعید مسعودی دادی کے ایک اور چادو نگار اہل ضحاک
میں سے ہیں، جو اپنی لسانی اور تحریری صلاحیتوں کے بل بوتے پر، آزادی خواہوں
کی صفِ اول میں پہنچ گئے۔ "ہمدرد"، "صداقت"، "حقیقت"، "خدمت"
غرض کئی اخباروں سے ان کا غلانیہ یا ہمدردہ واسطہ رہا۔ اور جس اخبار سے
ان کا قلم پیچھا گیا، وہ اس کے لئے چادو کی چھڑی ثابت ہوا۔

مولانا، کشمیر کے ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے والد زمیندار
اور پیر بھی تھے۔ فارسی کے اچھے عالم تھے، مولانا کی ولادت ۱۲۹۳ھ میں مظفر آباد
میں ہوئی، ابتدائی فارسی تعلیم، والد کے یہاں پائی۔ والدہ کا خاندان عربی سے
لگاؤ رکھتا تھا اور خود بھی وہ عربی اچھی جانتی تھیں۔ انہیں سے مولانا نے عربی
پڑھی۔ اس کے بعد لاہور گئے۔ اور نیشنل کالج میں داخل ہوئے، جہاں سے مولوی
فاضل کامیاب کیا اور بعد میں مولانا احمد علی سے تفسیر اور حدیث کا درس لیا۔

شیخ مولانا کا صبح سال ولادت ۱۲۹۳ھ ہے۔

۵۵۳

تعلیم سے قادر بنے ہوئے کے بعد منظر آباد ہائی سکول میں فارسی کے استاد مقرر ہو گئے۔ کشمیر میں ریہوداری ہائی اسکول میں وہ دسویں میٹر رہے۔ جنوں کے پرنس آف ویلز کالج میں ایک سال لیکچرار کی خدمت انجام دی۔ اور ایس۔ پی۔ کالج میں بھی ایک سال دسویں دیتے رہے۔

سیاست سے دلچسپی کی بدولت، انہیں ملازمت سے دست کش ہونا پڑا۔ تاہم ان کے علمی ربط اس طرح قائم رہے کہ پہلے وہ مسلم کانفرنس کے ترجمان "صداقت" کے ویریدہ ایڈیٹر رہے۔ مولوی عبدالرحیم اسس کے ایڈیٹر تھے ۱۹۳۵ء میں جب "ہمدرد" نیشنل کانفرنس کا ترجمان قرار پایا، تو مولانا مسعودی نے اس کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے۔ مرزا غلام حسن بیگ عارف کی شرکت میں "خدمت" جاری کیا۔ جو عرصہ تک نیشنل کانفرنس کا ترجمان رہا اور اب نیشنل کانگریس کے ترجمان کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ کشپ باندھو نے "ماتحت" اسی زمانے میں جاری کیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور اچھے اہل قلم علامہ حسین میر کشمیری اترتھی "اسلام" بھی نکال رہے تھے۔

مولانا مسعودی جب اپنے نام سے نہیں لکھتے تھے، اپنا قلمی نام "رجل لیلیٰ" اختیار کیا تھا۔ چنانچہ ان کے بہت سے اچھے مضامین اسی نام سے شائع ہوئے ہیں۔ مولانا ظفر علی خان، ان کی قلمی اور تقریری صلاحیتوں کی وجہ سے ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ شکر کہنے کا شوق بچپن سے تھا لیکن کلام کبھی اکٹھا نہیں کیا۔ فارسی میں غزلیں بھی ہیں اور اچھی بھی ہیں، لیکن کچھ سرمایہ اپنے پاس محفوظ نہیں رکھا۔ کچھ غزلیں جو سری پرتاپ کالج کی لیکچراری کے زمانے میں پرتاپ میں شائع ہوئی تھیں، وہ اب دستیاب نہیں ہوتیں۔ کیونکہ اس کے ابتدائی

لے: سردی صاحب سے چوک ہوئی ہے۔ یہ عارف دراصل غلام رسول عارف تھے۔

شکامے محفوظ نہیں ہیں۔ ایک آدمہ مصرعہ جو میرزا عارف نے مجھے سنایا تھا وہ ہے:
 "کر از خاک سید بنگر گریب ال چاک می آید"

مولانا مسعودی عرصہ تک نیشنل کانفرنس کے جنرل سیکرٹری بھی رہے۔ اس
 تعلق سے انہوں نے نئے کشمیر کے آئین اور میرزا افضل بیگ کے مصنفہ رسالے زرعی
 اصلاحات کو شائع کیا۔ نیشنل کانفرنس کے اجلاس بارہمولہ کے موقع پر شیخ محمد
 عبداللہ کی فرمائش پر، مولانا نے کشمیری کا قومی ترانہ، جھنڈے کے گیت کے طور پر لکھا
 تھا۔ یہ ترانہ حسب ذیل ہے:

لہرا، اے کشمیر کے جھنڈے طفل و جوان و پیر کے جھنڈے
 بازوئے بے کشمیر کے جھنڈے بل ولے دلیگیر کے جھنڈے

ہر سو لہرا، ہر دم لہرا

تا بہ قیامت پیہم لہرا

لہرا، اے کشمیر کے جھنڈے لہرا، اے کشمیر کے جھنڈے

میدان اور جبل پر لہرا

دشت پر لہرا، ڈل پر لہرا

گٹیہ اور محل پر لہرا

خشکی اور جل تھل پر لہرا

ہر سو لہرا، ہر دم لہرا تا بہ قیامت پیہم لہرا

لہرا، اے کشمیر کے جھنڈے

تو ہے ہماری آنکھ کا تارا

مظلوموں کے دل کا سہارا

رنگ ترا ہے لال و لہلا

۵۵۵

ہل ہے جس پر پیارا پیارا
ہر سو لہرا، ہر دم لہرا، تا بہ قیامت، یہ ہم لہرا
لہرا، اسے کشمیر کے جھنڈے

یہ گیت، نکلے جا کشمیر کے مجموعہ میں شامل ہے، جسے پیر عبد الواحد شاہ،
صدر قومی کلچرل محاذ نے ۱۹۴۸ء میں اپنے مختصر تعارف کے ساتھ شائع کیا ہے۔ پیر
عبد الواحد کا آزادی کی جدوجہد میں نمایاں حصہ رہا ہے۔ قومی کلچرل محاذ کے دوسرے
سرگرم کارکنوں میں شوالان سنگھ، جوبان اور غلام رسول رینیزو بھی خاص طور پر
قابل ذکر ہیں، جو محاذ کے آرگنائزنگ سیکرٹری تھے۔

ان کے ہم عصراں، مخالفت میں پنڈت کشیپ، بندھو، میر غلام محمد کشنی،
میر عبد العزیز، محمد ایوب صابر، پیر مبارک شاہ، پیر عبد الواحد اور پنڈت
نند لال وائل قابل ذکر ہیں۔

پنڈت کشیپ، بندھو نے جو کشمیر کے قدیم اہل صفات میں اپنی رنگارنگ
شخصیت کی وجہ سے نمایاں ہے، کئی اہم اخباروں کی ادارت کے فرائض
انجام دیئے اور ادب کی بھی خدمت کی۔ ان کا پہلا نام تارا چند تھا، لیکن کشیپ
بندھو کے قلمی نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان کی ولادت ۱۹۰۷ء میں قصبہ
گیرو (نور پورہ) میں ہوئی۔ گیرو میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد سری نگر میں
تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۱۹ء میں انٹرنس کا امتحان کامیاب کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے
وہ لاہور گئے۔ جہاں وہ ہندو دہالیہ میں چار سال زیر تعلیم رہے اور سنسکرت اور
ہندی کے امتحانات کامیاب کئے۔ وطن لوٹ کر وہ، محکمہ ہندو بہت اداشی
میں شجرہ کش کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ لیکن یہ ملازمت جلد ہی ترک کر دی اور
پھر لاہور جاکر ملازمت کی اور بعد میں کوئٹہ، بلوچستان گئے اور تار کے عسکر

میں ملازم ہوئے۔ اس دوران ان کے سیاسی رجحانات بیدار ہوئے اور کانگریس کی عدم تعاون کی تحریک میں شامل ہو کر ملازمت ترک کر دی۔ کشمیری مزدور بورڈ منظم کیا، جس کے وہ سیکرٹری بھی رہے۔ پنڈت مہتی لال نہرو نے بھی اس بورڈ کے لہجیانہ کے اس اجلاس میں شرکت کی اور تقریر بھی کی۔ اس بورڈ کے پلاٹ فارم سے پہلی دفعہ کشمیر مکشیر یوں کے لئے "کافرہ بلند ہوا۔"

لاہور میں صحافت سے انہیں ٹکلی تعلق پیدا ہوا۔ اور اخبار "عام" اخبار کشمیری اور "بہار کشمیر" کے حلقہ ادارت میں شامل رہے۔ اور "آریہ گزٹ" کی ادارت بھی کی۔ ۱۹۳۱ء میں جب کشمیر میں اخبارات کے اجراء کی آزادی مل چکی تھی، کشمیر لوٹے اور سناتن لیک سبھا قائم کی اور روزنامہ "مارتنڈ" جاری کیا۔ جو پچھلے سال تک مسلسل شائع ہوتا رہا۔ مسلم کانفرنس کی نیشنل کانفرنس میں تہیہ کی بعد، وہ نیشنل کانفرنس کے سرگرم کارکن بن گئے۔ آزادی کے حصول کے بعد، جب عوامی حکومت قائم ہوئی، تو پنڈت کشمیر باندھو دیہات کے محکموں کے ڈائریکٹر جنرل مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۳ء میں شیخ محمد عبدالرشید کی گرفتاری کے بعد وہ بھی جیل بھیجے گئے۔ اور ۱۹۵۵ء میں دوبارہ گرفتار ہوئے اور ۱۹۶۰ء میں رہا ہوئے۔ اس وقت گیسو میں مقیم ہیں اور حصول علم کے ذوق کی تکمیل میں مصروف ہیں۔

کشیپ بندھو شعرو سخن کا اچھا مذاق رکھتے ہیں اور بلبل تخلص کرتے ہیں۔ پہلے کشمیری میں کہنے کی کوشش کی، لیکن بعد میں اردو میں کہنے لگے۔ اور پروفیسر نند لال طالب سے مشورہ بھی کرتے رہے۔ کچھ عرصہ عبدالرؤف عشت لکھنوی کو بھی کلام دکھایا۔ ۱۹۶۱ء میں جب وہ کوٹڑ میں مقیم تھے۔ انہیں بلوچستان کی ندی لورا پر جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ لورا کو دیکھ کر کشمیر کے ایک پتے دلدادہ فرزند کی طرح انہیں اپنی دستا کی یاد آگئی اور ایک نظم کی صورت میں ان کے جذبات

۵۵۷

ہوئے ہیں۔ یہ نظم "مارتنڈ" کے شمارہ مارچ ۱۹۳۵ء میں ان کے ایک نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ نوٹ اور نظم کا ایک بند ذیل میں درج ہے :

"آج سے تقریباً چودہ سال پہلے، چند دوستوں کے اصرار پر مجھے کوئٹہ بلوچستان کی ایک چھوٹی سی ندی، لورا کے کنارے پر جانے کا اتفاق ہوا، وہاں مجھے اپنی دستا یاد آگئی۔"

اے آبِ رودِ لورا، اتنی ہو ہریانی

جب سندھ بہہ کے آئے جہلم سے تجھ میں پانی
میری طرف سے اس کو چھاتی سے تو لگانا

رودِ کے اس کو میری پھر داستانِ مٹانا
کہنا "اے خدا، اے آبِ رودِ جہلم

شیدا ہے دور تیرا، غربت میں تجھ سے چھوٹ کر
گودی میں جس کو تو نے پالا تھا مثلِ مادر

وہ دکھ اٹھا رہا ہے، غربت میں تجھ سے چھوٹ کر
نظم کے کُل چھ بند ہیں۔ آخری شعر ہے :

بلبل، ندیہ وصیت، احباب بھول جائیں

گنگا کے بدلے میرے، جہلم میں بھول جائیں

کشپ بندھوا اپنے زمانے کے اچھے مزاج نگار بھی رہے۔ جس کی کچھ تفصیل نیچے آ رہی ہے۔ ان کی بعض غزلوں میں بھی مزاج کا رنگ جھلک جاتا ہے۔ ایک غزل جو گلشنِ بلتستان کے بلبل کے توصیفی نام کے ساتھ "مارتنڈ" میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے کچھ شعر ہیں :

مری تقدیر بھی اُلٹی، مری تدبیر بھی اُلٹی

کسی محبوب کی ترچھی لگا ہیں یاد آتی ہیں

ہوئی ہیں راہی ملکِ عدم میری تمنائیں

مجھے ان بے کسوں کی خواہگا ہیں یاد آتی ہیں

رگوں میں خونِ جگر چلتا ہے بلبلِ ہارِ سادہ ہیں

جب اقلیمِ محبت کی احاطیں یاد آتی ہیں

ایک اور غزل "میں کون ہوں" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ جس کے دو شعر ہیں :-

ہے کوئی اس شوق دید کی حد کہ تیرے چہرہ پہ اوستہ لگے

پڑے ہیں چپکے کے داغ جتنے، لگا ہیں اتنی گڑھا چکا ہوں

اُٹھاؤں کھول کر نہ ان کے غریب نہ کھاول کیوں نہ آج کے گھونٹے

جنتا کے اُلفت، بڑھاکے ہمت، خود اپنی لُٹیا دبا چکا ہوں

کشیپ بندھو کی چند اچھی نظمیں "سواستیکا" کے مختلف شماروں میں شائع

ہوئی تھیں، جن میں "برق و شرار" اور "نالہ نیم شب" اچھی نظمیں ہیں۔ اول الذکر

ایک طویل نظم ہے، جس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے :

میں غمِ اشکِ خویش بوتلا ہوں اس زمیں میں

شعر و سخن کی وادی تو لالہ زار بن جا

میری شکستہ پائی ہے، منتظرِ خلش کی

اے شاہِ راہِ اُلفت، تو غارِ زار بن جا

شاید معاف کر دے، وہ کردگارِ خوبی

اے مجرمِ محبت، تو آشکار بن جا

۵۵۹

نفوس سے بھولتا ہوں، دنیا کے رنج و غم میں
 اے بے بس خوش الحان، پھر نغمہ یار بن جا
 "نارغیم شب" کے بھی کچھ شعر یہاں منقول ہیں:
 میری نوا سے غم کو صوت ہزار کر دے
 مرغِ خزاں کو یارب مرغِ بہار کر دے
 بیتابی جگر ہو اک لالہ زار سوزش
 دل کو عطا مسلسل اک خلفشار کر دے
 اے برق سن، اگر جا صبر و قرار پر تو
 پھر یاد یار محمد کو تو بے قرار کر دے

"مارٹنڈ" کے علاوہ بھی کشنپ بندھو کئی اخباروں کے بانی اور مدیر رہے۔
 "دلش" اور "کیسری" ان کے مشہور اخبار ہیں۔ ایک اور اخبار "سمانِ سدا" تھا۔
 بھی انہوں نے جاری کیا تھا۔ "مارٹنڈ" کے مزاحیہ اور نکاحیہ کالم کے وہ مالک تھے۔
 اور علامہ مجہول کے فرضی نام سے "چلت" اور "پاگل کی ڈائری" کے عنوانوں
 کے تحت لکھا کرتے تھے۔ "چلت" میں انہوں نے اپنے بعض معاصرین کے
 چہرے بھی لکھے ہیں۔ ایم۔ اے۔ صابری جو چہرہ انہوں نے لکھا تھا۔ اس کا
 اقتباس ذیل میں درج ہے :-

"ہمارے ملک میں ایم۔ اے تو بہت موجود ہیں، لیکن جو امتیاز
 ہمارے محترم دوست اصحاب کو حاصل ہے، شاید کسی اور ایم۔ اے
 کو حاصل نہیں۔۔۔۔۔۔ شاید اس کی وجہ یہ ہوگی کہ اصحاب
 صاحب کے ایم۔ اے کی یہ خصوصیت ہے کہ ہر ایک ایم۔ اے
 پاس شوق کے پیچھے ایم۔ اے کے حروف لکھے جاتے ہیں۔ بسکن

صابر صاحب کے اسم گرامی کے پہلے یہ حروف درج ہوتے ہیں ۔۔۔
 جہاں انہوں نے اپنے معاصرین کو اپنے قلم کا تحفہ 'مشق' بنایا۔ وہ خود بھی اپنے ہم عصر
 'علامہ صدیقی رانہوی کے کالم' 'اراکین محفل ادب' کا موضوع بنے۔ اس کا
 ذیل کا اقتباس، ان کی پہلو دار شخصیت کو سمجھنے میں کسی قدر مدد دے سکتا ہے۔
 "آئیے۔ پدھاریے، جے ہو آپ کی۔"

سُنا بیٹے، کیسے ہیں آپ، بہت خوش! ابھی آپ کا ذکر ہوا تھا
 ہو رہا تھا۔ ایک بزرگ کی زبانی سُنا ہے کہ آپ کا اصلی نام
 تارا چند ہے اور تخلص بیل، تعلیم پانے کے بعد آپ چند سال محکمہ
 بندوبست میں بھی ملازم رہے۔

"کشیتر سے ہجرت اختیار کی، آریہ دیوار تھی کلاس میں کچھ عرصہ
 تک دیوار تھی کی حیثیت میں رہے۔ کوئیٹ جاکر طائرانہ پرو بال
 نکالے۔" آریہ گزٹ کی ایڈیٹری کے دوران تحریر میں 'مشق' بہم
 پہنچائی اور معاش کی سبیل لگائی۔ سرنگے ہاتھ میں ڈنڈا، پیڑوں
 میں کھڑاؤں، کشیتر بیل نے جو مدت کے بعد آپ کو نئے رنگ
 میں دیکھا تو بڑے تپاک سے آدھگت کی۔۔۔۔۔

مولانا علانی کی رائے میں یہ تین چیزیں آپ کی باندیاں ہیں،
 ایک قلم، دوسری زبان، تیسری طاقتِ رفتار، مزاج نگاری
 میں آپ کشیتر کے لپٹس ہیں، اب سُنا ہے کہ بچپن میں جو
 شاعری کا شوق دامگیر تھا، دوبارہ عود کر آیا ہے۔۔۔۔۔

ایم۔ اے۔ صابر جن کا ابھی کشیپ بندھو کے قلم سے تعارف ہوا۔ ۱۹۳۵ء سے
 "البرق" ہفتہ میں دو بار نکالتے تھے جو سنہ ۱۹۴۷ء تک جاری رہا۔ ان کا پورا نام محمد ایوب

اور تخلص صابر تھا۔ اس خاندان میں علم و ادب اور صحافت کا ذوق ہمیشہ رہا۔ ان کے والد مولوی عبداللہ کا تذکرہ گذر چکا ہے۔ صابر آئینہ ہفت روزہ سری نگر کے ایڈیٹر شمیم احمد شمیم کے چچا ہوتے ہیں۔ پیر مبارک شاہ البرق کے مدیر معادن کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ اور "حقیقت" کے محض نام کے لئے ایڈیٹر بھی رہے۔ میر غلام محمد کشفی، صاحب ذوق ادیب اور عالم ہیں۔ باندی پور کے قریب گاؤں ونگرام ان کا وطن ہے۔ ابتداء میں، وہ کشمیر کے محکمہ تعلیم میں ملازم تھے لیکن اس دوران بھی ان کی قلمی صلاحیتیں روبکار آنے لگی تھیں۔ چنانچہ جب "خدمت" کے لئے مدیر کی تلاش ہوئی تو نظر انتخاب ان پر پڑی اور وہ سکول کی ملازمت سے مستعفی ہو کر اس روزنامہ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ اس اخبار میں "انکشافات" ان کا خاص مزاجیہ کالم ہوتا تھا۔ جس کے مشتملات خاص اثر کے بالک ہوتے تھے۔ آزادی کے بعد، کچھ اختلافات کے باعث وہ پاکستان چلے گئے۔ اور وہاں آزاد کشمیر ریڈیو سے وابستہ ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ علم و ادب کی خدمات بھی جاری ہیں، اپنا پنچ بھیر میں ادب سے بار بار میں انہوں نے دو تصانیف لکھی ہیں۔ کشمیری شعر و شاعری کے دور کا فی ضخیم کتاب ہے۔ "کشمیری زبان اور ادب" کے عنوان سے ان کا ایک معلومات آفرین مضمون "ادبی دنیا" لاہور کے کشمیر نمبر (۱۹۶۶ء) میں شائع ہوا ہے۔ اسی شمار میں ان کا ایک اور مضمون "کشمیر — اسلامی تہذیب و تمدن کا گہوارہ" کے عنوان سے لکھا ہوا بھی شامل ہے۔ ان کی ایک اور تصنیف "کشمیر ہمارا ہے" بھی منظر عام پر آچکی ہے۔ اس وقت وہ "ہماری آواز" بھی نکال رہے ہیں۔

احمد شمیم بھی صحافت سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔ نساء انڈسٹریل میگزین "آفتاب" (سری نگر) نے اپنے پاکستان میں قیام کے زمانے میں حکومت کی جانب سے راولپنڈی

سے کثیر نام سے جو اخبار جاری کیا تھا اس کے معاون مدیر رہے۔ بڑے سلجھے ہوئے مذاق کے ادیب اور تنقید نگار ہیں۔ اس وقت پاکستان کی حکومت کے جاری کئے اخبار "آزاد کشمیر نیوز" کے ایڈیٹر ہیں۔ میر عبد العزیز

میر عبد العزیز اسری نگر سے ہفت روزہ "روشنی" نکالتے تھے۔ انہیں کی ادارت میں ایک اور ہفت روزہ "جوہر" اور ایک ہفتہ وار "ملت" بھی نکلتا رہا۔ میر بھی اب پاکستان میں ہیں۔ وہاں واولپنڈی سے ایک ہفتہ وار "آواز حق" جاری کیا تھا، جو حکومت کے احکام کے تحت بند کر دیا گیا۔ اور اب "انصاف" کے نام سے ایک اور ہفتہ وار نکال رہے۔ چودھری عبد الواحد ایک اور صاحب قلم، سری نگر سے "اصلاح" کے نام سے ہفتہ وار اخبار نکالتے تھے۔ یہ جماعت احمدیہ کا ترجمان تھا۔ اور میرزا بشیر الدین احمد محمود اس کے بانی تھے۔ بعد میں عبد الغفار ڈار شوپیان سے نکالتے رہے، جو اس وقت پاکستان چلے گئے ہیں۔ چودھری عبد الواحد کا خاندان کشمیر سے میاں والی منتقل ہو گیا تھا لیکن وہ خود سری نگر میں رہتے تھے۔ اور خواجہ کمال الدین مبلغ اسلام کے ہمراہ انہوں نے انگلستان، سٹرا، جاوا وغیرہ کے دورے بھی کئے تھے۔ "اصلاح" کے کاتب عبد الرحمن جٹامی انشا پر دانتے اور اصلاح میں "جام جہاں نما" کے عنوان سے لکھتے تھے۔

دینا ناتھ جکین مست، جن کا تذکرہ لکھا جا چکا ہے، صحافت سے بھی متعلق رہے۔ چنانچہ سری نگر سے ہفت روزہ اخبار "جوہر" نکالتے تھے۔ اور بعد میں ایک اور ہفتہ وار "سنار" کے نام سے بھی جاری کیا تھا، جو کچھ عرصہ بعد بند ہو گیا۔ مست نے غلام محی الدین کے روزنامہ "رہبر" کے ہفتہ وار میں تبدیل ہونے کے، اس کے مدیر کی حیثیت سے کام کیا۔ حفیظ اللہ جالب اور نور الدین اختر بھی کثیر میں صحافت کے سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں اب پاکستان میں مقیم ہیں۔

۱۹۵۲ء میں غریب الوطنی میں انتقال کر گئے۔

۵۶۳

اور راولپنڈی سے ایک ہفتہ وار "آغاز" نکال رہے ہیں۔ محمد الدین فوقی کا "کشمیر جدید" سری نگر سے ۱۹۳۲ء میں جاری ہوا تھا، جو کچھ عرصہ بند ہو گیا۔ ۱۹۳۲ء میں بزاز کے "ہمدرد" کے علاوہ "اسلام" "روزنامہ کشمیر جدید" "روز" "ہر ہر" جن کا اوپر ذکر ہوا۔ اور "ہدایت" "خالہ" اور "مداقت" جاری ہوئے۔ "اسلام" میر واعظ مولوی محمد یوسف شاہ نے جاری کیا تھا۔ اور محمد امین اس کے مدیر تھے۔ یہ اخبار میر واعظ کی جماعت کا ترجمان تھا اور مسلمانوں کی سماجی اور معاشی اصلاح اور ترقی اس کے مقاصد تھے۔ میر واعظ ہی کی جانب سے ایک اور ہفتہ وار "حریت" بھی جاری ہوا تھا۔

ہفت روزہ "ہدایت" بھی اسی زمانے میں میر واعظ ہمدانی کی ادارت میں نکلنے لگا تھا۔ "خالہ" کے ایڈیٹر صدر الدین مجاہد تھے۔ یہ اخبار نیشنل کانفرنس کا ترجمان تھا۔ اس سے ایک سال پہلے یعنی ۱۹۳۲ء میں مجاہد نے ایک ہفتہ وار "بیکار" کے نام سے جاری کیا تھا۔ یہ سال بھر کے اندر بند کر دیا گیا اور مجاہد نے دوسرا ہفتہ وار "خالہ" جاری کیا۔ پنڈت شبنو ناتھ وکیل نے ہفتہ وار "وکیل" ۱۹۳۵ء میں جاری کیا تھا۔

"مداقت" شیخ محمد عبد اللہ اور ان کی جماعت کی جانب سے جاری ہوا تھا۔ اس کے مدیر کچھ عرصہ محمد عبد الرحیم رہے۔ بعد میں محمد ایوب رینہ اس کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ یہ سال بھر کے اندر بند ہو گیا اور اس کی جگہ "ہدایت" جاری ہوا۔ جس کے ایڈیٹر پریم ناتھ بزاز تھے۔ اور "قلندر" کے فرضی نام سے لکھا کرتے تھے۔

۱۹۳۹ء میں جو اخبار جاری ہوئے۔ ان میں "نور" اور "پیغام" قابل ذکر ہیں۔ "نور" محی الدین نور، ایم۔ ڈی۔ نور کے نام سے نکالتے تھے۔

"پیغام" ہفتہ وار قریشی محمد ایوب اور نظام الدین چستی کی ادارت میں جاری ہوا تھا، لیکن ایک سال بعد بند ہو گیا۔

"پریم ناغہ کنہ جو کچھ عرصہ 'مارٹنڈ' کے ایڈیٹر بھی رہے تھے، ہفتہ وار 'کثیر' کے بھی مدیر رہے، جو اسٹیس، بیولنز پارٹی کا ترجمان تھا۔ "جہانگیر" ایک اور ہفتہ وار ایس۔ کیو قلندر نے جاری کیا تھا جس میں مولانا سعودی بھی لکھتے تھے۔ بیرزادہ محمد یحییٰ رفیقی بھی اس اخبار میں کام کرتے رہے۔ مشہور ماہر قانون پندت جیالال کلم، جو ریاست کی عدالت العالیہ میں جج رہے تھے، 'تصنیف' تالیف اور صحافت سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کی 'تصنیف' دی کشمیری پینڈتس کا ذکر گندچکا ہے۔ اردو میں وہ اچھے مضمون نگار بھی رہے۔ ایک ہفتہ وار اخبار 'قومی ورد' کے نام سے انہوں نے ۱۹۴۲ء میں جاری کیا تھا۔ اس کے ایڈیٹر عمر بیٹ تھے۔ مولوی یوسف شاہ ایک اور اخبار 'الانوار' کے بھی بانی تھے۔ یہ مذہبی اخبار تھا جس کے ایڈیٹر نور الدین تھے۔

۹۔ ایک دو مخصوص مفادات کے اخبار یا رسائل بھی اس زمانے میں جاری ہوئے تھے۔ جن میں سے ایک کشمیر کے جاگیرداروں کی متحدہ جماعت کی جانب سے ان کے ترجمان کے طور پر، اتحاد جاگیرداران کے نام سے ہفتہ وار کی صورت میں جاری کیا گیا تھا۔ لیکن یہ زیادہ عرصہ تک نہ چل سکا۔ اور بند کر دیا گیا۔ ایک اور 'دیہاتی دنیا' ماہ نامہ تھا۔ جو محکمہ ترقیات دیہات کی جانب سے جاری ہوا تھا۔ دیہات سدھار کے مسائل، پنچائیتی اغراض و مقاصد کو فروغ دینے کا کام اس سے لیا جاتا تھا۔ اس کے پہلے ایڈیٹر شیخ غلام قادر مقرر ہوئے تھے۔ بعد میں پیٹل گنگا دھر بھٹ دیہاتی بھی کچھ عرصہ اس کے ایڈیٹر رہے۔ کچھ سال بعد اس کے انتظام میں تبدیلی ہوئی اور موجودہ زمانے میں دیہات سدھار

کے روپ میں شائع ہو رہا ہے۔

مارتنڈ "وادی کے قدیم اخباروں میں سے ہے اور مسلسل ۱۹۱۲ء سے لے کر ۱۹۶۹ء تک شائع ہوتا رہا۔ جیسا کہ اوپر تذکرہ کیا گیا ہے۔ پنڈت کشپ بندھو نے اس کی بنیاد رکھی تھی۔ لیکن یہ کبھی فرد کا اخبار نہیں تھا بلکہ سناتن یووک سمجھا۔ کشمیر کا ترجمان تھا۔ اور اس زمانے کے سارے اہل قلم اور خاص طور پر ادبی ذوق رکھنے والے پنڈتوں کا مرکزِ نظر اور ان کی قلمی مساعی کا محور رہا۔ اس میں خبروں کے علاوہ پنڈتوں کے مذہبی اور ملی مفاد، مذہبی تہواروں، مشاہیر، ادبی مشاغل، غرض ہر نوع کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ مزاح نگاری کے ذوق کو بھی اس کے پہلے ایڈیٹر کشپ بندھو، پردیسی اور کچھ اور لکھنے والوں نے فروغ دیا۔ اس کے ہفتہ وار ادبی ایڈیشن خاص طور پر دلچسپ ہوا کرتے تھے۔ اس کے ایڈیٹر بدلتے رہے۔ کشپ بندھو کے بعد پنڈت گواش لال کول نے اس کی ادارت سنبھالی۔ کچھ عرصہ سمجھو ناتھ کول اس کے ایڈیٹر رہے۔ پریم ناتھ کنہ جن کا ذکر دوسرے اخباروں کے سلسلے میں گذر چکا ہے۔ چند سال اس کو مرتب کرتے رہے۔ اس وقت وہ "ملاپ" دہلی کے ایڈیٹر ہیں۔ پنڈت اومکار ناتھ کول کا بھی اس کے حلقہ ادارت سے تعلق رہا۔ وہ اچھے الشاد پرداز ہیں اور کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ پچھلے آٹھ دس سال سے بدری ناتھ مٹو کے ہاتھ میں اس کی عنائن ادارت رہی۔ پچھلے سال ملکیت کی نزاع کے سلسلے میں یہ اخبار بند ہو گیا۔

اس کے لکھنے والوں کی فہرست بہت طویل ہے، بلکہ شاید ہر پنڈت جو قلم استعمال کر سکتا تھا، اس کے لئے "مارتنڈ" کے صفحات وقف تھے کئی مسلمان لکھنے والوں نے بھی اس کی خدمت کی اور یہ بھی درست ہے کہ خاص طور پر پنڈتوں میں "وتستا" و "ہمدرد" کے ساتھ ساتھ اردو کا علمی اور ادبی ذوق پیدا کرنے

اور اسے سنوارنے اور ترقی دینے میں اس اخبار کی خدمات یادگار رہیں گی۔
اس کے قابل ذکر لکھنے والوں میں پریم ناتھ پردیسی، دینا ناتھ دلیگیر، پنڈت ناتھ
چند ترسل، پنڈت دشوان ناتھ درماہ جموی، پنڈت دینا ناتھ ناڈم، علامہ
عادل درویش بھی شامل تھے۔

۲ "خدمت" کی طرح وادی کے طویل المیعاد اخباروں میں سے ہے۔
"مارننگ" پچھلے سال بند ہو گیا۔ لیکن یہ اخبار اب بھی جاری ہے اور حکومتی کانگریس
پارٹی کے ترجمان کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا اجراء مولوی محمد سعید سعیدی کے ہاتھوں
۱۹۳۹ء میں عمل میں آیا تھا۔ لیکن ادارت میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ ۱۹۴۳ء
میں اس کے ایڈیٹر خواجہ غلام رسول عارف رہے۔ اور یہ ہفتہ وار سے روزانہ کر دیا
گیا۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز کا بھی اس سے تعلق رہا۔ مولوی غلام احمد میر کشفی،
مولوی فاضل بھی کافی عرصہ تک اس کو مرتب کرتے رہے۔

اس وقت مند لال داتل اس کے ایڈیٹر ہیں۔ داتل بھی مولانا سعیدی
اور کشپ بندھو کی طرح صحافت میں خصوصیت حاصل کر چکے ہیں۔ وادی کے
کئی اخباروں کی ادارت سے ان کا تعلق رہا۔ اسی وقت ۱۹۴۹ء سے وہ
"خدمت" کو ترتیب دے رہے ہیں۔ سری نگر کے پنڈتوں کے ایک خاندان سے
ان کا تعلق ہے۔ تعلیم یہیں سری پرتاپ کالج میں پائی۔ ۱۹۳۹ء میں بی۔ اے کیا۔
اور زمانہ طالب علمی سے اردو انشا پرداز اور ادب کا انہیں ذوق رہا۔ تعلیم
ختم کرنے کے بعد ہی وہ صحافت کے میدان میں آئے۔ ۱۹۳۹ء میں ہفتہ وار
اخبار "ہمارا" کی ادارت کے فرائض انجام دینے لگے۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز نے جب
"ہمدرد" کو ہفتہ وار سے روزنامہ میں تبدیل کر دیا۔ تو بزاز کے ساتھ کام کرنے
لگے۔ "نوئیگ" روزانہ کی ادارت کے فرائض ۱۹۴۴ء میں سنبھالے اور اب

”خدمت“ کے ایڈیٹر ہیں۔

”خدمت“ کو ریاست کے اخباروں میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ ہمیشہ حکومتی جماعت کا ترجمان رہا۔ اس طرح اس کی خبروں اور اس کے اداروں کو ایک اہمیت حاصل ہے۔ اس کو ابتداء سے جیسے اچھے صاحب طرز اور اہل قلم فرید ملے۔ ان کی بدولت اس کو ادبیت سے لگاؤ رہا۔

”خدمت“ سے متوصل صحافت کا ذوق رکھنے والوں میں پنڈت شری دھر رینہ زار بھی ہیں۔ زار کے علاوہ پنڈت مکھن لال تھو بھی اسی اخبار سے وابستہ ہیں۔ تھو کشمیری کے اچھے شاعر ہیں۔

پنڈت کاشی ناتھ انیمہ کنول، جو اس وقت محکمہ کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے ڈپٹی سیکرٹری کے عہدہ پر مامور ہیں۔ ابتداء میں سیارت کے میدان میں رہے اور صحافت سے بھی ان کا تعلق رہا۔ وہ بخش غلام محمد کے پرائیویٹ سیکرٹری بھی رہے۔ ان کی تعلیم اردو میں اونچے درجے کی ہوئی ہے اور جنوں و کشمیر یونیورسٹی سے ادیب فاضل کا امتحان کامیاب کیلئے۔ انگریزی میں بھی دستگاہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے ابتداء میں ہمدرد کے حلقہ ادارت میں بھی کام کیا۔ اور خالصہ گزٹ کے بھی کچھ عرصہ ایڈیٹر رہے۔ وہ مضمون نگار بھی ہیں۔ چنانچہ ان کے مضامین ”ہمدرد“ اور دوسرے اخباروں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ۲۵ فروری ۱۹۴۳ء کے شمارہ ”ہمدرد“ میں ان کا ”تاجکان اور مسلمان“ کے عنوان سے ایک اچھا مطالعہ شائع ہوا ہے۔

پنڈت رادھا کرشن کاک وادی کے قدیم اہل صحافت میں ہیں۔ مختلف اوقات میں وہ کئی موقر اخباروں جیسے ”ہول اینڈ بلڈری گزٹ“ ”لاہور“ ”سٹیٹس مین“ ”ہمدرد“ کے علاوہ یونائیٹڈ پریس آف انڈیا کے بھی کشمیر کے لئے مراسلہ نگار رہے۔ ۱۹۳۵ء سے پہلے وہ ”ملاپ“ لاہور کے لئے مراسلہ نگار مقرر ہوئے تھے۔ ۱۹۴۵ء میں

۵۶۸

”انٹرنیٹ رپورٹریکا“ نے انہیں ریاست اور ملحقہ علاقوں کے لئے اپنا نامہ نگار مقرر کیا۔ ۱۹۶۲ء سے وہ ساری ذمہ داریوں سے دست ہو کر صرف ”سٹیٹسین“ کے لئے لکھ رہے ہیں۔

کاک کی تعلیم سری پرتاپ کالج میں ہوئی۔ انگریزی سے ان کی دلچسپی کی بدولت وہ ”پرتاپ“ کے حصہ انگریزی کے ایڈیٹر بھی مقرر ہوئے تھے۔ کچھ عرصہ ریاست کی سرکاری ملازمت بھی کی اور محکمہ مردم شماری میں دو سال تک کام کیا۔ اس کے بعد ملازمت ترک کر کے، صحیفہ نگاری کی تربیت بعض معتبر اہل صحافت جیسے کرنل جالنس، اور جے۔ ایچ سائڈس کی نگرانی میں حاصل کی۔ کرنل جالنس، جو ”سٹیٹسین“ اور ”ہول اینڈ ملٹری گزٹ“ کے نمائندہ تھے، ان کی صلاحیتوں سے بہت متاثر تھے۔ وسط ایشیا اور لداخ، کاک کے مطالعے کے خصوصی موضوع رہے ہیں۔ کشمیر کی تاریخ اور تہذیب پر ریڈیو کے لئے انہوں نے کئی مضامین لکھے اور نشر کئے۔ مقامی اخباروں میں بھی ان کے مضامین خاص طور پر سال نو کے موقع پر شائع ہوتے رہے ہیں۔

اس زمانے میں بھی کئی کشمیری اہل قلم جو کشمیر سے باہر تھے، کشمیر سے اپنے لگاؤ کے نتیجے کے طور پر اپنے اپنے شہروں سے اخبار نکالا کرتے تھے، جن میں کشمیر سے متعلق خبروں کا بیشتر حصہ ہوتا تھا۔ ان میں ”بہار کشمیر“، ”صبح کشمیر“ اخبار کشمیر“ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ”اخبار کشمیر“ فوق نکالتے تھے۔ ”بہار کشمیر“ ماہوار تھا۔ اس رسالے کے پہلے ایڈیٹر پروفیسر پران ناتھ کرواں، پروفیسر فورسن کرپن کالج لاہور تھے۔ بعد میں اس کی ادارت پنڈت لچھی ناراین کول کے سپرد ہوئی۔ دوسرے دور میں ڈاکٹر ہریشاد سنگھ اس کے ایڈیٹر تھے۔ یہ رسالہ کشمیری پنڈت سبھا لاہور کا ترجمان تھا۔ اس سبھا کے سرپرست راجہ نرنند ناتھ کول تھے۔

• صبح کشمیر بھی لاہور سے نکلتا تھا۔ جس کے ایڈیٹر روگھنا نغمہ کو لکھتے۔ "بہار کشمیر"
 کے مینجنگ ایڈیٹر پنڈت لچھی نارائن کو ل، فارسی اور اردو ادب کا اچھا ذوق
 رکھتے تھے اور صحافت کے ساتھ ان کی دلچسپی نے انہیں "بہار کشمیر" کے علاوہ
 اور کئی اخباروں سے منسلک رکھا۔ وہ احرار پارٹی، لاہور کے روزنامہ "آزاد" کے بھی
 مینجنگ ایڈیٹر رہے۔ رسالہ "صفر" لاہور کے ایڈیٹر اور سر تیج بہادر سپرو کے
 رسالے "کشمیر درپن" سے بھی ان کا تعلق رہا۔ لاہور سے ایک انگریزی رسالہ۔
 "نارودن انڈیا بی جرنل" نکالتے تھے اور اس میں ایک حصہ اردو کا بھی ہوتا تھا۔
 سیالکوٹ سے لالہ ہنسراج رہبر ہفتہ وار "رہبر" کے نام سے شائع کرتے تھے۔
 لالہ ملک راج صراف نے اپنی تصنیف "فنی ایز" میں کشمیر سے باہر رہنے
 والے کشمیریوں یا کشمیر سے ہمدردی رکھنے والوں نے جو اخبار جاری کئے تھے۔ ان کی
 تعداد کافی بتائی جاتی ہے، لیکن ان کی تفصیل نہیں دی۔ صراف نے ایک خاص
 اخبار "شادی" کا تذکرہ کیا ہے، جو ولی اللہ محمدی لکھتے تھے۔ اور یہ غالباً امرتسر
 سے نکلتا تھا۔ اس اخبار کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ اہل کشمیر کے درمیان شادی
 بیاہ کے رشتے طے کرانا چاہتا تھا اور یہ اخبار کشمیریوں اور پنجابیوں کے درمیان
 ناطولوں پر زور دیتا تھا۔ چنانچہ اس کے سرنامہ پر یہ کشمیری شعر لکھا ہوتا تھا۔
 پنجاب کشمیر کئے کرو تیلہ نو مرو تیلہ نو مرو
 (پنجاب اور کشمیر کو ایک کرو، بھرا ہم نہیں مرے گے)

کثیر ہیں اخباری صحافت کی جیسی گہا گہی رہی۔ ادبی صحافت سے ویسی دلچسپی نہیں رہی۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ ہفت روزہ اخبار اور روزناموں کے ادبی ایڈیٹین، اس کمی کو پورا کر دیتے تھے۔ ایک اور وجہ بھی تھی، کالجوں اور بعض سکولوں کی جانب سے بھی میقاتی رسالے شائع ہوتے تھے۔ اور ان سے پڑھے لکھے اصحاب کے ذوق انشاء کی تسکین ہو جاتی تھی۔ اس کے باوجود ایک اچھے بلند پایہ ادبی رسالے کی ضرورت سامنے شعور رکھنے والے اہل ذوق کو باقی رہی۔ اس کا کچھ اندازہ ابتدائی دور کے ایک رسالے "سواستیکا" کے اس اقتباس سے ہوتا ہے۔ اس کے مدیر مشہور اردو اور ہندی ادیب پنڈت ویر ویشیشور تھے۔ وہ جنوری ۱۹۴۱ء کے شمارے میں لکھتے ہیں:-

"ریاست میں ایک ادبی جرنل کی کمی کو محسوس کیا جا رہا ہے
..... جو یہاں کے ادباء کے خیالات پریشاں کو ایک سنگم پر
لا سکے اور ملک کے ادباء کی آواز کو ملا کر ایک ایسا سوز و ساز
پیدا کر سکے، جو ریاست کی ادبی فضا میں وجد آفرین اور
مسرور کن ارتعاش پیدا کرنے کا موجب ہو۔"

ان کی اس خواہش نے انہیں اس بات پر ابھارا تھا کہ ایک طبی رسالہ جو اردو میں کچھ پہلے سے نکل رہا تھا، اس کو اس کے مدیر کے تعاون سے ادبی رسالے میں تبدیل کریں۔ یہ ۱۹۴۰ء میں ادبی روپ میں جلوہ گر ہوا اور خود ویر ویشیشور اس کے مدیر بنے۔

ویر جی نے اس سے پہلے اس بارے میں جو کوششیں ہوئی تھیں ان کی طرف بھی اجمالی اشارے کئے ہیں کہ اس سے پہلے ایک ادبی رسالہ "ہمالیہ"

جاری کیا گیا تھا لیکن وہ زیادہ عرصہ چل نہ سکا۔ ریاست کے اخباروں کے ادبی شماروں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ جو دراصل ملک کے اہل ذوق اصحاب کی خواہشوں کی تکمیل کا ایک ذریعہ تھے۔ پھر اپنی کوشش کا ذکر کیا ہے کہ وہ خود "نرگس" کے نام سے ایک ماہوار رسالہ نکالتا چاہتے تھے لیکن کچھ موانعات کے سبب یہ رسالہ جاری نہ ہو سکا۔ انہوں نے ایک اور کوشش "جہانم" کا ذکر نہیں کیا ہے جو سری نگر کے ابتدائی رسالوں میں سے تھا۔ یہ ساری کوششیں انتظامی ناتجربہ کاری کا شکار ہو گئیں۔

"سواستیکا" کو ادبی روپ دیتے ہوئے، دیر و شیشور کے پیش نظر "مخزن" لاہور تھا۔ جو کشمیر میں بہت مقبول تھا اور واقعتاً، یہ کشمیر کے اہل ذوق اصحاب کی فکری اشاعت کا بھی واسطہ بن گیا تھا۔ اس میں شک نہیں، ادبی "سواستیکا" اب طبعی نہیں رہا تھا، تاہم اپنی پُرانی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے، وہ طب پر بھی مضامین شائع کرتا تھا۔ اس کے لکھنے والوں میں گنگا دھر بھٹ دیہاتی، دلکش کاشمیری، پریم ناتھ پردیسی، پنڈت دینا ناتھ وار پو شادہ، غلام رسول نازکی، غلام محمد طاووس، علامہ عادل درویش، پنڈت دینا ناتھ ناہم، راکت کاشمیری، برق کاشمیری، پنڈت شام لال ولی تیرتھ کاشمیری، ملک محی الدین قمر قمرازی، میرزا کمال الدین شیدا، نیاز کاشمیری اور کچھ دوسرے خوش فکر شامل تھے۔

رسالے میں خواتین کی دلچسپی کے موضوعات پر بھی مضامین شائع ہوتے تھے اور ایک حصہ بچوں کی دلچسپی کے مضامین اور نظموں کے لئے وقف تھا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کوشش بھی دیر پا ثابت نہیں ہوئی، تاہم اپنی دو تین سال کی مختصر زندگی میں اس کے شمارے پر دیسی کی ایک دو اچھی کہانیوں، جیسے اپنی دو تین سال کی مختصر زندگی میں اس کے شمارے پر دیسی کی ایک دو اچھی کہانیوں، جیسے "کلس" اور "لی پو"۔ گنگا دھر بھٹ دیہاتی کے ایک اچھے ڈرائے "سپاہی" اور کچھ مزاحیہ پاروں، پنڈت

کشپ بندھو کی ایک دو نظیں جیسے "برق و شرار" اور "نار نیم شب" شیا م لال دلی تیرہ کے افکار اور خود ویرجی کے "میرا ساجن" ادب لطیف کے انشائیے جیسے "گنم قبر" ، گنبد ، وغیرہ کو منظر عام پر لانے کا باعث ثابت ہوئے۔

کچھ اور لکھنے والوں کے نام جو "سوانح" کا "کھنڈے والوں میں ملتے ہیں ، وہ پنڈت بشیر ناتھ کول کویراج پنڈت جانی ناتھ در ، پنڈت شنکر ناتھ کول سفیر جی اے ، بیٹا شنکر ناتھ کول قصبہ ڈورو کے ڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ جانی ناتھ در ، طب کے موضوعات پر لکھتے تھے۔ بشیر ناتھ کول "دیش" کے ایڈیٹر بھی رہے تھے غالباً رسالے کو مقبیل بنانے کے مقصد سے ، ویرلشور نے فلموں پر تبصرہ کا بھی آغاز کیا تھا۔ اور یہ تبصرے "فلمی بھیدی" کے فرضی نام سے لکھتے تھے۔

اس دور میں سری نگر کے کالجوں خاص طور پر سری پرتاپ کالج اور امر سنگھ کالج سے معیاری ماہنامے بھی نکلنے لگے تھے۔ سری پرتاپ کالج ، جو کشمیر میں سب سے قدیم کالج ہے۔ اس کے اساتذہ اور طلباء میں ادبی ذوق اس صدی کے تیسرے دہے کے آغاز میں بہت فروغ پر تھا۔ کالج کے پرنسپل اور اساتذہ میں کئی صاحب ذوق اساتذہ موجود تھے۔ پرنسپل اقبال کشن شرگا اور اس کے بعد خاص طور پر پرنسپل محمد دین تاثیر کے عہد میں کالج میں ایک ادبی انجمن اُردو سمجھا کے نام سے قائم تھی جس کی کچھ تفصیل ادبی اداروں کے ماتحت آ رہی ہے۔ کالج سے ایک مہینہ کی رسالہ "پرتاپ" نکلتا تھا جس میں اساتذہ اور طلباء کے مضامین شامل ہوتے تھے۔ "پرتاپ" اُردو کے علاوہ اور چار زبانوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ رسالے کے نگران اساتذہ میں پروفیسر طیب شاہ صدیقی ضیغم ، پروفیسر محمد ابراہیم اور پروفیسر حامدی کشمیری جیسے صاحب ذوق ادیب شامل ہیں۔ رسالے میں انشائیوں ، عام مضامین ، نظموں ، غزلوں کے علاوہ بعض اچھے پایہ کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین بھی شائع ہوتے رہے۔

کالج میں طلباء کی زیادتی کی وجہ سے ایک نیا کالج، امر سنگھ کالج کے نام سے قائم ہوا تو تاثر اس کالج کے پرنسپل ہو گئے۔ اور ان کے اساتذہ میں پروفیسر محمود ہاشمی اور ڈاکٹر ابوب رب سومناٹھ قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر طیب شاہ ضیغم بھی اس کالج میں درس دیتے ہیں۔ تاثر اپنے ساتھ، سارا ادبی ذوق لے کر آئے تھے۔ اس لئے جلد ہی کالج کے اساتذہ اور طلباء دونوں میں شعرو ادب کا ذوق پرورش پانے لگا۔ اس صدی کے چوتھے دہے میں کالج سے ادبی رسالہ "لالہ رُخ" شائع ہونے لگا تھا۔ اساتذہ اور طلباء کے علاوہ مشہور ادیبوں اور شاعروں کے افکار کے لئے بھی اس میں جگہ تھی۔ چنانچہ پریم ناتھ پردیسی، شہ زور کشمیری اور اثر لکھنوی بھی اس رسالے کے لئے لکھتے رہے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکم بھی اس کالج کے پرنسپل رہے۔ رسالے کے بعض شماروں میں کئی اچھے تنقیدی مضامین، افسانے اور نظمیں شائع ہوئی ہیں۔

ادبی ذوق کالجوں کے علاوہ سکولوں کے طلباء میں بھی نمایاں تھا۔ ماہوار رسالہ "جہلم" کی طرف ادب پر اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ ۱۹۳۲ء کے لگ بھگ گورنمنٹ ہائی اسکول فتح کدل سے شائع ہونے لگا تھا۔ اس سکول کے نمایاں طالب علموں میں پتیامبر ناتھ دررقانی و چارنگی بھی تھے جن کا تذکرہ اسی باب میں گذر چکا ہے۔

ایک فتویٰ

۱۹۳۶ء (۱۳۵۵ھ) میں سری نگر کی ایک مسجد میں مٹی کے تیل کے چراغ کی بجائے بجلی نصب کرنے کے بارے میں نزاع پیدا ہوئی۔ جس پر ایک استفتا سربراہ اور وہ علماء کے یہاں روانہ کیا گیا تھا۔ فتویٰ طلب مسائل یہ تھے:-

”وقف کی آمدنی سے کفایت کے علاوہ موقوف میں خرچ لگانا جائز ہے یا نہیں۔ اور کیا متولی کو ایسا کرنے کا اختیار ہے یا نہیں؟ مثلاً چراغ کی روشنی جس کے مصرف میں چند آنے فی ماہ لگتے ہیں، مسجد کے لئے کفایت کرتی ہو، اس صورت میں اگر متولی انہی مرضی سے چراغ کی بتیاں جن کی فیس وغیرہ میں چراغ کی نسبت تقریباً سہ چند صرف ہوتا ہے، لگوائے۔ تو کیا یہ ماری فیس یا جس قدر چراغ کی نسبت اس میں خرچ زیادہ ہو، وقت کی آمدنی سے متولی ادا کر سکتا ہے؟ یا یہ کہ وہ اس کے لئے خود ضامن ہوتا ہے۔“

اسی سلسلے میں کچھ اور سوالات درج کئے گئے ہیں اور ان کے جوابات بھی لکھے ہیں۔ اصل مسئلے کے بارے میں جو فتویٰ دیا گیا تھا، نیچے درج ہے:-

”مسجد کے وقف کی آمدنی سے قدرے کفایت سے علاوہ مسجد کے کسی خرچ میں لگانا درست نہیں ہے۔“

ہر سوال کے جواب کے ساتھ، باغذی کتابوں کے نام بھی درج ہیں، جن پر یہ فتویٰ مبنی ہے۔ ان میں ”در مختار“، ”رد المحتار“، ”فتاویٰ عالمگیری“، ”بحر الدقایق“ کے نام بھی شامل ہیں۔ فتوؤں کے آخر میں جن علماء کی رائیں عربی، فارسی یا اردو میں درج ہیں۔ اور دستخط اور مہر ہیں ثبت ہیں۔ وہ اس عہد کے جید علماء میں سے تھے۔ ان کے نام

۱۔ مفتی اعظم مولانا شریف الدین۔ جن کی رائے عربی میں لکھی ہے
 ۲۔ مفتی غلام محی الدین جامی "أصاب مَنْ أَجَابَ" اہلی کو لازم ہے کہ
 بروفق شرع عمل نہ کریں، اور وہ کو بھی اطلاع دیوں تاکہ خلاف شرع
 سے بچیں۔

- ۳۔ مفتی نور الدین جامی۔ "المجیب مصیب"
 ۴۔ مفتی ضیاء الدین۔ "أصاب المجیب فیما اجاب قلہ اور"۔ بجلی
 پر زائد از خرچ، چراغ خرچ لگانا مال و تقا سے جائز نہیں۔
 ۵۔ مفتی محمد قوام الدین (مہر)۔ "جواہراتِ محرمہ درست اور صحیح بلکہ قابلِ عمل
 ہیں۔ مسلمانوں کو لازم ہے کہ مسائلِ صدر پر واقف ہو کہ خود عمل کریں اور باقی
 مسلمانوں کو عمل کرنے کی تحریک کرتے ہیں اور سعادتِ دارین حاصل کریں۔"
 ۶۔ مفتی محی الدین فتح کدلی (مہر)۔ عربی اور فارسی میں رائیں لکھی ہیں۔
 ۷۔ مفتی محمد سعادت مورخ (مہر) فارسی میں رائے۔
 ۸۔ مولوی احمد علی شاہ جامی (مہر) عربی میں رائے۔
 ۹۔ مفتی صدر الدین جامی۔ "المجیب مصیب" اہلیانِ اسلام کو لازم
 بلکہ واجب ہے کہ در ہر امور خواہ دینی ہو یا اخروی اتباعِ شریعتِ مظہرہ
 و تعمیل احکامِ شرعیہ پابند ہوں۔"

- ۱۰۔ میرک شاہ (ملارٹ) کی رائے خود ان کے اپنے قلم سے درج ہے :-
 "اوقاف مسجد کی آمدنی سے فرش اور روشنی میں صرف اسی قدر صرف
 کیا جاسکتا ہے جس سے ان چیزوں کی ضرورت بقدر کفایت رفع ہو جائے
 قدر کفایت سے زیادہ مقدار میں صرف کرنے کی صورت میں متولی پر
 ضلک آتا ہے۔ یعنی متولی کو اپنی جیب سے ادا کرنا پڑے گا اور اس

صورت میں کہ چراغ کا خرچ اہل محلہ ادا کرنے پر آمادہ ہیں اور بجلی لگانے کی صورت میں روشنی کا خرچ وقف سے کرنا پڑتا ہے، اگر متولی ایسے اوقاف سے جن کی واقفین نے صراحت کے ساتھ بجلی کے لئے اوقاف میں حصہ نہیں رکھا ہے، بجلی لگاتا ہے۔ تو ایسا متولی قابلِ تولیت ہی نہیں۔

۱۱۔ محمد یوسف علی، میر واعظ۔ فارسی میں خود ان کے قلم سے درج ہے۔

ایک عرضداشت

یہ عرضداشت ایک تاریخی دستاویز ہے جو مسلمانانِ کشمیر کی جانب سے مولانا مولوی محمد یوسف شاہ، میر واعظ کشمیر کی قیادت میں، مہاراجہ ہری سنگھ کی خدمت میں پیش کی گئی تھی۔ اس سے ریاست کی زبان کے بارے میں اہل کشمیر کی اکثریت کے مطالبوں اور اس زمانے میں ریاست کی لسانی صورتِ حال پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ عرضداشت طویل ہے۔ اس لئے اس کا اہم اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے۔

”عرضداشت منجانب مسلمانانِ کشمیر بوساطت مولانا مولوی محمد یوسف، میر واعظ کشمیر، بعالیٰ خدمت حضور پرنور، اندر مہند بہادر پتر سلطنت انگلیشیہ، مہاراج ادھیراج، ہز بانی نیس مہاراجہ صاحب بہادر، والی سلطنت جموں و کشمیر۔

”۱۸۴۶ء میں جب کہ حضور کے نیک نیت اسلاف کے قبضے میں صوبہ کشمیر آیا، اس وقت یہاں بھی دفتری کاروباری اور درسی

زبان باقی مکمل ہندوستان کے طریقہ فارسی تھی، جو تقریباً سات سو سال تک متواتر اسی حیثیت سے چلی آتی تھی۔ اس کے بعد بھی قریباً اور نصف صدی تک یہی سلسلہ بے کم و کاست جاری رکھتے ہوئے قانوناً تسلیم کیا گیا کہ صوبہ کشمیر کی دفتری زبان فارسی اور صوبہ جموں کی اُردو ہے۔ چنانچہ یہاں کی قانونی کتابوں میں اس مضمون کے سرکلر ابھی تک موجود ہیں۔ ایک سرکلر ۱۹۴۵ء بمقامی (۸۸-۱۸۸۷ء) مجموعہ سرکلرٹ جوڈیشل ایسٹے اول میں ہے۔۔۔۔۔ غیر تسلیم اہل دفاتر نے اپنی زبان کو قانوناً فارسی یا اُردو تسلیم کر لیا۔۔۔۔۔ یہاں یہ سوال پیدا کیا جاسکتا ہے کہ اُردو نے کچھ کیوں فارسی کی جگہ لی؟ جناب والا، یہ اسی رسم الخط کی یکسانیت اور جملوں اور فقرہوں کی ترکیب و بندش اور اسلوب بیان کی یکسانی کی خوبی ہے۔ زبان (فارسی) بدلنے کے نثری زبان (اُردو) کے سمجھنے، لکھنے، پڑھنے میں کوئی وقت نہیں نہ آئے۔۔۔۔۔ حضور کی قلمرو کے دونوں "عربوں" میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور وہ بھی غالباً اکثریت، یعنی ایک صوبہ میں، ۹ فیصدی اور دوسرے میں ۵۷ فیصدی سے متماثر ہے۔ پھر حضور والا کی یہ غالباً اکثریت والی رعایا اس ایک اور صوبہ ایک، و بعد عداوت کی بنا پر اس عام فہم زبان (اُردو) کو خارج البلد کرنے کی کوشش کو اسلام دشمنی سے تعبیر کرنے میں حق بجانب نہیں ہے۔۔۔۔۔ یہاں مسلم رعایا نے خود ہی عرصہ سے تعلیم میں کچھ ترقی کرنی شروع کی تھی تو وہ بھی اسی اُردو کی بدولت۔ اب اگر یہ دوسری چیز ان پر جبراً اطلاق کی جائے گی تو یقیناً وہ بہت ہی پیچھے ہٹ جائیں گے۔۔۔۔۔"

یہ عرضداشت میرد اعظا حافظ غلام رسول شامی نے اپنے ایک خط کے ساتھ اس زمانے کے وزیر اعظم، مسٹر آئینکار کے نام بھیجی تھی۔ خط بھی ذیل میں منقول ہے۔
 ”جناب پرائیم منسٹر صاحب!

تعلیمات - تبدیل زبان درسم الخط کے سلسلے میں اس بھی خواہ سرکار نے آپ سے کچھ بھیجی ملاقات میں کچھ سرسری گفتگو کی تھی۔ جس میں قرار پایا تھا کہ احکام کے متعلق مسلمانان کشمیر کی طرف سے جو اعتراضات ہو سکتے ہیں، وہ بصورت یادداشت پیش کئے جائیں۔

اسی گفتگو کے سلسلے میں مذکورہ بالا یادداشت مہاراجہ کی خدمت میں ایک عرضداشت کی صورت میں مرتب اور پیش کی گئی تھی۔

ادارے

اس زمانے میں جنوں کشمیر میں کئی علمی اور ادبی ادارے، علمی اور ادبی ذوق رکھنے والے اصحاب کی دلچسپی اور مساعی کی بدولت، جنوں اور سرینگر میں قائم تھے یا نئے قائم ہوئے۔ اکثر ادارے کالجوں، جیسے سری پرنٹاپ کالج یا امر سنگھ کالج سے وابستہ تھے جن میں اساتذہ اور طلباء دونوں حصہ لیتے تھے۔ یہ ادارے عموماً بزم ادب کے نام سے موسوم تھے۔ کالجوں کے علاوہ کئی معجز اخبار جیسے ”دلتا“، ”ہمدرد“، ”مارٹنڈ“، ”خدمت“ وغیرہ بھی کسی حد تک اداروں کی حیثیت رکھتے تھے۔ جن سے قلیل اعتبار رکھنے والے وابستہ تھے۔ اور کبھی کبھی علمی اور ادبی محفلیں بھی اُن اخباروں کے اہتمام سے منعقد ہوتی تھیں، جن میں ایک آدھ کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں گذر چکا ہے۔

ان سے ہٹ کر ادبی مذاکرات کے مقصد سے جو ادارے قائم ہوئے تھے ان میں سے ایک کشمیر رائیٹرز لیگ تھی جس کے قیام میں شمیم لال دلی تیرتھہ کشمیری کی

کی مسائی کو ذہل تھا اور اس کے اراکین میں پریم ناتھ پردیسی، پیرزادہ غلام احمد ہجوڑ، سومانہ ترجمیل، سومانہ زلشی، پنڈت گنگا دھر بھٹ دیہاتی، شاد کشمیری وغیرہ شامل تھے۔ اور اس کے اہتمام سے شعر و سخن اور علم و ادب کی مصفیس وقتاً فوقتاً منعقد ہوتی تھیں۔ ایک اور ادارہ اہل ریڈنگ روم کے نام سے بھی قائم تھا۔ جس کے قیام کے لئے ہمارا ہر پرتاپ سنگھ سے خاص طور پر اجازت اور منظورئی حاصل کی گئی تھی۔ اس ریڈنگ روم میں ملک بھر کے اردو اخبارات آتے تھے اور اس کے اراکین ہل بیٹھ کر شعری اور ادبی مذاکرات میں حصہ لیتے تھے۔ رشید لال دلی، اس کے بھی بانی مہمانوں میں سے تھے۔

شیخ محمد عبداللہ جب علی گڑھ سے تعلیم کی تکمیل کر کے آئے تو ان کے اور ان کے چند رفقاء کے ذہن میں بھی نوجوانوں کی علمی اور ادبی دلچسپیوں کو ترقی دینے کے مقصد سے ایک ادارہ قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور اس کی پیش رفت میں انہوں نے مسلم ریڈنگ روم قائم کیا تھا۔ اس ریڈنگ روم میں بھی ملک بھر کے اردو اور انگریزی اخبار آتے تھے اور تعلیم یافتہ نوجوان یہاں اکٹھے ہو کر علمی، ادبی اور بعض وقت سیاسی امور پر بھی تبادلہ خیال کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ آئندہ کے سیاسی کارکنوں کی تربیت گاہ بن گئی اور اگلے دور کی آزادی کی جدوجہد کے نیتا یہیں سے اُٹھے۔

اردو سبھا۔

ہری پرتاپ کالج سری نگر کے اساتذہ اور طلباء کی بزم تھی۔ یہ پہلے بزم ادب کے نام سے موسوم تھی، لیکن محمد دین تاثیر کے اس کالج کے پرنسپل مقرر ہو کر آنے کے بعد ان ہی کی تجویز سے بزم کا نام "اردو سبھا" میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اس بزم کے اہتمام سے وسیع پیمانے پر علمی ادب چلے اور مشاعرے منعقد ہوتے تھے۔ علمی اور ادبی جلسوں میں

مشاہیر بھی مدعو کئے جاتے تھے۔ سرتیج بہادر سپرو نے اپنی تاریخی تقریر میں کانڈکروہ
آگے آ رہے، اسی کالج اور اسی سبھا کے پلیٹ فارم سے کی تھی۔ کچھ عرصہ یہ بزم
خاموشی سی بھی رہی تھی۔ لیکن ۱۹۳۴ء میں اس کا احیاء ہوا۔

بزمِ اردو، جموں و کشمیر

ستمبر ۱۹۳۴ء میں سری نگر میں قائم ہوئی تھی۔ بزم کے مقاصد میں علمی اور
ادبی محفلوں کے انعقاد کے علاوہ خاص طور پر مشاعروں کی محفلیں وسیع پیمانہ پر منعقد
کرناتھا۔ اس بزم کا پہلا مشاعرہ، نیشن اسکول، سری نگر کے احاطہ میں، ستمبر ۱۹۳۴ء
کو منعقد ہوا تھا، جس کی صدارت پروفیسر نند لال کول طالب نے کی تھی۔ اس موقع پر
بزم کے عہدہ دار بھی چنے گئے۔ صدر، پنڈت دینا ناتھ چکمن، مست، کاشمیری، معتمد
قیس شروانی۔ دوسرے مشاعرے کی صدارت پروفیسر علیم الدین سالک نے کی تھی۔
اور محفل میں دشوناتھ ماہ، مولانا نہر شکوہ آبادی، انڈر سکری، محمد الدین فوق، فاضل
کاشمیری، فاضل کاشمیری، پنڈت رادھا کشن بھانجنون اور چودھری خوشی محمد ناظر
نے شرکت کی اور اپنا کلام سنایا۔ پروفیسر سالک نے اپنے خطبہ صدارت میں مشرقی
شاعری کی خصوصیات کے علاوہ اردو زبان کی تاریخ پر بھی مختصر روشنی ڈالی تھی۔
بزم کا تیسرا مشاعرہ ۱۴ ستمبر ۱۹۳۴ء کو پروفیسر نند لال کول طالب
کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ جس میں مذکورہ بالا شعراء کے علاوہ عبدالرحمن نیازی
نے بھی اپنا کلام سنایا تھا۔

۱۵ ستمبر ۱۹۳۴ء کو بزم کا ایک کاروباری جلسہ منعقد ہوا تھا۔ جس میں
یہ طے پایا کہ بزم کی دوش خیز جموں اور کشمیر کی ہوں گی۔ ان دونوں شاخوں کے
عہدیدار بھی منتخب ہوئے کشمیر کی شاخ کے صدر پنڈت دینا ناتھ مست، نایب

صدر میرزا کمال الدین شیدا اور معتمد حکیم برکت علی برکت۔ معتمد فائینانس حکومت
جہول و کشمیر اور جہول کی شاخ کے نایب صدر میرزا مبارک بیگ شیدا اور شیخ غلام
حیدر خان چستی اور معتمد محمد اکبر اجگر منتخب ہوئے۔ ان عہدیداروں کے علاوہ
ہر شاخ کے ایک ایک "امین" یا خزانہ دار کا بھی انتخاب ہوا۔ کشمیر کی شاخ کے
امین پیر زادہ علی اکبر اور جہول کی شاخ کے لالہ گردھاری لالہ صراف نمنا، پرونیسر
سالک اور محمد الدین فوق، بزم کے سرپرست مقرر ہوئے۔ فوق اس زمانے میں
"اجبار کشمیری" نکالتے تھے۔

ایک اور بزم، کشمیری بزم ادب کے نام سے، میرزا غلام حسن بیگ عارف اور
ان کے کچھ ساتھیوں کی مساعی سے ۱۹۴۴ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس کا مقصد بھی نوجوان
ادیبوں میں شائستہ ادبی صلاحیتوں کو ابھارنا اور ان کے اظہار کے مواقع فراہم کرنا تھا۔
بزم ساغر، کے نام سے شعر و سخن کی ایک انجمن، سری نگر میں قائم ہوئی تھی جس
سرگرم اراکین میں پنڈت زندون ٹینگ ساغر، پنڈت دینا ناتھ نادم، دینا ناتھ
مات، پنڈت لہ کول شایق، اور کئی نوجوان شاعر شامل تھے۔ علامہ عامل درویش
گو اس بزم کے سرپرست کی حیثیت رکھتے تھے۔ بزم کی مجلسیں انہیں کی قیام گاہ،
بارہ نشاط کے قریب، گپت گنگا میں منعقد ہوتی تھیں۔ غزل کہنے کے لئے طرح مصرع
دیا جاتا اور ایک دو محفلوں کے لئے طرح مصرع ساغر کی غزلوں سے منتخب کیا گیا
تھا۔

پس نوشت: یونکو ہاری کے نامور شاعر میاں محمد بخش (جنہیں پنجابی اور پہاڑی زبان کے دعویٰ دار اپنے اپنے حلقہ لسانی سے منسک قرار دیتے ہیں) ۱۸۲۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۷ء میں وفات پانے۔ وہ ضلع میرپور کے رہنے والے تھے۔ اُن کی تصنیف "سیف الملک" کا درجہ پنجابی زبان میں ہیر راجپوت کے بعد آتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے پندرہ سولہ اور کتا میں لکھیں۔ تنازعہ تحقیق کے مطابق وہ ایک غیبی رمز کے تحت سرینگر آئے۔ اور شیخ احمد کشمیر (غالباً شیخ احمد تارہ بلی متوفی ۱۲۹۲ھ) سے سلیک و سلوک کے مسائل پر تبادلہ خیال کیا۔ بعد میں باطنی ترغیب اور مرشد کے اشارے پر وہ خود حضرت شیخ نور الدین نورانی دلیؒ کی بارگاہ پر حاضری دینے کے لئے چرار شریف گئے۔ اسی طرح یہ بات بھی تذکروں میں بیان ہوئی ہے کہ حضرت شیخ مخدوم حمزہ کشمیری (وفات: ۱۳۰۷ھ) جب چرار شریف جلتے تو اعلیٰٰ نئی میں ادھر ہی جوتے اتار کر ننگے پاؤں زیارت کی طرف سفر جاری رکھتے۔

